فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ الآية
وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝ الآية

پاسبانِ حق

نجم الفتاوی

جلد سوم

کتاب الزکوۃ والصوم والحج

زکوۃ، روزہ اور حج سے متعلق تقریباً ساڑھے پانچ سو اہم فتاویٰ جات کا مدلل ومفصل مجموعہ

تالیف

شیخ الحدیث مفتی سید نجم الحسن امروہوی دامت برکاتہم
مہتمم ورئیس دارالافتاء جامعہ دارالعلوم یاسین القرآن

جدید ترتیب وتبویب

مفتی وقار احمد
استاذ جامعہ دارالعلوم یاسین القرآن ([illegible])

فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ٥ الاية

وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ٥ الاية

نَجْمُ الفَتَاوٰى

جلد سوم

كتاب الزكوة والصوم والحج

زکوٰۃ، روزہ اور حج سے متعلق تقریباً ساڑھے پانچ سو
اہم فتاوی جات کا مدلل ومفصل مجموعہ

تالیف

شیخ الحدیث مفتی **سیّد نجم الحسن** امروھوی دامت برکاتہم

مہتمم ورئیس دارالافتاء جامعہ دارالعلوم یاسین القرآن

جدید ترتیب وتبویب

مفتی **وقار احمد**

استاذ جامعہ دارالعلوم یاسین القرآن (نارتھ کراچی)

کتاب کا نام	نجم الفتاویٰ (جلد سوم) ''کتاب الزکوٰۃ والصوم والحج''
مؤلف	حضرت شیخ الحدیث مفتی سید نجم الحسن امروہوی دامت برکاتہم
ترتیب وتبویب	مولانا مفتی وقار احمد صاحب (استاذ جامعہ دارالعلوم یاسین القرآن نارتھ کراچی)
کمپوزنگ، سیٹنگ	بھائی شکیل احمد صدیقی صاحب
سن اشاعت	۱۴۳۱ھ بمطابق ۲۰۱۰ء
مطبع	پرنٹ مارک 0321-3939101, 0321-9270048
ناشر	شعبہ نشر واشاعت دارالعلوم یاسین القرآن نارتھ کراچی

حاصل کرنے کیلئے رابطہ کیجئے

شعبۂ نشر واشاعت۔ جامعہ دارالعلوم یاسین القرآن نارتھ کراچی

0301-3452678 021-32064664021-38302662

مکتبہ المعارف، اسلام کتب مارکیٹ بنوری ٹاؤن کراچی

0333-2833755

نیز ملک کے تمام مشہور کتب خانوں پر بھی دستیاب ہے

فہرست کتاب الزکوۃ

جن چیزوں اور لوگوں پر زکوٰۃ واجب نہیں

مصارف زکوٰۃ کا بیان

جن جگہوں پر زکوۃ کی رقم نہیں دی جاسکتی

﴿باب العشر والخراج﴾

زکوٰۃ کے متفرق مسائل

فہرست کتاب الصوم

﴿رمضان کا چاند دیکھنا اور اختلاف مطالع کا بیان﴾

﴿روزے کی تعریف اور اس کی اقسام﴾

﴿سحری اور افطاری کا بیان﴾

﴿جن چیزوں سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے﴾

﴿جن چیزوں سے روزہ نہیں ٹوٹتا﴾

جن چیزوں سے روزہ مکروہ ہوجاتا ہے

جن چیزوں سے روزہ مکروہ نہیں ہوتا

روزے کی قضاء، کفارہ، فدیہ اور نذر وغیرہ کا بیان

روزے کے متفرق وجدید مسائل

اعتکاف کے مسائل

فہرست کتاب الحج

﴿فصل فی فرضیة الحج وشرائطه وأركانه﴾

(حج کی فرضیت، شرائط اور ارکان سے متعلق مسائل کا بیان)

فصل فی واجبات الحج وسننه

(حج کے واجبات اور سنن کا بیان)

﴿فصل فی اشتراط المحرم للمرأة﴾

(عورتوں کیلئے محرم کی شرط کا بیان)

﴿فصل فی الاحرام﴾

(احرام اور اس کے مباحات و ممنوعات کا بیان)

﴿فصل فی القران والتمتع﴾

(حج قران اور تمتع سے متعلق مسائل کا بیان)

فصل فی الحج عن الغیر والبدل والوصیۃ

(حج بدل اور نفلی حج سے متعلق مسائل کا بیان)

﴿فصل فی الجنایات﴾

(جنایات کا بیان)

﴿فصل فی العمرة﴾

(عمرہ سے متعلق مسائل کا بیان)

فصل فی زیادة المدینة المنورة والمقامات المتبركة

(مدینہ منورہ اور مقامات مقدسہ سے متعلق مسائل کا بیان)

﴿فصل فی المسائل المتفرقة المتعلقة بالحج﴾

(حج کے متعلق متفرق مسائل کا بیان)

﴿کتاب الزکوۃ﴾

(مسائل زکوٰۃ کا بیان)

﴿زکوٰۃ کی تعریف، نصاب، حکم، فضائل اور نہ دینے کے نقصانات﴾

(۱) زکوٰۃ کی تعریف، حکم اور فوائد ونقصانات

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ میں ایک اسکول ٹیچر ہوں خالی گھنٹے میں ہم تمام اساتذہ جمع ہو کر چائے وغیرہ پیتے ہیں اور مختلف موضوعات پر آپس میں گفتگو کرتے ہیں۔ ایک روز اسی طرح کی گفتگو میں زکوٰۃ کے مسئلے پر بات چیت ہوئی لیکن صحیح تحقیقی بات ہمیں معلوم نہ تھی اس لئے یہ ذمہ میں نے اپنے سر لیا کہ میں اپنے مفتی صاحب سے آپ لوگوں کو پوچھ کر بتادوں گا، اس لئے حضرت آپ مہربانی فرما کر ہمارے ان سوالات کے جوابات بتادیں کہ زکوٰۃ کی کیا تعریف ہے؟ یہ کب فرض ہوئی اور اسکا انکار کرنیوالے اور ادا نہ کرنیوالے کا کیا حکم ہے؟ زکوٰۃ دینے یا نہ دینے کے کیا کیا فوائد ونقصانات ہیں، نیز کونسے مہینہ میں زکوٰۃ ادا کرنا افضل ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... زکوٰۃ کے لغوی معنی پاکی اور بڑھوتری کے ہیں۔ اور اصطلاحِ شریعت میں زکوٰۃ کہتے ہیں کسی صاحب نصاب کا، مال پر سال گزرنے کے بعد اس مال کا ڈھائی فیصد محض اللہ کی رضا کیلئے کسی مسلمان فقیر غیر ہاشمی کو اسطور پر مالک بنانا کہ مالک کے منافع اس سے کلی طور پر منقطع ہو جائیں۔

راجح قول کے مطابق اجمالاً زکوٰۃ کی فرضیت کا حکم ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں آیا البتہ تفصیلاً ہجرت کے بعد سن ۲ ہجری شوال کے مہینہ میں زکوٰۃ کی فرضیت کا حکم نازل ہوا۔

زکوٰۃ کا منکر کافر ہے اور اس بات پر علماء کا اتفاق ہے کہ اگر کوئی شخص یا جماعت زکوٰۃ ادا کرنے سے منع کرے اور مزاحمت کرے تو خلیفہ وقت پر لازم ہے کہ ان سے قتال کرے جیسا کہ صحابہ کرام نے کیا تھا۔

نیز زکوٰۃ ادا نہ کرنیوالا شخص گناہ گار اور فاسق ہے اسکے متعلق قرآن وحدیث میں بہت وعیدیں آئی ہیں۔ بعض آیات میں آتا ہے کہ سونے چاندی کو گرم کر کے زکوٰۃ ادا نہ کرنیوالے کی پیشانی، پہلو اور پشت کو داغا جائیگا اور اسکے خزانے کو سانپ کی شکل میں گلے کا طوق بنا کے ڈال دیا جائیگا۔ اسکے علاوہ اور بیشمار وعیدات تارک زکوٰۃ کے بارے میں آئی ہیں۔

زکوٰۃ ادا کرنے کے فوائد میں سب سے بڑا فائدہ تو یہی ہے کہ اس میں اللہ تعالی کے حکم کی بجا آوری ہے جو صاحب نصاب پر فرض ہے اور اللہ تعالی کی خوشنودی اور رضا کا سبب ہے، اسی طرح اللہ تعالی زکوٰۃ ادا کرنیوالے سے گناہوں کی گندگی کو پاک کر دیتے ہیں اور زکوٰۃ، زکوٰۃ ادا کرنے والے میں جود وسخا پیدا کرتی ہے جبکہ بخل کو دور کرتی ہے۔ اس میں غریبوں کی اعانت ہے اور کمزوروں کو قوی کرتا ہے۔ نیز زکوٰۃ دینے سے مال میں برکت ہوتی ہے اور باقی ماندہ مال محفوظ ہو جاتا ہے۔

نیز زکوٰۃ کی ادائیگی میں کسی مہینہ کی کوئی تخصیص نہیں ہے بلکہ سال پورا ہونے پر جلد سے جلد ادا کر دینی چاہئے، اگر ادا کرنے سے پہلے

موت آ گئی تو گناہ گار ہوگا۔

لمافی الفقہ الاسلامی(۲/۷۳۴): فمن انکر فرضیتھا کفر وارتدان کان مسلماناشاببلادالاسلام بین اھل العلم وتجری علیہ احکام المرتدین.....لمانع الزکاۃ عقاب فی الأخرۃ وعقاب فی الدنیا (وفی ص ۷۳۵)وبناء علیہ قال العلماء بالاتفاق اذامنع واحداوجمع الزکاۃ وامتنعوابالقتال وجب علی الامام قتالھم وان منعھاجھلابوجوبھاأوبخلابھالم یکفر.

وفی الشامیۃ(۲/۲۷۲): وقدیقال المراد ان لایؤخرالی العام القابل لمافی البدائع عن المنتقی بالنون اذالم یؤد حتی مضی حولان فقدأساء وأثم. واللہ اعلم بالصواب

(۲) زکوۃ کی مشروعیت، فضائل اور وعیدیں

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ مجھے دینی باتیں سیکھنے اور معلوم کرنے کا بہت شوق ہے۔ میں یہ باتیں خود بھی سیکھتا ہوں اور دوسروں کو بھی سکھاتا ہوں۔ آپ سے نہایت مؤدبانہ درخواست یہ تھی کہ آپ مجھے یہ بتائیے کہ زکوۃ کی مشروعیت کب ہوئی؟ نیز زکوۃ ادا کرنے کے کیا فوائد ہیں اور زکوۃ ادا نہ کرنے کے کیا نقصانات ہیں۔ تفصیل سے بیان فرما کر عنداللہ ماجور ہوں؟

الجواب حامداًومصلیاً زکوۃ ہجرت کے دوسرے سال یعنی ۲ھ شوال میں صوم رمضان کے بعد مدینہ منورہ میں فرض ہوئی، زکوۃ ایک مالی عبادت ہے جو نماز، روزہ کی طرح فرض ہے اور جس کا ادا کرنا ہر مالدار صاحبِ نصاب کے ذمہ سال گزرنے پر ضروری ہے۔

زکوۃ کے فضائل بیشمار ہیں اُن میں سے چند فضائل یہ ہیں:

(۱) زکوۃ کی وجہ سے دنیا اور آخرت میں سرخروئی حاصل ہوتی ہے۔

(۲) حدیث شریف میں آتا ہے کہ مال کی زکوۃ ادا کرنے سے مال کے شر سے انسان محفوظ ہو جاتا ہے۔

(۳) زکوۃ کی ادائیگی سے مال پاک ہو جاتا ہے۔

(۴) زکوۃ کی ادائیگی نفس کو بخل اور کنجوسی سے پاک کرنے کا ذریعہ ہے۔

(۵) مال میں برکت آتی ہے۔

(۶) حدیث شریف میں ہے کہ صدقہ کے دینے سے شر کے ستر دروازے بند ہو جاتے ہیں اور زکوۃ ادا نہ کرنے والوں کے بارے میں قرآن پاک میں سخت وعید آئی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں (یعنی زکوۃ نہیں نکالتے) ان آپ ان کو ایک بڑی دردناک سزا کی خبر سنا دیجئے جو کہ اس روز واقع ہوگی۔ اور حدیث شریف میں بھی سخت وعید آئی ہے:

☆ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو قوم زکوۃ نہیں نکالتی اللہ تعالیٰ اسے قحط سالی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

☆ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا اور اس نے اس سے زکوۃ ادا نہ کی تو قیامت کے روز اس کے مال و

بڑا زہریلا گنجا سانپ بنا دیا جائے گا وہ سانپ اس کی گردن میں لپٹ جائے گا پھر اس کے دونوں جبڑے نوچے گا اور کہے گا میں ہی تیرا مال ہوں، میں ہی تیرا خزانہ ہوں۔

اور زکوٰۃ نہ دینے والا دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کی لعنت کا مستحق بنتا ہے۔

لما في بذل المجهود(۳/۱): اختلف في اول فرض الزكوة فذهب الاكثر الى انه وقع بعد الهجرة فقيل كان في السنة الثانية قبل فرض رمضان.

لما في الطحطاوي على مراقي الفلاح(ص۷۱۳): فرضت في السنة الثانية من الهجرة كالصوم قبل فرضه وهي طهرة لصاحبها من الذنوب قال الله تعالى (خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وتُزَكِّيْهِمْ بها) ولها معان اخروهي البركة يقال زكت النفقة اذا بورك فيها. والمدح .. وقال الاجهوري قيل ورد أن على مانع الزكوة سبعين لعنة ... ورد في الحديث الحسن أنه ينزل من السماء كل يوم وليلة اثنتان وسبعون لعنة منها احدى سبعون على مانع الزكوة وواحدة على اليهود.

وفي الدر المختار(۲۵۶/۲): كتاب الزكوة قرنها بالصلوة في اثنين وثمانين موضعا في التنزيل دليل على كمال الاتصال بينهما فرضت في السنة الثانية قبل فرض رمضان.

وفي الفقه الاسلامي (۷۳۳/۲): الزكوة ركن من اركان الاسلام الخمسة وفرض من فروضه وفرضت في المدينة في الشوال السنة الثانية من الهجرة بعد فرض رمضان وزكاة الفطر

وفيه ايضاً(ص۷۳۴): لمانع الزكوة عقاب في الاخرة وعقاب في الدنيا اما عقاب الاخرة فهو العذاب الأليم لقوله تعالى والذين يكنزون الذهب والفضة .. فبشرهم بعذاب أليم... ولقوله عليه السلام من اتاه الله مالا فلم يؤد زكاته مثل له شجاعا اقرع له زبيبتان يطوقه يوم القيمة ياخذ بلهزمتيه يعني شدقيه ثم يقول انا مالک انا كنزک ... وفي رواية مامن صاحب ذهب ولا فضة لايؤدى منها حقها اى زكاتها الا اذا كان يوم القيمة صفحت صفائح من نار فاحمي عليها في نارجهنم فيكوى بها جنبه وجبينه وظهره كلما ردت أعيدت له في يوم كان مقداره خمسين الف سنة حتى يقضى بين العباد فيرى سبيله اما الى الجنة واما الى النار واما العقاب الدنيوى للفرد بسبب التقصير والاهمال فهو اخذها منه والتعزير والتغريم المالي واخذ الحاكم شطر المال قهرا عنه

(۳) زکوٰۃ کے لغوی، اصطلاحی معنی، زکوٰۃ کے منکر اور تارک کا حکم

سوال　کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زکوٰۃ کے لغوی اور اصطلاحی معانی کیا ہیں، زکوٰۃ کی

فرضیت کب ہوئی، زکوۃ کا منکر اور زکوۃ ادا نہ کرنے والا کافر ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً زکوۃ کے لغوی معنی پاکیزگی اور زیادتی کے ہیں اور اصطلاح شریعت میں زکوۃ مال مخصوص کا مخصوص اشخاص کو مالک بنانے کا نام ہے اللہ کی رضا کیلئے۔ اور اکثر حضرات کے نزدیک زکوۃ کی فرضیت سنہ ۲ ہجری میں ہوئی اور زکوۃ کا منکر کافر ہے۔ اور تارک گناہ گار ہے۔

لمافي الشامية(۲/۲۵٦): وشرعا (تمليک جزء مال عينه الشارع من مسلم فقير غير هاشمي ولا مولاه مع قطع المنفعة عن المملک من کل وجه لله تعالى.

وفي الدر المختار(۲/۲۵٦): وفرضت في السنة الثانية قبل فرض رمضان.

وفي الفقه الاسلامي وادلته(۳/۱۷۹۲): واجمع المسلمون في جميع الاعصار على وجوب الزکاة، واتفق الصحابة رضي الله عنهم على قتال مانعيها، فمن أنكر فرضيتها كفر وارتد ان كان مسلماً ناشئاً ببلاد الاسلام بين أهل العلم وتجرى عليه احكام المرتدين ويستتاب ثلاثا، فان تاب والاقتل ومن أنكر وجوبها جهلاً به اما لحداثة عهده بالإسلام، أو لأنه نشأ ببادية نائية عن الأمصار، عرف وجوبها ولا يحكم بكفره، لأنه معذور

وفي الفقه الاسلامي وادلته(۳/۱۷۹۳ تا ۱۷۹۴):لمانع الزکاة عقاب في الآخرة وعقاب في الدنيا. أما عقاب الآخرة فهو العذاب الأليم لقوله تعالى (وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ والْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللهِ. فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ يَوْمَ يُحْمىٰ عَلَيْهَا فِيْ نارِ جَهَنَّمَ، فَتُكْوىٰ بها جِبَاهُهُمْ وجُنُوْبُهُمْ وظُهُوْرُهُمْ، هٰذَا ما كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا ما كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ وأما العقاب الدنيوى للفرد بسبب التقصير والإهمال فهو أخذها منه والتعزير والتغريم المالي وأخذ الحاكم شطر المال قهراً عنه، قال رسول الله ﷺ من أعطاها. اى الزكاة مؤتجراً فله أجرها، ومن منعها فإنا آخذوها وشطر إبله عزمة من عزمات ربنا تبارک وتعالى. لايحل لآل محمد منها شئ فان كان مانع الزكاة جاحدا لو جوبها فقد كفر ... وان منعها جهلاً بوجوبها أو بخلاً بها لم يكفر،

(۴) فرضیت زکوۃ کیلئے نصاب اور حولان حول کی شرائط

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں درجہ ثالثہ کا طالب علم ہوں، اس سال امتحان دے کر گھر آیا ہوا تھا، رمضان کی تیاری کیلئے دورکر رہا تھا تو اچانک ایک مسئلہ ذہن میں آیا، لیکن جواب مجھے سمجھ نہ آیا تو آنجناب کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں، سوال یہ تھا کہ قرآن کریم میں جگہ جگہ حکم ہے کہ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ اب قرآن نے تو مطلق کہا ہے کہ زکوۃ

دو، لیکن ہم نے کتابوں میں زکوٰۃ کے مسائل کے بیان میں پڑھا ہے کہ زکوٰۃ کی فرضیت کی شرائط میں سے ایک شرط اس کا نصاب کا ہونا اور دوسری شرط اس پر حولان حول کا ہونا ہے تو یہ شرائط جو زکوٰۃ سے متعلق کتابوں میں لکھی ہیں یہ زیادتی علی کتاب اللہ میں داخل نہیں ہیں۔ نیز نصاب اور حولان حول کی شرائط کس نص سے ثابت ہیں۔ براہ کرم مفصل بحوالہ جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً اگرچہ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کے متعلق قرآن مجید میں مطلق حکم فرمایا ہے لیکن اس پر نصاب اور حولان حول کی شرائط کا اضافہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی متعدد احادیث میں موجود ہے جو کہ خبر مشہور ہیں۔ اسی طرح زکوٰۃ کی فرضیت کیلئے ان دونوں شرائط کے پائے جانے پر اجماع بھی نقل کیا گیا ہے۔ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اجماع بمنزلہ خبر متواتر کے ہوتا ہے اور اجماع فقہاء عظام خبر مشہور کے حکم میں ہے۔ اور خبر متواتر اور مشہور سے کتاب اللہ پر زیادتی جائز ہے، بہر حال فرضیت زکوٰۃ کیلئے نصاب اور حولان حول کی شرائط حدیث مشہور کی بنا پر لگائی گئی ہیں۔

لما في الصحيح للبخاری(۱/۱۸۸،۱۸۹): حدثنا اسحق بن يزيد قال اخبرنا شعيب بن اسحق قال انا الاوزاعی قال اخبرنی يحيى بن ابی كثير ان عمرو بن يحيى بن عمارة اخبره عن ابيه يحيى بن عمارة بن ابی الحسن انه سمع ابا سعيد يقول قال النبی ﷺ ليس فيما دون خمس اواق صدقة ولا فيما دون خمس ذود صدقة وليس فيما دون خمسة اوسق صدقة.

وفی عمدة القاری(۸/۲۵۹): ((ليس فيما دون خمسة اواق صدقة)) وفيه بيان نصاب الفضة وهو خمسة اواق وهی مائتا درهم لان كل اوقية اربعون درهما وحدد الشرع نصاب كل جنس بما يحتمل المواساة فنصاب الفضة خمس اواق وهو مائتا درهم بنص الحديث والاجماع واما الذهب فعشرون مثقالا، والمعول فيه على الاجماع.

وفی الهداية(۱/۲۰۰): الزكوة واجبة على الحر العاقل البالغ المسلم اذا ملك نصابا ملكا تاما وحال عليه الحول: اما الوجوب فلقوله تعالىٰ واتوا الزكاة ولقوله عليه السلام ادّوا زكوة اموالكم وعليه اجماع الامة والمراد بالواجب الفرض لانه لا شبهة فيه...... ولا بدمن ملك مقدار النصاب لانه ﷺ قدر السبب به ولا بد من الحول لانه لابد من مدة يتحقق فيها النماء وقدرها الشرع بالحول لقوله ﷺ لا زكوة فی مال حتى يحول عليه الحول ولانه الممكن به من الاستمناء لاشتماله على الفصول المختلفة والغالب تفاوت الاسعار فيها فادير الحكم عليه.

وفی نور الانوار(صـ۲۲۲): ثم هو على مراتب(ای الاجماع)...... فالأقوىٰ اجماع الصحابه نصاً مثل أن يقولوا جميعا اجمعنا على كذا) فانه مثل الآية والخبر المتواتر...... ثم اجماع من بعدهم (ای بعد الصحابة من اهل كل عصر) على حكم لم يظهر فيه خلاف من سبقهم من الصحابة فهو بمنزلة الخبر

المشهور يفيد الطمانينة دون اليقين.

(۵) زکوٰۃ کا نصاب

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ میں تبلیغی جماعت سے تعلق رکھنے والا ہوں، تبلیغی جماعت میں اوقات لگتے رہتے ہیں ہمارے ایک رشتہ دار ہیں جو اکثر مجھ سے مسائل پوچھتے رہتے ہیں اگر مجھے یقیناً معلوم ہوتے ہیں تو میں بتا دیتا ہوں ایک دن انہوں نے مجھ سے زکوٰۃ کے متعلق کچھ مسائل پوچھے جن کے بارے میں مجھے یقینی طور پر علم نہیں تھا تو میں نے چاہا ان مسائل کے بارے میں آپ سے پوچھ کر ان کو بتادوں وہ مسائل یہ ہیں:

زکوٰۃ کا نصاب کتنا ہے؟ چاندی کے بجائے اگر کوئی سونے کو سامنے رکھ کر زکوٰۃ انگریزی مہینہ کے اعتبار سے دیدیا کرے تو اسکا کیا حکم ہے اور اگر پہلے اسی طرح ادا کی جاچکی ہو تو اسکا کیا کیا جائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: زکوٰۃ کا شرعی نصاب ساڑھے سات تولہ سونا (۸۷،۴۷۹گرام) اور ساڑھے باون تولہ چاندی (۶۱۲،۳۵گرام) ہے اور چاندی کے نصاب کا اعتبار کرکے زکوٰۃ دینا ضروری ہے کیونکہ سونے چاندی کی قیمت میں تفاوت ہو تو اقل نصاب پر زکوٰۃ ادا کی جائیگی اور آجکل اقل نصاب چاندی کا ہے لہٰذا سونے کے نصاب کو معیار بنا کر زکوٰۃ ادا کرنا جائز نہیں ہے۔

امور شرعیہ میں قمری سال کا لحاظ ہے نہ کہ شمسی سال کا، شمسی سال گیارہ دن بڑا ہوتا ہے لہٰذا جب گزشتہ سالوں میں شمسی سالوں کے لحاظ سے زکوٰۃ دی ہے تو قمری سال کا حساب کرکے باقی ماندہ زکوٰۃ ادا کردی جائے اور آئندہ سالوں میں قمری سال کا لحاظ کرکے زکوٰۃ ادا کی جائے۔

لمافي التاتارخانية(۲/۲۳۷): ولو كان بالتقويم بكل واحدمنهمايبلغ نصابايقوم بماهوانفع للفقراء من حيث الرواج وان كانا في الرواج سواء يتخير المالك وفي شرح الطحاوي:فأمافي بلادنااليوم يقوم عروض التجارة على كل حال بالدراهم لان النقد عندناهو الدراهم.

وفي الشامية(۲/۲۹۵):وأجل سنة قمرية بالاهلة على المذهب وهي ثلاثمائة واربع وخمسون وبعض يوم وقيل شمسية بالايام وهي ازيدباحد عشريوما. والله اعلم بالصواب

(۶) ساڑھے سات تولہ سونا اور ساڑھے باون تولہ چاندی کا نصاب کیسے بنا؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ پہلے دور کے اندر دراہم اور دینار ہوتے تھے اسی حساب سے کتابوں میں زکوٰۃ کے متعلق لکھا ہوا ہے کہ دوسو دراہم میں زکوٰۃ ہے اور بیس دینار میں زکوٰۃ ہے لیکن آجکل دراہم اور دینار تو نہیں ہیں گرام اور تولے ہیں تو علماء کرام فرماتے ہیں کہ چاندی کا نصاب ساڑھے باون تولہ چاندی اور سونے کا نصاب ساڑھے سات تولہ ہے اب

معلوم یہ کرنا ہے کہ ان حضرات نے یہ نصاب کس حساب سے مرتب کئے ذرا تفصیل کے ساتھ اس کی وضاحت فرمائیں نیز یہ بھی بتائیں کہ سونے اور چاندی کا نصاب رتی ماشے اور گرام کے اعتبار سے کتنا بنتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ...... احادیث مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سونے کا نصاب ۲۰ مثقال (دینار) اور چاندی کا نصاب ۲۰۰ درہم ہے لیکن چونکہ آجکل دینار و درہم موجود نہیں اس لئے موجودہ پیمانوں کے لحاظ سے ان کی مقداریں درج ذیل ہیں:

''اجمالاً موجودہ پیمانوں کی مقداریں''

ایک قیراط=۵جو=۲۱۸۷ء ملی گرام= ۱٫۸ رتی

ایک رتی کا وزن ۱۲۱۵ء ملی گرام ہے، ۲۱۸۷ء÷ ۱۲۱۵ء= ۱٫۸ رتی

ایک ماشہ=۸ رتی، ایک تولہ= ۱۲ ماشہ

ایک درہم=۱۴ قیراط، ایک دینار= ۲۰ قیراط

ایک کلو= ۱۰۰۰ گرام، ایک گرام= ۱۰۰۰ ملی گرام

''تفصیل درہم تولہ، ماشہ''

ایک درہم=۱۴ قیراط، ایک قیراط=۱٫۸ رتی

۱٫۸ رتی x ۱۴ قیراط=۲۵٫۲ رتیاں x ۲۰۰ درہم= ۵۰۴۰ رتیاں

۵۰۴۰ رتیاں÷۸ رتی یا ایک ماشہ=۶۳۰ ماشے

۶۳۰ ماشے ÷ ۱۲ ماشے یا ایک تولہ = ۵۲٫۵ تولے ہوتے ہیں

''تفصیل گرام در درہم''

ایک درہم میں گرام=۱۴x۲۱۸۷ء =۳٫۰۶۱۸ گرام

۲۰۰ درہم میں گرام= ۳٫۰۶۱۸x۲۰۰ =۶۱۲٫۳۶ گرام

ایک تولہ میں گرام= ۹۷۲ء۰x۱۲ = ۱۱٫۶۶۴ گرام

۵۲٫۵ میں گرام= ۱۱٫۶۶۴x۵۲٫۵=۶۱۲٫۳۶ گرام

''تفصیل دینار تولہ، ماشہ''

ایک دینار=۲۰ قیراط، ایک قیراط =۱٫۸ رتی x۲۰ قیراط=۳۶ رتیاں

۳۶ رتیاں x۲۰ دینار= ۷۲۰ رتیاں÷ ۸ رتی یا ایک ماشہ = ۹۰ ماشے

۹۰ ماشے÷ ۱۲ ماشے= ۷٫۵ تولے ہوتے ہیں

''تفصیل گرام در دینار''

ایک دینار میں گرام= ۰٫۲۱۸۷x۲۰ =۴٫۳۷۴ گرام

۲۰ دینار میں گرام= ۲۰ x ۴٫۳۷۴ = ۸۷٫۴۸ گرام

ایک تولہ میں گرام= ۱۲ x ۰٫۱۲۱۵ =۱٫۶۶۴ گرام

۷٫۵ تولے میں گرام= ۷٫۵ x ۱۱٫۶۶۴ = ۸۷٫۴۸ گرام

لہٰذا خلاصہ کلام یہ ہے کہ ۲۰۰ درہم موجودہ زمانے کے اعتبار سے ۵۲٫۵ تولہ چاندی یا ۶۱۲٫۳۶ گرام چاندی بنتے ہیں، اور ۲۰ مثقال (دینار) موجودہ زمانے کے اعتبار سے ۷٫۵ تولہ سونا یا ۸۷٫۴۸ گرام سونا بنتے ہیں۔

لما فی ترمذی شریف (۱/۱۳۴): **عن علیؓ قال قال رسول اللہ ﷺ قدعفوت عن صدقة الخیل والرقیق فھاتوا صدقة الرقة من کل اربعین درھما درھم ولیس لی فی تسعین ومائة شیٔ فاذا بلغت مائتین ففیھا خمسة دراھم.**

وفی عالمگیری (۱/۱۷۸): **تجب فی کل مائتی درھم خمسة دراھم وفی کل عشرین مثقال ذھب والمثقال ھو الدینار عشرون قیراطا**

والدرھم اربعة عشر قیراطا

والقیراط خمس شعیرات

وفی الدرالمختار (۲/۲۹۵): **نصاب الذھب عشرون مثقالاً والفضة مائتا درھم کل عشرة دراھم وزن سبعة مثاقیل والدینار عشرون قیراطا والدرھم أربعة عشر قیراطاً والقیراط خمس شعیرات فیکون الدرھم الشرعی سبعین شعیرة والمثقال مائة شعیرة**

(۷) گرام کے اعتبار سے سونے چاندی کا نصاب

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں شادی شدہ ہوں اور میرے آپ سے چند سوال ہیں جن کا مجھے جواب چاہئے، عین نوازش ہوگی، اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔ میری کچھ الجھن کم ہوگی اور ہماری معلومات میں اضافہ ہوگا۔ میں بہت پریشان رہتی ہوں اس مسئلہ کی وجہ سے، صحیح جواب نہیں ملتا، کتابوں سے بھی ٹھیک رہنمائی نہیں ملی۔ مفتی صاحب زکوۃ کے بارے میں پوچھنا تھا کہ شادی بیاہ میں عورتوں کو زیور ملتا ہے ہر شوہر کی اتنی آمدنی نہیں ہوتی کہ زکوۃ ادا کرسکیں تو کیا کرنا چاہئے؟ مفتی صاحب اتنا تو معلوم ہے کہ 7 تولہ سونے پر زکوۃ ہوتی ہے لیکن مفتی صاحب آج کل 10 گرام سونے کا حساب چلتا ہے تو کتنے گرام سونے پر زکوۃ ادا کرنی ہوگی اور کیا ہم تھوڑا تھوڑا کرکے ادا کرسکتے ہیں کیونکہ میرے شوہر ملازمت پیشہ ہیں اور مجھے اتنا خرچ نہیں ملتا کہ میں ایک ساتھ زکوۃ دوں تو پورا سال تھوڑا تھوڑا دے سکتی ہوں یا رمضان میں ہی دینا ضروری ہے؟

نیز مفتی صاحب ایک الجھن یہ ہے کہ آج کل ہمارے معاشرے میں الگ الگ مسلک ہیں، اہل سنت، اہل تشیع، اہل حدیث وغیرہ وغیرہ۔ تو مفتی صاحب ایک اہل سنت کی لڑکی کی شادی اہل تشیع میں ہو سکتی ہے یا نہیں اور اگر کچھ حالات میں ہو جائے تو کیا نکاح ہو جائے گا یا نہیں اور آخرت میں اس کی پکڑ ہے یا نہیں؟ اس لڑکی کیلئے کیا حکم ہے اگر اس کا شوہر اپنے مسلک پر نہ چلتا ہو۔ مجھے اس کا جواب ضرور دیجئے گا۔ آپ کی عین نوازش ہوگی۔

الجواب حامداً ومصلیاً......(۱)......سونے کا نصاب بالاتفاق 20 مثقال ہے جو تولے کے حساب سے ساڑھے سات (7.5) تولہ بنتا ہے اور گرام کے حساب سے 87.48 گرام بنتا ہے، لہٰذا اگر آپ کے پاس صرف سونا ہے (اگرچہ زیور کی شکل میں کیوں نہ ہو) اس کے علاوہ نقدی یا مملوکہ زائد از ضرورت سامان نہیں ہے تو اگر اس سونے کی مقدار 87.48 گرام کو پہنچتی ہے تو زکوٰۃ واجب ہے۔ اگر 87.48 گرام کی مقدار کو نہیں پہنچتی لیکن نقدی رقم یا کوئی مملوکہ زائد از ضرورت سامان بھی موجود ہے تو اگر دونوں کی مشترکہ قیمت ساڑھے باون (52.5) تولہ چاندی یا 612.36 گرام چاندی کی قیمت کے برابر یا زائد ہو جائے تو اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ جو ساڑھے باون (52.5) تولہ چاندی کے حساب سے نکالی جائے گی۔

(۲)......زکوٰۃ یکمشت ادا کرنا ضروری نہیں بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے ادا کرنا بھی جائز ہے البتہ یکمشت ادا کرنا بہتر ہے۔ اسی طرح رمضان شریف میں ادا کرنا بھی ضروری نہیں بلکہ جس وقت بقدر نصاب مال پر ایک سال کا عرصہ گزر جائے اس وقت زکوٰۃ کا وجوب ہوتا ہے، البتہ جب سال رمضان یا رمضان کے بعد پورا ہو رہا ہو تو رمضان میں ادا کرنا بہتر ہے۔

(۳)......سنی لڑکی کا نکاح شیعہ لڑکے کے ساتھ جائز نہیں، جس سنی لڑکی کا نکاح ہوا ہے اُس نکاح کو ختم کر دیا جائے، ورنہ ساری زندگی زنا ہوتا رہے گا۔

لما في تقريرات الرافعي (۱۸۳/۳): (ماخوذ من الفتح حيث قال واما المعتزلة الخ) وجعل الرملي في حاشية المنح المعتزلي والرافضي بمنزلة اهل الكتاب حيث قال قوله وصح نكاح كتابية القول يدخل في هذا الرافضة بانواعها والمعتزلة فلا يجوز ان تتزوج المسلمة السنية من الرافضي لانها مسلمة وهو كافر، فدخل تحت قولهم لايصح تزوج مسلمة بكافر، وقال الرستغفني لاتصح المناكحة بين اهل السنة والاعتزال فالرافضة مثلهم او أقبح، والرملي جعلهم من قبيل اهل الكتاب فيجوز نكاح نساء هم ولا يزوجون ولعله اعدل الاقوال لانه لايشك في كفر الرافضة.

وفي الدرالمختار (۲۹۵/۲): (نصاب الذهب عشرون مثقالاً والفضة مائتا درهم)

وفي الشامية تحته: (قوله عشرون مثقالاً) فما دون ذالك لازكوة فيه ولو كان نقصاناً يسيراً يدخل بين الوزنين لانه وقع الشك في كمال النصاب فلا يحكم بكماله مع الشك.

(۸) زکوٰۃ کے معاملے میں ساڑھے باون تولہ چاندی کے نصاب مقرر کرنے میں حکمت

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فقہ کی کتابوں میں یہ بات مصرح ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس مثلاً ساڑھے چار تولہ سونا ہو اور اس کے پاس مثلاً نقدی ہو یا چاندی ہو تو ان دونوں کو ملا کر اگر اس کی قیمت ساڑھے باون تولہ چاندی تک پہنچ جائے تو اس پر زکوٰۃ لازم ہوگی تو پوچھنا یہ ہے کہ فقہاء نے ساڑھے باون تولہ چاندی تک پہنچنے کی قید کیوں لگائی ہے یہ بھی تو کہہ سکتے تھے کہ ان دونوں کو ملا کر اگر ساڑھے سات تولہ سونے تک قیمت چلی جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے تو فقہاء نے ملانے کی صورت میں چاندی کا اعتبار کیوں کیا ہے سونے کا اعتبار کیوں نہیں کیا؟ تشفی بخش جواب مرحمت فرما کر شکریہ کا موقع دیں۔ بندہ بے حد مشکور ہوگا۔

الجواب حامداً ومصلیاً......شریعت مطہرہ میں ہر شخص کا خاص خیال رکھا گیا ہے چاہے وہ امیر ہو یا غریب۔ لہٰذا زکوٰۃ کے معاملے میں جو چاندی کا نصاب شریعت نے مقرر کیا ہے دراصل اس میں غریب لوگوں کا خیال رکھا گیا ہے کیونکہ سونے کے نصاب کی بنسبت چاندی کا نصاب جلدی پورا ہو جاتا ہے۔ جس سے غرباء ومساکین کو زیادہ فائدہ پہنچتا ہے۔

لما فی الفتاوىٰ التاتارخانية (۲/۲۳۷): ولو كان بالتقويم بكل واحد منهما يبلغ نصابا يقوم بما هو انفع للفقراء الخ.

وفی الهندية (۱/۱۷۹): ولو ضم احد النصابين الى الآخر حتى يؤدى كله من الذهب او من الفضة لا بأس به لكن يجب ان يكون التقويم بما هو أنفع للفقراء قدر او رواجا والافيؤدى من كل واحد ربع عشره الخ.

وفی الدر المختار (۲/۲۷۲): فيأثم بتاخيرها بلا عذر ...... لأن الأمر بالصرف الى الفقير معه قرينة الفور وهی انه لدفع حاجته وهی معجلة الخ.

(۹) اموالِ زکوٰۃ کی قسمیں اور ان کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کل جمعہ کے دن میں نے ایک مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی جو مولانا صاحب نماز پڑھا رہے تھے وہ بڑا اچھا بیان فرماتے ہیں انہوں نے آخر میں ایک مسئلہ ذکر کیا جو کہ میری سمجھ میں نہیں آیا وہ زکوٰۃ کا مسئلہ تھا انہوں نے فرمایا کہ مال کی دو قسمیں ہیں، اموالِ ظاہرۃ اور اموالِ باطنہ پھر انہوں نے کچھ اور وضاحت بھی کی، اب آپ سے معلوم یہ کرنا ہے کہ اموال ظاہرہ اور باطنہ کسے کہتے ہیں؟ کیا ان دونوں میں زکوٰۃ ہوتی ہے یا ان میں سے ایک میں؟ نیز ان کے علاوہ بھی مال کی قسمیں ہیں یا نہیں؟ براہ کرم مدلل انداز میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں مولانا صاحب کی بات درست ہے کہ مال کی دو قسمیں ہیں:

اموال ظاہرہ، اموال باطنہ

اموال ظاہرہ:۔ ہر وہ مال جس کو چھپانا چاہے تو چھپا نہیں سکتا۔ مثلاً پالتو مویشی وغیرہ۔

اموال باطنہ:۔ ہر وہ مال جس کو آدمی چھپانا چاہے تو چھپا سکتا ہے۔ مثلاً سونا، چاندی وغیرہ۔

بذا صاحب نصاب شخص پر جب زکوٰۃ واجب ہونے کی تمام شرائط پائی جائیں تو اموال ظاہرہ اور اموال باطنہ دونوں کی زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہوتی ہے۔ نیز ان کے علاوہ جو مال ہے وہ بھی انہیں (مذکورہ) دوقسموں میں منحصر ہیں۔

لمافي الفقه الاسلامي وادلته (۱۸۱۹/۳): تجب الزكاة في انواع خمسة من المال وهي: النقود، والمعادن والركاز، وعروض التجارة والزروع والثمار، والانعام وهي الابل والبقر والغنم، واوجب ابو حنيفة خلافا لصاحبيه الزكاة في الخيل والمفتى به هور ايهما.

وفي الشامية (۳۱۰/۲): (قوله الظاهرة والباطنة) فان مال الزكاة نوعان: ظاهر، وهو المواشي وما يمربه التاجر على العاشر، وباطن: وهو الذهب والفضة، واموال التجارة في مواضعها بحر ومراده هنا بالباطنة ماعدا المواشي بقرينة قوله المارين باموالهم والافالكل مامربه العاشر فهو من نوع الظاهر، وسماها باطنة باعتبار ما كان قبل المرور اما الباطنة التي في بيته لو اخبر بها العاشر فلا ياخذ منها كما صرح به في البحر ...... واشار بهذا التعليم الى رد مافي العناية وغيرها من المرادهنا الاموال الباطنة لان الظاهرة: وهي السوائم لا يحتاج العاشر فيها الى مرور صاحب فانه ياخذ عشرها وان لم يمر صاحب المال عليه فانه كما في النهر مبنى عن عدم التفرقة بين العاشر والساعي...... الخ.

وفي الدرالمختار(۲۶۶/۲): ولا في مال مفقود وجده بعد سنين وساقط في بحر استخرجه بعدها ومغضوب لا بينة عليه فلو له بينة تجب لما مضى الافي غصب السائمة فلا تجب وان كان الغاصب مقرا ومدفون ببرية نسي مكانه ثم تذكره...... ودين كان جحده المديون سنين ولا بينة له عليه ثم صارت له بان اقر بعدها عندقوم (وقيدها في مصرف الخانية بما اذا خلف عليه عند القاضي اما قبله فتجب لما مضى وما أخذ مصادرة اي ظلما ثم وصل اليه بعد سنين لعد النمو والاصل فيه حديث علي لازكاة في مال الضمار وهو مالا يمكن الا انتفاع به مع بقاء الملك.

(۱۰) حکومت کن اموال کی زکوٰۃ وصول کر سکتی ہے؟

سوال .. کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ اموال کی دو قسمیں ہیں ظاہرہ، باطنہ۔ اور پہلے زمانے میں حکام خود زکوٰۃ کی وصولی کرتے تھے۔ لیکن یہ بات میرے صحیح طرح سمجھ میں نہ آسکی مجھے آپ بتادیں

کہ یہ اموال ظاہرہ اور اموال باطنہ کیا ہوتے ہیں؟ اور موجودہ حکومت کن اموال کی زکوٰۃ خود وصول کر سکتی ہے، اور بینکوں میں موجود لوگوں کی رقوم کا شمار کس قسم کے اموال میں ہوتا ہے؟ اموال ظاہرہ میں یا اموال باطنہ میں۔ براہ کرم ذرا آسان انداز میں جواب دیجئے گا۔

الجواب حامداًومصلیاً ...حضرات فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ اموال کی دو قسمیں ہیں ظاہرہ اور باطنہ۔ ظاہرہ سے مراد وہ مال ہے جو ظاہر ہو، جیسے اونٹ بکریاں گائے وغیرہ اور باطنہ سے مراد وہ مال ہے جو ظاہر نہ ہو، لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو، اس کا صحیح علم مالک ہی کو ہو جیسے نقد، سونا، چاندی اور تجارتی مال وغیرہ۔ بینکوں میں جمع شدہ رقم بھی اموال باطنہ میں سے ہے۔ حکومت اموال ظاہرہ کی زکوٰۃ وصول کر سکتی ہے اور اموال باطنہ کی زکوٰۃ صاحب مال خود ادا کرے گا۔ البتہ اگر حکومت بینک میں جمع شدہ رقم کیلئے زکوٰۃ وصول کرے اور صاحب مال نے بینک کی وصولی سے پہلے پہلے نیت کر لی تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

لمافي بدائع الصنائع(۲/۴۴۷): فمال الزكاة نوعان: ظاهر وهو المواشي، والمال الذى يمر به التاجر على العاشر، وباطن وهو الذهب والفضة واموال التجارة في مواضعها، اما الظاهر: فللامام ونوابه وهم المصدقون من السعاة والعشار ولاية الاخذ ....والدليل على ان للامام ولاية الاخذ في المواشي والاموال الظاهرة　　اما الكتاب فقوله تعالىٰ((خذ من اموالهم صدقة)) (التوبة:۱۰۳)

... واما السنة فان رسول الله ﷺ كان يبعث المصدقين الى أحياء العرب والبلدان والافاق لاخذ الصدقات من الانعام والمواشي في اماكنها وعلى ذلك فعل الائمة من بعده من الخلفاء الراشدين: ابى بكر، وعمر، وعثمان وعلى رضى الله عنهم. حتى قال الصديق رضى الله عنه...... والله لو منعوني عقالاً كانوا يؤدونه الى رسول الله ﷺ لحاربتهم عليه...... وكذا المال الباطن اذا مر به التاجر على العاشر كان له ان ياخذ في الجملة لانه لما سافربه واخرجه من العمران صارظاهرا والتحق بالسوائم

فان عمر رضى الله عنه نصب العشار وقال لهم خذوا من المسلم ربع العشر ومن الذمى نصف العشر ومن الحربى العشر)) وكان ذلك بمحضر من الصحابة، ولم ينقل انه انكر عليه واحد منهم فكان اجماعاً.

واما المال الباطن الذى يكون في المصر فقد قال عامة مشايخنا: ان رسول الله ﷺ طالب بزكاته وابو بكر وعمر طالبا. وعثمان طالب زمانا، ولما كثرت اموال الناس ورأى ان في تتبعها حرجا على الامة، وفي تفتيشها ضررا بارباب الاموال، فوض الاداء الى اربابها. وذكر امام الهدى الشيخ ابو منصور الماتريدى السمرقندى رحمه الله وقال لم يبلغنا ان النبى ﷺ بعث في مطالبة المسلمين بزكاة الورق واموال التجارة ولكن الناس كانوا يعطون ذلك، ومنهم من كان يحمل الى الائمة فيقبلون منه ذلك.

وفي الاشباه والنظائر(صـ۲۲): واما الزكاة فلا يصح اداء ها الابالنية، وعلى هذا فما ذكره الاسبيجابي ان من امتنع عن ادائها اخذها الامام كرها ووضعها في اهلها وتجزيه لان للامام ولاية اخذها فقام اخذه مقام دفع المالك باختياره فهو ضعيف.

وفي الشامية(۲/۳۱۰): (قوله الظاهر والباطنة) فان مال الزكاة نوعان ظاهر وهو المواشي وما يمربه التاجر على العاشر وباطن وهو الذهب والفضة واموال التجارة في مواضعها بحر. ومراده هنا بالباطنة ماعدا المواشي بقرينة قوله المارين باموالهم والا فكل مامر به على العاشر فهو من نوع الظاهر، وسماها باطنة باعتبار ما كان قبل المرور واما الباطنة التي في بيته لو اخبربها العاشر فلا ياخذ منها كما صرح به في البحر.

وفي الفقه الاسلامية وادلته(۳/۱۹۷۳): فان كان مال الزكاة خفيا اوباطنا: وهو الذهب والفضة واموال التجارة في مواضعها، جاز للمالك ان يفرقها بنفسه او ان يدفعها الى الامام لان رسول الله ﷺ طالب بزكاته وتبعه في ذلك ابو بكر وعمر، ثم طالب بها عثمان لمدة ولما كثرت اموال الناس وراى ان في تتبعها حرجا على الامة فوض الاداء الى اربابها...... وان كان مال الزكاة ظاهرا وهو المواشي و الزروع والثمار والمال الذي يمربه التاجر على العاشر فيجب عند الجمهور منهم الحنفية والمالكية دفعها الى الامام.

(۱۱) سونے اور چاندی کا مفتی بہ نصاب اور اس کی تحقیق

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ہاں زکوٰۃ میں چاندی کا نصاب ساڑھے باون تولہ(۵۲.۵)اور سونے کا نصاب ساڑھے سات تولہ(۷.۵)رائج ہے یہی حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اوزان شرعیہ میں بیان فرمایا ہے جبکہ فتاویٰ کی کتابوں میں نصاب مختلف بیان فرمایا گیا ہے مثلاً امداد الفتاویٰ میں چاندی کا نصاب ۵۲تولہ اور سونے کا نصاب ۷تولہ اور کفایت المفتی میں چاندی کا نصاب ۵۴تولہ ۲ماشے، اور احسن الفتاویٰ کے مطابق چاندی کا نصاب ۳۵.۵۷تولہ اور سونے کا نصاب ۸.۲۰۸تولہ بنتا ہے۔اب معلوم یہ کرنا ہے کہ فتویٰ کس نصاب پر ہے اور اس کی وجہ ترجیح کیا ہے اور یہ نصاب کس طرح بنے گا۔

الجواب حامداً ومصلیاً......فقہاء کرام کی تصریحات کے مطابق ایک قیراط ۵جَو کا ہوتا ہے اور چونکہ جَو ہر جگہ اور ہر وقت کا مختلف ہوتا ہے اس لئے جن اصحاب نے بھی ۵جَو کا وزن کیا مختلف آیا اس سے بڑھ کر یہ کہ ترازو میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے اس لئے وزن کا مختلف آنا یقینی بات ہے جب ابتداء ہی میں وزن مختلف ہوگا تو نصاب زکوٰۃ ۲۰۰درہم اور ۲۰دینار میں بھی فرق آئے گا اسی اختلاف وزن کی وجہ سے علماء کرام کے بیان کردہ تولہ کے اعتبار سے نصاب زکوٰۃ میں فرق پایا جاتا ہے۔

یہی اختلاف موجودہ زمانے میں بھی پایا جاتا ہے کیونکہ ہمارے دارالافتاء کی طرف سے بھی مختلف جگہوں کی ۵جَو کا وزن متعدد سناروں سے کرایا گیا تو مختلف وزن آیا اس لئے اختلاف سے بچنے کیلئے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے وزن کے مطابق ۵جَو کا وزن لے لیا جائے اس لئے کہ ۵ جو کے اوزان ۲۱۴ء سے لے کر ۲۳۹ء تک موجود ہیں اوزان میں سے معتدل قول ۲۱۸ء کا ہے جو کہ حضرت مفتی شفیع صاحبؒ کا ہے اسی قول کے مطابق نصاب زکوٰۃ چاندی کا ساڑھے باون تولہ (۵۲ء۵) اور سونے کا ساڑھے سات تولہ (۷ء۵) رائج ہے اس قول سے عدول میں چونکہ انتشار کا اندیشہ ہے اس لئے اسی پر عمل کیا جائے گا۔

آسانی کیلئے نقشہ ملاحظہ فرمائیں:

ایک قیراط = ۵ جو، ۸ رتی ایک ماشہ، ۱۲ ماشہ ایک تولہ، ایک درہم میں ۱۴ قیراط، ایک گرام ۱۰۰۰ ملی گرام

رتی، ماشہ، تولہ

ایک قیراط ۵جَو کا وزن = ۰ء۲۱۸۷ ملی گرام اور ایک رتی کا وزن = ۰ء۱۲۱۵ ملی گرام

ایک قیراط میں رتی = ۰ء۲۱۸۷ ÷ ۰ء۲۱۵ = ۱.۸ رتی۔

ایک درہم میں رتیاں = ۱۴x۱ء۸ = ۲۵ء۲ رتیاں

۲۰۰ درہم میں رتیاں = ۲۰۰ x ۲۵ء۲ = ۵۰۴۰ رتیاں

ایک درہم میں ماشہ = ۸ ÷ ۲۵ء۲ = ۳ء۱۵ ماشہ

۲۰۰ درہم میں ماشہ = ۲۰۰ x ۳ء۱۵ = ۶۳۰ ماشے

۲۰۰ درہم میں تولے = ۱۲ ÷ ۶۳۰ = ۵۲.۵ تولے

ملی گرام، گرام

ایک قیراط میں ملی گرام = ۰ء۲۱۸۷ ملی گرام

ایک درہم میں گرام = ۱۴ x ۰ء۲۱۸۷ = ۳ء۰۶۱۸ گرام

۲۰۰ درہم میں گرام = ۲۰۰ x ۳ء۰۶۱۸ = ۶۱۲ء۳۶ گرام

ایک ماشہ میں ملی گرام = ۸ x ۰ء۱۲۱۵ = ۰.۹۷۲ ملی گرام

ایک تولہ میں گرام = ۱۲ x ۰ء۹۷۲ = ۱۱.۶۶۴ گرام

۵۲.۵ تولے میں گرام = ۵۲.۵ x ۱۱ء۶۶۴ = ۶۱۲ء۳۶ گرام

نوٹ: اسی مذکورہ حساب کے مطابق ۲۰ دینار کے ۷.۵ (ساڑھے سات تولہ) بنتے ہیں۔

لما في بدائع الصنائع (۲/۴۰۵،۴۱۰): أما الاثمان المطلقة وهي الذهب والفضة أما قدر النصاب فيهما فالامر لايخلو إما أن يكون له فضة مفردة أو ذهب مفرد أو اجتمع له الصنفان جميعاً فإن كان

له فضة مفردة فلا زكاة فيها حتى تبلغ مائتى درهم وزنا وزن سبعة فإذا بلغت ففيها خمسة دراهم ...... فأما اذا كان له ذهب مفرد فلا شئى فيه حتى يبلغ عشرين مثقالاً فإذا بلغ عشرين مثقالاً ففيه نصف مثقال.

وفى العالمگيرية(۱/۱۷۸): تجب فى كل مائتى درهم خمسة دراهم وفى كل عشرين مثقال ذهب نصف مثقال مضروباً كان أو لم يكن مصوغاً او غير مصوغ حلياً كان للرجال أو للنساء تبراً كان أو سبيكةً.

وفى الدر المختار(۲/۲۹۵): (نصاب الذهب عشرون مثقالاً والفضة مائتا درهم كل عشرة) دراهم (وزن سبعة مثاقيل) والدنيار عشرون قيراطاً والدرهم أربعة عشر قيراطاً والقيراط خمس شعيرات.

﴿سونا، چاندی، نقدی، مال تجارت، استعمالی اشیاء، وغیرہ سے متعلق مسائل زکوٰۃ کا بیان﴾

(۱۲) لڑکیوں کی شادی کیلئے رکھے ہوئے زیورات پر زکوٰۃ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے لڑکیوں کی شادی کیلئے زیورات بنا کر رکھے ہوئے ہیں، اگر ہر لڑکی کو دیے جائیں تو کسی کا زیور نصاب کو نہیں پہنچتا، تو کیا ان زیورات پر زکوٰۃ ہوگی یا نہیں جبکہ میرے پاس نقد رقم موجود نہیں ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں زیورات چونکہ آپ نے بیٹیوں کو ابھی تک نہیں دیے۔ لہٰذا وہ ابھی تک آپ ہی کی ملکیت میں ہیں۔ اگر وہ زیورات نصاب تک پہنچ جائیں تو زکوٰۃ کی ادائیگی آپ پر واجب ہے۔

لمافي الهندية (۱/۱۷۸): تجب في كل مائتي درهم خمسة دراهم وفي كل عشرين مثقال ذهب نصف مثقال مضروبا كان أولم يكن مصوغا أوغير مصوغ حليا كان للرجال أو للنساء تبرا كان او سبيكة كذا في الخلاصة و يعتبر فيهما ان يكون المؤدى قدر الواجب وزنا ولايعتبر فيه القيمة عند ابى حنيفة.

وفي الدر المختار (۲/۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷): (نصاب الذهب عشرون مثقالا والفضة مائتا درهم كل عشرة) دراهم (وزن سبعة مثاقيل) والدينار عشرون قيراطا والدرهم أربعة عشر قيراطا والقيراط خمس شعيرات فيكون الدرهم الشرعي سبعين شعيرة والمثقال مائة شعيرة فهو درهم وثلاث اسباع درهم...... (والمعتبر وزنهما أداء وجوبا) ولا قيمتهما.

وفي الشامية تحته: (قوله والمعتبر وزنها أداء) أي من حيث الاداء يعني يعتبر ان يكون المؤدى قدر الواجب وزنا عند الامام...... (قوله: ووجوبا) من حيث الوجوب يعني يعتبر في الوجوب ان يبلغ وزنهما نصابا.

(۱۳) عورت کو شوہر کی طرف سے ملنے والے زیورات میں زکوٰۃ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ عورت کو جو زیورات شادی کے موقع پر دیے جاتے ہیں بعض زیورات میکے والے دیتے ہیں اور بعض شوہر کی طرف سے ہوتے ہیں تو آیا ان زیورات کی زکوٰۃ کون ادا کرے گا شوہر ادا کرے گا یا بیوی کے ذمہ ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... شادی کے موقع پر عورت کو جو زیورات ملتے ہیں چاہے شوہر کی طرف سے ہوں یا میکے والوں کی طرف سے ہوں، عام طور پر اس کو عورت ہی کی ملکیت سمجھا جاتا ہے، لہٰذا اگر بقدر نصاب ہوں، اور ان پر سال گزر جائے تو عورت کے ذمہ زکوٰۃ ادا کرنا

واجب ہے۔البتہ اگر بیوی کی طرف سے شوہر ادا کرنا چاہے تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

لما فی الهندية(۱/۳۲۷): لو جهز ابنته وسلمه اليها ليس له فی الاستحسان استرداده منها وعليه الفتوی ..... واذا بعث الزوج الی اهل زوجته أشياء عندزفافها منها ديباج فلما زفت اليه أراد أن يسترد من المرأة الديباج ليس له ذلک اذا بعث اليها علی جهة التمليک.

وفی الشامية(۲/۳۴۸): قلت: وسألت عن المرأة هل تصير غنية بالجهاز الذی تزف به الی بيت زوجها؟ والذی يظهر مما مر ان ما كان من أثاث المنزل وثياب البدن وأو انی الاستعمال ممالا بدلأمثالها منه فهو من الحاجة الاصلية وما زاد علی ذلک من الحلی والأوانی والأمتعة التی يقصد بها الزينه اذا بلغ نصاباتصير به غنية ثم رأيت فی التاتارخانية فی باب صدقة الفطر: سئل الحسن بن علی عمن لهاجواهر و لآلی تلبسها فی الاعياد وتتزين بها للزوج وليست للتجارة هل عليها صدقة الفطر؟ قال: نعم اذا بلغت نصابا.

وفی الدر المختار(۳/۱۵۵): (جهز ابنته بجهاز وسلمها ذلک ليس له الاسترداد منها ولا لورثته بعده إن سلمها ذلک فی صحته) بل تختص به (وبه يفتی).

(۱۴) زکوٰۃ خالص سونے پر ہے یا بناوٹ کے بعد جو وزن ہے اس پر

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری شادی 23 اگست 1998ء میں ہوئی ہے اور اسلامی سال ۲۹/ربیع الثانی ۱۴۱۹ھ میں ہوئی میرا ایک سال مکمل ہوتے ہی میں نے رمضان کے مہینے میں زکوٰۃ دینا شروع کردی اور الحمد للہ زکوٰۃ دیتا آرہا ہوں لیکن اس سال میں ادھار کا مقروض ہوں اور میرے پاس رقم بھی نہیں ہے تو اس سال میں نے رمضان میں زکوٰۃ صرف ہزار روپے دی ہے۔پوچھنا یہ ہے کہ اس رمضان میں میرا زکوٰۃ دینا ضروری ہے یا میں پیسے آنے پر زکوٰۃ ادا کروں بلکہ سال میرا ربیع الثانی ۲۹ میں ہو جاتا ہے۔زیورات تو بیگم کے ہیں لہٰذا زکوٰۃ میں ادا کرتا تھا۔

(۲)۔سونے کا جو پورا وزن ہوتا ہے اُس پر زکوٰۃ نکالی جاتی ہے یا پھر سونے کا جو یعنی خالص سونا ہوتا ہے اس پر زکوٰۃ دی جاتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....(۱)۔بیگم کے زیورات کی زکوٰۃ آپ پر لازم نہیں لیکن آپ ان کی اجازت سے ادا کرتے رہے ہیں تو اداء ہوگئی، اب زیورات کے علاوہ مال نہ ہونے کی صورت میں بھی سال پورا ہونے پر زکوٰۃ واجب ہے(بشرطیکہ وہ نصابِ زکوٰۃ کے بقدر ہوں) اس کی ادائیگی کیلئے قرض لینا پڑے تو قرض لیں۔بصورت دیگر کچھ زیور فروخت کرکے ادا کریں اگر اس طرح ادا نہیں کی تو ادائیگی تک زکوٰۃ بدستور واجب رہے گی۔اور بلا عذر تاخیر پر گناہ بھی ہوگا۔

(۲)۔سونے چاندی کے زیورات میں صرف سونے چاندی کے وزن کے اعتبار سے زکوٰۃ واجب ہوتی ہے باقی بناوٹ (موتی وغیرہ) کا

وزن اس میں شامل نہیں ہوگا۔

لمافی الهندية (۱/۱۷۹): وكذا في حق الوجوب يعتبر أن يبلغ وزنهما نصاباً ولا يعتبر فيه القيمة بالاجماع حتى لو كان له ابريق فضة وزنها مائة وخمسون وقيمتها مائتان لاتجب فيها الزكوة.

وفي الشامية (۲/۲۶۹): قال العلامة الشامي عليه الرحمه: في البحر لوادى زكاة غيره بغير امره فبلغه فأجاز لم يجز لانها وجدت نفاذ اعلى المتصدق لانها ملكه ولم يكن نائبا عن غيره فنفذت عليه اهـ لكن قد يقال تجزى عن الآمر مطلقاً لبقاء الاذن بالدفع، قال في البحر ولو تصدق عنه بأمره جاز ويرجع بما دفع عند ابي يوسف.

وفي الدرالمختار (۲/۲۷۱،۲۷۲): وافتراضها عمرى أى على التراخي، وصححه الباقاني وغيره وقيل فورى أى واجب على الفور وعليه الفتوى كمافي شرح الوهبانية فيأثم بتاخيرها بلا عذر

وفي الشامية تحته: (قوله بتأخيرها الخ) ظاهره الاثم بالتاخير ولو قل كيوم أو يومين، لانهم فسروا الفور بأول اوقات الإمكان، وقد يقال المراد ان لا يؤخر الى العام القابل.

(۱۵) دلہن کو ہدیہ میں ملنے والے زیورات میں زکوٰۃ کا حکم

سوال ...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر دولہا کے باپ نے دلہن کو زیور دیتے وقت یہ کہہ دیا یا لکھ دیا کہ یہ گفٹ اور ہدیہ ہے۔ اور یہ زیور نصاب کے برابر یا اس سے زیادہ ہو تو سال گزرنے کے بعد دلہن کو زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ...... صورت مسئولہ میں چونکہ زیورات دلہن کی ملکیت میں ہیں اور وہ نصاب کے برابر بھی ہیں لہٰذا سال کے گزرنے پر دلہن پر زکوٰۃ فرض ہوگی۔

لما في الهندية (۴/۳۷۷): والقبض الذى يتعلق به تمام الهبة وثبوت حكمها القبض باذن المالك الاذن تارة يثبت نصاوصريحا وتارة يثبت دلالة فالصريح ان يقول اقبضه اذا كان الموهوب حاضرا في المجلس ويقول اذهب واقبضه اذا كان غائبا عن المجلس ثم اذا كان الموهوب حاضرا وقال له الواهب اقبضه فقبضه في المجلس او بعد الافتراق عن المجلس صح قبضه وملكه قياسا واستحسانا.

وفي الدرالمختار (۲/۲۹۸،۲۹۷): (واللازم) مبتدأ (في مضروب كل) منهما (ومعموله ولو تبرا اوحليا مطلقا) مباح الاستعمال أولاولو للتجمل والنفقة لانهما خلقا اثمانا فيز كيهما كيف كانا.

وفی الشامیة(۵/۶۹۶): (قوله و کذا زفاف البنت) ای علی هذا التفصیل بان کان من اقرباء الزوج او المرأة او قال المهدی أهدیت للزوج او المرأة کما فی التاتر خانیة.

وفی الدر المختار(۵/۷۰۴): (ولووهب لمحرم بلا رحم کأخیه رضاعا) ولو ابن عمه (ولمحرم بالمصاهرة کامهات النسآء والربائب واخیه وهو عبدلاجنبی او لعبد اخیه رجع ولو کانا) ای العبد ومولاه (ذارحم محرم من الواهب فلا رجوع فیها اتفاقا علی الاصح).

(۱۶) عطر کے کاروبار میں زکوٰۃ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں عطر کا کاروبار کرتا ہوں۔ لیکن مجھے پریشانی یہ ہے کہ میں اس کی زکوٰۃ کس طرح نکالوں کیونکہ اس میں ہر قسم کا عطر ہوتا ہے بعض مہنگے ہوتے ہیں اور بعض کی قیمت بہت کم ہوتی ہے؟

الجواب حامداومصلیا... صورت مسئولہ میں آپ کے پاس تجارت کیلئے جو عطر ہے اگر اس کی مالیت بقدر نصاب ہو تو سال گزرنے کے بعد اس کی زکوٰۃ ادا کرنا آپ پر واجب ہے ادائیگی زکوٰۃ کی دو صورتیں ممکن ہیں بہتر صورت یہ ہے کہ آپ ہر قسم کے عطر کی مارکیٹ ریٹ کے حساب سے قیمت لگا کر زکوٰۃ ادا کریں اور اگر یہ صورت ممکن نہ ہو تو پھر اندازے سے ہر قسم کے عطر کی قیمت لگا کر زکوٰۃ ادا کریں۔

لمافی الهندیة(۱/۱۷۹): وتضم قیمة العروض الی الثمنین والذهب الی الفضة قیمة کذا فی الکنز الزکاة واجبة فی عروض التجارة کائنة ماکانت اذا بلغت قیمتها نصابا من الورق والذهب کذا فی الهدایة ویقوم بالمضروبة کذا فی التبیین وتعتبر القیمة عند حولان الحول بعد ان تکون قیمتها فی ابتداء الحول مائتی درهم من الدراهم الغالب علیها الفضة کذا فی المضمرات.

وفی الفقه الاسلامی(۳/۱۸۷۱): یقوم التاجر العروض أو البضائع التجاریة فی آخر کل عام بحسب سعرها فی وقت اخراج الزکاة لابحسب سعر شرائها ویخرج الزکاة المطلوبة وتضم السلع التجاریة بعضها الی بعض عند التقویم ولو اختلفت أجناسها کثیاب وجلود ومواد تموینیة وتجب الزکاة بلاخلاف فی قیمة العروض لافی عینها لان النصاب معتبر بالقیمة فکانت الزکاة منها وواجب التجارة هو ربع عشر القیمة کالنقد باتفاق العلماء قال ابن المنذر أجمع أهل العلم علی ان فی العروض التی یرادبها التجارة: الزکاة اذا حال علیها الحول.

(۱۷) مہنگائی کی وجہ سے قیمت نصاب تک پہنچ جانے والے مال تجارت میں زکوٰۃ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کچھ عرصہ پہلے میں نے شہر سے باہر ایک پلاٹ بغرض تجارت خریدا تھا اس

وقت اس کی قیمت نصاب سے کم تھی اب حکومت نے جہاں میں نے پلاٹ خریدا تھا بائی پاس بنانے کی منظوری دیدی ہے جس سے وہاں کے پلاٹوں کی قیمتوں میں بہت ہی زیادہ اضافہ ہوگیا ہے اور میرے پلاٹ کی قیمت بڑھ گئی ہے اور نصاب زکوٰۃ سے کہیں زیادہ ہوگئی ہے، تو اب اس کے سال کی ابتداء کب سمجھی جائے گی، مہنگائی سے پہلے یا بعد میں؟

الجواب حامداًومصلیاً صورتِ مسئولہ میں تجارتی مال کی قیمت مہنگائی کی وجہ سے نصاب سے بھی بڑھ ہوگئی ہے تو سال کی ابتداء مہنگائی کے بعد سے سمجھی جائے گی۔

لمافي الخانية على هامش الهندية (۱/۲۵۲): لو اشتراه بمائة وتسعين درهما وذلك قيمته ثم صار يساوي مائتي درهم مضروبة قال محمد رحمه الله تعالىٰ يعتبر الحول من حين صار يساوي مائتي درهم مضروبة.

وفي الشامية (۲/۲۵۹): (قوله ملك نصاب) فلا زكاة في سوائم الوقف والخيل المسبلة لعدم الملك ولا فيما احرزه العدوّ بدراهم لأنهم ملكوه بالاحراز عندنا خلافا للشافعي بدائع ولا فيما دون النصاب.....لأنّ حولان الحول على النصاب شرط لكونه سببا وهذا علّة للنسبة.

وفي اللجنة الدائمة (۹/۳۱۸): ج: يبدأ الحول من يوم تم النصاب لامن اليوم الذي ملك فيه المسلم نقدا اوعروض تجارة أقل من النصاب ففي المثال الذي ذكرته لايبدأ الحول من يوم بدأ يجمع بل يبتدئ الحول من يوم تم عنده النصاب وتعتبر قيمة عروض التجارة في الزكاة يوم يحول عليها الحول.

(۱۸) جس مالِ تجارت کی قیمت بدلتی رہتی ہے اس میں زکوٰۃ کا حکم

سوال .....کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ میں پہلے یہ سمجھتا تھا کہ زکوٰۃ اس پر واجب ہوتی ہے جس کے پاس سونا چاندی ہو لیکن گزشتہ جمعرات مجھے میرا ایک دوست شب جمعہ میں مدنی مسجد لے گیا وہاں ایک مولوی صاحب سے ملاقات کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ مال تجارت پر بھی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے تو میں نے اس وقت ارادہ کرلیا کہ میں بھی اپنے مال تجارت کی زکوٰۃ ادا کروں گا۔ لیکن الجھن یہ ہے کہ میرا مالِ تجارت ایسا ہے کہ جس کی قیمت بدلتی رہتی ہے، بلکہ بعض اوقات قیمت خرید سے بھی کم ہوجاتی ہے اور مال فروخت ہونے کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ تو اس کی زکوٰۃ دینے کی کیا صورت ہوگی؟

الجواب حامداًومصلیاً..... صورت مسئولہ میں اس مالِ تجارت پر سال گزرنے کے بعد جب آپ اس کی زکوٰۃ ادا کریں گے تو اس دن مارکیٹ میں جو مال کی قیمت ہوگی اس کے حساب سے آپ کو زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی۔

لمافي الهندية (۱/۱۷۹): اذا كان له مائتا قفيز حنطة للتجارة تساوي مائتي درهم فتم الحول ثم زاد السعر أو انتقص فان أدى من عينها أدى خمسة أقفزة وان ادى القيمة تعتبر قيمتها يوم الوجوب لان

الواجب احدهما ولهذا يجبر المصدق على قبوله وعندهما يوم الاداء.

وفي الدر المختار(۲/۲۸٦): وتعتبر القيمة يوم الوجوب وقالا يوم الاداء وفي السوائم يوم الأداء اجماعا وهو الاصح ويقوم في البلد الذى المال فيه ولو في مفازة ففي أقرب الأمصار اليه فتح.

وفي شامية تحته (قوله وهو الاصح) أى كون المعتبر في السوائم يوم الأداء اجماعا هو الاصح فانه ذكر في البدائع أنه قيل ان المعتبر عنده فيها يوم الوجوب وقيل يوم الأداء وفي المحيط يعتبر يوم الأداء بالاجماع وهو الاصح. فهو تصحيح للقول الثاني الموافق لقولهما، وعليه فاعتبار يوم الأداء يكون متفقا عليه عنده وعندهما.

(۱۹) ہوائی جہاز، ریل گاڑی اور کوچز کے ٹکٹ پر زکوٰۃ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم نے سیر وتفریح کیلئے مری جانے کا پروگرام بنایا ہوا تھا چنانچہ میں نے اپنے لئے اور اپنے اہل خانہ کیلئے ہوائی جہاز کی چھ ٹکٹیں بک کروالیں تھیں کہ اچانک میرے والد صاحب کی طبیعت خراب ہوگئی جس کی وجہ سے سارا پروگرام ختم ہوگیا لیکن ہوائی جہاز کے ٹکٹ ہمارے پاس موجود تھے۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا ہوائی جہاز کے ٹکٹ پر جبکہ ان کی قیمت بقدر نصاب ہو تو زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اسی طرح ریل گاڑی اور کوچز کے ٹکٹ پر اگر ان کی قیمت بقدر نصاب ہو تو زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً زکوٰۃ کے وجوب کیلئے شرط یہ ہے کہ وہ اشیاء جن پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ حاجت اصلیہ سے فارغ ہوں۔ لہٰذا ہوائی جہاز، ریل گاڑی اور کوچز کے ٹکٹ پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی بشرطیکہ وہ ٹکٹیں تجارت کی غرض سے نہ ہوں۔ اس لئے کہ یہ حاجت اصلیہ میں سے ہے۔ اگر چہ اس کی مالیت مقدار نصاب کے برابر ہو۔

لما في الهندية(۱/۱۷۲): منها فراغ المال) عن حاجته الاصلية فليس دور السكنى وثياب البدن واثاث المنازل ودواب الركوب وعبيد الخدمة وسلاح الاستعمال زكاة.

وفي الشامية(۲/۲٦۲): (قوله فارغ عن حاجته الاصلية) . ماكان نصابا من النقدين أو أحدهما فارغا عن الصرف الى تلك الحوائج لكن كلام الهداية مشعربأن المراد به نفس الحوائج فانه قال وليس في دور السكنى وثياب البدن واثاث المنازل ودواب الركوب وعبيد الخدمة وسلاح الاستعمال زكاة لانها مشغولة بحاجته الاصلية وليست بنامية ايضاً.

(۲۰) بیوپاری کو دیے ہوئے مال میں قیمت وصول کرنے سے پہلے زکوٰۃ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے کچھ مال بیوپاری کے حوالہ کردیا ہے لیکن اب

تک اس کی قیمت وصول نہیں کی ہے تو اب میں کیا کروں، کیا رقم وصول کرنے سے پہلے مجھ پر زکوۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً صورت مسئولہ میں چونکہ اس مال کی قیمت بیوپاری کے ذمہ آپ کا دین ہے اور اس طرح کے دین پر بھی زکوۃ واجب ہوتی ہے۔ البتہ ادائیگی اس وقت ضروری ہوگی جب اس کو وصول کرلیں۔

وفی الدر المختار (۲/ ۳۰۵): (و) اعلم ان الدیون عند الامام ثلاثة قوی ومتوسط، وضعیف، فـ (تجب) زکاتها اذا تم نصابا وحال الحول: لکن لافورا بل (عند قبض اربعین درهما من الدین) القوی کقرض (وبدل مال تجارة) فکلما قبض اربعین درهما یلزمه درهم.

وفی الشامیة تحته: (قوله وحال الحول) ای ولو قبل قبضه فی القوی والمتوسط وبعده فی الضعیف ط(قوله عند قبض اربعین درهما) قال فی المحیط لان الزکاة لاتجب فی الکسور من النصاب الثانی عنده مالم یبلغ اربعین للحرج فکذلک لایجب الأداء مالم یبلغ أربعین للحرج.

(۲۱) تجارت کی نیت کے بعد آپ پر گزشتہ دوسالوں کی زکوۃ واجب ہے

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دوسال قبل میرے والد صاحب کا ایک سفر میں انتقال ہو گیا تھا۔ ان کی چاولوں کی ہول سیل کی دکان تھی۔ بوقت انتقال دکان میں دوسو من چاول تھا، میں چونکہ ان کی اکلوتی اولاد ہوں اور اس وقت پڑھائی میں مشغول تھا اس لئے دکان کو تالا لگا دیا تھا، میرے گزر بسر کیلئے ہماری دوسری دکانوں سے کرایہ آتا تھا، وہ کافی تھا۔ اب جبکہ میں اپنی تعلیم سے فراغت حاصل کر چکا ہوں تو چاہتا ہوں کہ اپنے والد صاحب مرحوم کے ہی کاروبار کو آگے بڑھاؤں۔ مسئلہ مجھے آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ جب میرے والد صاحب کا انتقال ہوا تھا میں نے اسی وقت سے ان چاولوں کی تجارت کی نیت کی ہوئی تھی۔ لیکن بیچ نہیں رہا تھا اور اب دوسال بعد میں عملی طور پر ان کی تجارت کر رہا ہوں۔ تو آیا مجھ پر ان چاولوں کی گزشتہ دوسالوں کی زکوۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً آپ پر گزشتہ دوسال کی زکوۃ واجب نہیں ہے۔

لمافی نور الانوار (صـ ۳۶): (والامر نوعان مطلق عن الوقت) ای احدهما امر مطلق غیر مقیدبوقت یفوت بفوته (کالزکوة وصدقة الفطر) فانهما بعد وجود السبب ای ملک المال والراس والشرط ای حولان الحول ویوم الفطر لا یتقیدان بوقت یفوتان بفوته بل کلما ادی یکون اداء لا قضاء وان کان المستحب التعجیل.

وفی الدر المختار (۲/ ۲۷۲۔۲۷۳): (وما اشتراه لها) ای للتجارة (کان لها) لمقارنة النیة لعقد التجارة (لاما ورثه ونواه لها) لعدم العقد الا اذا تصرف فیه ای ناویا فتجب الزکوة لاقتران النیة

بالعمل.

وفي الشامية (۲/۳۰۵): وذكر في المنتقى: رجل له ثلاثمائة درهم دين حال عليه ثلاثة احوال فقبض مائتين فعند ابي حنيفة يزكي للسنة الاولى خمسة وللثانية والثالثة اربعة اربعة من مائة وستين ولا شيء عليه في الفضل لانه دون الاربعين.

(۲۲) مردوں کیلئے سونے کی انگوٹھی پہننا اور اس پر زکوٰۃ کے وجوب کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ گزشتہ ہفتہ الحمدللہ میں چلہ لگا کر واپس آ رہا ہوں، میں پہلی مرتبہ اللہ کے راستے میں نکلا تھا، میری خوش قسمتی یہ تھی کہ ہماری جماعت میں دارالعلوم کراچی کے ایک فاضل بھی تھے، ماشاء اللہ بڑے خوش اخلاق اور ذی علم انسان تھے، ان کے ساتھ وقت اچھا گزرا، کافی باتیں سیکھنے کو ملیں، انہوں نے میرے ہاتھ میں سونے کی ایک انگوٹھی دیکھی تو مجھے کہا کہ حدیث میں مردوں کیلئے سونے وغیرہ کی چیز پہننا منع آیا ہے۔ پھر جب میں نے اسے اتار کر رکھ دیا تو انہوں نے پوچھا کہ یہ آپ کے پاس کتنے عرصے سے ہے، میں نے کہا کہ دو سال سے، میری شادی کے موقعہ پر سسرال والوں نے دی ہے۔ انہوں نے کہا کہ آپ کسی دارالافتاء سے فتویٰ بھی لے لیجئے گا کہ آیا اس پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟ لیکن مجھے اس وجہ سے تردد ہے کہ میں نے خود اپنے امام صاحب سے سنا ہے کہ استعمال کی چیزوں پر زکوٰۃ نہیں ہوتی۔ اب آپ بتائیں کہ کیا واقعی ان مولوی صاحب کی بات درست ہے؟ اب میں کیا کروں آپ میری مکمل رہنمائی فرمادیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً ...(۱)۔ مردوں کیلئے سونے کی انگوٹھی استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

(۲)۔ اگر صرف انگوٹھی ہے تو انگوٹھی چونکہ عام طور پر بقدر نصاب نہیں ہوتی لہٰذا زکوٰۃ نہیں آئیگی لیکن اگر اس کے ساتھ اور مال بھی موجود ہے اور ان سب کی قیمت ملا کر ساڑھے باون تولہ (۶۱۲.۳۵ گرام) چاندی کی قیمت کے برابر ہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی اور امام صاحب کا جو کہنا ہے کہ استعمالی اشیاء میں زکوٰۃ نہیں وہ سونا، چاندی کے علاوہ باقی اشیاء کے بارے میں ہے۔

لـــ في البخاري (۲/۸۷۱): عن أبي هريرة عن النبي ﷺ انه نهى عن خاتم الذهب الحديث وعن عبدالله ان رسول الله ﷺ اتخذ خاتما من ذهب وجعل فصه ممايلي كفه فاتخذه الناس فرمى به واتخذ خاتما من ورق أو فضة، رواه البخاري.

وفي الدر المختار مع الشامية (۲/۲۹۵-۲۹۸): (نصاب الذهب عشرون مثقالا والفضة مائتا درهم الخ) (في مضروب كل منهما ومعموله ولو تبراً أو حلياً مطلقاً مباح الاستعمال أولا وللتجمل والنفقة لأنهما خلقا أثمانا فيزكيهما كيف كانا) (قوله أولا) كخاتم الذهب للرجال والأواني مطلقا ولو من فضة الخ.

وفیہ ایضا(۲/۳۰۳): (وقیمۃ العرض) للتجارۃ (تضم إلی الثمنین)...... (و)یضم (الذهب إلی الفضة) وعکسہ بجامع الثمنیۃ الخ) قال فی الشامیۃ تحت قولہ ویضم الخ، وفی البدائع ایضاً أن ماذکر من وجوب الضم إذا لم یکن کل واحد منهما نصابا بأن کان أقل ......ولکن یجب أن یکون التقویم بما هو أنفع للفقراء الخ.

(۲۳) سونے کے لگائے ہوئے دانتوں پر زکوٰۃ کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں شوگر کا مریض ہوں، میرے اکثر دانت جھڑ گئے ہیں، میرے چھوٹے بیٹے نے جو کہ سعودیہ میں مقیم ہے، میرے چار سونے کے دانت بنوا کردیئے ہیں، میرے پاس نقد 15 ہزار روپے بھی ہیں۔ میرے ایک دوست مجھے کہہ رہے تھے کہ تم پر زکوٰۃ نکالنا فرض ہے اوران سونے کے دانتوں کی رقم پر بھی زکوٰۃ ہوگی۔ لیکن میرے ایک دوسرے کہہ رہے تھے کہ دانت تو ضرورت میں داخل ہوگئے ان پر کیسی زکوٰۃ؟ اب میں الجھ گیا ہوں، براہ کرم آپ میری صحیح بات کی طرف رہنمائی فرمادیں۔

الجواب حامداًومصلیاً...... صورت مسئولہ میں دوصورتیں ہیں: (۱)۔ سونے کے لگائے ہوئے دانتوں کا اگر بغیر ضرر کے مسوڑھوں سے جدا کرنا ممکن ہوتو ایسے دانتوں پر شرعاً زکوٰۃ واجب ہوگی اس لئے کہ وجوب زکوٰۃ کی ایک شرط مال کا نامی ہونا ہے اوراس طرح کے دانت جو بغیر نقصان وتکلیف کے جدا ہوسکتے ہوں مال نامی میں داخل ہیں، چنانچہ نقد اضافی رقم کے ساتھ اس سونے کی قیمت کو ملا کر اگر رقم مقدار نصاب تک پہنچتی ہوتو زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ دوسری صورت اس میں یہ ہے کہ سونے کے دانتوں کا بغیر ضرر کے جدا کرنا ممکن نہ ہو کہ پختہ طور پر نصب کئے گئے ہوں تو چونکہ ایسے دانت مال نامی میں داخل نہیں ہیں، اس لئے بعض علماء جیسے حضرت تھانویؒ وغیرہ (امدادالفتاویٰ، ۲/۴۹) نے اس پر عدم وجوب زکوٰۃ کا قول بیان کیا ہے، اصولی اعتبار سے سونا چاندی خلقۃً مال ہیں اس لئے سونا چاندی خواہ ضرورتاً زینت ہو یا بغیر ضرورت کے استعمال میں ہر حال میں اس پر وجوب زکوٰۃ کا قول کرنا اس فقہی اصول کے عین موافق ہے جبکہ ان کے جدا کرنے میں ضرر عظیم یعنی آپریشن کے ذریعے جدا کرنے کی نوبت نہ آتی ہو، اور چونکہ دانتوں میں ضرر عظیم نہیں ہے لہٰذا اس کی زکوٰۃ ادا کی جائے۔ اعلاء السنن(۱۷/۲۹۲): ثم ذکر حدیث عرفجة وقال وبهذا الحدیث یحتج محمد علی جواز تضبیب السن بالذهب ولانہ یباح لہ ان یشدہ بالفضة فکذا بالذهب...... ولانہ تبع للسن والتبع حکمہ حکم الاصل وهذا یوافق اصل ابی حنیفة.

(نوٹ): مرقومہ بالا مسئلہ کی دوسری شق کا حکم احتیاط پر مبنی ہے۔ اس لئے اس بارے میں دوسرے اکابر علماء کرام سے بھی اس کا حکم پوچھ لیا جائے۔ واللہ اعلم بالصواب

لمافی الشامیۃ(۱/۳۳۰): وقد صرح بہ فی القنیة فقال، ولو اتخذ فی یدہ وشما لا یلزمہ السلخ اھ.

لکن فی الذخیرة لو اعاد سنه ثانیا ونبت وقوی فان امکن قلعه بلا ضرر قلعه، والا فلا...... الی ان قال، وفی مفسدات الصلاة من خزانة الفتاوی کسر عظمه فوصل بعظم الکلب ولا ینزع الابضرر جازت الصلوة...... الخ.

وفی الدر المختار(۲/۲۹۷): (واللازم) مبتدأ (فی مضروب کل) منهما (ومعموله ولو تبراً او حلیا مطلقاً) مباح الاستعمال اولا ولو للتجمل والنفقة، لانهما خلقا اثمانا فیزکیهما کیف کانا

وفی الشامیة تحته: (قوله ومعموله) ای ما یعمل من نحو حلیة سیف أو منطقة او لجام او سرج او الکواکب فی المصاحف والاوانی وغیرها اذا کانت تخلص بالاذابة. الخ.

وفی الهندیة(۱/۱۳): والوسخ والدرن لا یمنع والطین والتراب فی الظفر لا یمنع، والصرام والصباغ مافی ظفرهما یمنع تمام الاغتسال، وقیل کل یجزیهم للحرج والضرورة ومواضع الضرورة مستثناة عن قواعد الشرع.

(۲۴) ۳۰ ہزار کی مالیت پر زکوٰۃ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کتنی مالیت پر زکوٰۃ فرض ہے؟ ۳۰ ہزار پر زکوٰۃ فرض ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......زکوٰۃ ہر اس شخص پر فرض ہے جو نصاب یعنی ساڑھے باون تولہ چاندی یا اتنی ہی مالیت کی نقدی یا سونے یا مالِ تجارت کا مالک ہو، یا ان چاروں اشیاء میں سے بعض یا سب کا مجموعہ ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر اس کی ملکیت میں ہو، البتہ اگر کسی شخص کے پاس سونے کے سوا کوئی چیز موجود نہ ہو، تو اس کا نصاب ساڑھے سات تولہ سونا ہے۔ اور اس مقدارِ نصاب پر سال گزر چکا ہو۔ چونکہ فی الوقت 30 ہزار روپے کی مالیت ساڑھے باون تولہ چاندی کی مالیت سے زیادہ ہے اس لئے 30 ہزار کی مالیت کے مالک پر زکوٰۃ فرض ہے بشرطیکہ اس رقم پر سال گزر گیا ہو۔

لمافی الهندیة(۱/۱۷۲): رجل أدی خمسة من المائتین بعد الحول الی الفقیر او الی الوکیل لاجل الزکاة ثم ظهر فیها درهم ستوقة لم تکن تلک الخمسة زکاة لنقصان النصاب.

(۲۵) مہر پر زکوٰۃ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ پچھلی جمعرات کو ہمارے محلے میں ایک عالمہ آئی ہوئی تھیں۔ ان کا مطالعہ بڑا اچھا تھا۔ دینی مسائل پر بھی انہوں نے کافی معلومات دیں۔ زکوٰۃ کا ایک مسئلہ انہوں نے یہ بتایا کہ بعض صورتوں

میں مہر پر بھی زکوٰۃ آتی ہے۔ ابھی وہ اس بارے میں تفصیل بیان کرتیں یا ہم ان سے پوچھتے ان کے شوہر انہیں لینے آ گئے۔ مجھے بڑی فکر لگی کہ میرا مہر تو بارہ تولہ سونا ہے جو کہ ابھی تک بالکل بھی نہیں ملا اور میں نے آج تک اس کی کوئی زکوٰۃ بھی نہیں نکالی۔ کیونکہ میرے شوہر بھی غریب ہیں اور ان کی آمدنی بھی قلیل ہے۔ اب آپ بتائیں کہ میں کیا کروں، اور کیا طریقہ اختیار کروں۔ کیا ہر قسم کے مہر پر زکوٰۃ لازم ہوتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......مہر دین ضعیف ہے اور دین ضعیف کا حکم یہ ہے کہ جب تک اس پر نصاب کے بقدر قبضہ نہ کیا جائے اور قبضہ سے بعد سال نہ گزر جائے اس وقت تک زکوٰۃ لازم نہیں ہوتی یہ حکم اس وقت ہے جبکہ مہر کے علاوہ کوئی اور مال نہ ہو، اگر مال ہو تو پھر جس قدر بھی مہر حاصل ہو، اس کو مال موجود میں ملا کر زکوٰۃ ادا کی جائے گی لہٰذا صورت مسئولہ میں چونکہ آپ کو ابھی تک مہر نہیں ملا اس لئے اس کی زکوٰۃ لازم نہیں ہے۔

لما في الهندية(۱/۱۷۵): واما سائر الديون المقر بها فهي على ثلاث مراتب عند ابى حنيفة رحمه الله ضعيف وهو كل دين ملكه بغير فعله لا بدلاً عن شئ نحو الميراث او بفعله لا بدلاً كالوصية أو بفعله بدلاً عما ليس بمال كالمهر وبدل الخلع والصلح عن دم العمد والدية وبدل الكتابة لازكوة فيه عنده حتى يقبض نصاباً ويحول عليه الحول.

وفي الدر المختار(۲/۳۰٦): (و) عند قبض (مائتين مع حولان الحول بعده) أى بعد القبض (من) دين ضعيف وهو (بدل غير مال) كمهر ودية وبدل كتابة وخلع.

(۲٦) مطلقہ غیر مدخول بہا عورت کے مہر میں زکوٰۃ کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی عورت کو نکاح کے بعد پورا مہر مل گیا اور وہ نصاب کے برابر یا اس سے زیادہ ہے اور ایک سال تک اس کے قبضے میں رہے، اور اس کے بعد اس کا شوہر رخصتی اور خلوت صحیحہ سے پہلے اس عورت کو طلاق دیدے اور دیئے ہوئے مہر میں سے آدھا مہر واپس لے لے، تو کیا اس عورت پر پورے مہر کی زکوٰۃ دینا فرض ہے یا آدھے مہر کی؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورتِ مسئولہ کے بارے میں علمائے احناف رحمہم اللہ سے دو قول منقول ہیں۔

(۱)۔ بعض فرماتے ہیں کہ آدھے مہر کی۔ (۲)۔ اور بعض فرماتے ہیں کہ پورے مہر کی زکوٰۃ دینا اس پر فرض ہے۔ البتہ صاحب فتاویٰ الولوالجیہ، صاحب فتاویٰ تاتارخانیہ، صاحب فتاویٰ درمختار نے پورے مہر کی زکوٰۃ ادا کرنے کا قول اختیار کیا ہے۔ اور علامہ شامی نے درمختار کی عبارت نقل کرنے کے بعد اس پر استدراک نہیں کیا ہے اس لئے اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بھی پورے مہر کی زکوٰۃ دینے کو راجح قرار دیا ہے۔ لہٰذا احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ عورت پورے مہر کی زکوٰۃ ادا کرے۔

لمافي الخانية على هامش الهندية (۱/۲۵۳): ولو تزوجها على مائتى درهم ودفع اليها ثم طلقها بعد

الحول قبل الدخول كان عليها الزكوة المائتين.

وفي الفتاوىٰ الولوالجية(١/١٨٥): ولو تزوج رجلٌ إمرأة على ألف درهم، وقبضت، وحال عليها الحول، ثم طلقها قبل الدخول زكت الألف كلها، لأنه وجب في ذمتها مثل نصف المقبوض لا عين المقبوض.

وفي الفتاوىٰ التاتارخانية(٢/٢٤٩): رجل تزوّج إمرأة عن ألف درهم ودفعها اليها فحال عليها الحول وهي في يدها حتى وجبت عليها الزكاة ثم طلقها قبل الدخول بها وأخذ منها نصف المهر لايسقط عنها شئ من الزكاة.

وفي الدر المختار(٢/٣٠٨، ٣٠٧): (ويجب عليها) أى المرأة (زكاة نصف مهر) من نقد(مردود بعد) مضيّ (الحول من ألف) كانت(قبضته مهراً) ثم ردّت النصف (لطلاق قبل الدخول بها) فتزكي الكل، لما تقرر أنّ النقود لا تتعيّن في العقود والفسوخ.

وفي الشامية تحته: (قوله ويجب عليهاالخ) صورتها: تزوّج إمرأة بألف وقبضتها وحال الحول ثم طلقها قبل الدخول فعليها ردّ نصفها إتفاقاً لكن زكاة النصف المردود لاتسقط عنها خلافاً لزفرؒ. شرح المجمع.

(۲۷) بدلِ خلع اورمہر پر زکوٰۃ کا حکم

سوال کیافرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ بندہ نے گھریلو ناچاقی کی بناپر اپنے شوہر سے خلع کا مطالبہ کیا تھا شوہر نے بندہ کے ساتھ مبلغ پچیس ہزارروپے پرخلع کرلیا، اس واقعہ کوتقریباً تین سال ہو چکے ہیں جس وقت یہ معاملہ ہوا تھا آدھی رقم اسی وقت اداکردی گئی تھی اور آدھی رقم تین ماہ بعدادا کردی گئی، اب پوچھنا یہ ہے کہ اس رقم کی زکوٰۃ کس پرآئیگی؟ اور کب سے؟ ابھی تک کسی نے بھی اس رقم کی زکوٰۃ ادانہیں کی ہے، اسی طرح اگرعورت کا مہر بقدرنصاب ہواورعورت کوادانہیں کیا گیا ہوتو اس صورت میں زکوٰۃ کس پرآئیگی؟

الجواب حامداًومصلیاً.....صورت مسئولہ میں جس وقت شوہرکوآدھی رقم اداکردی گئی تواس رقم کا شوہر مالک ہو چکا لہٰذا نصاب پر سال گزرنے کے بعدزکوٰۃ شوہراداکریگااوراگر یہ رقم نصاب کے برابر نہیں تو اپنے دوسرے نصاب کے ساتھ اس کوملاکر اگرنصاب کوپہنچ رہا ہو توزکوٰۃ اداکریگاورنہ نہیں۔

اسی طرح عورت جب تک مہر پر قبضہ نہ کرلے اس وقت تک عورت پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی البتہ مہر کی رقم پر قبضہ کے بعدسال گزرنے پراگر یہ رقم نصاب کے برابر ہوتو عورت پرزکوٰۃ واجب ہوگی لیکن اگرشوہر نے بیوی کومہرادانہیں کیااورشوہر کے پاس رقم بقدرنصاب موجود ہےتو سال گزرنے پرشوہر پرزکوٰۃ واجب ہوگی۔

لمافي الدر المختار(۲/۳۰۶): (من)دين ضعيف وهو (بدل غيرمال)كمهرودية وبدل كتابة وخلع الااذاكان عنده مايضم الى الدين الضعيف.

وفي الشامية تحته(قوله الااذاكان عنده مايضم الى الدين الضعيف)استثناء من اشتراط حولان الحول بعدالقبض والاولى أن يقول مايضم الدين الضعيف اليه كماافاده ح والحاصل انه اذاقبض منه شيئاوعنده نصاب يضم المقبوض الى النصاب ويزكيه بحوله ولايشترط له حوله بعد القبض.

والله اعلم بالصواب

(۲۸) مشترکہ کاروبار میں زکوٰۃ کا حکم

سوال کیافرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ ہم پانچ بھائی بہن سب ساتھ رہتے ہیں جائیداداور کاروبار بھی مشترک ہے۔دوان میں سے نابالغ ہیں،اب زکوٰۃ کی ادائیگی کی کیاصورت ہوگی؟ کیاپوری جائیداداور مشترکہ کاروبار سے زکوٰۃ ادا کی جائیگی تفصیل سے واضح فرمادیں۔

الجواب حامداًومصلیاً......صورت مسئولہ میں نابالغ بچوں پرزکوٰۃ واجب نہیں ہے،لہٰذاان دونوں کے حصے الگ کرکے باقی بالغ افراد اپنے اپنے حصے شمار کرکے زکوٰۃ ادا کریں بشرطیکہ وہ صاحب نصاب ہوں۔

لمافي الشامية(۲/۳۰۴): (قوله وان تعددنصاب)اى بحيث يبلغ قبل الضم مال كل واحدبانفراده نصابافانه يجب حينئذ على كل منهمازكاة نصابه.

(۲۹) مالِ مشترک میں زکوٰۃ کا حکم

سوال......کیافرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر چندافراد کے درمیان مال مشترک ہے،اور مال کو تقسیم کرنے کی صورت میں ہرشریک کے حصے میں نصاب کے برابر مال آتا ہےتو سال پوراہونے کے بعد ہرشریک کواپنے اپنے حصے کی زکوٰۃ اداکرنالازم ہوگی یامال مشترک سے اداکرنالازم ہوگی؟

الجواب حامداًومصلیاً......صورت مسئولہ میں مال مشترک میں اگر ہرشریک کا حصہ نصاب زکوٰۃ تک پہنچ رہاہے،تو سال پوراہونے پر ہر ایک شریک اپنے حصہ کے بقدرزکوٰۃ اداکرے،چاہے وہ مال مشترک سے ادا کی جائے یاکسی اور مال سے۔دونوں صورتوں میں زکوٰۃ ادا ہوجائے گی۔

لمافي فتاویٰ الهندية(۱/۱۸۱): الخليطان في المواشي كغير الخليطين فان كان نصيب كل واحد منهما يبلغ نصابا وجبت الزكاة والا فلا سواء كانت شركتهما عنانا أو مفاوضة او شركة ملك

بالإرث أو غيره من أسباب الملك...... فإن كان نصيب أحدهما يبلغ نصابا ونصيب الآخر لايبلغ نصابا وجبت الزكاة على الذى يبلغ نصيبه نصابا دون الآخر.

وفي الشامية(۲/ ۲۸۱): فلو مشتركة بين ثلاثة أثلاثا فعلى كل شاة قال في البحر: ولو كانت لرجل فليس للساعي أن يفرقها ويجعلها أربعين أربعين، فيأخذ ثلاث شياه لأنه باتحاد المالك صار الكل نصابا ولو كان بين رجلين أربعون شاة لاتجب على واحد منهما الزكوة، وليس للساعي أن يجمعها ويجعلها نصاباً ويأخذ الزكاة منها لأن ملك كل واحد منهما قاصر عن النصاب.

(۳۰) ''بی سی'' ڈالنے کے بعد زکوٰۃ کا حکم

سوال　کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ لوگ عموماً کمیٹی یعنی ''بی سی'' ڈالتے ہیں اور بعض بی سیاں تو لاکھوں کی ہوتی ہیں کیا اس صورت میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اگر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے تو کس پر یعنی کمیٹی ڈالنے والے پر یا جس کے پاس کمیٹی ڈالی ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ براہ کرم مدلل انداز میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداًومصلياً...... جو آدمی صاحب نصاب ہو اور اس کے پاس اپنی ضرورت اصلیہ سے زائد مال موجود ہو، اور اس پر سال گزر جائے تو اس پر زکوٰۃ کی ادائیگی لازم ہے اور اگر کوئی شخص اپنے مال میں سے کسی کو قرض دیدے تو اس قرض کی وصولی کے بعد اس پر گزرے ہوئے سالوں کی زکوٰۃ کی ادائیگی لازم ہوگی، اس سے پہلے نہیں۔ چونکہ ''بی سی'' کی صورت بھی قرض کی ہے اس لئے ''بی سی'' میں دی ہوئی رقم اگر نصاب کے برابر ہو تو ملنے کے بعد مالک پر گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ کی ادائیگی لازم ہوگی، ملنے سے پہلے نہیں۔

لمافي الهندية (۱/ ۱۷۵): وفي مقرّبه تجب مطلقا سواء كان مليا او معسرا او مفلسا .... ولو هرب غريمه وهو يقدر على طلبه او التوكيل بذلك فعليه الزكاة.

وفي الدرالمختار(۲/ ۲۶۶، ۲۶۷): ولو كان الدين على مقر ملئ او على معسر او مفلس...... او جاحد عليه بينة...... او علم به قاض...... فوصل الى ملكه لزم زكاة ما مضى.

وفي الدرالمختار(۲/ ۳۰۵): واعلم ان الديون عند الامام ثلاثة: قوى ومتوسط وضعيف، فتجب زكاتها اذا تم نصابا وحال الحول، لكن لا فورا بل عند قبض اربعين درهما من الدين القوى كقرض وبدل مال التجارة فكلما قبض اربعين درهما يلزمه درهم ......الخ.

(۳۱) اگر صاحب نصاب نے اپنی رقم کسی کو قرض دی تو زکوٰۃ کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے پاس کچھ نقد رقم تھی جو نصاب کے برابر تھی لیکن میرے ایک دوست

کو ضرورت تھی میں نے اس کو قرضہ دیدیا تو اب مجھے اس رقم کی زکوۃ ادا کرنی ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً صورت مسئولہ میں کیونکہ رقم نصاب کے برابر تھی اگر اس پر سال پورا ہوگیا تھا تو اب زکوۃ دینا واجب ہے اور اگر سال پورا نہیں ہوا تھا تو جب سال پورا ہوگا اس پر زکوۃ واجب ہوجائے گی اور زکوۃ کی ادائیگی رقم واپس ملنے کے بعد لازم ہوگی۔

لمافي الهندية(١/١٧٥): ولها سائر الديون المقربها فهي على ثلاث مراتب عند ابي حنيفة ضعيف وهو كل دين ملكه بغير فعله لابد لاعن شئ نحو الميراث...... ووسط وهو ما يجب بدلاعن مال ليس للتجارة كعبيد الخدمة..... وقوى وهو ما يجب بدلاعن سلع التجارة اذا قبض أربعين زكى لما مضى كذا في الزاهدى.

وفي الشامية (٢/٣٠٥): (قوله فكلما قبض اربعين درهما يلزمه درهم) هو معنى قول الفتح والبحر ويتراخى الاداء الى ان يقبض اربعين درهما ففيها درهم وكذا فيما زاد فبحسابه اى فيما زاد على الأربعين من اربعين ثانية وثالثة الى ان يبلغ مائتين ففيها خمسة دراهم ولذا عبر الشارح بقوله فكلما الخ و ليس المراد ما زاد على الاربعين من درهم أو أكثر كما توهمه عبارة بعض المحشين حيث زاد بعد عبارة الشارح وفيما زاد بحسابه لانه يوهم ان المراد مطلق الزيادة في الكسور وهو خلاف مذهب الامام كما علمته مما نقلناه آنفا عن المحيط فافهم.

(۳۲) قرض دیئے ہوئے مال میں زکوۃ ادا کرنا

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے سالے نے اپنا مکان بنوانے کے لئے مجھ سے ایک لاکھ روپے قرض لیا تھا، اس وقت اس کے حالات بھی اچھے تھے، امید تھی کہ سال چھ ماہ میں دے دیگا۔ لیکن اس کے حالات پھر خراب ہوگئے۔ اور اب دس سال گزر گئے ہیں اور اس کے حالات بہتر نہیں ہوئے، میں ہر سال اس رقم کی زکوۃ نکالتا ہوں۔ کیونکہ میرا سالہ کہتا ہے کہ جب ہوجائیں گے دیدوں گا۔ لیکن اب میں سوچتا ہوں کہ اگر اگلے دس سال تک بھی اس کے پاس نہ ہوئے تو میں کیا کروں گا؟ کیا یہ مجھ پر ظلم نہ ہوگا کہ میری پوری رقم زکوۃ کی مد میں چلی جائے گی؟ آیا میرے لئے کوئی چھوٹ ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورت مسئولہ میں جو رقم آپ نے اپنے برادر نسبتی (سالے) کو بطور قرض دی ہے۔ اس پر زکوۃ واجب ہے کیونکہ قرض عقد تبرع یعنی مقروض کے ساتھ احسان کرنا ہے، اور یہ احسان آپ نے خود کیا ہے۔ اور کسی نے آپ سے زبردستی نہیں کروایا۔ اور اس کا بدلہ اللہ آپ کو دے گا، لہٰذا مذکورہ صورت میں آپ پر اس مال کی زکوۃ واجب ہے۔ البتہ زکوۃ ادا کرنا قرضہ وصول ہونے کے بعد لازم ہوگا۔ تاہم قرضہ وصول ہونے سے پہلے آپ نے زکوۃ ادا کردی تو زکوۃ ادا ہوجائے گی، اور وصول ہونے کے بعد گزشتہ سالوں کی زکوۃ دوبارہ ادا کرنا لازم نہیں ہوگی۔

لمافی المحيط البرهاني(۳/۲۴۴): يجب ان يعلم بأن من عليه الدين لايخلوا اما ان يكون مقرا بالدين، او جاحداً له، واما ان يكون مليئاً او مفلساً، فان كان مليئاً وكان مقراً بالدين، فلا يخلوا اما ان وجب الدين بدلاً عما هو مال التجارة، كبدل الدراهم والدنانير، وعروض التجارة، وما أشبهه وهو الدين القوىّ، او وجب بدلاً عما هو مال، الا انه ليس للتجارة، كثمن عبيد الخدمة وما أشبهه وهو الدين الوسط، او وجب بدلا عمّا هو ليس بمال كالمهر، والدية، وبدل الخلع والصلح عن دم العمد، وما أشبهه وهو الدين الضعيف؛ وما وجب بدلا عما هو مال التجارة، فحكمه عند ابى حنيفة ان يكون نصاباً قبل القبض، تجب فيه الزكاة، ولكن لا يجب فيه الاداء مالم يقبض منه اربعين درهما، وما وجب بدلاً عما هو مال الا انه ليس للتجارة، فحكمه فى رواية عنه انه لا يكون نصاباً قبل القبض، وعلى هذه الرواية اعتمد الكرخىّ وفى رواية الاصل عنه انه يكون نصاباً قبل القبض يجب فيه الزكاة ولكن لا يجب فيه الاداء مالم يقبض منه مائتى درهم، وما وجب بدلا عما ليس بمال فحكمه على قوله الاوّل انه يكون نصاباً قبل القبض، وعلى قوله الأخر لا يكون نصاباً قبل القبض وهو الصحيح.

وفى الهندية(۱/۱۷۵): واما سائر الديون المقربها فهى على ثلاث مراتب عند ابى حنيفة رحمه الله تعالىٰ ضعيف وهو كل دين ملكه بغير فعله لا بدلاً عن شئى نحو الميراث او بفعله لابدلاً عن شئى كالوصية او بفعله بدلا عما ليس بمال كالمهر وبدل الخلع والصلح عن دم العمد والدية وبدل الكتابة لازكاة فيه عنده حتى يقبض نصاباً ويحول عليه الحَول. ووسط وهو ما يجب بدلاً عن مال ليس للتجارة كعبيد الخدمة وثياب البذلة اذا قبض مائتين زكى لما مضى فى رواية الاصل، وقوى وهو ما يجب بدلاً عن سلع التجارة اذا قبض اربعين زكى لمامضى، كذا فى الزاهدى.

وفى الدر المختار(۲/۲۶۶): (ولو كان الدين على مقر ملئى او) على (معسر او مفلس) اى محكوم بافلاسه (او) على (جاحد عليه بينة) وعن محمد لازكاة، وهو الصحيح.

وفى الشامية تحته: وفى المحيط عن المنتقى عن محمد، لو كان له دين على وال وهو مقربه الاانه لايعطيه وقد طالبه بباب الخليفة فلم يعطه فلا زكاة فيه.

(۳۳) قرض کی معافی کی صورت میں گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا صدر میں کپڑے کا کاروبار ہے اور الحمدللہ ہر سال

حساب لگا کر اپنے مال تجارت کی زکوۃ ادا کرتا ہوں۔ اب سے تقریباً دس سال پہلے مجھ سے ایک شخص نے کچھ قرض مانگا تھا میں نے اسے اس وقت دیدیا تھا جس کی قیمت بقدر نصاب تھی کئی سالوں کے بعد میں نے وہ قرض معاف کر دیا۔ اس سال جب میں اپنے مال کی زکوۃ نکالنے لگا تو میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ میرا جو ایک شخص پر بقدر نصاب قرض تھا۔ کئی سالوں کے بعد وہ قرض میں نے معاف کر دیا تھا تو کیا اب ان گزشتہ سالوں کی زکوۃ میرے ذمہ لازم ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... اگر کسی شخص کا دوسرے آدمی پر بقدر نصاب کئی سال تک قرض رہا پھر دائن (قرض خواہ) نے مدیون (مقروض) کو معاف کر دیا تو اب مقروض دو حال سے خالی نہیں یا موسر (مالدار) ہوگا یا معسر (تنگ دست) اگر مدیون موسر ہے اور دین قوی (مثلاً نقد رقم یا سونا چاندی کسی کو قرض دے دیا یا مال تجارت فروخت کیا اور اس کا قرض کسی کے ذمے باقی ہے) معاف کر دیا تو اس صورت میں گزشتہ سالوں کی زکوۃ ساقط نہیں ہوگی بلکہ ادا کرنی لازم ہوگی۔ البتہ دین متوسط (حوائج اصلیہ میں سے کوئی چیز فروخت کی اور اس کا ثمن کسی کے ذمے باقی ہے مثلاً پہننے کے کپڑے، خدمت کے غلام، طعام وغیرہ) یا دین ضعیف (وہ دین جو غیر مال کے بدلے لازم ہوا ہو، مثلاً بدل خلع، دیت، مہر وغیرہ) کے معاف کرنے سے گزشتہ سالوں کی زکوۃ ساقط ہو جائے گی۔ اور اگر مقروض معسر ہے تو چاہے کوئی سا بھی دین ہو معاف کرنے سے گزشتہ سالوں کی زکوۃ ساقط ہو جائے گی۔

لمافي الهندية(١/١٧١): ومن تصدق بجميع نصابه ولا ينوى الزكاة سقط فرضها وهذا استحسان كذا في الزاهدي ..... ولو كان له دين على فقير فابرأه عنه سقط عنه زكوته نوى به عن الزكوة أو لا لانه كالهلاك ولو أبرأه عن البعض سقط زكاة ذلك البعض لما قلنا وزكاة الباقي لا تسقط ولو نوى به الاداء عن الباقي كذا في التبيين. ولو كان من عليه الدين غنيا فوهبه منه بعد الحول ففي رواية الجامع يضمن قدر الزكاة وهو الاصح هكذا في محيط السرخسي.

وفي الدر المختار (٢/٣٠٧): ولو أبرأ رب الدين المديون بعد الحول، فلا زكوة سواء كان الدين قويا اولا خانية وقيده في المحيط بالمعسر اما الموسر فهو استهلاك فليحفظ بحر. (وفي الشامية تحته) (قوله قيده) أي قيد عدم الزكاة فيما اذا ابرأ الدائن المديون (قوله بالمعسر) بالمديون المعسر فكان الابراء بمنزلة الهلاك (قوله فهو استهلاك) اى فتجب زكاته (قوله وهذا ظاهر) اى قول البحر وقيده الخ ظاهر في ان مراده انه تقييد للاطلاق المذكور في قوله سواء كان الدين قوياً اولا الشامل لاقسام الدين الثلاثة اى أن سقوط الزكاة بابراء الموسر عنه بعد الحول في الديون الثلاثة مقيد بالمعسر احتراز عن الموسر فان المديون اذا كان موسراً أوابرأه الدائن لاتسقط الزكاة لانه استهلاك، وهذا غير صحيح في الدين الضعيف لانه لاتجب زكاته الا بعد قبض نصاب وحولان الحول عليه بعد القبض فقبله لاتجب فيكون ابراء ه استهلا كا قبل الوجوب فلا يضمن

زکاتہ ومثلہ الدین المتوسط علی ماقدمناہ من تصحیح البدائع وغایۃ البیان وکان الاوضح فی التعبیر ان یقول وھذا ظاھر فی أن ابراء المدیون الموسر استھلاک مطلقا وھو غیر صحیح۔

(۳۴) کئی سالوں کی زکوٰۃ اور دکان کی زکوٰۃ کیسے نکالی جائے؟

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے والد صاحب نے اپنی جائیداد تقسیم کی تو مجھے ایک خالی دکان دی میرے پاس کچھ رقم تھی کچھ والد صاحب سے قرض لے کر دکان میں سامان ڈالا سامان عورتوں کے استعمال کا ہے موتی ستارے وغیرہ اس دکان سے میں نے اتنا کمایا والد صاحب کا قرضہ بھی دیدیا ایک گھر اور دو تین دکانیں بنوائیں وہ گھر اور دکانیں کرایہ پر دی ہیں اور وہ کرایہ میرے استعمال میں ہے اس دکان کو تقریباً چار یا پانچ سال ہو گئے ہیں اس عرصہ میں میں نے دکان کے سامان کی زکوٰۃ ادا کی اور نہ وہ رقم جو میں نے اس دکان سے کما کر جمع کی اس کی زکوٰۃ ادا کی اور اس زکوٰۃ نہ ادا کی ہوئی رقم سے میں نے وہ گھر اور دکانیں بنوائی ہیں (اب اللہ نے مجھے توفیق دی ہے کہ میں ان شاء اللہ زکوٰۃ ادا کروں گا آئندہ اور گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ مجھے دینا ضروری ہے یا نہیں گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ دینا ضروری ہو تو دینے کا کیا طریقہ ہوگا؟) اب مسئلہ یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ کرایہ میرے لیے استعمال کرنا حلال ہے یا نہیں اور میں اس کرائے کو زکوٰۃ میں دوں تو زکوٰۃ ادا ہوگی یا نہیں اور دیگر صدقہ خیرات کرنا کیسا ہے اگر یہ کرایہ میرے لئے حلال نہ ہو اور میں گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کر دوں پھر میرے لیے حلال ہو جائے گا اور زکوٰۃ وغیرہ دینا صحیح ہوگا کیونکہ میں نے سنا ہے جس مال کی زکوٰۃ ادا نہ کی جائے وہ حرام ہو جاتا ہے میں نے بھی مال کی زکوٰۃ نہیں دی لہٰذا میرا مال بھی حرام ہو گیا اور میں نے اسی مال سے گھر اور دکانیں بنوائی ہیں جس کا کرایہ آ رہا ہے۔

دوسری بات یہ معلوم کرنی ہے میں نے شروع میں جو دکان میں سامان ڈالا تھا وہ اس رقم کا تھا جو میں نے سی ڈی ٹیلیویژن کرائے پر دے کر جمع کیا تھا پھر اس رقم سے دکان میں سامان ڈالا اور اتنی ترقی ہوئی۔ معلوم یہ کرنا ہے ٹیلیویژن وغیرہ کے کرائے کا استعمال کرنا کیسا ہے اور اس کرائے سے دکان میں سامان ڈالا اور اتنا کاروبار بڑھ گیا اب ان تمام چیزوں کا کیا حکم ہے؟

تیسری بات یہ معلوم کرنی ہے ہماری دکان میں جو سامان ہے اس کا اندازہ کرنا کتنے کا ہے اور اس پر کتنی زکوٰۃ آئے گی یہ ذرا مشکل ہے میرے والد صاحب نے ایک مولوی صاحب سے مسئلہ معلوم کیا تو انہوں نے بتایا سامان ایسا ہو جس میں مشکل ہو کتنا ہوگا کتنی زکوٰۃ آئے گی تو اس صورت میں اس سامان اور کام کے جاننے والے دو یا تین شخصوں کو بلا کر اندازہ لگایا جائے کتنا مال ہوگا مثلاً ایک نے کہا دو لاکھ دوسرے نے سوا دو لاکھ اور تیسرے نے ڈھائی لاکھ کہا تو احتیاطاً جس نے زیادہ بتایا ہے اس کے قول کا اعتبار کر کے زکوٰۃ ادا کر دو، کیا اس طرح کرنا صحیح ہے؟ مولانا صاحب جلد از جلد جواب عنایت فرمائیں مہربانی ہوگی، اللہ تعالیٰ آپ کو اجر عظیم عطا فرمائیں گے۔

الجواب حامداً ومصلیاً ...... زکوٰۃ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فریضہ ہے۔ اگر کوئی کسی وجہ سے زکوٰۃ نہ نکالے تو بعد میں اس پر زکوٰۃ نکالنا ضروری ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں گزشتہ چار پانچ سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے اور جس مہینے سے آپ صاحب نصاب

ہو گئے تھے یعنی دوکان کا سامان اور نقد رقم ملا کر جس مہینہ سے وہ نصاب زکوٰۃ (ساڑھے سات تولے سونا یا ساڑھے باون تولہ چاندی) کو پہنچتا ہے اسی مہینے سے زکوٰۃ کا حساب لگایا جائے۔ مثلاً والد صاحب کے قرضہ دینے کے بعد اگر ماہ رمضان میں آپ کے پاس بقدر نصاب سامان اور رقم موجود تھی تو اگلے سال شعبان کے آخر میں آپ کے پاس جو بقدر نصاب سامان اور رقم تھی اس پر زکوٰۃ فرض ہوئی تھی۔ اور اب تک جو چار یا پانچ شعبان کے مہینے گزرے ہیں ان تمام کی زکوٰۃ آپ پر لازم ہے۔

اور اب زکوٰۃ نکالنے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ غور وفکر کر کے اندازہ لگائیں کہ پہلے سال شعبان میں آپ کے پاس کتنی رقم اور کتنا دوکان کا سامان تھا اور پھر دوسرے اور تیسرے سال میں وہ سامان اور رقم کتنے تک پہنچے۔ مثلاً پہلے سال دوکان کا سامان اور آپ کے پاس نقد رقم ملا کر کل مالیت پچاس ہزار روپے (۵۰۰۰۰) تک بنتی تھی تو اس میں بارہ سو پچاس روپے (۱۲۵۰) زکوٰۃ ہوگی۔ پھر دوسرے سال میں کل مالیت ایک لاکھ (۱۰۰۰۰۰) تک پہنچ گئی تو اس میں پہلے سال کی زکوٰۃ کی رقم نکال کر "۹۸۷۵۰" روپے رہ جائیں گے اور اس رقم پر "۲۴۶۸.۲۵" روپے زکوٰۃ آئے گی۔ پھر تیسرے سال میں اگر آپ کی کُل مالیت دو لاکھ (۲۰۰۰۰۰) ہوگئی تو اس میں سے پہلے اور دوسرے سال کی زکوٰۃ کی رقم منہا کر کے "۱۹۶۲۸۱" رہ جائیں گے اس میں زکوٰۃ کی کل رقم "۴۹۰۷" روپے بنتی ہے۔ چوتھے سال میں اگر کل مالیت تین لاکھ (۳۰۰۰۰۰) ہو تو پہلے تین سالوں کی زکوٰۃ کی رقم نکال کر "۲۹۱۳۷۴" روپے بنتی ہے۔ اس میں زکوٰۃ کی رقم "۷۲۸۴" روپے بنتی ہے اور اب پانچویں سال میں اگر کل مالیت چار لاکھ (۴۰۰۰۰۰) روپے ہو تو اس میں پہلے چار سالوں کی زکوٰۃ کی رقم نکال کر کل رقم ۳۸۴۰۹۰ روپے بنتی ہے اور اس میں زکوٰۃ کی رقم "۹۶۰۳" روپے بنتی ہے۔ اس حساب سے پانچ سالوں کی زکوٰۃ کی کل رقم "۲۵۵۱۲" روپے ہوگی۔ یہ ایک مثال ہے آپ خود یا کسی معتبر عالم دین سے اس حساب کے مطابق حساب لگا کر جو رقم زکوٰۃ کی بنے گی ادا کیجئے۔ باقی دوکانوں اور گھر کا کرایہ مستقل شمار نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ سال کے آخر میں نقد رقم ہی کے ساتھ ملا کر شمار کیا جاتا ہے اور اس رقم اور باقی سامان کو ملا کر ہی زکوٰۃ نکالی جاتی ہے۔ نیز زکوٰۃ میں تاخیر کی وجہ سے مال حرام نہیں ہوتا البتہ بغیر کسی عذر کے تاخیر کرنے سے انسان گناہ گار ضرور ہوتا ہے لہٰذا اب چار یا پانچ سال کی زکوٰۃ ادا کرنے سے آپ کا گناہ بھی ختم ہو جائے گا اور آپ کیلئے اس مال سے خیرات، صدقات دینا بھی جائز ہو جائے گا۔

(۲)۔ سی ڈی ٹیلیویژن وغیرہ کرائے پر دے کر جس رقم سے آپ نے شروع میں دوکان میں سامان ڈالا تھا وہ رقم حرام ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ صرف اس رقم کو صدقہ کیا جائے۔ مثلاً اس وقت آپ کے پاس بیس ہزار روپے (۲۰۰۰۰) تھے اور تیس ہزار (۳۰۰۰۰) والد صاحب سے قرض لیے تھے تو اب صرف بیس ہزار روپے (۲۰۰۰۰) بغیر نیت ثواب کے صدقہ کریں۔ اس سے انشاء اللہ تعالیٰ آپ کا مال اور چیزیں پاک اور حلال ہو جائیں گی۔

(۳)۔ سال کے آخر میں خود ہی سامان کا اندازہ لگانا چاہئے۔ عام طور پر دوکان خواہ کتنی ہی کیوں بڑی نہ ہو، اور اس میں سامان کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو مالک دوکان کو دوسرے لوگوں سے اچھا اور مناسب اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے آسان طریقہ یہی ہے کہ خود ہی حساب کتاب سے دوکان کے سامان اور چیزوں کے فروخت ہونے کی قیمت سے صحیح اندازہ لگایا جائے اور پھر اس کو اور نقد رقم (اگر نقد رقم موجود

ہو) کو ملا کر مجموعہ مالیت کی زکوٰۃ نکالنی چاہیے۔

لما في الفتاوى الهندية(۴/۴۴۹): ولا تجوز الاجارة على شيء من الغناء والنوح والمزامير والطبل وشيء من اللهو وعلى هذا الحداء وقراءة الشعر وغيره ولا اجر في ذالك وهذا كله قول ابي حنيفة وابي يوسف ومحمد رحمهم الله تعالىٰ كذا في غاية البيان.

وفي الدر المختار(۶/۵۵): (لاتصح الاجارة لعسب التيس)..... ولا (لاجل المعاصي مثل الغناء والنوح والملاهي) ولو اخذ بلاشرط يباح.

وفي الشامية..... وفي المنتقى: امرأة نائحة أو صاحبة طبل او زمر اكتسبت مالا ردته على اربابه ان علموا والا تتصدق به وان من غير شرط فهو لها: قال الامام الأستاذ لايطيب. والمعروف كالمشروط اهـ.

قلت: وهذا مما يتعين الاخذ به في زماننا لعلمهم انهم لا يذهبون الا بأجر البتة ط.

وفي الدر المختار(۲/۲۵۹،۲۶۰):(وسببه)..... (ملك نصاب حولي)..... (تام)..... (فارغ عن دين له مطالب من جهة العباد) سواء كان لله كزكاة وخراج وفي الشامية تحت (قوله كزكاة) فلو كان له نصاب حال عليه حولان ولم يزكه فيهما لازكاة عليه في الحول الثاني.

وفي الدر المختار(۲/۲۹۹): (وفي كل خمس) بضم الخاء (بحسابه) ففي كل اربعين درهما درهم، وفي كل اربعة مثاقيل قيراطان وما بين الخمس الى الخمس عفو. وقالا: ما زاد بحسابه وهي مسألة الكسور.

وفي الشامية تحت(قوله وقالا ما زاد بحسابه) يظهر أثر الخلاف فيما لو كان له مائتان وخمسة دراهم مضى عليها عامان: قال الامام: يلزمه عشرة وقالا: خمسة لانه وجب عليه في العام الاول خمسة وثمن فبقي السالم من الدين في الثاني نصاب الاثمن. وعنده لازكاة في الكسور فبقي النصاب في الثاني كاملا وفيما اذا كان له الف حال عليها ثلاثة احوال كان عليه في الثاني اربعة وعشرون وفي الثالث ثلاثة وعشرون عنده.

وقالا يجب مع الاربعة والعشرين ثلاثه اثمان درهم ومع الثلاثة والعشرين نصف وربع وثمن درهم ولا خلاف انه يجب في الاول خمسة وعشرون كذا في السراج نهر.

اقول : قوله وثمن درهم كذا وجدته ايضا في السراج وصوابه وثمن ثمن درهم كمالا يخفى على الحاسب.

وفی الشامیۃ(۲/۲۹۲): رجل دفع إلی فقیر من المال الحرام شیئا یرجو به الثواب یکفر، ولو علم الفقیر بذالک فدعاله وأمن المعطی کفرا جمیعا.

وفی الدر المختار(۲/۲۷۱، ۲۷۲): وافتراضها عمری أی علی التراخی، وصححه البَاقانی وغیره وقیل فوری أی واجب علی الفور وعلیه الفتوی کما فی شرح الوهبانیة فیأثم بتاخیرها بلا عذر

وفی الشامیة تحته: (قوله بتأخیرها الخ) ظاهره الاثم بالتاخیر ولو قل کیوم أو یومین، لانهم فسروا الفور بأول اوقات الإمکان، وقد یقال المراد ان لا یؤخر الی العام القابل.

وفی الشامیة (۲/۴۵۷): (قوله کان اداء) ای ویسقط عنه الاثم اتفاقاً کما فی البحر قیل: المراد اثم تفویت الحج لا اثم التاخیر. قلت: لا یخفی مافیه بل الظاهر ان الصواب اثم التاخیر اذ بعد الاداء لا تفویت وفی الفتح: ویاثم بالتاخیر عن اول سنی الامکان فلو حج بعده ارتفع الاثم وفی القهستانی: فیأثم عند الشیخین بالتاخیر الی غیره بلا عذر الا اذا ادی ولو فی آخر عمره فانه رافع للاثم بلا خلاف.

(۳۵) اگر سونے، چاندی سے کپڑوں پر نقش وغیرہ کرایا تو زکوٰۃ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ جب سے میری منگنی ہوئی ہے سسرال کی طرف سے مختلف تحائف کا سلسلہ جاری ہے اس دفعہ انہوں نے ایک سوٹ بھیجا ہے جس پر سونے اور چاندی کے تار وغیرہ سے کام کیا گیا ہے۔ تو کیا ان کپڑوں پر زکوٰۃ فرض ہے یا نہیں۔ اگر فرض ہے تو زکوٰۃ کس طرح نکالی جائے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً عورت کیلئے سونے، چاندی کا استعمال جائز ہے البتہ مرد کیلئے سونے، چاندی کی تار وغیرہ سے کپڑوں پر کام کرانا چار انگشت کی مقدار تو مباح ہے اس سے زائد مکروہ ہے۔ تاہم اگر سونے، چاندی کی تار وغیرہ سے کپڑوں پر کام کرایا گیا اور یہ سونا، چاندی علیحدہ طور پر یا دوسرے مال سے ملا کر نصاب کو پہنچتا ہو، تو اس میں زکوٰۃ واجب ہے اور زکوٰۃ نکالنے میں سونے، چاندی کی مقدار کے اندر سنار کا قول معتبر ہوگا۔

لمافی الهندیة(۱/۱۷۸): تجب فی کل مائتی درهم خمسة دراهم وفی کل عشرین مثقال ذهب نصف مثقال مضروبا کان اولم یکن مصوغا اوغیر مصوغ حلیا کان للرجال او للنساء تبرا کان او سبیکة کذا فی الخلاصة.

وفی الدر المختار(۲/۲۹۷): (واللازم) مبتدأ(فی مضروب کل) منهما(ومعموله ولو تبرا او حلیا مطلقا) مباح الاستعمال اولا ولو للتجمل والنفقة لانهما خلقا اثمانا فیزکیهما کیف کانا.

وفیه ایضا(۲/۳۵۲): (وکذا المنسوج بذهب یحل إذا کان هذا المقدار) أربع أصابع (وإلا لا) یحل

للرجل زيلعي

وفي الشامية تحته: وعبارة الزيلعي مطلقة عن التقييد بالرجل، واعترض بأن هذا ليس من الحلي، فالظاهر أن حكم النساء فيه كالرجال أقول: فيه نظر لأن الحلي كما في القاموس ما يتزين به ولاشك أن الثوب المنسوج بالذهب حلي. وقدمنا عن الخانية أن النساء فيما سوى الحلي من الأكل والشرب والادهان من الذهب والفضة والعقود بمنزلة الرجال ولا بأس لهن بلبس الديباج والحرير والذهب والفضة واللؤلؤ اهـ وفي الهداية: ويكره أن يلبس الذكور من الصبيان من الذهب والحرير اهـ وسيأتي وفي القنية لا بأس بالعلم المنسوج بالذهب للنساء فأما للرجال فقدر أربع أصابع وما فوقه يكره.

وفي الشامية(٦/٣٥٥): وفيه ان الوارد عن الشارع ﷺ انه لبس الجبة المكفوفة بحرير فليس فيه ذكر فضة ولا ذهب فليتأمل وليحرر اهـ. اقول: الظاهر ان وجه الاستشكال ان كلامن العلم والكفاف في الثوب انما حل لكونه قليلا وتابعا غير مقصود كما صرحوا به وقد استوى كل من الذهب والفضة والحرير في الحرمة فترخيص العلم والكفاف من الحرير ترخيص لهما من غيره ايضا بدلالة المساواة ويؤيد عدم الفرق مامر من اباحة الثوب المنسوج من ذهب اربعة اصابع وكذا كتابة الثوب بذهب او فضة والاناء ونحوه المضبب بهما فتأمل والاشكال الواردهنا وارد ايضا على ماقدمه عن المجتبى في علم العمامة.

(٣٦) وارثوں کے حق میں جو مال آئے اس پر زکوٰۃ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر گاڑی وغیرہ کے ایکسیڈنٹ میں کسی کا انتقال ہوگیا. اور گاڑی والے یا کمپنی نے جان کے معاوضہ میں دیت کی رقم دی، اور رقم کو تقسیم کرنے کے بعد تمام وارثوں کے حصے میں نصاب کے برابر یا اس سے زیادہ رقم آئی تو کیا اس صورت میں وارثوں پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً صورت مسئولہ میں جو مال وارثوں میں سے ہرایک کے حق میں آیا ہے چونکہ وہ نصاب کے برابر یا زیادہ ہے اسلئے اگر اس پر سال گزر گیا ہے تو زکوٰۃ واجب ہے۔

لمافي الهندية(١/١٧٢): (ومنها كون المال نصاباً) فلا تجب في اقل منه وفي (١/١٧٥) (منها حولان الحول على المال).... ومن كان له نصاب ما استفاد في اثناء الحول مالا من جنسه ضمه زكوة سواء كان لميراث اوهبة او غير ذالک.

وفي الدر المختار(٢/٢٥٩): سبب افتراضها (ملک نصاب حولی) نسبة للحول

وفی الشامیة تحته: (لحولانه علیه) ای لان حولان الحول علی النصاب شرط لکونه سببا.

وفی الفقه الاسلامی(۳: ۱۹۰۰). المقصود اصل الملک وملک الید بان یکون مملوکا فلا زکاة فی سوائم الوقف والخیل المسوقوفة لعدم الملک ولاتجب الزکاة فی المال الذی استولیٰ علیه العدو واحرزه بداره لان الاعداء فی رأی الحنفیة ملکوه بالاحراز فزال ملک المسلم عنه.

(۳۷) سیونگ سرٹیفکیٹ میں اصل رقم کی زکوٰۃ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک گورنمنٹ ادارہ میں ملازمت کرتا ہوں ہر ماہ کی تنخواہ سے میں بچت کر کے رقم جمع کرتا رہا،جب رقم زیادہ ہوگئی تو میں نے سوچا کہ اس کو بینک میں جمع کروادیتا ہوں اور میں نے بینک جا کر سیونگ اکاؤنٹ میں اپنی رقم جمع کروائی بینک نے مجھے سرٹیفکیٹ جاری کردیا۔جو کہ میرے پاس موجود ہے اب آپ حضرات سے یہ معلوم کرنا ہے کہ سیونگ سرٹیفکیٹ کی اصل رقم پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں،اگر وہ نصاب کے برابر ہو یا اس سے زیادہ ہو؟

الجواب حامداً ومصلیاً سیونگ سرٹیفکیٹ میں اصل رقم میں ملکیت مالک کی ہی ہوتی ہے لہٰذا جب وہ رقم نصاب کے برابر یا نصاب سے زائد ہو،اور اس پر سال بھی گزرجائے تو زکوٰۃ مالک پر واجب ہے۔اور سیونگ سرٹیفکیٹ میں اصل رقم سے زائد جو مالیت مل رہی ہے وہ سود اور حرام ہے اس رقم کا اصل مالک کو لوٹانا ضروری ہے۔اور اگر اصل مالک معلوم نہ ہو تو بلانیت ثواب اس کو صدقہ کرنا واجب ہے۔نیز

لمافی الهندیة(۴: ۳۳۸): اما تفسیرها شرعا: فالایداع هو تسلیط الغیر علی حفظ ماله والودیعة مایترک عند الامین کذا فی الکنز واما حکمها:فوجوب الحفظ علی المودع وصیر ورة المال امانة فی یده ووجوب ادائه عند طلب مالکه کذا فی الشمنی.

وفی البزازیة علی الهندیة(۴: ۸۶): ولو بلغ المال الخبیث نصابا لایجب فیه الزکاة لان الکل واجب التصدق.

وفی النتف فی الفتاویٰ(ص۱۱۲): والرابع من اسباب وجوب الزکاة هو ان یکون المال حلالاً، لان المال اذا کان حراما لایخلو من وجهین اما ان یکون له خصم حاضر فیرده علیه واما ان لایکون له خصم حاضر فیعطیه للفقراء کله ولا یحل له منه قلیل ولا کثیر.

(۳۸) کارخانے کی مالیت پر زکوٰۃ لازم ہوگی یا آمدنی پر؟ نیز زبردستی زکوٰۃ لینے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک کارخانہ ہے جس کی آمدنی تقریباً چار لاکھ روپے ماہانہ ہے تو کیا میرے اوپر اس کارخانے کی مالیت پر زکوٰۃ لازم ہوگی یا آمدنی پر؟ نیز ایک تنظیم والے ہم سے زبردستی ہر ماہ دس ہزار

روپے زکوٰۃ کے نام پر لے جاتے ہیں تو کیا اس سے زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے یا مجھے سال کے اختتام پر دوبارہ زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً ..... صورت مسئولہ میں آپ پر کارخانہ سے حاصل ہونے والی آمدنی پر زکوٰۃ لازم ہوگی باقی جو تنظیم والے زبردستی زکوٰۃ وصول کر لیتے ہیں اس کا حکم یہ ہے کہ اگر زکوٰۃ دیتے وقت آپ نے زکوٰۃ کی ادائیگی کی نیت کر لی ہو، اور وہ مصرف پر خرچ کریں تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی اور اگر وہ مصرف پر خرچ نہ کریں تو دوبارہ ادائیگی ضروری ہوگی۔

وفی الدر المختار(۲/۲۸۸): (اخذ البغاة والسلاطين الجائرة (زكاة) الأموال الظاهرة كـ(لسوائم والعشر والخراج لا اعادة على أربابها ان صرف) المأخوذ (في محله) الآتي ذكره (والا)يصرف (فيه فعليهم) فيما بينهم وبين الله (اعادة غير الخراج) لانهم مصارفه. واختلف في الاموال الباطنة ففي الولوالجية وشرح الوهبانية المفتي به عدم الإجزاء وفي المبسوط الاصح الصحة اذا انوى بالدفع لظلمة زماننا الصدقة عليهم لانهم بما عليهم من التبعات فقراء حتى أفتى امير بلخ بالصيام لكفارة عن يمينه ولو اخذها الساعي جبرا لم تقع زكاة لكونها بلا اختيار ولكن يجبر بالحبس ليؤدي بنفسه لان الاكراه لاينافي الاختيار وفي التجنيس المفتي به سقوطهافي الاموال الظاهرةلا الباطنة.

وفي الشامية(۲/۲۹۰): الأصح ان مايأخذه ظلمة زماننا من الجبايات والمصادرات يسقط عن أرباب ألاموال اذا نووا عند الدفع التصدق عليهم لأنهم بما عليهم من التبعات فقراء فليتأمل.

(۳۹) ضرورتِ زندگی کیلئے جمع کی ہوئی رقم پر زکوٰۃ کا حکم

سوال　کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے اپنی ذاتی موٹر سائیکل خریدنے کے ارادے سے کچھ رقم پس انداز کی تھی۔ اب وہ رقم جڑ کر تقریباً پچاس ہزار بن چکی ہے، جمعہ کے دن میں نے اپنے خطیب صاحب سے سنا ہے کہ جس کے پاس بیس، تیس ہزار روپے ہوں اور اس پر سال گزر جائے تو زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے۔ میرے پاس اس رقم پر پورا سال تو ابھی نہیں ہوا البتہ ایک ماہ بعد ہو جائے گا۔ اب جبکہ یہ رقم میں نے اپنی ضرورتِ زندگی کی ایک چیز کیلئے جوڑی ہے تو کیا اس میں بھی زکوٰۃ لازم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ..... جو رقم اپنی ضرورت زندگی کیلئے جمع کی جائے اور اس پر سال ایسی حالت میں گزر جائے کہ وہ ضرورت میں خرچ نہ ہو تو حاجت اصلیہ سے زائد ہونے کی بنا پر اور پورا سال اس میں خرچ نہ ہونے کی وجہ سے اس پر زکوٰۃ لازم ہو جاتی ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں سال پورا ہونے پر رقم مذکور پر زکوٰۃ لازم ہوگی۔

لما في البحر الرائق(۲/۲۰۶):ان نفي وجوبها فيما اذا كان له دراهم مستحقة للصرف الى تلك الحوائج مخالف لما في الدراية والبدائع تجب الزكاة في النقد كيف ما امسكه للنماء او للنفقة.

وفي الدر المختار(۲/۲۶۲): (و) فارغ (عن حاجته الاصلية) لان المشغول بها كالمعدوم وفسره

عن ملك بما يدفع عنه الهلاك تحقيقا كثيابه او تقديرا كدينه. وفي رد المحتار فاذا كان معه دراهم امسكها بنية صرفها الى حاجته الاصلية لاتجب الزكاة فيها اذا حال الحول وهي عنده لكن اعترضه في البحر بقوله: ويخالفه ما في المعراج في فصل زكاة العروض ان الزكاة تجب في النقد كيف ما امسكه للنماء او للنفقة وكذا في البدائع في بحث النماء التقديري　اذا امسكه لينفق منه كل ما يحتاجه فحال الحول وقد بقي معه منه نصاب فانه يزكي ذالك الباقي وان كان قصده الانفاق منه ايضا في المستقبل لعدم استحقاق صرفه الى حوائجه الاصلية وقت حولان الحول.

(۴۰) ضروری اشیاء کی خریداری کیلئے جمع شدہ رقم پر زکوٰۃ کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ میں کہ میں گھر کی ضروری اشیاء مثلاً فریج، واشنگ مشین وغیرہ کیلئے سال بھر رقم جمع کرتا رہا اور سال کے آخر میں یہ ارادہ تھا کہ میں یہ اشیاء خرید لوں لیکن کسی وجہ سے نہ خرید سکا، تو اب سوال یہ ہے کہ اس رقم پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: واضح رہے کہ جو رقم بقدر نصاب زکوٰۃ کو پہنچ جائے اور اس پر سال بھی گزر جائے تو ایسی مالیت پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ لہذا صورت مسئولہ میں اگر رقم نصاب کو پہنچتی ہے اور سال بھی گزر چکا ہے تو آپ پر زکوٰۃ واجب ہے باقی فریج، واشنگ مشین وغیرہ اشیاء کی خریداری کی نیت مانع زکوٰۃ نہیں ہے۔

كما في الهندية (١/١٧٢-١٧٣): (واما شروط وجوبها فمنها) الحرية　(ومنها كون المال نصابا) فلا تجب في اقل منه هكذا في العيني شرح الكنز　(ومنها فراغ المال) عن حاجته الاصلية فليس في دور السكنى وثياب البدن واثاث المنازل ودواب الركوب.

وفي الشامية (٢/٢٦٢): (قوله وفارغ عن حاجته الاصلية) اشار الى انه معطوف على قوله عن دين (قوله وفسره ابن ملك) اي فسر المشغول بالحاجة الاصلية والاولى فسرها وذلك حيث قال وهي مايدفع الهلاك عن الانسان تحقيقا كالنفقة ودور السكنى وآلات الحرب والثياب المحتاج اليها　فاذا كان له دراهم مستحقة بصرفها الى تلك الحوائج صارت كالمعدومة　وظاهر قوله فاذا كان له دراهم الخ ان المراد من قوله وفارغ عن حاجته الاصلية ماكان نصابا من النقدين أو أحدهما فارغا عن الصرف الى تلك الحوائج، لكن كلام الهداية مشعر بأن المراد به نفس الحوائج. فانه قال: وليس في دور السكنى وثياب البدن واثاث المنازل ودواب الركوب وعبيد الخدمة وسلاح الاستعمال زكاة لانها مشغولة بحاجته الاصلية وليست بنامية ايضا وبه يشعر كلام

المصنف الآتی ایضا.

(۴۱) بیچنے کی نیت سے خریدی ہوئی دکان پر زکوٰۃ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے دکان بیچنے کی نیت سے لی ہے لیکن ابھی تک فروخت نہیں ہوئی ہے بلکہ خالی ہے تو کیا اس پر زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہے یا نہیں؟ اگر لازم ہے تو زکوٰۃ کس طرح ادا کی جائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ہر وہ چیز جو فروخت کرنے کی نیت سے خریدی جائے اور اس کی قیمت بقدر نصاب زکوٰۃ ہو، اور اس پر سال بھی گزر جائے تو اس چیز کی زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہوتی ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ نے جو دکان فروخت کرنے کی نیت سے خریدی ہے اگرچہ خالی ہے، لیکن اس کی قیمت اگر ساڑھے باون تولے چاندی کی قیمت کے برابر یا اس سے زیادہ ہو تو سال گزرنے کے بعد اس کی زکوٰۃ کی ادائیگی آپ پر واجب ہوگی۔

لما فی الھندیۃ(۱: ۱۷۹): (الفصل الثانی فی العروض): الزکاۃ واجبۃ فی عروض التجارۃ کائنۃ ما کانت اذا بلغت قیمتها نصابا من الورق والذھب. کذا فی الھدایۃ، ویقوم بالمضروبۃ، کذا فی التبیین. وتعتبر القیمۃ عند حولان الحول بعد أن تکون قیمتها فی ابتداء الحول مائتی درھم من الدراھم الغالب علیها الفضۃ. کذا فی المضمرات. ثم فی تقویم عروض التجارۃ التخییر یقوم بأیھما شاء من الدراھم والدنانیر، الا اذا کانت لاتبلغ بأحدھما نصابا فحینئذ تعین التقویم بما یبلغ نصابا. ھکذا فی البحر الرائق.

وفی الدر المختار(۲: ۲۹۵): (نصاب الذھب عشرون مثقالا والفضۃ مائتا درھم کل عشرۃ) دراھم (وزن سبعۃ مثاقیل) (والمعتبر وزنھما اداء وجوبا)ولا قیمتھما(واللازم) مبتدأ (فی مضروب کل منھما (ومعمولہ ولو تبرا أو حلیّا مطلقا) مباح الاستعمال اولا ولو للتجمل والنفقۃ لأنھما خلقا أثمانا فیزکیھما کیف کانا. (أو) فی (عرض تجارۃ قیمتہ نصاب) الجملۃ صفۃ عرض وھو ھنا مالیس بنقد.

(۴۲) قسطوں کی رقم پر زکوٰۃ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ ایک شخص نے دو لاکھ روپے میں دو گاڑیاں فروخت کیں ہر مہینہ ہر گاڑی کی تین ہزار روپے قسط ملتی ہے جو کہ یوٹیلٹی ضروریات میں خرچ ہو جاتی ہے، اسطرح سالانہ بہتر ہزار روپے قسط وصول ہوتی ہے جو ختم بھی ہوگئی۔

نیز اسی شخص نے کسی سے ایک لاکھ روپے قسط پر گاڑی خریدی جسکی ہر مہینہ قسط دیتا ہے۔

۱۔ کیا اس شخص پر اگر اسکے پاس نقدی موجود نہ ہو زکوٰۃ فرض ہوگی؟

۲۔ زکوۃ کب سے فرض ہوگی؟

۳۔ اگر نقدی موجود ہو تو پھر ادائیگی کی کیا صورت ہوگی حالانکہ وہ بقدر نصاب نہیں ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً صورت مسئولہ کے جواب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ زکوۃ اس شخص پر فرض ہوتی ہے جو صاحب نصاب ہو اور اس نصاب پر سال بھی گزرے۔ اب جو شخص صاحب نصاب نہ ہو یا صاحب نصاب تو ہو لیکن اس پر سال نہ گزرا ہو تو اس پر زکوۃ فرض نہ ہوگی۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں مذکورہ شخص نے جب اپنی دونوں گاڑیاں دو لاکھ میں فروخت کی تھیں تو اسی وقت وہ صاحب نصاب بن گیا تھا البتہ ابھی سال نہیں گزرا تھا اس لئے زکوۃ کی ادائیگی واجب نہ ہوئی تھی سال گزرنے کے بعد چونکہ ۲۷ ہزار خرچ ہو چکے ہیں اور ایک لاکھ نئی گاڑی کی قسط میں دینا ہے۔ اس لئے بقیہ رقم جو تقریباً انیس ہزار بنتی ہے اس پر زکوۃ واجب ہے البتہ جب تک قبضہ نہیں ہو جاتا اس رقم میں سے زکوۃ ادا کرنا واجب نہیں اور اگر اس شخص کی ملکیت میں کچھ اور نقدی ہو تو اس کو اس رقم کے ساتھ ملا کر اس کی بھی زکوۃ نکالنا واجب ہے۔

لمافي الدر المختار (۲/۲۵۹): (وسببه) أي سبب افتراضها (ملک نصاب حولي)

وفي الشامية تحته: (قوله نصاب) هو مانصبه الشارع علامة على وجوب الزكاة من المقادير المبينة (قوله لحو لانه عليه) أي لان حولان الحول على النصاب شرط لكونه سببا وهذاعلة للنسبة.

(۴۳) زکوۃ کی ادائیگی دائن پر واجب ہے

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید کا عمر پر دو لاکھ روپے قرض ہے۔ عمر کے پاس فی الحال رقم موجود نہیں، رقم کی ادائیگی کیلئے جو مدت مقرر ہوئی تھی وہ بھی گزر گئی مگر اس پر رقم ادا نہیں کی گئی جسکی وجہ سے دونوں کے درمیان جھگڑا بھی ہو گیا تھا، بعد میں دونوں اس بات پر تیار ہو گئے کہ زید کو عمر ہر مہینہ چار ہزار روپے ادا کرے گا اس سال تک یہی معاملہ چلتا رہا زید کو جو رقم ملتی وہ گھر یلو ضروریات میں خرچ کرتا رہتا جب سے رقم دی ہے اسوقت سے اب تک تین سال گزر گئے ہیں۔ پوچھنا یہ ہے کہ اس دو لاکھ روپے کی زکوۃ زید پر آئیگی یا عمر پر؟ اگر زید پر آئیگی تو اسکے پاس رقم موجود نہیں جس سے وہ استفادہ کر سکے اور اگر عمر پر آئیگی تو یہ اس کی ملک میں نہیں ہیں۔ یعنی اس نے بطور قرض لی ہے اگرچہ فی الحال بلکہ سال کے اخیر تک عمر کے پاس بھی نہیں ہے، نیز اگر زید پر آئیگی تو کیا پوری دو لاکھ پر آئیگی یا جو رقم اس نے وصول کی ہے جو ختم بھی ہو چکی ہے اس کو دو لاکھ سے منہا کر کے بقیہ رقم پر آئیگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً صورت مسئولہ میں زکوۃ زید پر آئیگی نا کہ عمر پر البتہ زید کے عمر پر جو دو لاکھ روپے قرض ہیں ان پر زکوۃ کا نفس وجوب ثابت ہو جائیگا اور اسکا ادا کرنا اس وقت واجب ہوگا جب یہ رقم مل جائیگی اور اگر تھوڑی تھوڑی کر کے لے جیسا کہ سوال میں مذکور ہے تو حاصل ہونے والی رقم سے گزشتہ سالوں کا ڈھائی فیصد حصہ زکوۃ میں دیتا رہے۔

لمافي فتاوى قاضيخان (۱/۱۲۲): الدين يمنع الزكاة اذا كان له مطالب من جهة العباد كالقرض.

وفي الشامية (۲/۳۰۵): (فكلما قبض اربعين درهما يلزمه درهم) هو معنى قول الفتح والبحر

ویتراخی الاداء الی أن یقبض أربعین درهما ففیها درهم و کذافیما زادفبحسابه. والله اعلم بالصواب

(۴۴) حوائج اصلیہ کیلئے جمع کی ہوئی رقم پر زکوٰۃ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ چند سالوں سے میں گھر خریدنے کیلئے رقم جمع کر رہا ہوں اور اب یہ رقم نصاب کے برابر بلکہ زائد ہے، تو کیا اس پر زکوٰۃ واجب ہے کیونکہ میرے محلے میں ایک قاری صاحب ہیں وہ فرماتے ہیں کہ اس رقم پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اس لئے کہ آپ اس کو گھر خریدنے کیلئے جمع کر رہے ہیں اور گھر ضرورت کی اشیاء میں سے ہے جس پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً جو چیزیں انسان کی حوائج اصلیہ میں داخل ہیں مثلاً سواری، کپڑے، نفقہ، مکان اور ان میں استعمال ہونے والی اشیاء، اگر تجارت کی نیت سے نہ ہوں تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اگرچہ ان کی مالیت نصاب تک پہنچ جائے۔ البتہ اگر حوائج اصلیہ کیلئے اتنے پیسے جمع کئے جو نصاب تک پہنچ جاتے ہوں اور ان پر ایک سال بھی گزر جائے تو ان پر زکوٰۃ واجب ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں گھر خریدنے کیلئے جمع کی ہوئی رقم پر زکوٰۃ واجب ہے۔

وفی التاتارخانیة (۲/۲۳۰): الزکاة واجبة فی الذهب والفضة مضروبة کانت او غیر مضروبة وفی الخانیة مصوغا کان او غیر مصوغ حلیا کان للرجال او النساء عندنا نوی التجارة ام لا.

وفی الطحطاوی علی الدر (۱/۳۹۱): هو صفة لنصاب ای یشترط فی النصاب ذهبا أو فضة لوجوب الزکاة فیه ان لا یحتاج الی انفاقه فی الحاجة الا صلیة وهو یفید انه ان کان معه دراهم امسکها للنفقة لا زکاة فیها ولو حال علیها الحول قال فی البحر ویخالفه مافی معراج الدریة والبدائع ان الزکاة تجب فی النقد کیف امسکه للنماء أو للنفقة.

وفی الدر المختار (۲/۲۶۷): (وشرطه) أی شرط افتراض ادائها (حولان الحول) وهو فی ملکه (وثمنیة المال کالدراهم والدنانیر) لتعینهما للتجارة باصل الخلقة فلتزم الزکاة کیفما امسکهما ولو للنفقة.

(۴۵) پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ میں سرکاری ملازم ہوں اور حکومت ہر ماہ ہماری تنخواہ سے کچھ رقم کاٹ لیتی ہے اور ریٹائرمنٹ کے بعد پنشن کی صورت میں اس کو واپس کرتی ہے تو کیا مجھے اس رقم کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً حکومت سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں سے ہر ماہ جو رقم کاٹ لیتی ہے اس کو پراویڈنٹ فنڈ کہا جاتا ہے اور یہ ملازمین کی تنخواہ کا حصہ ہوتا ہے شرعی اعتبار سے یہ دین ضعیف کے حکم میں ہے کہ اس پر اس وقت زکوٰۃ لازم ہوگی جب بقدر نصاب قبضے

میں آجائے اور اس پر ایک قمری سال گزر جائے لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ پر گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں۔

وفي البدائع الصنائع(۲/ ۳۹۲): وجملة الكلام في الديون انها على ثلاث مراتب في قول ابي حنيفة دين قوي، ودين ضعيف، ودين وسط كذا قال عامة مشايخنا ... واما الدين الضعيف فهو الذى وجب له لابدلا عن شئ سواء وجب له بغير صنعه كالميراث او بصنعه كالوصية أووجب بدلا عما ليس بمال كالمهر وبدل الخلع ولازكاة فيه مالم يقبض كله ويحول عليه الحول بعد القبض.

وفي الدر المختار(۲/۲۶۵): ولا في ثياب البدن المحتاج اليها لدفع الحر والبرد ابن ملك (واثاث المنزل ودور السكنى ونحوها).

وفي الشامية تحته: (قوله واثاث المنزل الخ) محترز قوله نام ولو تقديراً وقوله ونحوها اى كثياب البدن الغير المحتاج اليها وكالحوانيت والعقارات.

وفي الفقه الاسلامي(۳/۱۹۴۸): لاتجب الزكاة في اعيان العمائر الاستغلالية والمصانع والسفن والطائرات وما أشبهها بل تجب في صافي غلتها عند توافر شروط النصاب فحولان الحول.

وفي الشامية (۲/۲۹۵): وأجل سنة قمرية بالأهلية على المذهب وهي ثلثمائة وأربع وخمسون وبعض يوم.

(۴۶) پیداوار کو نرخ بڑھنے تک اسٹور کرنا نیز اس میں زکوٰۃ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقہ میں سیب کی فصل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا، اور عوام کی معاش بھی یہی ہے اور ہر ایک یہی چاہتا ہے کہ فصل اچھے نرخ پر فروخت ہوجائے تو اس کیلئے یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں، اسٹور کرتے ہیں یعنی فصل جب پک جائے اور اس کو منڈی میں بیچ دیتے ہیں تو وہاں پر مال کو جمع کرتے ہیں۔ اس لئے کہ وقتی طور پر مارکیٹ کا نرخ بہت کم ہوتا ہے اور اگر مارکیٹ کا نرخ اچھا ہو تو فوراً فروخت کردیتے ہیں لیکن جب مارکیٹ کا نرخ کم ہو تب یہ لوگ مال واسٹور کرتے ہیں چار، پانچ، چھ مہینے تک جب مارکیٹ کا نرخ اچھا ہوجائے تب اپنا مال نکال کر فروخت کرتے ہیں۔ اب میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں:

(۱) کیا ایسی حالت میں مال کو مارکیٹ میں اسٹور کرنا جائز ہے جبکہ قیمت کم ہو؟

(۲) اگر مارکیٹ کے بجائے گھر میں مال کو جمع کریں تو اس کا کیا حکم ہے؟

(۳) کبھی حالات صحیح نہیں ہوتے تو ایسی صورت میں مال کو اسٹور کرنے کا کیا حکم ہے۔ جبکہ اس صورت میں مجبوری بھی ہے؟

(۴) اگر یہ ساری شقیں ناجائز ہیں تو کیا کسی غریب کیلئے اس میں کچھ صورتیں نکل سکتی ہیں؟

(۵) اوران میں زکوٰۃ کا کیا حکم ہوگا۔ آیا فروخت کرنے کے بعد واجب ہوگی یا کہ مال کو منڈی تک پہنچنے سے واجب ہوگی اور یہ کہ باغات کو چشموں کے ذریعے سے سیراب کیا جاتا ہے۔

آپ حضرات سے گزارش ہے کہ مجھ غریب کی رہنمائی فرما کر ثواب دارین حاصل کریں۔

الجواب حامداً ومصلیاً صورت مسئولہ میں جب فصل پک جائے تو اس کو منڈی میں لاکر ذخیرہ اندوزی کرنا صرف اس نیت سے کہ جب مارکیٹ کی قیمتیں بڑھیں گی تو اچھے نرخ پر فروخت کروں گا اور اس میں لوگوں کو ضرر بھی ہو تو یہ ذخیرہ اندوزی کے حکم میں ہے اور ناجائز ہے۔ اسی طرح اگر ذخیرہ اندوزی کرنے والا چاہے گھر میں یا منڈی میں ذخیرہ اندوزی کرے دونوں کا ایک ہی حکم ہے۔ ہاں البتہ کوئی چالیس (۴۰) دن سے کم عرصے تک ذخیرہ اندوزی کرتا ہے یا اسی طرح اگر حالات خراب ہوں تو حالات صحیح ہونے تک ضرورت کی وجہ سے گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ اور مذکورہ پھلوں کو چونکہ چشموں کے ذریعے سیراب کیا جاتا ہے اس لئے ان میں عشر واجب ہوگا جسے ہر طرح سے خرچ نکالنے سے پہلے ادا کرنا ضروری ہوگا۔

لما في الشامية(۶/۳۹۸): الاحتكار لغة احتباس الشيء انتظاراً لغلائه والاسم الحكرة بالضم والسكون كما في القاموس. وشرعا: إشتراء طعام ونحوه وحبسه إلى الغلاء اربعين يوماً لقوله عليه الصلاة والسلام من احتكر على المسلمين أربعين يوماً ضربه الله بالجذام والإفلاس وفي رواية فقد برئ من الله وبرئ الله منه. قال في الكفاية : أي خذله والخذلان ترك النصرة عند الحاجة وفي أخرى" فعليه لعنة الله والملائكة والناس أجمعين لايقبل الله منه صرفاً ولاعدلاً..........وعن أبي يوسف كل ماأضر بالعامة حبسه فهو إحتكارٌ.

وفي الشامية(۲/۳۲۵): قوله:(يجب العشر) ثبت ذلك بالكتاب والسنة والإجماع والمعقول أي يفترض لقوله تعالى "وآتوا حقه يوم حصاده".فإن عامة المفسرين على أنه العشر أو نصفه وهو مجمل بينه قوله ﷺ ((ماسقت السماء ففيه العشر وما سقي بغرب أودالية ففيه نصف العشر)).

(۴۷) ایڈوانس رقم پر زکوٰۃ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک گھر کرایہ پر لیا ہوا ہے اور مجھے اس میں رہتے ہوئے تقریبا پندرہ سال ہوگئے ہیں۔ میں نے اس کا ایڈوانس اسی ہزار روپے رکھوایا تھا، مجھے اب کچھ دینی معاملات کی سوچ بچار ہوئی ہے تو معلوم کیا کہ کیا اس رقم کی بھی زکوٰۃ نکالی جائے گی بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہوگی اور بعض کہتے ہیں کہ نہیں ہوگی اور کیا پچھلے پندرہ سال کی زکوٰۃ نکالوں گا؟ اس صورت میں تو ایک کافی بڑی رقم نکالنی پڑے گی۔ انتہائی مؤدبانہ طور پر عرض یہ ہے کہ مجھے اس مسئلے کے بارے میں ضرور بتادیجئے۔

الجواب حامداً ومصلیاً کسی بھی معاملہ میں جو رقم بطور ضمانت کے رکھوائی جاتی ہے شرعی اصطلاح میں اس کو رہن کہتے ہیں اور اجرت کے بدلہ میں رہن رکھنا بھی جائز ہے اور رہن جب تک کہ مرتہن (صورت مسئولہ میں مالک مکان) کے قبضہ میں ہو زکاۃ نہیں، نہ راہن (صورت مسئولہ میں کرایہ دار) پر نہ مرتہن پر، لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ پر اس ایڈوانس میں دی ہوئی رقم پر زکاۃ نہیں ہے اور مالک مکان سے واپس لینے کے بعد بھی گزشتہ سالوں کی زکاۃ نہیں ہوگی۔

لمافي الطحطاوي(۱: ۳۹۱): في الدر المختار (فلا زكاة على مكاتب) لعدم الملك التام ولا في كسب مأذون (ولا في مرهون) بعد قبضه ولا فيما اشتراه لتجارة قبل قبضه.

في الطحطاوي: (قوله ولا في مرهون) اى لا على المرتهن لعدم ملك الرقبة ولا على الراهن لعدم اليد، واذا استرده الراهن لايزكي عن السنين الماضية وهو معنى قول الشرح بعد قبضه.

وفي الشامية(۲: ۲۶۳): (قوله ولا في مرهون) اى لا على المرتهن لعدم ملك الرقبة ولا على الراهن لعدم اليد واذا استرده الراهن لا يزكي عن السنين الماضية، وهومعنى قول الشارح بعد قبضه ويدل عليه قول البحر ومن موانع الوجوب الرهن ح وظاهره ولو كان الرهن أزيد من الدين ط.

قلت لكن أرجع شيخ مشائخنا السائحاني الضمير في قول الشارح بعد قبضه الى المرتهن كما رأيته بخطه في هامش نسخته. ويؤيده ان عبارة البحر هكذا: ومن موانع الوجوب الرهن اذا كان في يد المرتهن لعدم ملك اليد اهـ وليس فيها ما يدل على أنه لا يزكيه بعد الاسترداد، لكن قال في الخانية السائمة اذا غصبها ومنعها عن المالك وهو مقر ثم ردها عليه لازكاة على المالك فيما مضى وكذا لو رهنها بألف وله مائة الف فحال الحول على الرهن في يد المرتهن يزكي الراهن ما عنده من المال إلا ألف الدين، ولا زكاة في غنم الرهن لانها كانت مضمونة بالدين فرق بين الدراهم المغصوبة والسائمة فانه يزكي الدراهم اذا قبضها دون السائمة ولو الغاصب مقراً، وظاهره أنه لا فرق في الرهن بين السائمة والدراهم فليتأمل.

(۴۸) زکوٰۃ میں تعجیل اور تاخیر کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ہر سال رمضان کے مہینے میں زکوٰۃ نکالتا ہوں۔ گزشتہ کئی سالوں سے میرا یہی معمول ہے لیکن دو سال ہوئے تھے رمضان میں زکوٰۃ نکالنے میں کچھ دشواری ہوتی ہے دیگر مصروفیات کی وجہ سے زکوٰۃ کا حساب کتاب کرنا مشکل ہوتا ہے تو میں زکوٰۃ کچھ تاخیر سے ایک دو مہینوں کے بعد ادا کردیتا ہوں کیا میرے لئے ایسا کرنا جائز ہے اور اگر کبھی زیادہ تاخیر ہوجائے تو کیا ایسی صورت میں میں گنہگار رہوں گا یا نہیں، نیز زکوٰۃ جلدی ادا کرنا مستحب ہے یا تاخیر سے؟

برائے مہربانی قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداًومصلیاً...... چونکہ زکوٰۃ محتاجوں کی ضروریات پورا کرنے کیلئے فرض کی گئی ہے۔ اسی وجہ سے زکوٰۃ میں تعجیل مستحب ہےاور تاخیر بھی عذر کی بناء پر جائز ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص اتنی تاخیر کردے کہ دوسرے سال کی زکوٰۃ کی ادائیگی بھی فرض ہوجائے تو یہ شخص گناہگار ہوگا۔

لمافی الهندية(۱/۱۷۰): وتجب على الفور عند تمام الحول حتى يأثم بتأخيره من غير عذر وفي رواية الرازي على التراخي حتى ياثم عند الموت والاول اصح.

وفي الدر المختار(۲/۲۷۱،۲۷۲): (وافتراضها عمري) اى على التراخي، وصححه الباقاني وغيره (وقيل فوري) اى واجب على الفور(وعليه الفتوى) كما في شرح الوهبانية(فياثم بتأخيرها) بلا عذر .

وفي رد المحتار: قوله (اى واجب على الفور)...... اى ان اصل الاداء فرض وكونه على الفور واجب وهذا ماحققه في فتح القدير من ان المختار في الاصول ان مطلق الامر لايقتضي الفور ولا التراخي بل مجرد الطلب فيجوز للمكلف كل منهما لكن الامر هنامعه قرينة الفور الخ ما يأتي. (قوله فياثم بتأخيرها الخ) ظاهره الاثم بالتاخير ولوقل...... وقد يقال المراد ان لايؤخر الى العام القابل لما في البدائع عن المنتقى بالنون اذا لم يؤد حتى مضى حولان فقد اساء واثم.

(۴۹) پیشگی زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے والد صاحب کئی سالوں سے اس طرح کررہے ہیں کہ جب سال پورا ہوجاتا ہے تو وہ اس سال کی بھی زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اگلے تین یا چار سالوں کی زکوٰۃ بھی ادا کردیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ زندگی موت کا کچھ پتہ نہیں ہے میں اگلے سالوں کی زکوٰۃ بھی ابھی نکال لوں تاکہ مجھے بہت زیادہ ثواب ملے میں نے ان سے کہا کہ زکوٰۃ کیلئے تو سال گزرنا اور نصاب ہونا شرط ہے آئندہ سالوں میں اس بات کا یقین تو نہیں ہے کہ نصاب پورا ہو یا سال گزر جائے تو وہ نہ مانے اور کہنے لگے کہ میں تو نکالوں گا۔ تو اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا ان کا اس طرح اگلے سالوں کی زکوٰۃ نکالنا درست ہے یا نہیں؟ کیا اگلے سالوں کی زکوٰۃ ہوجائے گی یا نہیں؟ برائے مہربانی جواب سے ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداًومصلیاً...... پیشگی زکوٰۃ کی ادائیگی کیلئے تین شرائط کا ہونا ضروری ہے۔ (۱) زکوٰۃ کی ادائیگی کے وقت مالک نصاب ہونا۔ (۲) نصاب سال کے دوران بالکلیہ ختم نہ ہوجائے۔ (۳) جس نصاب کی زکوٰۃ پیشگی ادا کی ہے وہ نصاب سال کے آخر میں پورا ہو۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں اگرچہ پیشگی کئی سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنا تو جائز ہے لیکن آئندہ سالوں میں سال کے آخر میں مالک نصاب ہونا اور دوران سال نصاب کا بالکلیہ ختم ہونا یا نہ ہونا یقینی امر نہیں ہے اس لئے بہتر یہی ہے کہ فی الحال واجب شدہ سال کی زکوٰۃ ادا کی جائے۔

لما في الهندية (١/١٧٦): ويجوز تعجيل الزكاة بعد ملك النصاب ولا يجوز قبله. وانما يجوز التعجيل بثلاثة شروط احدها ان يكون الحول منعقدا عليه وقت التعجيل والثاني ان يكون النصاب الذي ادى عنه كاملا في آخر الحول والثالث ان لا يفوت اصله فيما بين ذالك.

وفي الشامية (٢/٢٩٣): (ولو عجل ذو نصاب قيد بكونه ذا نصاب) لانه لو ملك اقل منه فعجل خمسة عن مأتين ثم تم الحول على مأتين لا يجوز. وفيه شرطان آخر ان. ان لا ينقطع النصاب في اثناء الحول فلو عجل خمسة من مأتين ثم هلك مافي يده الا درهما ثم استفاد فتم الحول على مأتين جاز ما عجل بخلاف مالو هلك الكل. وان يكون النصاب كاملا في آخر الحول　قوله لسنين بان كان له ثلثمائة درهم دفع منها مائة درهم عن المائتين عشرين سنة. قوله او النصب: صورته ان يدفع المائة المذكورة عن المائتين وعن تسعة عشر نصابا ستحدث فحدثت له في ذالك العام صح وان حدثت في عام آخر فلا بدلها من زكاة على حدة　لكن المائة التي عجلها تقع زكاة عن المائتين عشرين سنة　صح لوجود السبب اى سبب الوجوب وهو ملك النصاب النامي فيجوز التعجيل لسنة واكثر　قال في البحر ولا يخفى ان الافضل عدم التعجيل للاختلاف فيه عند العلماء ولم اره منقولا.

وفي بدائع الصنائع (٢/٩٨): واما شرائط الجواز فثلاثة. احدها كمال النصاب في اول الحول. والثاني: كماله في آخر الحول والثالث: ألا ينقطع النصاب فيما بين ذالك. حتى لو عجل وله في اول الحول اقل من النصاب. ثم كمل في آخره فتم الحول والنصاب كامل لم يكن المعجل زكاة بل كان تطوعا.　وكذا لو عجل والنصاب كامل ثم هلك نصفه مثلا فتم الحول والنصاب غير كامل لم يجز التعجيل وانما كان كذالك. لان المعتبر كمال النصاب في طرفي الحول.

(۵۰) سال کے درمیان میں نصاب کے کچھ حصے کے ہلاک ہونے سے زکوٰۃ ساقط نہیں ہوتی

سوال　کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے پاس گزشتہ سال پندرہ شوال کو اتنی رقم جمع ہوگئی تھی کہ جس سے آدمی صاحب نصاب بن جاتا ہے۔ بچی بیمار تھی علاج معالجے میں کچھ خرچ زیادہ ہوا تو میں صاحب نصاب نہ رہا البتہ تھوڑی سی رقم باقی رہی پھر ابھی اس شوال میں رمضان کی برکت سے کاروبار میں نفع ہوا، اور میرے پاس دوبارہ اتنی رقم ہوگئی جو نصاب تک پہنچ جائے۔ اب بعض لوگ کہہ رہے ہیں کہ میرے اوپر زکوٰۃ فرض ہے۔ اور ایک دوست کی رائے ہے کہ نہیں ہے۔ چونکہ ہمیں دینی مسائل معلوم کرنے کا شوق بھی ہے اس لئے آپ کو زحمت دے رہے ہیں آپ بتائیں اس صورت میں مجھ پر زکوٰۃ واجب ہے؟ اور اگر میرے

بیں پہلے والی رقم بالکل ختم ہو جاتی تو جب بھی یہی حکم ہوتا؟ براہ کرم آسان الفاظ میں جواب تحریر فرمادیں۔

الجواب حامداًومصلیاً زکوٰۃ کا نصاب اگر سال کے شروع میں اور سال کے آخر میں پورا ہو تو اس صورت میں زکوٰۃ واجب ہوگی اگرچہ درمیان میں کچھ مال ہلاک (ختم) ہو جائے لہٰذا آپ کے اوپر زکوٰۃ فرض ہے ہاں اگر درمیان میں سارا مال ہلاک (ختم) ہو جائے تو اس صورت میں زکوٰۃ ساقط ہو جاتی ہے۔

لمافي التاتارخانية(۲/ ۲۵۱،۲۵۲): وفي عروض التجارة والدراهم والدنانير نقصان النصاب في اثناء الحول لايمنع وجوب الزكوة بلا خلاف وفي السراجية وان عاد الى شئ قليل، ولو كان النصاب كاملا في اول الحول وكاملا في آخر الحول وفيما بينهما هلك كله ولم يبق منه شئ لاتجب الزكاة. وفي السغناقي بالاتفاق.

وفي الهندية(۱/ ۱۷۵): واذا كان النصاب كاملاً في طرفي الحول فنقصانه فيما بين ذلك لا يسقط الزكاة.

(۵۱) زکوٰۃ میں سال کے آخر کی رقم کا اعتبار ہوگا

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر سال کے شروع میں کسی کے پاس تیس ہزار روپے ہوں اور اس پر کوئی قرض بھی نہ ہو البتہ آخری مہینے یعنی سال کے اختتام پر اس کے پاس مزید کچھ رقم آ گئی تو کونسی رقم پر زکوٰۃ آئیگی؟

الجواب حامداًومصلیاً صورت مسئولہ میں تیس ہزار اور جتنی رقم سال کے آخر میں زائد ہوئی ہے سب کو ملا کر زکوٰۃ ادا کی جائیگی۔

لمافي الشامية(۲/ ۲۸۸): (قوله من جنسه) سيأتي أن احدالنقدين يضم الى الآخر وأن عروض التجارة تضم الى النقدين للجنسية باعتبار قيمتها.

﴿جن چیزوں اور لوگوں پر زکوٰۃ واجب نہیں﴾

(۵۲) نابالغ پر زکوٰۃ نہیں

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ ایک شخص نے اپنے نابالغ بیٹے کے نام کچھ نقدی اور سونا کر دیا ہے لیکن قبضہ میں نہیں دیا ہے، زکوٰۃ کس پر آئیگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورت مسئولہ میں نابالغ بیٹا اس نقدی اور سونے کا مالک بن گیا ہے اگرچہ اسکے قبضہ میں نہ ہو، اسلئے کہ باپ اگر اپنی نابالغ اولاد کو کچھ دے تو بغیر قبضہ کے بھی وہ اس کی مالک بن جاتی ہے اور بہتر ہے کہ اس پر گواہ بھی بنا دیئے جائیں تاکہ بعد میں انکار کا احتمال نہ رہے، پس سوال میں ذکر کردہ صورت میں نقدی اور سونے کی زکوٰۃ کسی کے ذمہ نہیں، کیونکہ نابالغ پر زکوٰۃ نہیں ہوتی۔

لمافی خلاصة الفتاویٰ (۳۹۸/۴): وفی نسخة الامام السرخسی: هبة الرجل من ابنه الصغير يصح ويتم بلفظ واحد ويكون الاب قابضاله لكونه في يده..... بخلاف ما اذا كان الابن بالغا حيث يشترط قبضه وان كان في عياله. والله اعلم بالصواب

(۵۳) یتیم بچہ پر صدقۃ الفطر، قربانی اور زکوٰۃ کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ۱۸ ماہ کا یتیم بچہ جو مالدار ہو، اس پر صدقۃ الفطر، قربانی، زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟ ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کس کے مال سے پھر قربانی کے گوشت اور کھال کا کیا حکم ہے؟ آیا اس کو بیچ دیا جائے یا صدقہ کیا جائے یا اس کے اقرباء میں تقسیم کیا جائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... قربانی اور زکوٰۃ کے وجوب کیلئے بلوغ شرط ہے اور صدقۃ الفطر کیلئے بلوغ شرط نہیں۔ پس صورت مسئولہ میں اس بچہ پر قربانی وزکوٰۃ واجب نہیں البتہ صدقۃ الفطر واجب ہوگا اور اس بچہ کے مال ہی سے ادا کیا جائے گا۔

لمافی الدر المختار (۲۵۸/۲): وشرط افتراضها عقل وبلوغ واسلام وحرّية ... (۳۵۹/۲) تجب على كل حرّ مسلم ولو صغيرا مجنونا وقال في الشامية قال في البدائع وامّا العقل والبلوغ فليسا من شرائط الوجوب في قول ابي حنيفه وابي يوسف، حتى تجب على الصبي والمجنون اذا كان لهما مال ويخرجها الولي من مالهما.

وفي (۳۱۶/۶): (ويضحّي عن ولده الصغير من ماله) صححه في الهداية (وقيل لا) صححه في الكافي

قال ولیس للاب ان یفعله من مال طفله ورجحه ابن شحنة قلت وهو المعتمد لما فی متن مواهب الرحمن من انه اصح ما یفتی به وعلله فی البرهان بانه ان کان المقصود الا تلاف فالاب لایملکه فی مال ولده کالعتق او التصدق باللحم فمال الصبی لا یحتمل صدقة التطوع وعزاه للمبسوط فیحفظ

وفی (صـ۳۱۷): وکذا الجد والوصی وقال فی الشامیة واختاره فی الملتقی حیث قدمه وعبر عن الاول بقیل ورجحه الطرسوسی بان القواعد تشهد له ولانها عبادة ولیس القول بوجوبها اولی من القول بوجوب الزکاة فی ماله(۶/۳۱۶).

(۵۴) غیر مملوکہ رقم پر زکوٰۃ واجب نہیں

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ میرے پاس لقطہ کی رقم پڑی ہوئی ہے جو تقریباً ایک سال سے میرے پاس ہے تو کیا مجھے اس رقم کی زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی؟

الجواب حامداًومصلیاً واضح رہے کہ زکوٰۃ اس مالیت پر واجب ہے جس کا انسان خود مالک ہو۔ غیر مملوکہ مال پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔ لقطہ (گری پڑی چیز) کی رقم ملتقط (اٹھانے والا) کے قبضہ میں بطور امانت کے ہوتی ہے اس میں ملکیت اصل مالک کی ہی ہوتی ہے۔ لہٰذا لقطہ کی رقم میں اٹھانے والے پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ اگرچہ سال بھی گزر جائے۔ تاہم اسے چاہئے کہ اس کی خوب تشہیر کرے اور اگر پھر بھی مالک کا پتہ نہ چلے تو بنیت صدقہ کسی مستحق کو دیدے۔

لما فی الهندیة(۲/۲۸۹): هی مال یوجد فی الطریق ولا یعرف له مالک بعینه کذا فی الکافی .... واذا رفع اللقطة یعرفها ثم بعد تعریف المدة المذکورة الملتقط مخیربین ان یحفظها حسبة وبین ان یتصدق بها، فان جاء صاحبها فامضی الصدقة یکون له ثوابها وان لم یمضها ضمن الملتقط.

وفی الشامیة(۴/۲۷۹): وفی النهر: معنی الانتفاع بها صرفها الی نفسه کما فی الفتح، وهذا لایتحقق مابقیت فی یده لا تملکها کما توهمه فی البحر لانها باقیة علی ملک صاحبها مالم یتصرف بها، حتی لو کانت اقل من نصاب وعنده ماتصیر به نصاباً حال علیه الحول تحت یده لا یجب علیه زکاة.

قلت: مقتضاه انها لو کانت ثوبا فلبسه لا یملکها مع انه یصدق علیه انه صرفها الی نفسه.....

(قوله لوفقیرا) قید به لان الغنی لایحل له الانتفاع بها الابطریق القرض، لکن باذن الامام نهر.

(۵۵) کریڈٹ کارڈ پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل کریڈٹ کارڈ کا رواج عام ہے جو شخص کریڈٹ

کارڈ استعمال کرتا ہے میرے ایک ماموں زاد بھائی ہیں وہ بھی کریڈٹ کارڈ استعمال کرتے ہیں میں نے ان سے کہا کہ آپ اس کریڈٹ کارڈ کی زکوۃ ادا کرتے ہیں کہ نہیں تو انہوں نے کہا کہ یہ تو کریڈٹ کارڈ استعمال کی چیز ہے ضرورت پڑنے پر ہم اس کو استعمال کرتے ہیں لہٰذا اس میں زکوۃ نہیں ہے حالانکہ بعض اوقات ان کے پاس کریڈٹ کارڈ میں لاکھوں روپے ہوتے ہیں آیا ان کی یہ بات درست ہے کہ کریڈٹ کارڈ پر زکوۃ نہیں ہوتی۔ آپ حضرات اس کا تسلی بخش جواب عنایت فرمائیں۔ شکریہ

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر کوئی آدمی قرضدار ہے تو اس پر زکوۃ نہیں لہٰذا صورت مسئولہ میں چونکہ کریڈٹ کارڈ ایک قرضہ ہے جو بینک جاری کرتا ہے اور قرضہ پر زکوۃ نہیں، لہٰذا یہ کارڈ وصول کرنے والا جتنی خریداری کرتا ہے اس کی ادائیگی بینک کرتا ہے اور یہ خریدار بینک کا مدیون بنتا ہے۔ لہٰذا جب تک اس کے پاس یہ کارڈ موجود ہے اس وقت تک اس پر زکوۃ نہیں البتہ یہ کارڈ لینا درست نہیں اس لئے کہ اس کی بنیاد سود پر ہے۔

لمافی سراجیة (صـ۲۵): الدین المطالب له من جهة العباد یمنع وجوب الزکوة بقدره.

وفی الهندية (۱/۱۷۱): واما شروط وجوبها فمنها الحرية...... ومنها کون المال نصابا فلا تجب فی اقل منه هکذا فی العینی شرح الکنز　ومنها الفراغ عن الدین قالا اصحابنا رحمهم الله تعالیٰ کل دین له مطالب من جهة العباد یمنع وجوب الزکوة سواء کان الدین للعباد کالقرض وثمن البیع او لله تعالیٰ کدین الزکوة.

وفی الدرالمختار (۲/۲۵۹): وسببه ای سبب افتراضها (ملک نصاب حولی) نسبة للحول لحولانه علیه تام　فارغ عن دین مطالب من جهة العباد سواء کان لله کزکاة وخراج او للعبد ولو کفالة او مؤجلاً ولو صداق زوجته المؤجل للفراق.

(۵۶) مال ضمار کی اقسام اور ان میں زکوۃ کے وجوب کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک یونیورسٹی کا طالب علم ہوں، میں زکوۃ کے مسائل اور عنوان پر ایک مقالہ لکھ رہا ہوں، کافی حد تک مواد تیار ہو گیا ہے لیکن مال ضمار کے بارے میں کچھ تحقیق رہ گئی ہے۔ کسی نے مشورہ دیا کہ مفتی صاحب سے اس کی مکمل تحقیق معلوم کریں۔ لہٰذا آنجناب مہربانی فرما کر مجھے یہ بتا دیں کہ مال ضمار کیا ہوتا ہے اور کس صورت میں اس پر زکوۃ واجب ہوتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ضمار لغت میں چھپانے اور پوشیدہ رکھنے کو کہتے ہیں شریعت میں اس مال کو کہتے ہیں جس پر مالک کو قبضہ حاصل نہ ہو، اور ملک زائل نہ ہو، اور وصول کرنے کی غالب امید نہ ہو، اس کی چند قسمیں ہیں:

(۱)۔ مال مفقود جو کئی سال گم ہو جانے کے بعد مل جائے۔

(۲)۔ساقط فی البحر جو سمندر میں گر چکا ہو کئی سال بعد حاصل ہو جائے۔

(۳)۔وہ مال جو بادشاہ نے ظلماً قبضہ کیا ہو اور اس پر گواہ موجود نہ ہو۔

(۴)۔وہ قرضہ جس کا مدیون نے کئی سال تک انکار کیا ہو پھر بعد میں اس کا اقرار کرے بشرطیکہ جب انکار کیا تھا تو اس کے پاس گواہ موجود نہ تھے۔

(۵)۔اور وہ مال جو کہ صحراء میں دفن کیا گیا ہو، دفن کرنے والا جگہ بھول گیا ہو، تو ان تمام صورتوں میں اس کے مالک پر گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

لما في الفتاویٰ الهندية(۱/۱۷۴): ويشترط ان يتمكن من الاستنماء بكون المال في يده أو يدنائبه فان لم يتمكن من الاستنماء فلا زكاة عليه وذلک مثل مال الضمار كذا في التبيين وهو كل ما بقي اصله في ملكه ولكن زال عن يده زوالا لا يرجى عوده في الغالب كذا في المحيط ومن مال الضمار الدين المجحود والمغصوب اذا لم يكن عليهما بينة فان كانت عليهما بينة وجبت الزكاة الا في غصب السائمة فانه ليس على صاحبها الزكاة وان كان الغاصب مقرا ومنه المفقود والآبق والماخوذ مصادرة وساقط في البحر والمدفون في الصحراء المنسي مكانه.

وفي رد المحتار مع الدر المختار(۲/۲۶۶): (ولا في مال مفقود) وجده بعد سنين) وفي الشامية تحته شروع في مسألة في مال الضمار كمايأتي. (وساقط في بحر) استخرجه بعدها (ومغصوب لا بينة عليه) فلوله بينة تجب لما مضى الافي غصب السائمة فلا تجب وإن كان الغاصب مقرًا كمافي الخانية (ومدفون ببرية نسي مكانه) ثم تذكره وكذا الوديعة عند غير معارفه بخلاف المدفون في حرز. (ودين) كان (جحده المديون سنين)و لابينة له عليه (ثم) صارت له بأن (اقر بعدها عند قوم) وقيده في مصرف الخانية بما اذا حلف عليه عند القاضي أما قبله فتجب لما مضى (وما أخذ مصادرة) اى ظلما (ثم وصل اليه بعد سنين) لعدم النمو.

(۵۷) گروی رکھی ہوئی اشیاء پر زکوٰۃ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کچھ عرصہ پہلے میں نے ایک شخص سے ایک لاکھ روپیہ قرضہ لیا تھا اور اس نے زیورات گروی کے طور پر لئے تھے اور ابھی تک میں نے قرضہ واپس نہیں کیا اور زیورات اسی کے پاس ہیں تو ان کی زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اگر ہے تو کس کے ذمہ واجب ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً گروی رکھے ہوئے زیورات پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، کیونکہ زکوٰۃ ملکیت تامہ پر واجب ہوتی ہے اور گروی رکھے ہوئے زیورات پر ملکیت تامہ حاصل نہیں ہے۔

لما في الهندية(۱/۱۷۲): (ومنها الملک التام) وهو ما اجتمع فيه الملک واليد واما اذا وجد الملک دون اليد کالصداق قبل القبض او وجد اليد دون الملک کملک المکاتب والمديون لاتجب فيه الزکوة کذا في السراج الوهاج ولا علی الراهن اذا کان الرهن في يد المرتهن هکذا في البحر الرائق.

وفي الدر المختار(۲/۲۶۳): (ولا زکوة علی مکاتب) لعدم الملک التام ..... ولا في مرهون بعد قبضه. وفي ردالمحتار قوله(ولا في مرهون) ای لا علی المرتهن لعدم ملک الرقبة ولا علی الراهن لعدم اليد. الخ

(۵۸) مرہونہ اشیاء میں راہن اور مرتہن پر زکوٰۃ کا حکم

سوال　کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک مدرسہ میں تدریس کے فرائض سرانجام دیتا ہوں، کبھی کسی مسئلہ میں الجھن ہوتی ہے تو جب تک میں اسے حل نہ کرلوں تو پریشان رہتا ہوں، اسی طرح کا ایک مسئلہ میں نے ابھی چند دن پہلے ایک کتاب میں پڑھا ہے کہ ''شئ مرہونہ پر زکوٰۃ نہ راہن کے ذمہ ہے اور نہ مرتہن کے ذمہ ہے''۔ لیکن اس کی وجہ مجھے معلوم نہ ہوسکی۔ براہ کرم آپ اس میں میری کچھ مدد فرمائیں۔

الجواب حامداًومصلياً　زکوٰۃ کے وجوب کیلئے شرط یہ ہے کہ مالک کونصاب معینہ پر ملک تام حاصل ہو، اور رہن میں چونکہ راہن اور مرتہن کی ملک تام نہیں ہوتی۔ راہن کا قبضہ نہیں ہوتا، اور مرتہن کی ملکیت نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے شئ مرہونہ میں راہن اور مرتہن دونوں پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔

لمافي الفتاوی الهندية(۱/۱۷۲): ولا علی الراهن اذاکان الرهن في يد المرتهن هکذا في البحر الرائق.

وفي حاشية الطحطاوی علی الدر(۱/۳۹۱): (قوله ولافي مرهون) ای لا علی المرتهن لعدم ملک الرقبة ولا علی الراهن لعدم اليد واذا استرده الراهن لا يزکی عن السنين الماضية وهو معنی قول الشرح بعد قبضه ويدل عليه قول البحر ومن موانع الوجوب الرهن اه حلبي وظاهره ولو کان الرهن ازيد من الدين.

وفي الدر المختار مع الشامية(۲/۲۶۳):(ولا في مرهون بعد قبضه) ای لا علی المرتهن لعدم ملک الرقبة ولا علی الراهن لعدم اليد واذا استرده الراهن لايزکی عن السنين الماضيه وهو معنی قول الشارح. بعد قبضه ويدل عليه قول البحر ومن موانع الوجوب الرهن ح ولو کان الرهن ازيد من الدين ط.

(۵۹) مالِ حرام پر زکوٰۃ فرض نہیں

سوال　کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ میں کہ زید نے تعلیم حاصل کرنے کے بعد بینک میں ملازمت اختیار کی، شروع میں

دورانِ تعلیم اسکے پاس کچھ بھی نہ تھا مزدوری کر کے وقت گزارتا تھا ملازمت کے بعد چونکہ بینک کی تنخواہ ایک بڑی مقدار میں ہوتی تھی اس لئے وہ جلد ہی ایک بڑا مالدار بن گیا۔اب وہ حج کرنا چاہتا ہے تو ایک آدمی نے اسے یہ کہا کہ آپ پر حج فرض نہیں ہے اسلئے کہ آپ کا پیسہ حرام کا ہے اور مال حرام پر نہ زکوٰۃ ہے اور نہ حج۔تو کیا واقعی زید پر باوجود مالدار ہونے کے حج وغیرہ فرض نہیں ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً بینک سے حاصل ہونیوالی آمدنی سودی معاملات کی وجہ سے حرام اور ناجائز ہے اسلئے صورت مسئولہ میں زید کے پاس اگر خالص بینک کی کمائی ہے اسکے علاوہ حلال رقم کچھ نہیں تو اسپر حج فرض نہیں کیونکہ مال حرام جبکہ وہ حلال مال سے مخلوط نہ ہو سارے کا سارا بلانیت ثواب واجب التصدق ہوتا ہے اس پر حج اور زکوٰۃ فرض نہیں ہوتی۔البتہ اگر اسکے ساتھ حلال مال بھی ملا ہوا ہے تو حج اور زکوٰۃ فرض ہو جائیگی مگر اسے چاہئے کہ اس رقم سے حج نہ کرے بلکہ کسی سے قرض لیکر حج کرے اور پھر اپنے مال سے قرض ادا کردے اور اگر کوئی حرام اور مشتبہ مال سے ہی حج ادا کرے تو اسکا فرض تو ساقط ہو جائیگا لیکن اس پر ثواب نہ ملے گا۔

وفی الشامیة(۲/۲۹۱): فی القنیة: لو کان الخبیث نصابالایلزمه الزکاةلان الکل واجب التصدق علیه فلایفیدایجاب التصدق ببعضه ثم قال بعد اسطر: فأفادبقوله،وان یکن له سواهانصاب الخ؛أن وجوب الزکاة مقیدبمااذاکان له نصاب سواها.

وفیه ایضاً(۲/۴۵٦):قال:فقدیقال ان الحج نفسه الذی هو زیارة مکان مخصوص ألخ لیس حرامابل الحرام هو انفاق المال الحرام ولاتلازم بینهماکماان الصلاة فی الأرض المغصوبة تقع فرضاوانما الحرام شغل المکان المغصوب لامن حیث کون الفعل صلاة لأن الفرض لایمکن اتصافه بالحرمة.

(٦٠) چھوٹے بھائی کے مال میں جو کہ بطور امانت ہو زکوٰۃ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک چھوٹا بھائی ہے جس کی ملکیت میں ۹ لاکھ روپے ہیں اور وہ میرے قبضہ میں بطور امانت ہیں تو کیا مجھے چھوٹے بھائی کی طرف سے زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....صورت مسئولہ میں اگر آپ کا بھائی نابالغ ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں۔اس لئے کہ وہ مکلف نہیں۔اور اگر بالغ ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے لیکن آپ اس کی اجازت کے بغیر زکوٰۃ ادا نہیں کر سکتے۔اس لئے کہ یہ آپ کی ملکیت نہیں۔

لمافی الهندیة(۱/۱۷۲): ومنها العقل والبلوغ: فلیس الزکاة علی الصبی ومجنون اذا وجد منه الجنون فی السنة کلها.

وفیه ایضاً(۱/۱۷۱): رجل ادی زکاة غیره عن مال ذلک الغیر فاجازه المالک فان کان المال قائما فی یدالفقیر جاز والا فلا.

وفی الشامیة(۲/۲۵۸): (قوله عقل و بلوغ) فلا تجب علی مجنون وصبی لانها عبادة محضة.

(٦١) حرام مال میں زکوٰۃ کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ میں نے ایک سال پہلے 90 ہزار روپے بینک میں رکھوائے تھے اور اب مجھے ایک لاکھ ملے گا تو کیا زکوٰۃ صرف 90 ہزار روپے کی ادا کرنی ہوگی یا لاکھ کی جبکہ دس ہزار سود کے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: قرآن پاک اور احادیث مبارکہ میں سود کو حرام قرار دیا گیا ہے یہاں تک کہ اگر کوئی سود سے باز نہیں آتا تو اس کیلئے قرآن مجید میں اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کا اعلان فرمایا لیکن اگر کسی نے نادانستہ طور پر سود کے پیسے لے لئے تو اس کو بغیر نیت ثواب کے پورا کا پورا صدقہ کرنا واجب ہے۔ البتہ اگر سود کے پیسوں کو اپنے حلال مال کے ساتھ ملایا تو اس کے مجموعے پر زکوٰۃ آئے گی صرف فرق اتنا ہوگا کہ حلال مال سے شرعاً زکوٰۃ ہوگی اور حرام مال سے صدقہ شمار ہوگا۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں ایک لاکھ کے مجموعے پر زکوٰۃ آئے گی البتہ زکوٰۃ میں ادا کی گئی رقم کا ڈھائی فیصد حلال مال کی طرف سے زکوٰۃ اور مال حرام کی طرف سے صدقہ شمار ہوگا۔ یاد رہے کہ بقیہ حرام مال کو بھی بغیر نیت ثواب کے فقیر پر صدقہ کرنا واجب اور ضروری ہے۔

لمافي الشامية(٢/ ٢٩١): لو كان الخبيث نصابا لايلزمه الزكاة لان الكل واجب التصدق عليه فلا يفيد ايجاب التصدق ببعضه. قلت: لكن قدمنا عن القنية والبزازية. ان ما وجب التصدق بكله لايفيد التصدق ببعضه لان المغصوب ان علمت اصحابه او ورثتهم وجب رده عليهم والا وجب التصدق به.

وفي الدر المختار(٢/ ٢٩٠):(ولو خلط السلطان المال المغصوب بماله ملكه فتجب الزكاة فيه ويورث عنه) لان الخلط استهلاك اذا لم يمكن تميزه عند ابى حنيفة وقوله أرفق اذ قلما يخلو مال عن غصب وهذا اذا كان له مال غير ما استهلكه بالخلط منفصل عنه يوفي دينه والا فلا زكاة كما لو كان الكل خبيثا.

وفي النتف (صـ٢١١): والرابع من أسباب وجوب الزكاة هو ان يكون المال حلالا لان المال اذا كان حراما لايخلو من وجهين اما ان يكون له خصم حاضر فيرده عليه واما ان لايكون له خصم حاضر فيعطيه للفقراء كله ولا يحل له منه قليل ولا كثير والزكاة انما تكون في المال الحلال.

(٦٢) اولاد کو دینے کیلئے لئے گئے مکانوں پر زکوٰۃ کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ میں کہ میں نے اپنے چند ذاتی مکان اس لئے خریدے ہیں کہ بیٹوں اور بیٹیوں کی شادی کے وقت ان کو دیدوں گا اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا ان مکانوں پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً......صورت مسئولہ میں ان مکانوں پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔البتہ اگر یہ مکان کرائے پر دیئے ہوئے ہیں اوران کی آمدنی نصاب تک پہنچتی ہے تو سال گزرنے پر اس آمدنی میں زکوٰۃ واجب ہے۔

لمافی الخانیة علی هامش الهندیة(۱/۲۵۱): ولو اشتری الرجل دارا أو عبداللتجارة ثم اجره یخرج من أن یکون للتجارة لانه لما آجره فقد قصد المنفعة.

وفیه ایضاً (۱/۲۵۳):اذا آجر داره أو عبده بمائتی درهم لاتجب الزکاة مالم یحل الحول بعد القبض فی قول أبی حنیفة رحمه الله تعالیٰ.

وفی الدرالمختار(۲/۲۶۲): (و)فارغ (عن حاجته الأصلیة) لأن المشغول بها کالمعدوم

وفی الشامیة تحته: (قوله وفارغ عن حاجته الاصلیة) ...... فسر المشغول بالحاجة الأصلیة و الاولیٰ فسرهاوذلک حیث قال وهی مایدفع الهلاک عن الانسان تحقیقا کالنفقة ودور السکنی .... فانه قال: ولیس فی دور السکنی .... لأنها مشغولة بحاجته الاصلیة ولیست بنامیة ایضاً.

(۶۳) دودھ کی غرض سے خریدے گئے جانور پر زکوٰۃ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے دودھ کے مقصد سے جانور رکھے ہیں وہ جنگل میں نہیں چرتے بلکہ میں خود ان کو گھر میں یا فارم میں کھلاتا ہوں تو کیا ان جانوروں پر زکوٰۃ فرض ہے یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً......ذکر کردہ مسئلے میں ان جانوروں پر زکوٰۃ واجب نہیں البتہ ان جانوروں سے حاصل شدہ دودھ کی قیمت پر زکوٰۃ واجب ہوگی بشرطیکہ وہ زکوٰۃ کے نصاب کو پہنچتی ہو،اور اس پر سال بھی گزر رہا ہو۔

لمافی الهندیة(۱/۱۷۸): (الفصل الخامس فیما لاتجب فیه الزکاة)...... ولیس فی العوامل والحوامل والعلوفة صدقة کذا فی الهدایة.

وفی الدر المختار(۲/۲۸۲): (و) لا فی(عوامل وعلوفة) مالم تکن العلوفة للتجارة.

وفیه ایضاً(۲/۲۷۳،۲۷۴): والاصل أن ماعدا الحجرین والسوائم انما یزکی بنیة التجارة بشرط عدم المانع المؤدی إلی الثنی وشرط مقارنتها لعقد التجارة وهو کسب المال بالمال بعقد شراء.

(۶۴) دیسی اور جنگلی جانوروں کے ملاپ سے پیدا ہونے والے جانور پر زکوٰۃ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے بہت سارے جانور ہیں میں انہیں کبھی کبھی چرانے کیلئے جنگل لے جاتا ہوں وہاں میرے کچھ جانوروں کا جنگلی جانوروں سے ملاپ ہوجاتا ہے اب پوچھنا یہ ہے کہ وہ جانور جو جنگلی

جانوروں کے ملاپ سے پیدا ہوئے ہوں کیا ان پر بھی زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً جو جانور کسی جنگلی اور دیسی جانور سے مل کر پیدا ہوں تو اگر مادہ دیسی ہو تو اس پر زکوٰۃ آئے گی بشرطیکہ جانور سوائم ہوں یعنی دودھ یا نسل کیلئے ہو، اور پورا سال یا سال کا بیشتر حصہ چراگاہ میں چرتے ہوں اور نصاب بھی مکمل ہو، یا تجارت کیلئے ہوں تو مال تجارت ہونے کی وجہ سے جبکہ نصاب پورا ہو، زکوٰۃ آئے گی۔

لمافي التاتارخانية (۲/۲۱۸): وذكر القدوري في كتابه أن السائمة هي الراعية التي تكتفي بالرعي ويمونها ذلك (صـ۲۱۹) ولو اشترى سائمة للتجارة كان فيها زكوة التجارة...... (صـ۲۲۳) وقال أصحابنا المتولدبين الغنم والظباء تعتبر فيه الام وإن كانت الام غنما تجب الزكاة ويكمل به النصاب وكذلك المتولدبين المتولد الأهلي والوحشي.

(۶۵) انڈوں کیلئے پالی گئی مرغیوں پر زکوٰۃ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک مرغی فارم بنایا ہے جس میں ہم لوگ مرغیاں پالتے ہیں اور ان کے انڈے فروخت کرتے ہیں تو کیا ان مرغیوں پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً چونکہ صورت مسئولہ میں مرغیاں تجارت کیلئے نہیں ہیں لہٰذا ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، البتہ انڈوں کی قیمت پر زکوٰۃ واجب ہوگی بشرطیکہ بقدر نصاب ہو، اور اس پر سال گزر جائے۔

لمافي الهندية(۱/۱۷۹): الزكاة واجبة في عروض التجارة كائنة ماكانت اذا بلغت قيمتها نصابا من الورق والذهب كذا في الهداية ويقوم بالمضروبة كذافي التبيين وتعتبر القيمة عند حولان الحول بعد أن تكون قيمتها في ابتداء الحول مأتي درهم من الدراهم الغالب عليها الفضة كذا في المضمرات.

وفي الدرالمختار(۲/۲۷۳): والأصل أن ماعدا الحجرين والسوائم انما يزكى بنية التجارة وشرط مقارنتها لعقد التجارة وهو كسب المال بالمال بعقد شراء أو اجارة أو استقراض ولو نوى التجارة بعد العقد أو اشترى شيئا للقنية ناوياً أنه إن وجد ربحاً باعه لازكوة عليه.

(۶۶) کان سے نکلنے والے کوئلے، تیل اور گیس میں زکوٰۃ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زمین سے نکلنے والی چیزوں کوئلہ، تیل، گیس وغیرہ میں شریعت کی طرف سے کچھ حصہ غریبوں کیلئے مقرر ہے یا نہیں اور اس کی آمدنی پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟ ہمارے محلے میں ایک کان سے

کوئلہ نکلتا ہے۔ کیا اس پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟ یا اس کا خمس نکالا جائے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً معدنیات کی تین قسمیں ہیں:

(۱)۔ پہلی قسم وہ ہے جو جامد ہو، اور آگ پر رکھنے سے پگھلتی ہو، مثلاً سونا، چاندی اور لوہا وغیرہ۔

(۲)۔ دوسری قسم وہ ہے جو جامد ہو، لیکن آگ پر رکھنے سے نہیں پگھلتی ہو، مثلاً چونا، گچ، یاقوت، زمرد، فیروزہ، سرمہ وغیرہ۔

(۳)۔ تیسری قسم وہ ہے جو مائع ہو جامد نہ ہو، مثلاً پیٹرول وغیرہ۔ مذکورہ تینوں قسموں میں سے صرف پہلی قسم میں خمس ہے باقی دو قسموں میں خمس نہیں۔

کوئلہ چونکہ دوسری قسم میں ہے اور تیل و گیس تیسری قسم میں شامل ہیں اس لئے ان میں خمس نہیں ہے۔ البتہ انہیں فروخت کرنے کے بعد جو آمدنی ہوگی اگر وہ بقدر نصاب ہو، اور اس پر سال گزر جائے تو اس میں زکوٰۃ دینا لازم ہوگی۔

لمافی الهندية(۱/۱۸۵): واما المانع كالقير والنفط والملح وما ليس بمنطبع ولا مانع كالنورة والجص والجواهر واليواقيت فلا شئ فيها.

وفي الدر المختار(۲/۳۱۸): (و) من (كنز) اى مال (مدفون) دفنه الكفار لأنه الذى(وجد مسلم او ذمى) ولوقناصغيرا انثى (معدن نقد و)نحو (حديدوهو كل جامدينطبع بالنارمنه الزيبق فخرج المانع كنفط وقاروغير المنطبع كمعادن الاحجار.

وفي الشامية (۲/۳۱۹): ومانع كالماء والملح والقير والنفط وما ليس شيئا منهما .... (قوله كنفط) .. وهو دهن يعلو الماء (قوله قار) والقار والقير والزفت شئ يطلى بها السفن.

وفي الفقه الاسلامي (۳/۱۸۵۵): والمعادن ثلاثة أنواع :أ- جامد يذوب وينطبع بالنار كالنقدين (الذهب والفضة) والحديد والنحاس والرصاص ويلحق به الزئبق، وهذا هو الذى يجب فيه الزكوة وهى الخمس وإن لم يبلغ نصابا-ب- جامد لا يذوب ولا ينطبع بالنار كالجص والنورة..... والكحل والزرنيخ وسائر الاحجار كالياقوت والملح-ج- مانع ليس بجامد كالقار (الزفت) والنفط (البترول) ولا يجب الخمس الا فى النوع الأول.

(۶۷) فلیٹ کا صرف نقشہ تیار کرنے کے بعد فروخت کرنا، نیز اس رقم پر زکوٰۃ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل یہ رواج ہے اور عام ہے کہ ایک شخص کی زمین ہے اور اس زمین پر فلیٹ بنانے کا ارادہ ہے نقشہ وغیرہ بنوالیا ہے اب بننے سے پہلے ہی لوگ اس سے فلیٹ خرید رہے ہیں اور اس کے پاس رقم قسط وار آرہی ہے۔ اب عرض یہ ہے کہ اس طرح کی خرید وفروخت درست ہے یا نہیں؟ اور اگر درست ہو تو کیا ایسے شخص پر زکوٰۃ واجب

ہوں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ....اگر فلیٹ کے حدود اربعہ متعین اور واضح ہوں یعنی کس فلور میں ہے کتنے گز کا ہے وغیرہ اور نقشہ میں موجود صفات پر دونوں راضی ہوں کہ بعد میں جھگڑا پیدا نہ ہو، اور وہ صفات فلیٹ بننے کے بعد فلیٹ میں موجود بھی ہوں تو یہ بیع درست ہے۔ اور یہ صورت استصناع میں داخل ہے۔

(۲)۔ بیچنے والا اگر عاقل بالغ اور صاحب نصاب ہے تو اس رقم پر زکوٰۃ آئے گی اور اگر پہلے سے صاحب نصاب نہیں اور رقم آنے کے بعد صاحب نصاب بنا تو سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی۔

لما في تاتارخانية(۲/۲۱۷): الزكاة واجبة على الحر العاقل البالغ المسلم اذا بلغ نصابا ملكاً تاما وحال عليه الحول.

وفي الهندية(۳/۲۰۷): الاستصناع جائز في كل ماجرى التعامل فيه كالقلنسوة والخف والاواني المتخذة من الصفر و النحاس وما أشبه ذلك استحسانا كذا في المحيط، ثم إنما جاز الاستصناع فيما للناس فيه تعامل اذا بين وصفا على وجه يحصل التعريف أما فيما لاتعامل فيه كالاستصناع في الثياب بأن يأمر حائكا ليحيك له ثوبا بغزل من عند نفسه لم يجز كذا في الجامع الصغير.

وفي الفقه الاسلامي وادلته(۵/۳۶۵۷): ثم انتشر الاستصناع انتشاراً واسعا في العصر الحديث فلم يعد مقصورا على صناعة الاحذية والجلود و النجارة والمعادن..... وانما شمل صناعات متطورة ومهمة جدا في الحياة المعاصرة كالطائرات والسفن والسيارات..... ولم يقتصر الأمر على الصناعات المختلفة مادام يمكن ضبطها باالمقاييس والمواصفات المتنوعة وإنما يشمل أيضا إقامة المباني وتوفير المساكن المرغوبة وقد ساعد كل ذلك في التغلب على ازمة المساكن، ومن أبرز الأمثلة والتطبيقات لعقد الاستصناع بيع الدور والمنازل والبيوت السكنية على الخريطة ضمن أوصاف محددة، فإن بيع هذه الاشياء في الواقع القائم لايمكن تسويغه الاعلى أساس الوعد الملزم بالبيع أو على عقد الاستصناع، ويعد العقد صحيحا اذا صدرت رخصة البناء ووضعت الخريطة وذكرت في شروط العقد مواصفات البناء بحيث لاتبقى جهالة مفضية الى النزاع والخلاف، وقدأصبح من السهل ضبط الاوصاف، ومعرفة المقاديروبيان نوع البناء سواء بيع البناء على الهيكل أم مكسيا كامل الكسوة مع الاتفاق على شروط الكسوة وأوصافها من النوع الجيداوالوسط أو العادى، ويتم تسديد الثمن عادة على اقساط ذات مواعيد محددة وتحتسب الأقساط جزأ من الثمن فلا زكوة فيها الا اذا فسخ العقد.

(۶۸) دودھ بیچنے کیلئے پالی ہوئی بھینسوں پرزکوٰۃ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے پھوپھا کا ایک بھینسوں کا باڑہ ہے، جس میں تقریباً چالیس پچاس بھینسیں ہیں، پھوپھا کا یہ دودھ کا کاروبار بڑا اچھا چل رہا ہے۔ اب آپ سے پوچھنا یہ تھا آیا ان پر بھینسوں کی زکوٰۃ نکالنی لازم ہے یا دودھ کی بھی؟

الجواب حامداًومصلیاً......صورت مسئولہ میں اگر آپ کے پھوپھا نے بھینسوں کو تجارت کیلئے پالا ہے تو ان پر بھینسوں کی کل مالیت کے اعتبار سے ڈھائی فیصد زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اور اگر یہ بھینسیں دودھ بیچنے کیلئے پالیں ہیں تو اس صورت میں ان پر بھینسوں کی زکوٰۃ واجب نہیں لیکن دودھ سے حاصل ہونے والی آمدنی کی ڈھائی فیصد زکوٰۃ واجب ہوگی بشرطیکہ نصاب کے برابر ہو، اور سال گزر جائے۔

لمافي الدرالمختار مع رد المحتار (۲/۲۷۳): والاصل أن ما عدا الحجرين والسوائم انما يزكى بنية التجارة بشرط عدم المانع المؤدى الى الثنى وشرط مقارنتها لعقد التجارة الخ (قوله ماعدا الحجرين) وما عدا ما ذكر كالجواهر والعقارات والمواشي العلوفة و العبيد والثياب والأمتعة ونحوذالك من العروض.

وفيه ايضاً(۲/۲۷۵): (هي المكتفية بالرعي في اكثر العام لقصد الدر والنسل والزيادة والسمن...... لكن في البدائع لو أسامها للحم فلا زكاة فيها...... ولو للتجارة ففيها زكاة التجارة...... لأن زكاة السوائم وزكاة التجارة مختلفان قدرا وسببا).

قوله مختلفان قدراً وسبباً لأن القدر في مال التجارة ربع العشر وفي السوائم مايأتي بيانه والسبب فيهما هو المال النامي لكن بشرط نية التجارة في الأول ونية الإسامة للدروالنسل في الثاني.

وفي الفقه الاسلامي(۳/۱۹۴۸): لاتجب الزكاة في أعيان العمارالا ستغلالية والمصانع والسفن والطائرات وما أشبهها بل تجب في صافي غلتها عند توافر شرط النصاب وحولان الحول.

(۶۹) سونے چاندی کے علاوہ دھات سے بنائے گئے زیورات میں زکوٰۃ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری شادی دوسال قبل ہوئی، الحمدللہ میں اچھی ازدواجی زندگی گزار رہی ہوں، صوم وصلوٰۃ کی پابند ہوں، میرے سونے کے زیورات تو (جن کی میں زکوٰۃ نکالتی تھی) میرے شوہر کی بیماری میں لگ گئے، لیکن اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ وہ صحت مند ہو گئے۔ اب آپ سے مسئلہ یہ معلوم کرنا ہے کہ پچھلے سال کے آخر میں، میری بڑی بہن نے کچھ آرٹیفیشل زیورات دیئے، اور ایک پانچ تولے چاندی کا سیٹ دیا ہے جس پر سونے کا پانی چڑھا ہوا ہے۔ آیا میں ان زیورات کی بھی

زکوٰۃ نکالوں گی؟ براہ کرم جلد از جلد جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... آرٹیفیشل زیورات چونکہ سونے اور چاندی کے علاوہ دوسری دھات کے بنے ہوئے ہوتے ہیں اور دوسری دھات میں جب تک تجارت کی نیت نہ ہو، اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی اور چاندی کی مذکورہ مقدار چونکہ نصاب مقررہ سے کم ہے۔ اس لئے اسمیں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی البتہ اگر اور مال جو آپ کی ملکیت میں ضرورت سے زائد ہو، جن کی قیمت اور مذکورہ چاندی کی قیمت ملائی جائے اس مجموعہ کی قیمت ساڑھے باون تولہ چاندی (٦١٣.٣٥ گرام) کی قیمت کے برابر ہو تو اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔ نیز چاندی اور دوسرے دھات پر سونے کے پانی چڑھانے کی وجہ سے زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔

لما في البدائع الصنائع(٢/ ٢٠٨): وكذا روى الحسن عن ابى حنيفةؒ فيمن كانت عنده...... رصاص أو نحاس أو مموهة بحيث لايخلص فيها الفضة انها ان كانت للتجارة يعتبر قيمتها فان بلغت مائتى درهم من الدراهم التى تغلب فيها الفضة ففيها الزكاة وإن لم تكن للتجارة فلا زكوة فيها لما ذكرنا أن الصفر ونحوه لا تجب فيه الزكاة ما لم تكن للتجارة......الخ.

(٧٠) مال موہوبہ میں نیتِ تجارت کے بعد تجارت شروع کرنے سے پہلے زکوٰۃ کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک فیکٹری میں امامت کرتا ہوں مالک نے مجھے بہت زیادہ کپڑا دیا تھا کہ میں اپنا کاروبار کروں لیکن میں نے ابھی تک اس کو محفوظ کر کے رکھ لیا ہے تو کیا میرے اوپر اس کپڑے کی زکوٰۃ نکالنا ضروری ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورتِ مسئولہ میں ان کپڑوں پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، اس لئے کہ یہ کپڑے آپ کی ملکیت میں بطور ہبہ آئے ہیں، ہبہ وغیرہ میں صرف تجارت کی نیت کرنے سے تجارت کا مال شمار نہیں کیا جائے گا جب تک کہ اس مال کے ساتھ تجارت شروع نہ کی جائے۔

لمافي التاتارخانيه(٢/ ٢٣٩): واختلفوا فيما اذا ملكها بالتبرع كالهبة والصدقة والوصية والخلع والصلح عن دم العمد ونوى التجارة عند التملك قال ابو يوسف تعمل نيته وقال محمدؒ لاتعمل نيته، وقول ابى حنيفة كقول محمد كذا ذكره بعض المشايخ، وفي الهداية: وقيل: الاختلاف على العكس.

وفي الفقه الاسلامي(٣/ ١٨٧٠): والثالث: نية التجارة مصحوبة بعمل التجارة فعلا، لان مجرد النية لايكفي.

وفي الدرالمختار(١/ ٢٧٣): (وما ملكه بصنعه كهبة او وصية او نكاح......الخ.

وفي الشامية تحته: (قوله وما ملكه بصنعه الخ) أى ما كان متوقفا على قبوله وليس مبادلة مال بمال كهذه العقود إذا نوى عند العقد كونه للتجارة لا يصير لها على الأصح، لان الهبة والصدقة والوصية

لیست بمبادلة أصلا.

(۱۷) کرائے پردیئے ہوئے مکانوں، دکانوں، کارخانوں پرزکوٰۃ کاحکم

سوال کیافرماتے ہیں علماءکرام اس مسئلہ میں کہ میری طارق روڈ دبئی سینٹر میں کئی دکانیں ہیں جن کو میں نے کرایہ پر دیا ہے، اب میں اس کی زکوٰۃ کس طرح نکالوں، کیادکانوں کی جو قیمت ہے اس پرزکوٰۃ ہے یاجوآمدنی کرائے کی صورت میں آتی ہے اس پرزکوٰۃ ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً ...... دکانیں، کارخانے، زمینیں، مکانات وغیرہ اگرتجارت کیلئے نہ ہوں بلکہ انہیں صرف کرائے پر دیا ہوا ہے یا اپنے ذاتی استعمال میں ہیں تو اس صورت میں ان کی مالیت پرزکوٰۃ واجب نہیں ہوگی بلکہ ان سے حاصل ہونے والے کرائے پرزکوٰۃ واجب ہوگی بشرطیکہ کرائے کی آمدنی بقدرنصاب ہو، اورحولان حول ہوجائے یعنی نصاب پرایک پوراقمری سال گزرجائے۔

لمافي الخانية على هامش الهندية (۱/۲۵۳): اذا آجر داره أو عبده بمائتي درهم لاتجب الزكاة مالم يحل الحول بعد القبض في قول أبي حنيفة رحمه الله تعالىٰ.

وفي الهندية(۱/۱۷۵): واما سائر الديون المقربها فهي على ثلاث مراتب عند ابى حنيفة ضعيف، وهو كل دين ملكه بغير فعله لابدلاً عن شئ نحو الميراث أوبفعله لابدلاً عن شئ كالوصية أو بفعله بدلاً عما ليس بمال كالمهر وبدل الخلع لازكاة فيه عنده حتى يقبض نصابا ويحول عليه الحول، ووسط وهو مايجب بدلاً عن مال ليسَ للتجارة كعبيدالخدمة وثياب البذلة اذا قبض مائتين زكى لما مضى في رواية الاصل وقوى وهومايجب بدلاً عن سلع التجارة اذا قبض اربعين زكى لما مضى.

وفي الدر المختار(۲/۳۰۵): (و)اعلم ان الديون عند الامام ثلاثة: قوى، ومتوسط، وضعيف ف(تجب) زكاتها اذا تم نصاباً وحال الحول لكن لافوراً بل (عند قبض أربعين درهماً من الدين) القوى كقرض (وبدل مال تجارة) فكلما قبض اربعين درهماً يلزمه درهم(و)عند قبض (مائتين منه لغيرها) أى من بدل مال لغير تجارة وهو المتوسط كثمن سائمة وعبيد خدمة ونحوهما مماهو مشغول بحوائجه الاصلية كطعام و شراب و املاک ويعتبر ما مضى من الحول قبل القبض في الاصح ...... (و)عند قبض (مائتين مع حولان الحول بعده) اى بعد القبض (من) دين ضعيف وهو (بدل غير مال) كمهر ودية وبدل كتابة وخلع الا اذا كان عنده مايضم الى الدين الضعيف كما مرّ.

وفي الشامية (۲/۲۹۵): وأجل سنة قمرية بالأهلية على المذهب وهي ثلثمائة وأربع وخمسون وبعض يوم.

(۷۲) دورانِ سال نصاب کا مال ختم ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے پاس سال کے شروع میں دو لاکھ روپے تھے جو بعد میں کسی طرح ختم ہوگئے اور اب میرے پاس تقریباً ڈھائی لاکھ روپے موجود ہیں تو کیا میرے اوپر زکوٰۃ فرض ہے؟ جبکہ اس موجودہ رقم پر سال مکمل نہیں ہوا؟

الجواب حامداً ومصلیاً ...صورت مسئولہ میں اگر آپ کا مال دوران سال میں بالکل ختم ہوگیا تھا اور آپ کے پاس کچھ مال بھی باقی نہ رہا تھا تو آپ پر اس مال کی زکوٰۃ واجب نہیں رہی اور موجودہ ڈھائی لاکھ پر سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی البتہ اگر آپ کے پاس درمیان سال میں کچھ نہ کچھ مال باقی رہا تھا تو اس پر سال پورا ہوتے ہی اس ڈھائی لاکھ روپے کو اس مال کے ساتھ ملا کر پھر پورے مال کی زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہوگا۔

وفی التاتارخانیة(۲/۲۵۲): شرح الطحاوی: ولو کان النصاب کاملاً فی اول الحول وکاملا فی آخر الحول وفیما بینهما هلک کله ولم یبق منه شیٔ لاتجب الزکاة.

وفی الدر المختار(۲/۳۰۲): فلو هلک کله بطل الحول.

(وفی الشامیة تحته) (قوله لو هلک کله) ای فی اثناء الحول بطل الحول حتی لو استفاد فیه غیره استأنف له حولا جدیداً او تقدم حکم هلاکه بعد تمام الحول فی زکاة الغنم.

(۷۳) رہائشی مکان پر زکوٰۃ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک سال پہلے ایک مکان بنوایا تھا جس پر تقریباً دس لاکھ خرچ ہوئے تھے اور یہ مکان خالی ہے ابھی تک میں نے رہائش اختیار نہیں کی تو کیا اس مکان کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً... صورت مسئولہ میں مذکورہ مکان اگر رہائش کیلئے بنوایا تھا تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی اگرچہ استعمال میں نہ ہو، لیکن اگر تجارت کی نیت سے بنوایا تھا تو زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔

وفی الهندیة(۱/۱۷۲): (ومنها فراغ المال) عن حاجته الاصلیة فلیس فی دور السکنی وثیاب البدن وأثاث المنازل ودواب الرکوب وعبید الخدمة وسلاح الاستعمال زکاة وکذا طعام أهله وما یتجمل به من الاوانی اذا لم یکن من الذهب والفضة وکذا الجوهر واللؤلؤ والیاقوت والبلخش والزمرد ونحوها اذا لم یکن للتجارة وکذا لواشتری فلوسا للنفقة کذا فی العینی شرح الهدایة.

وفی الدر المختار(۲/۲۶۴،۲۶۵): (ولا فی ثیاب البدن) المحتاج الیها لدفع الحر والبرد ابن ملک وأثاث المنزل ودور السکنی ونحوها) وکذا الکتب وان لم تکن لاهلها اذا لم تنو للتجارة.

(۷۴) اگر بکریوں کو گھر میں چارہ کھلایا جائے تو زکوٰۃ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے پاس پچاس بکریاں ہیں جن کو ہم صبح وشام کو گھر میں چارہ ڈالتے ہیں لیکن دن کو جنگل میں چراتے ہیں تو کیا ان بکریوں پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... اگر بکریوں کو صبح وشام گھر میں چارہ ڈالا جاتا ہو، اور یہ چارہ ان کیلئے کافی ہو تو اس صورت میں بکریاں علوفہ شمار ہوں گی یعنی جن کو چارہ اپنے خرچے سے کھلایا جاتا ہو، اگرچہ دن میں انہیں جنگل وغیرہ میں چرایا جاتا ہو، تو ان پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی بشرطیکہ وہ تجارت کیلئے نہ ہوں۔

لمافي الهندية(۱/۱۷۶): فإن كانت تسام في بعض السنة وتعلف في البعض فان اسيمت في اكثرها فهي سائمة وإلافلا كذا في محيط السرخسي. حتى لو علفها نصف الحول لاتكون سائمة ولا تجب فيها الزكاة كذا في التبيين.

وفي الشامية(۲/۲۷۵): اذا لوحمل الكلأ إليها في البيت لاتكون سائمة.

وفي الدر المختار (۲/۲۸۲): (و)لا في (بغال وحمير) سائمة إجماعا (ليست للتجارة) فلولها فلا كلام لانها من العروض (و)لافي (عوامل وعلوفة) مالم تكن العلوفة للتجارة.

(۷۵) جس قرض کے ملنے کی امید نہ ہو اس پر زکوٰۃ کا حکم

سوال... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک دکاندار آدمی ہوں مجھ سے لوگ سامان وغیرہ خریدتے ہیں چونکہ بڑا اسٹور ہے تو کچھ چھوٹے دکاندار مجھ سے سامان قرض پر بھی لے جاتے ہیں اور اس طرح کئی سال گزر جاتے ہیں لیکن وصولی نہیں ہوتی، اس طرح کافی سرمایہ بن جاتا ہے، اب آیا جس قرض کی وصولی کی امید ہو، اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی یا نہیں؟ یعنی اس کی ادائیگی فی الحال ضروری ہوگی یا ملنے کے بعد اور جس قرض کے ملنے کی امید نہ ہو، اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی یا نہیں اگر یہ قرض بعد میں مل جائے تو ما قبل والے سالوں کی زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی یا وہ بھی ادا کرنا ہوگی۔ قرآن وسنت کی روشنی میں وضاحت فرماویں۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... قرض شدہ مال اگر کامل نصاب ہو، تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، البتہ (قبل القبض) قبضہ کرنے سے پہلے ادا کرنا لازم نہ ہوگا۔ بلکہ رقم وصول کرنے کے بعد گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ فی الحال ادا کرنا لازم ہوگی۔

باقی وہ مال جن کی وصولی کی کوئی اُمید نہ ہو، تو وہ مال ضمار شمار ہوگا، اور مال ضمار پر گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ اور اگر مال معلوم تو ہو لیکن قرضدار کے مفلس ہونے کی وجہ سے وصولی میں نا اُمیدی ہو تو ایسا مال وصول ہونے سے گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہوگا۔

لما في خلاصة الفتاوى(۱/۲۳۸): أما اذاجحدها سنين ثم اقام هو البينة لم يكن عليه زكوة مامضى

عند الثلاثة بخلاف ماإذا كان مقرا أويعلم القاضي ولو كان المديون مقرا لكنه مفلس فعليه الزكاة لمامضى اذا قبضه.

وفي الهندية (١: ١٧٥): وفي مقر به تجب مطلقا سواء كان مليا أو معسرا او مفلسا كذا في الكافي.

وفي الشامية (٢: ٢٦٢). (قوله لازكاة في مال الضمار) الضمار بالضاد المعجمة بوزن حمار. قال في البحر، وهو في اللغة الغائب الذي لايرجى فاذا رجي فليس بضمار... لو كان له دين على وال وهو مقر به إلا أنه لا يعطيه وقد طالبه بباب الخليفة فلم يعطه فلا زكاة فيه ولو هرب غريمه وهو يقدر على طلبه أو التوكيل بذلك فعليه الزكاة.

(٧٦) دوکان کے استعمال کیلئے رکھے ہوئے فریزر پرزکوٰۃ کا حکم

سوال　کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے اپنی دکان کیلئے فریزر خریدا ہے (بطور تجارت یعنی بوتل، جوس وغیرہ رکھنے کیلئے) مگر میرے گھر والوں نے نصف فریزر اپنے استعمال میں رکھا ہے یعنی دوخانے ہیں، تو ایک خانے میں وہ گھر کا سامان وغیرہ رکھتے ہیں یعنی گوشت، گھی، دودھ، لسی اور سبزی وغیرہ اور دوسرے خانے میں میں دکان کا سامان یعنی بوتل، جوس وغیرہ رکھتا ہوں۔ اب پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ یہ ضرورت اصلیہ میں بھی داخل ہوگی اور مال تجارت میں بھی داخل ہوگی۔ اب میرے لئے اس میں زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟ آیا سال کے پورا ہونے پر زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوگی یا زکوٰۃ ساقط ہوگی؟ ذرا وضاحت کریں تاکہ میرا دل مطمئن ہوجائے۔

الجواب حامداً ومصلیاً　مال تجارت یا اس سے حاصل شدہ آمدنی جب نصاب زکوٰۃ کو پہنچ جائے اور اس پر سال بھی گزر جائے تو زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، باقی اسباب تجارت جیسے کارخانوں مشینوں، زراعت کے اوزار وغیرہ پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں جب فریزر جوس، بوتل وغیرہ رکھنے کیلئے خریدا ہے نہ کہ بیچنے کیلئے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ خواہ گھر کی ضروریات میں استعمال ہو یا نہ ہو۔

لمافي المحيط البرهاني (٣: ١٢٢): آلات الصناع الذين يعملون بها وظروف الامتعة لايجب فيها الزكاة لانها غير معدة للتجارة

وفي الشامية (٢: ٢٦٥): (قوله وكذلك الآت المحترفين) اى سواء كانت مما لاتستهلك عينه في الانتفاع.

(٧٧) سلائی، کڑھائی کے استعمال کیلئے رکھی ہوئی مشینوں پرزکوٰۃ کا حکم

سوال　کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم دو بہنوں نے مل کر اپنے گھر میں کڑھائی کا کاروبار

شروع کیا تھا، جس کیلئے ہم نے دو مشینیں خریدی تھیں ان میں سے ایک کو کبھی کبھار استعمال کرتی ہیں اور دوسری مشین سے کام زیادہ ہوتا ہے البتہ گھر کا کام بھی اکثر اسی دوسری مشین سے کرتی ہیں۔ تو آیا اب دونوں مشینوں پر زکوٰۃ ہے یا صرف ایک پر؟ نیز دوسری مشین گھر کے استعمال میں بھی رہتی ہے تو اسکا کیا حکم ہے؟ اور مال تجارت کی تعریف کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... ہر وہ چیز جو آلات حرفت و پیشہ میں سے ہو، اس کی قیمت پر زکوٰۃ واجب نہیں بلکہ اس سے حاصل ہونے والی آمدنی جب نصاب تک پہنچ جائے اور سال بھی گزر جائے تو اس آمدنی پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ لہٰذا سوال میں مذکور مشینیں بھی آلات حرفت میں سے ہیں اگر ان کو صرف کڑھائی کے کاروبار کیلئے خریدا ہے نہ کہ بیچنے کیلئے تو ان پر زکوٰۃ واجب نہیں، خواہ گھر کے استعمال میں ہوں یا نہ ہوں۔

(۲)...... مال تجارت ہر وہ مال ہے جس میں خریدنے کے وقت تجارت کی نیت کی ہو۔

لما في ابی داؤد (۱/۲۱۸): لقوله عليه الصلاة والسلام عن سمرة بن جندب قال اما بعد فان رسول الله ﷺ كان يأمرنا ان نخرج الصدقة من الذى نعد للبيع.

وفي الدر المختار (۲/۲۶۳): (ولا في ثياب البدن)...... وكذالک آلات المحترفين.

وفي الطحطاوى على الدر (صـ۳۹۲): كتاب الزكاة: قوله وكذالک آلات المحترفين) اى لاتجب فيها الزكاة.

(۷۸) کام کاج کے بیل، گائے میں زکوٰۃ کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ان گرمیوں کی چھٹیوں میں ہم پنجاب اپنی خالہ جان کے گھر گئے۔ ہم نے دیہاتی ماحول پہلی مرتبہ دیکھا تھا اس لئے کچھ زیادہ ہی مزہ آ رہا تھا۔ ہماری خالہ کے گھر آٹھ بڑے بڑے بیل تھے جو ان کی زمینوں پر ہل وغیرہ کے کام آتے تھے۔ ہم دن میں زمینوں پر جاتے اور رات میں کھلے صحن میں بیٹھ کر خوب گپ شپ کرتے تھے، ایک دن باتوں باتوں میں زکوٰۃ کے مسائل پر بات چیت ہونے لگی تو میرے بڑے بھائی جنہوں نے چند ماہ مدرسہ میں بھی پڑھا ہے وہ کہنے لگے کہ خالہ جان کی گائیں اور بیل وغیرہ پر بھی زکوٰۃ واجب ہے، اس پر میں نے کہا کہ اچھا ہمارے گھر جو طوطے پلے ہوئے ہیں یا خالہ جان کے گھر جو مرغیاں ہیں ان پر بھی زکوٰۃ واجب ہے؟ اس پر وہ خاموش ہو گئے۔ پھر طے یہ ہوا کہ کراچی پہنچ کر مفتی صاحب سے معلوم کر لیا جائے۔ اب جب ہم یہاں پہنچ گئے تو بھائی نے مجھے یہ مسئلہ یاد دلایا تو اسے تفصیلاً لکھ کر آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ براہ کرم اس کا جواب دے کر احسان فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... بیل اور گائے میں زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جب ان کی تعداد تیس یا تیس سے اوپر ہو، اور اکثر سال باہر چرتے ہوں، یا تجارت کیلئے ہوں اور جو بیل اور گائے کام کاج وغیرہ کیلئے ہوں ان میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔ صورت مسئولہ میں چونکہ مذکورہ

بیل کھیتوں میں ہل وغیرہ کے کام آتے ہیں اس لئے ان میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی اور اسی طرح طوطے اور مرغیوں میں بھی زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جب وہ تجارت کیلئے پلے ہوئے ہوں۔

لـمـا فـي الجوهرة النيرة(۱/۲۹۷): (وليس في العوامل والحوامل والمعلوفة صدقة) يعني بالعوامل ولو سميت وبالمعلوفة ولو لم تعمل عليها، لأن السبب هو المال النامي ودليله الإسامة أو الاعداد للتجارة ولم يوجد، ولان في المعلوفة تتراكم المؤنة، فينعدم النماء فيها معنى.

وفـي البحر الرائق(۲/۳۸۱): (ولا في العلوفة والعوامل) للحديث: ليس في الحوامل والعوامل والعلوفة صدقة) ولان السبب هو المال النامي ودليله الاسامة او الأعداد للتجارة ولم يوجدا.

وفـي الشامية(۲/۲۸۲): (قوله ولا في عوامل) اى التي اعدت للعمل كاثار الارض بالحراثة كالسقي.

وفـي الفقه الاسلامي وادلته(۲/۱۹۱۶): كونها سائمة اى راعية في معظم الحول لا معلوفة ولا عاملة في حرث ونحوه هذا شرط عند الجمهور.

وفـي فتاوىٰ اللجنة الدائمة(۹/۲۱۸): تجب الزكاة في الارانب المتخذة للتجارة اذا بلغت قيمتها نصابا بنفسها او بضمها الى غيرها مما يزكى وحال عليها الحول، ويخرج ربع العشر من قيمتها كعروض التجارة.

(۷۹) کتابوں پر زکوٰۃ کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک روز اپنے دوست کے ساتھ ایک بہت بڑے عالم کے گھر گیا تو دیکھا ماشاء اللہ بڑی سادہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ البتہ ان کے پاس دینی کتابوں کا ایک بڑا قیمتی اور نایاب ذخیرہ موجود ہے، ان کے بیان کے مطابق کئی کئی ہزار کی سینکڑوں کتابیں ان کے پاس ہیں۔ اور بعض کتابیں تو ایسی تھیں جن کو پڑھنے کی شاید ہی نوبت آئی ہو۔ بہر کیف ان کو دیکھ کر اور ان کی باتوں کو سن کر میں سوچنے لگا کہ پھر جب یہ اپنی کتابوں کی زکوٰۃ نکالتے ہوں گے تو کتنی نکلتی ہوگی؟ لیکن میرا دوست کہنے لگا کہ دینی کتابوں کی زکوٰۃ نہیں ہوتی؟ لیکن میں نے خود ایک عالم کو دینی کتابوں کی زکوٰۃ نکالتے ہوئے دیکھا ہے۔ اب آپ ہمیں بتائیں کہ کیا دینی کتابوں پر اگر چہ وہ کتنی ہی قیمتی کیوں نہ ہوں زکوٰۃ نہیں اس کی کیا وجہ ہے اگر ہے؟ تو بتادیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......شریعت مطہرہ نے زکوٰۃ تین قسم کے مالوں (نقدی، سونا، چاندی اور مال تجارت) پر واجب کی ہے اس کے علاوہ وہ چیزیں جو لوگوں کی ضرورت وحاجت وغیرہ کی ہیں ان پر زکوٰۃ نہیں۔ اسی لئے کتابوں پر جب وہ تجارت کیلئے نہ ہوں تو زکاۃ نہیں ہے۔ اگر تجارت کیلئے ہوں تو زکاۃ ہوگی، پس آپ نے جس عالم کو کتابوں کی زکوٰۃ دیتے ہوئے دیکھا تو وہ کتابیں تجارت کیلئے ان کے پاس ہوں گی۔

لما فی الولوالجیۃ(۱/۱۷۷): رجل له کتب من العلم مایساوی مائتی درهم یحل له ان یاخذ الزکاة ان کانت الکتب ممّا یحتاج هو الیها للحفظ والدراسة والتصحیح. حل له أخذها فقها کان او حدیثا أو أدباً لانها مشغولة بحاجته فصار کثیاب، اللبس، واما لمصاحف هکذا الجواب إن کان عنده مایحتاج إلیها حل وان کان عنده زائداً علی قدر الحاجة وهو یساوی مائتی درهم لایحل.

وفی الهندیة(۱/۱۷۲): ومنها فراغ المال عن حاجته الاصلیة فلیس فی دور السکنی وثیاب البدن واثات المنازل ودواب الرکوب وعبید الخدمة وسلاح الاستعمال زکاة...... وکذا کتب العلم ان کان من اهله وآلات المحترفین.

وفی الشامیة(۲/۲۶۲): وکتب العلم لاهلها فان الجهل عندهم کالهلاک فاذا کان له دراهم مستحقة بصرفها إلی تلک الحوائج صارت کالمعدومة.

(۸۰) پاؤں میں لگائی ہوئی سونے کی راڈ پر زکوٰۃ کا حکم

سوال۔ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ماموں کی ٹانگ ایک حادثے میں ٹوٹ گئی تھی، ڈاکٹروں سے مشورہ کے بعد ان کے بیٹوں نے جو کہ کویت میں رہائش پذیر ہیں، ان کی ٹانگ میں سونے کی ایک راڈ ڈلوادی، کچھ عرصے بعد اللہ تعالیٰ نے جب انہیں صحت دی تو وہ گھر آ گئے۔ ماشاءاللہ بڑے پرہیزگار اور نیک آدمی ہیں۔ اب جب انہیں پتا چلا کہ راڈ سونے کی ڈالی گئی ہے تو وہ فکر میں پڑ گئے کہ اس کی زکوٰۃ بھی نکالنی ہوگی۔ ہمیں بڑا تعجب ہوا کہ اس پر بھی زکوٰۃ ہوگی۔ اپنی دلی تسلی کیلئے آپ کو تکلیف دے رہا ہوں۔ براہِ کرم آپ بتائیں کیا اس راڈ پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی؟

الجواب حامداًومصلیاً۔ صورتِ مسئلہ میں چونکہ یہ شخص اس راڈ کے نکالنے پر بغیر مشقت کے قادر نہیں ہے اور اسی طرح اس میں نمو بھی نہیں ہے ابتداءً من وجہ مالِ ضمار کی طرح ہے۔ اس لئے مذکورہ راڈ پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

لما فی الهندیة(۱/۱۷۴): (ومنها کون النصاب نامیا) حقیقة بالتوالد والتناسل والتجارة او تقدیرا بأن یتمکن من الاستنماء۔

وفی الهندیة(۱/۱۷۴): ویشترط ان یتمکن من الاستنماء بکون المال فی یده اوید نائبه فان لم یتمکن من الاستنماء فلا زکاة علیه وذالک مثل مال الضمار کذا فی التبیین　ومنه المفقود والآبق والماخوذ مصادرة والساقط فی البحر والمدفون فی الصحراء المنسی مکانه...

وفی الفقه الاسلامی وادلته(۳/۱۷۹۵): ولا زکاة عند الحنفیة ایضا لعدم النمو فی مال مفقود أو ضال وجده بعد سنین ولافی ساقط فی بحر استخرجه بعد سنین۔

(۱۷۹۶/۳): ودلیل الحنفیۃ علی عدم وجوب الزکاۃ فی ھذہ الاحوال: حدیث ((لازکاۃ فی مال الضمار)) ای مالا یمکن الانتفاع بہ مع بقاء الملک.

(۸۱) مرتد کا دوبارہ مسلمان ہونے کے بعد بحالت اسلام مفروضہ زکوٰۃ کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلے میں ایک بڑے صاحب رہتے تھے جو بڑے مالدار اور صاحب ثروت آدمی تھے کبھی کبھی نماز بھی پڑھا کرتے تھے لیکن زکوٰۃ وغیرہ بالکل ادا نہیں کرتے تھے کچھ ہی دن پہلے ایک قادیانی ان کے پیچھے لگا اور انہیں دعوت دے کر اس نے انہیں قادیانی کر دیا۔ اس پر ہم نے اپنے محلے کے امام صاحب کو بتایا تو انہوں نے بڑے میاں کو سمجھایا اور الحمدللہ اب وہ دوبارہ مسلمان ہوگئے ہیں اور باقاعدگی سے نماز بھی ادا کرنی شروع کر دی ہے اور زکوٰۃ کی ادائیگی کا بھی ارادہ کرلیا ہے۔ آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ قادیانی ہونے سے پہلے ان کے ذمہ جو زکوٰۃ واجب تھی کیا قادیانی (کافر) ہونے کے بعد وہ ساقط ہوگئی یا اب بھی ادائیگی لازم ہے۔ برائے مہربانی تسلی بخش جواب عنایت فرمائیں۔ اگر کسی شخص پر زکوٰۃ دینا فرض تھا لیکن اس نے نہیں دی اور بعد میں مرتد ہوا۔ لیکن مرتد ہونے کے بعد دوبارہ مسلمان ہوا۔ تو کیا اب دوبارہ مسلمان ہونے کے بعد مرتد ہونے سے پہلے جو زکوٰۃ دینا فرض تھا، اُس کا دینا لازم ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: چونکہ زکوٰۃ ایک عبادت ہے اور اس کے وجوب اور بقاء دونوں کیلئے اسلام کا ہونا شرط ہے۔ لہٰذا اگر کوئی مسلمان صاحب نصاب تھا اور زکوٰۃ اس پر فرض ہو چکی تھی اور زکوٰۃ کے فرض ہونے کے بعد العیاذ باللہ مرتد ہوگیا۔ تو زکوٰۃ اس سے ساقط ہو جائے گی اور دوبارہ مسلمان ہونے کے بعد اس زکوٰۃ کا دینا لازم نہیں ہوگا۔

لما فی الھندیۃ (۱/۱۷۱): ثم الاسلام کما ھو شرط الوجوب شرط لبقاء الزکوۃ عندنا حتی لو ارتد بعد وجوبھا سقطت کما فی الموت فلو بقی علی ارتدادہ سنین فبعد اسلامہ لایجب علیہ شی لتلک السنین.

وفی الشامیۃ (۲/۲۵۹): (قولہ واسلام) فلا زکاۃ علی کافر لعدم خطابہ بالفروع سواء کان اصلیا او مرتدا فلو اسلم المرتد لا یخاطب بشیء من العبادات ایام ردتہ ثم کما شرط للوجوب شرط لبقاء الزکوۃ عندنا حتی لو ارتد بعد وجوبھا سقط کمافی الموت بحر عن المعراج.

(۸۲) ٹریکٹر اور اس کے اوزار پر زکوٰۃ کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک زمیندار آدمی ہوں اور میری بہت ساری زمینیں ہیں ہر سال کرائے پر ٹریکٹر لے کر میں اپنی زمین میں بیج بوتا تھا اب میں نے سوچا کہ ایک اپنا ٹریکٹر خرید لوں چنانچہ اس سال میں نے اپنا

ٹریکٹر اور ساتھ اس کے اوزار وغیرہ بھی خرید لئے ہیں۔ اب آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ کیا ٹریکٹر پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً زکوٰۃ کے وجوب کیلئے ضروری ہے کہ وہ سامان جس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے حاجت اصلیہ سے زائد ہو، لہٰذا صورت مسئولہ میں ٹریکٹر اور اس کے اوزار حاجت اصلیہ میں داخل ہیں ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

لما في الهندية (۱۷۲/۱): ومنها فراغ المال) عن حاجته الاصلية فليس في دور السكنى و ثياب البدن و آثاث المنازل ودواب الركوب وعبيد الخدمة وسلاح الاستعمال زكوٰة.

وفي الشامية (۲۶۲/۲): قوله فارغ عن حاجته الاصلية)...... قوله و فارغ عن حاجته الاصلية ماكان نصابا من النقدين او احدهما فارغا عن الصرف الى تلك الحوائج لكن كلام الهداية مشعربأن المراد به نفس الحوائج فانه قال وليس في دور السكنى وثياب البدن وأثاث المنازل ودواب الركوب وعبيد الخدمة وسلاح الاستعمال زكاة لانها مشغولة بحاجته الاصلية وليست بناميه أيضا.

(۸۳) پیشگی ادا کی ہوئی اجرت پر زکوٰۃ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے زمین اجارہ پر لی ہے، اور ہر سال کی اجرت معین کرکے چند سال کی اجرت پیشگی ادا کردی ہے، تو کیا اس رقم پر جو کہ پیشگی ادا کی ہے زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً صورت مذکورہ میں پیشگی ادا کی ہوئی رقم مستاجر کی ملکیت سے نکل گئی اور اجر (مالک ارض) اس کا مالک ہوگیا ہے اس لئے اس رقم کی زکوٰۃ مستاجر پر نہیں بلکہ اجر کے اوپر لازم ہوگی۔ اگر وہ اس کی وجہ سے صاحب نصاب ہوگیا ہو، اور اس رقم پر سال گزر گیا ہو۔

لما في فتح القدير (۱۶۵/۲): وأما زكاة الأجرة المعجلة عن سنين في الاجارة الطويلة التي يفعلها بعض الناس عقوداً ويشترطون الخيار ثلاثة أيام في رأس كل شهر فتجب على الآجر لأنه ملكها بالقبض.

وفيه ايضاً (صـ۱۶۶): ولو كان تقابضا في الأجرة والدار فظاهر أنه لازكاة على المستاجر لزوال ملكه بالتعجيل ولم تعد لعدم الا نفساخ.

وفي الهندية (۱۷۴/۱): ويشترط ان يتمكن من الاستنماء بكون المال في يده أويد نائبه فان لم يتمكن من الاستنماء فلا زكاة عليه ... وهو كل مابقي أصله في ملكه ولكن زال عن يده زوالاً لايرجى عوده في الغالب.

وفي الشامية (۱۰/۲): وفي العتابية: إذا عجل الأجرة لا يملك الاسترداد.

﴿مصارف زکوٰۃ کا بیان﴾

(۸۴) مصرف زکوٰۃ کی تعیین کا طریقہ

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے پچھلے سال جب زکوٰۃ نکالی تھی تو ایک صاحب کو مستحق سمجھ کر دیدی تھی، حالانکہ بعد میں تحقیق سے معلوم ہوا کہ وہ مستحق نہ تھے، مجھے آپ صرف اتنا بتادیں کہ ہم مستحق کی تحقیق کس طرح کریں تاکہ ہماری زکوٰۃ اپنے صحیح حقدار تک پہنچ جائے۔

الجواب حامداًومصلیاً مستحق زکوٰۃ کی تحقیق مندرجہ ذیل باتوں سے ہوسکتی ہے۔

(۱)۔ظن غالب کا ہونا کہ یہ مستحق زکوٰۃ ہے۔

(۲)۔اس پرآثار فقر کا ہونا۔

(۳)۔یا اس سے سوال کیا جائے کہ وہ مستحق زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

لہٰذا اگر آپ نے اپنے ظن غالب سے کسی کو مستحق زکوٰۃ سمجھ کر زکوٰۃ دیدی تو زکوٰۃ ادا ہوگئی ہماری رائے میں آپ اپنی زکوٰۃ مدارس دینیہ کو دیں کیونکہ مدارس دینیہ بالیقین صحیح مصرف ہیں کیونکہ (۱)۔طلباء مستحق بھی ہیں۔ (۲)۔مسافر بھی ہیں۔ (۳)۔اوراس میں ترویج دین کی اعانت بھی ہے۔

لمافی الهندية(۱۹۰،۱۸۹/۱) اذا شک وتحری فوقع فی اکبر رأیه انه محل الصدقة فدفع الیه اوسأل منه فدفع أو رآه فی صف الفقراء فدفع فان ظهر انه محل الصدقة جاز بالاجماع وکذا ان لم یظهر حاله عنده.

وفی الدر المختار (۳۵۳،۳۵۲/۲) (دفع بتحر) لمن یظنه مصرفا (فبان أنه عبده او مکاتبه او حربی ولو مستأمنا أعادها) لمامر (وإن بان غناه أو کونه ذمیاً أو انه ابوه أو ابنه او امرأته او هاشمی لا) یعید لانه أتی بمافی وسعه حتی لو دفع بلا تحر لم یجز إن أخطأ. وفی الشامیة تحته:(قوله لانه اتی بما فی وسعه) ای اتی بالتملیک الذی هو الرکن علی قدر وسعه اذ لیس مکلفا اذا دفع فی ظلمة مثلا بأن یسأل عن القابض من انت.

(۸۵) ادائیگی زکوٰۃ کے وقت مستحق ہونے کی تحقیق کرنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں جب زکوٰۃ دینا چاہتا ہوں تو اس وقت بہت سارے

لوگ میرے پاس زکوٰۃ لینے کیلئے آتے ہیں لیکن مجھے پتہ نہیں ہوتا کہ ان میں سے کون غریب ہے اور کون امیر جبکہ وہ سب غریب ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں تو ایسی صورتِ حال میں میں کیا کروں؟

الجواب حامداومصلیا چونکہ ادائیگی زکوٰۃ کیلئے ضروری ہے کہ زکوٰۃ وصول کرنے والے کی تحقیق کی جائے لہٰذا صورت مسئولہ میں پہلے تحقیق کرلی جائے پھر اگر اطمینان ہو جائے تو زکوٰۃ دیدیں ورنہ نہ دیں۔

لمافي الهندية(۱/۱۸۹،۱۹۰): اذا شك وتحرى فوقع في اكبر رأيه انه محل الصدقة فدفع اليه اوسأل منه فدفع أو رآه في صف الفقراء فدفع فان ظهرانه محل الصدقة جاز بالاجماع وكذا ان لم يظهر حاله عنده.

وفي الدر المختار (۲/۳۵۲،۳۵۳): (دفع بتحر) لمن يظنه مصرفا (فبان أنه عبده او مكاتبه او حربي ولو مستأمنا أعادها) لمامر (وإن بان غناه أو كونه ذمياً او انه ابوه أو ابنه او امرأته او هاشمي لا) يعيد لانه أتى بمافي وسعه حتى لو دفع بلا تحرلم يجز إن أخطأ وفي الشامية تحته:(قوله لانه اتى بما في وسعه) اى أتى بالتمليك الذى هو الركن على قدر وسعه اذ ليس مكلفا اذا دفع في ظلمة مثلا بأن يسأل عن القابض من أنت.

(۸۶) زکوٰۃ کی ادائیگی سے حج کی جمع شدہ مطلوبہ رقم کم ہونے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ اگر کسی نے حج کیلئے رقم جمع کی ہو اور اس پر سال گزر جائے اور نصاب سے زائد بھی ہو، اب اگر اس سے زکوٰۃ ادا کرتا ہے تو حج جو اس پر فرض ہے کیلئے بقیہ رقم سے داخلہ ممکن نہیں رہتا اس صورت میں کیا کیا جائے؟

الجواب حامداومصلیا صورت مسئولہ میں حج درخواستوں کی وصولی کے ایام سے پہلے اگر یہ شخص نصاب حج وزکوٰۃ کا مالک ہو جائے تو اس پر صرف زکوٰۃ فرض ہوگی، حج فرض نہ ہوگا لیکن اگر شخص مذکور نصابِ حج وزکوٰۃ کا مالک درخواستوں کی وصولی کے درمیان ہوا ہے تو اس پر دونوں فریضے واجب ہونگے اور ادائیگی کی صورت یہ ہوگی کہ پہلے حج ادا کرے کیونکہ حج کا وجوب فی الفور ہے اور زکوٰۃ کو بعد میں ادا کرے۔

لمافي الشامية(۲/۲۶۱):(قوله كمامرفي الزكاة)أى من بيان مالابدمنه من الحوائج الاصلية كفرسه وسلاحه وثيابه وعبيدخدمته والات حرفته وأثاثه وقضاء ديونه وأصدقته ولومؤجلة كمافي اللباب وغيره والمرادقضاء ديون العباد.ولذاقال في اللباب أيضاوان وجدمالاوعليه حج وزكاة يحج به قيل الاأن يكون المال من جنس ماتجب فيه الزكاة فيصرف اليها.

وفيه ايضاً(۲/۲۶۵):(قوله وقت):ظرف متعلق بمحذوف خبرالعبرة أى ثابتة وقت خروج اهل بلدهاولوقبل أشهرالحج لبعدالمسافة ط(قوله وكذاسائرالشرائط) أى يعتبروجودهافي ذالك

الوقت:(تتمة)ذكر صاحب اللباب في منسكه الكبيرأن من الشرائط امكان السيروهوان يبقى وقت يمكنه الذهاب فيه الى الحج على السير المعتاد فان احتاج الى ان يقطع كل يوم أوفي بعض الايام أكثر من مرحلة لايجب الحج.

(۸۷) زکوٰۃ کی رقم تھوڑی تھوڑی ادا کرنے کا حکم

سوال ...کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ میں الحمدللہ صاحب نصاب ہوں اور ہر سال زکوٰۃ کی ادائیگی بھی کرتا ہوں البتہ میری زکوٰۃ ادا کرنے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ سال پورا ہو جانے کے بعد تھوڑی تھوڑی رقم ادا کرتا ہوں تو کیا اس طرح زکوٰۃ ادا کرنا صحیح ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً ...صورت مسئولہ میں سال پورے ہو جانے کے بعد تھوڑی تھوڑی زکوٰۃ ادا کرنا جبکہ زکوٰۃ کی [illegible] عذر کے ہو تو مکروہ ہے اگرچہ زکوٰۃ ادا ہو جائیگی اسلئے بہتر یہی ہے کہ آپ زکوٰۃ کی رقم یک مشت ہی نکال دیا [illegible] بعد سال پورا ہونے سے پہلے تھوڑی تھوڑی نکال دیا کریں اور سال کے آخر میں حساب کرلیا کریں [illegible] سال پورا ہو جانے کے بعد بھی زکوٰۃ ادا نہ کی اور موت آگئی تو گناہ گار ہونگے۔

لمافي الدر المختار(۲/۲۷۲،۲۷۱):(وقيل فوری) ای واجب على الفوروعليه الفتوى كمافي شرح الوهبانية (فيأثم بتاخيرها) بلا عذر (و ترد شهادته) لان الأمر بالصرف الى الفقيرمعه قرينة الفور وهي أنه لدفع حاجته وهي معجلة فمتى لم تجب على الفورلم يحصل المقصود من الايجاب على وجه التمام.

(۸۸) رمضان المبارک میں زکوٰۃ ادا کرنا

سوال کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ ہمارے کراچی شہر میں لوگ عموماً رمضان میں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، کیا رمضان میں زکوٰۃ ادا کرنے کا ثواب زیادہ ہے؟ اگر درمیان سال میں کسی مستحق کو زکوٰۃ ادا کردی جائے تو اس کا ثواب زیادہ ہے یا رمضان المبارک میں زکوٰۃ ادا کرنیکا ثواب زیادہ ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً ......رمضان المبارک کے جملہ فضائل میں ایک فضیلت یہ بھی آئی ہے کہ ماہِ مبارک میں نفل عمل فرض کے برابر ہو جاتا ہے جبکہ فرض عمل کا ثواب ستر گناہ بڑھ جاتا ہے لہٰذا ماہ مبارک میں زکوٰۃ ادا کرنے کا ثواب بھی زیادہ ہوگا، لیکن کیونکہ زکوٰۃ کی مشروعیت فقراء ومساکین کی حاجت پوری کرنے کے لئے ہوئی ہے لہٰذا جو صورت انفع للفقراء ہو اسکو اختیار کر کے زکوٰۃ ادا کرنے میں زیادہ ثواب ہوگا، اب اگر حولانِ حول سال کے درمیان میں ہوا تو اسی وقت زکوٰۃ ادا کرنے میں زیادہ ثواب ہوگا کیونکہ اس وقت غریب لوگ [illegible] زیادہ حاجتمند ہوتے ہیں اور تاخیر کرنے میں انکی حاجات کا لحاظ نہیں ہوتا، نیز کسی شرعی عذر کے بغیر زکوٰۃ کی ادائیگی میں تاخیر کرنا [illegible]

ہے، البتہ اگر حولان حول سے پہلے رمضان المبارک کے مہینہ میں زکوٰۃ ادا کی گئی یا حولان حول ہی رمضان المبارک کے مہینہ میں ہو رہا ہے تو ان دو صورتوں میں ماہ مبارک میں زکوٰۃ ادا کرنے کا ثواب زیادہ ہوگا۔

لمافی صحیح ابن خزیمة(۳/۱۹۱):من تقرب فیه بخصلة من الخیر کان کمن ادی فریضة فیما سواہ ومن ادی فیه فریضة کان کمن ادی سبعین فریضة فیماسواہ.

وفی الشامیة(۲/۲۷۲): (قوله فیاثم بتاخیرها)ظاهره الاثم بالتاخیر ولو قل کیوم اویومین لانهم فسروا الفور باول اوقات الامکان. والله اعلم بالصواب

(۸۹) کسی کے کہنے پر اس کی طرف سے زکوٰۃ ادا کرنا

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی نے کسی کو پیسے نہیں دیئے اور صرف اتنا کہہ دیا کہ آپ میری طرف سے زکوٰۃ ادا کردیں اور اُس نے ان کی طرف سے زکوٰۃ ادا کردی تو کیا کہنے والے کی طرف سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورتِ مسئولہ میں کہنے والے کی طرف سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، البتہ اگر موکل نے پیسے واپس کرنے کی شرط لگائی تھی تو پھر وکیل موکل پر پیسوں کے سلسلے میں رجوع کرسکتا ہے اور اگر واپس کرنے کی شرط نہیں لگائی تھی اور وکیل نے اس کی طرف سے زکوٰۃ ادا کردی تو یہ وکیل کی طرف سے ہبہ ہے اور موکل کی زکوٰۃ ادا ہوگئی۔ اس صورت میں ادا کرنے والا شخص موکل سے پیسے وصول کرنے کا مطالبہ بھی نہیں کرسکتا۔

لمافی الشامیة (۲/۲۶۹): قال فی البحر: ولو تصدق عنه بامره جاز ویرجع بما دفع عند ابی یوسف وعند محمد لا یرجع الا بشرط الرجوع اهـ تأمل.

وفیه ایضاً (۳/۳۸۰): لو قال اعطه عن کفارتی أو أدزکاة مالی وکذا عوض عن هبتی أوهب لفلان عنی الفالا یرجع بلاشرط الرجوع، ففی کل موضع ملک المدفوع الیه المال المدفوع مقابلا بملک المال فالمامور یرجع بلا شرط ولو بلا مقابلة مال لا یرجع بلاشرط بزازیة وتمام الکلام علی هذه المسائل ذکرناہ فی تنقیح الحامدیة.

(۹۰) کئی سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کئی سالوں سے میں نصاب کے برابر مال اپنے پاس رکھتا تھا لیکن کبھی زکوٰۃ ادا نہیں کی تھی اب میں نے اللہ پاک سے توبہ کی ہے اور ہر سال زکوٰۃ ادا کرنے کا وعدہ کیا ہے تو کیا گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً......جو شخص صاحب نصاب ہو، تو نصاب کا مالک ہونے سے ایک قمری سال بعد اس پر زکوٰۃ لازم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ پر گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہے۔ اگر پہلے سال کی زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد مال نصاب سے کم رہ گیا، تو پھر بقیہ سالوں کی زکوٰۃ لازم نہ ہوگی۔ اور اگر زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد بھی نصاب بدستور کامل ہے، تو پھر جس سال کی زکوٰۃ ادا کرنے تک نصاب پورا ہو، اس سال کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے۔

لمافي الهندية(۱/۱۷۶): رجل له مائتا درهم فحال عليه ثلاثة احوال الايوما ثم افادخمسة يزكي للحول الاول خمسه لاغير لانه انتقص النصاب في الحول الثاني والثالث بدين الزكاة.

وفي الشامية (۲/۳۰۵): وذكر في المنتقى: رجل له ثلثمائة درهم دين حال عليها ثلاثة احوال فقبض مائتين فعند ابي حنيفة يزكي للسنة الاولى خمسة وللثانية والثالثة أربعة أربعة من مائة وستين.

(۹۱) ادائیگی زکوٰۃ بذریعہ چیک

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلے میں ایک صاحب رہتے ہیں بہت مالدار ہیں یہاں کراچی میں ان کی کپڑوں کی دو فیکٹریاں ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ دیندار بھی ہیں ہر سال رمضان المبارک میں اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ ان کے دفتر کے سامنے مستحقین کی لائن لگی ہوتی ہے۔ لیکن وہ نقد رقم دینے کے بجائے ہر مستحق کو رقم کا چیک دیدیتے ہیں ان کو دیکھ کر میں نے بھی یہ ارادہ کیا کہ آئندہ نقد رقم کے بجائے میں بھی جب زکوٰۃ ادا کروں تو مستحقین کو چیک دیدوں گا لیکن ساتھ ہی میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا اور آپ سے وضاحت کروانا چاہتا ہوں کہ اگر کسی مستحق کو زکوٰۃ کی رقم کے بجائے اس رقم کا چیک دیں تو کیا چیک دینے سے زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں جبکہ کسی شخص نے مستحق کو زکوٰۃ میں نقد رقم کی بجائے چیک دیدیا ہو تو اس صورت میں جب تک یہ مستحق شخص اس چیک کو نقدی (کیش) میں تبدیل نہیں کرائے گا یا اور کوئی مالکانہ تصرف نہیں کرے گا اس وقت تک اس زکوٰۃ دہندہ کی زکوٰۃ کی ادائیگی مکمل نہ ہوگی۔ کیونکہ زکوٰۃ کیلئے کسی مستحق کو عین مال کا مالک بنانا ضروری ہے جبکہ چیک بذاتِ خود کوئی مال نہیں ہے۔

لمافي البحر الرائق (۲/۳۷۰): ولو أمر فقيرا بقبض دين له على آخر نواه عن زكوة عين عنده جاز لأن الفقير يقبض عينا فكان عينا عن عين.

وفي الهندية(۱/۱۷۱): ولو أمر فقيرا بقبض دين له على آخر ونواه عن زكوة عين عنده جاز.

(۹۲) منی آرڈر کے ذریعے زکوٰۃ مستحق تک بھیجنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں پنجاب سے کراچی بغرض کاروبار آیا تھا اور میں نے

یہاں کاروبار شروع کیا۔الحمدللہ،اللہ تعالیٰ نے کاروبار میں بہت برکت دی ہے اور میرے کاروبار میں مزید اضافہ ہورہا ہے اور اس پرایک سال سے زائد عرصہ گزر چکا ہے اب میں اپنے مال کی زکوٰۃ اپنے غریب رشتہ داروں کے پاس منی آرڈر کے ذریعے بھیجنا چاہتا ہوں آپ سے پوچھنا یہ ہے کہ زکوٰۃ کی رقم منی آرڈر کے ذریعے سے بھیجنا جائز ہے یا نہیں؟اسی طرح منی آرڈر کی فیس زکوٰۃ سے ادا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً زکوٰۃ کی ادائیگی کیلئے ضروری ہے کہ مسلمان فقیر کواللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے بغیر عوض کے مال کا مالک بنایا جائے۔یہ زکوٰۃ چاہے خود دے یا وکیل کے ذریعے دے وہی زکوٰۃ ادا شمار ہوگی جس کا مالک فقیر بنے گا۔لہٰذا صورت مسئولہ میں منی آرڈر کے ذریعہ زکوٰۃ کی رقم بھیجنا صحیح ہے۔لیکن منی آرڈر کی فیس زکوٰۃ کی رقم سے دینا جائز نہیں۔اگر زکوٰۃ کی رقم سے فیس دی تو وہ رقم جو فیس پر لگی ہے وہ زکوٰۃ کی ادائیگی شمار نہیں ہوگی اس کا دوبارہ ادا کرنا لازم ہوگا۔اس لئے کہ فقیر اس کا مالک نہیں بنا۔

لمافي الهندية(۱/۱۷۰): فهي تمليك المال من فقير مسلم غير هاشمي ولا مولاه بشرط قطع المنفعة من المملك من كل وجه لله تعالىٰ.

وفي الدر المختار(۲/۲۵٦): وشرعا (تمليك) خرج الاباحة، فلو أطعم يتيما ناوياً الزكاة لايجزيه الا اذا دفع اليه المطعوم كما لو كساه بشرط أن يعقل القبض الا اذا حكم عليه بنفقتهم (جزمال) خرج المنفعة، فلو اسكن فقيرا داره سنة ناويا لايجزيه (عينه الشارع) وهو ربع عشر نصاب حولي.

وفي الشامية(۲/۲۵۷): (قوله الا اذا دفع اليه المطعوم) لانه بالدفع إليه بنية الزكاة يملكه فيصير آكلا من ملكه بخلاف ما اذا أطعمه معه، ولا يخفى انه يشترط كونه فقيرا. ولا حاجة الى اشتراط ففر أبيه ايضا لان الكلام في اليتيم ولا أباله فافهم.

(۹۳) بذریعہ ایزی لوڈ(Easy Load)زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم

سوال.. کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص اپنی زکوٰۃ ادا کرنا چاہتا ہے اور وہ زکوٰۃ کی رقم بکر جو مستحق زکوٰۃ ہے کو دینا چاہتا ہے وہ زکوٰۃ دینے کی یہ صورت اختیار کرتا ہے کہ وہ شخص بکر کے موبائل میں ایزی لوڈ کراتا ہے تو کیا اس سے اس کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی یا نہیں؟ واضح رہے کہ ایزی لوڈ میں ٹیکس کو منہا کر دیا جاتا ہے تو کیا ٹیکس کی رقم وہ شخص الگ سے ادا کرے گا؟یا جتنا ایزی لوڈ کرایا ہے اتنا ہی زکوٰۃ کی ادائیگی میں شمار ہوگا۔

(۲) بسا اوقات موبائل میں پیسے آجاتے ہیں جن کے متعلق کوئی علم نہیں ہوتا کہ کس نے بھیجے ہیں از روئے شرع اس کا استعمال کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......زکوٰۃ ادا کرنے کیلئے اصل قیمت ہی دینا ضروری نہیں ہے بلکہ ہر وہ چیز جس سے مستحق زکوٰۃ کو نفع پہنچایا جائے زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے لہٰذا صورت مسئولہ میں بذریعہ ایزی لوڈ زکوٰۃ ادا ہو جائے گی اور اس سے منہا ہونے والا ٹیکس زکوٰۃ ادا کرنے والے کو

اپنی طرف سے ادا کرنا پڑے گا اس لئے کہ مستحق زکوٰۃ کو بغیر کسی عوض کے زکوٰۃ کا مالک بنانا ضروری ہے لہٰذا جو رقم اس تک پہنچے گی وہی زکوٰۃ شمار ہوگی جو ٹیکس میں جائیگی وہ زکوٰۃ میں شمار نہیں ہوگی اس کا الگ سے ادا کرنا ضروری ہوگا۔

صورت ثانیہ میں جو رقم آپ تک پہنچی ہے اس کو خدائی عطاء سمجھیں اور اس کا استعمال شرعاً جائز ہے۔البتہ اگر کسی طرح بھیجنے والے کا پتہ چل جاتا ہے اور وہ اس کا تقاضا کرتا ہے تو پھر اتنی مقدار رقم مالک تک پہنچانا ضروری ہے۔

لما في الولوالجية(١/١٧٧): رجل يعود يتيما فجعل يكسوه ويطعمه وجعل مايكسو او مايأكل عنده من زكاة ماله فالكسوة تجوز لوجود ركنه وهو التمليك واما الاطعام ان دفع الطعام اليه بيده يجوز ايضا لهذه العلة وان كان لم يدفع اليه ويأكل اليتيم لم يجز لانعدام الركن وهو التمليك .

وفي الشامية(٢/٣٥٥): (واعتبار حاله الخ) اشار الى انه ليس المراد دفع مايغنيه في ذالك اليوم عن سوال القوت فقط بل عن سوال جميع ما يحتاجه فيه لنفسه وعياله...... والأوجه ان ينظر الى مايقتضيه الحال في كل فقير من عيال و حاجة اخرى كدهن وثوب وكراء منزل وغير ذالك.

وفي الطحطاوي(١/٣٩٥): ولا يشترط الدفع من عين مال الزكوة لانه لوامر انسانا بالدفع عنه اجزاه.

(٩٤) ایزی لوڈ کے ذریعہ ادائیگی زکوٰۃ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے بنیت زکاۃ غریب آدمی کو ایزی لوڈ کروادیا اور ایزی لوڈ بھی ہوا تو کیا زکاۃ ادا ہو جائے گی؟ مدلل جواب دے کر مشکور فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......زکوٰۃ کی ادائیگی کیلئے تملیک (یعنی فقیر کو مکمل طور پر مالک بنانا) اور فقیر کا قبضہ کرنا ضروری ہے اس طور پر کہ وہ اپنی مرضی سے تصرف کر سکے لہٰذا ایزی لوڈ کی صورت میں فقیر کیلئے مکمل طور پر تملیک پائی جاتی ہے اور قبضہ بھی پایا جاتا ہے۔لہٰذا ایزی لوڈ میں زکوٰۃ کی نیت کی تو زکوٰۃ اتنی رقم کی ادا ہوگی جو فقیر تک پہنچے گی اور جو ٹیکس وغیرہ میں کٹ جاتی ہے اس کی ادائیگی الگ سے کرنی ہوگی۔

لمافي المحيط البرهاني (٣/٢٠٦): لان النصاب اذا كان عينا فالواجب تمليك جزء منه من كل وجه...... لان الواجب في باب الزكاة التمليك من كل وجه

وفي الدر المختار(٢/٢٥٦): هي تمليك خرج الاباحة فلو اطعم يتيما ناوياً الزكاة لا يجزيه الا اذا دفع اليه المطعوم...... (جزء مال) خرج المنفعة فلو اسكن فقيرا داره سنة ناوياً لايجزيه الخ.

(في الهامش) ولذا قال في التاتر خانية عن المحيط اذا كان يعول يتيما ويجعل مايكسوه ويطعمه من زكاة ماله ففي الكسوة لاشك في الجواز لوجود الركن وهو التمليك وأما الطعام فما يدفعه اليه

بیدہ یجوز ایضاً لما قلنا بخلاف ما یاکلہ بلا دفع الیہ............ والمال کما صرح بہ اہل الاصول ما یتمول ویدخر للحاجة وهو خاص بالأعیان فخرج بہ تملیک المنافع اهـ.

وفی الفقہ الاسلامی(۱۷۹۶/۳): واما رکن الزکاة فهو اخراج جزء من النصاب بانها ید المالک عنہ وتملیکہ الی الفقیر وتسلیمہ الیہ او الی من هو نائب عنہ وهو الامام......

وفی الهندیة(۱۷۱/۱):اذا وکل فی اداء الزکاة اجزأتہ النیة عند الدفع الی الوکیل ....

(۹۵) زکوٰۃ میں کسی منفعت کو زکوٰۃ کی نیت سے ادا کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں الحمدللہ ایک صاحب ثروت آدمی ہوں اور ایک شریفانہ زندگی گزار رہا ہوں، اپنی طاقت کے بقدر اسلامی احکام پر بھی عمل کرنے کی کوشش کرتا ہوں میری بیوی بھی ایک اچھے گھرانے سے تعلق رکھتی ہے اس کے ماں باپ نے شادی کے موقع پر اسے تقریباً چالیس تولہ سونا دیا تھا۔ میں پورے اہتمام سے اس سونے اور اپنی جائیداد کی بھی زکوٰۃ نکالتا ہوں۔ اب مسئلہ آپ سے جو پوچھنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ میرا ایک مکان ہے جس کا ماہوار کرایہ چھ ہزار روپے آتا ہے۔ وہ آجکل خالی پڑا ہوا ہے، اب میرا ارادہ ہو رہا ہے کہ وہ مکان بطور کرایہ پر میں اپنی خالہ زاد بہن کو جو مستحق اور غریب ہے دے دوں۔ اور کرایہ کی رقم جو وہ مجھے دے گی وہ نہ لوں بلکہ میرے ذمہ جو ساٹھ ستر ہزار روپے زکوٰۃ کی مد میں لازم ہیں وہ بطور زکوٰۃ اسے دوں۔ لیکن میری بیوی کہتی ہے کہ آپ انہیں پیسے بھی نہ دیں اور ہر ماہ سمجھ لیں کہ ہم چھ ہزار روپے انہیں زکوٰۃ دے رہے ہیں اور وہ اس کے بدلے ہمارے مکان میں رہ رہی ہیں۔ لیکن میرا دل مطمئن نہیں تو سوچا آپ سے پوچھ لوں۔ آپ مجھے قرآن وسنت کی روشنی میں بتائیں کہ آیا یہ صورت درست ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کوئی صحیح صورت تجویز فرمادیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً: زکوٰۃ میں زکوٰۃ ادا کرنے والے کی طرف سے مال متقوم کو نیت کے ساتھ مستحق فقیر کی طرف سپرد کرنا ضروری ہے کسی منفعت کو زکوٰۃ کی نیت سے ادا کرنا درست نہیں۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں مکان کرایہ پر دے کر اس میں ادائیگی زکوٰۃ کی نیت کرنا درست نہیں کیونکہ وہ ایک منفعت ہے اور اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے زکوٰۃ کی رقم کو اپنی خالہ زاد بہن کی طرف جو مستحق ہے ادا کردیں پھر اس سے کرایہ کی رقم وصول کریں۔

لمافی الدر المختار(۲۷۱/۲): وحیلة الجواز ان یعطی مدیونہ الفقیر زکاتہ ثم یاخذها عن دینہ.

وفی الاشباہ والنظائر(صـ۴۰۷): ومن لہ علی فقیر دین وأراد جعلہ عن زکاة العین فالحیلة ان یتصدق علیہ ثم یأخذہ منہ عن دینہ.

وفی الهندیة(۱۹۰/۱): ولو دفع الیہ دارا لیسکنها عن الزکاة لا یجوز کذا فی الزاهدی.

(۹۶) زکوۃ کی ادائیگی مال متقوم سے ضروری ہے ردی مال سے زکوۃ ادانہیں ہوگی

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کسی شخص پر زکوۃ واجب ہوجائے اس بارے میں فقہاء فرماتے ہیں کہ زکوۃ یا تو اس مال سے ادا کرے یا اس کی قیمت ادا کردے اب پوچھنا یہ ہے کہ زکوۃ ادا کرتے وقت ان دونوں کے علاوہ استعمالی اشیاء مثلاً مستعمل جوتے، کپڑے سائیکل، سواری وغیرہ میں سے اس کی زکوۃ دے دیں تو کیا اس سے زکوۃ ادا ہوجائے گی اور ان اشیاء کا زکوۃ میں دینا کیسا ہے؟ بینوا توجروا

الجواب حامداً ومصلیاً: فقہاء کرام نے زکوۃ کی ادائیگی کیلئے یہ اصول لکھا ہے کہ ہر ایسا مال جو متقوم ہو یعنی کچھ نہ کچھ قیمت رکھتا ہو اس سے زکوۃ ادا کرنا جائز ہے اور بقدر قیمت زکوۃ ادا ہوجائے گی البتہ ایسی چیز جو ردی ہو، اور انسان اس کے استعمال کو ناپسند کرتا ہو مثلاً پرانے جوتے کپڑے وغیرہ زکوۃ میں ادا کرنا مکروہ ہے۔ قرآن وحدیث میں بہترین مال سے صدقہ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اور گھٹیا مال سے صدقہ کرنے کو ناپسند قرار دیا گیا ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے يا ايُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ ولا تيمموا الخبيث منه (ترجمہ: اے ایمان والو! اپنی بہترین کمائی میں سے خرچ کرو، گھٹیا چیز کا ارادہ نہ کرو)۔ اور ایک دوسری جگہ ارشاد ہے لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (ترجمہ: تم نیکی کے کامل درجہ کو نہیں پہنچ سکتے جب تک تم اپنا محبوب مال خرچ نہ کرو)۔ ان آیت سے معلوم ہوا کہ زکوۃ کی ادائیگی اپنے بہترین مال سے کرنی چاہیے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں استعمالی اشیاء مثلاً جوتے، کپڑے سائیکل، سواری وغیرہ بوجہ متقوم ہونے کے زکوۃ میں ادا کرنا جائز ہے البتہ اس جیسی گھٹیا چیزیں زکوۃ میں ادا کرنا مکروہ ہے۔

لمافی القرآن الکریم (سورۃ آل عمران): لن تنالوا البرّ حتّی تنفقو مما تحبّون الخ.

(سورۃ البقرۃ: ۲۶۷): یا ایها الذین آمنوا انفقوا من طیبات ماکسبتم ومما اخرجنا لکم من الارض ولا تیمموا الخبیث منه تنفقون ولستم بآخذیه الا ان تغمضوا فیه الخ.

وفی تفسیر مظهری (۱/۳۹۲): (الّا ان تغمضوا فیه) یعنی لو کان لاحد کم علی رجل حق فجاءه بهذا لم یاخذه الا وهو یری انه قد ترک حقّه قال الحسن وقتادة لو وجد تموه یباع فی السوق ما احد تموه بسعر الجید. وروی عن البراء انّه قال لو کان اهدی ذلک لکم ما اخذ تموه الا استحیاء من صاحبه وغیظا فکیف ترضون للّٰه مالا ترضون لانفسکم هذا اذ کان المال کلّه جیّد فلیس له اعطاء الرّدی وان کان کلّ ماله ردیا فلا باس باعطاء الرّدی.

وفی البدائع الصنائع (۲/۱۶۹): واماّ الذی یرجع الی المودّی فمنها ان یکون مالاً متقوّما علی الاطلاق سواء کان منصوصا علیه اولا من جنس المال الذی وجبت فیه الزکاة او من غیر جنسه والاصل انّ کل مال یجوز التصدق به تطوعاً یجوز ادا الزکاة منه ومالا فلا ... غیر انّ المودّی یعتبر

فيه القدر والصفة فى بعض الاموال وفى بعضها القدر دون الصفة وفى بعضها الصفة دون القدر .....
فان كان من السوائم فان ادّى المنصوص عليه من الشّاة وغيره يراعى فيها صفة الواجب وهو ان
يكون وسطا فلا يجوز الرّدى الا على طريق التقويم وان كان من عروض التجارة فان ادّى من
النصاب ربع عشره يجوز كيفما كان النصاب لانه ادى الواجب بكماله وان ادّى من غير النصاب
فان كان من جنسه يراعى فيه صفة الواجب من الجيدو الوسط والرّدى ولو ادّى الرّدى مكان الجيد
والوسط لايجوز الا على طريق التقويم بقدره وعليه التكميل.

وفى الفقه الاسلامى(۱۹۷۲/۳): يشترط ان يكون المؤدى مالاً متقوّما على الاطلاق سواء كان
عند الحنفية منصوصا عليه ام لا من جنس المال الذى وجبت فيه الزكاة ام من غير جنسه
ويكره تعمد الصدقة بالردى لقول الله تعالىٰ ولا تيمموا الخبيث منه تنفقون ويستحب تعمد اجود
ماله واحبّه اليه لقوله تعالىٰ لن تنالو البر حتى تنفقوا مما تحبّون.(صـ۲۰۵۹)

(۹۷) دوائیوں کی زکوۃ ادا کرنے کا طریقہ

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ پاپوش میں میرا ایک دواخانہ ہے اور اب میں سال کے بعد اس کی زکوۃ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ تو کیا میں ان دوائیوں کی مجموعی قیمت کا اندازہ کر کے زکوۃ ادا کروں یا تمام دوائیوں کا الگ الگ وزن کر کے قیمت نکالنے کے بعد زکوۃ ادا کروں۔ قرآن اور سنت کی روشنی میں اس مسئلے کا شرعی حل فرمائیں۔

الجواب حامداومصلیا..... صورت مسئولہ میں تمام دوائیوں کی زکوۃ ادا کرنا واجب ہے اور قیمت وہ معتبر ہوگی جو ان کو یک دم فروختگی کے وقت ٹھہرائی جائے۔

لمافى الهندية (۱۷۹/۱): ويقوم بالمضروبة كذا فى التبيين، وتعتبر القيمة عند حولان الحول
بعدان تكون قيمتهافى ابتداء الحول مائتى درهم من الدراهم الغالب عليها الفضة كذا فى
المضمرات، ثم فى تقويم عروض التجارة التخيير يقوم بأيهما شاء من الدراهم والدنانير الا اذا
كانت لاتبلغ باحدهما نصابا فحينئذ تعين التقويم بما يبلغ نصابا هكذا فى البحر الرائق.

وفى الدر المختار(۲۹۸/۲،۲۹۹): فيزكيهما كيف كانا (او)فى (عرض تجارة قيمته نصاب) الجملة
صفة عرض وهوهنا ماليس بنقد . فأفاد أن التقويم انما يكون بالمسكوك عملا بالعرف (مقوما
باحدهما) ان ستويا فلواحدهما أروج تعين التقويم به،

وفى الشامية (۲۸٦/۲): (قوله وهو الاصح) اى كون المعتبر فى السوائم يوم الاداء اجماعا هو الاصح

فانه ذكر في البدائع انه قيل ان المعتبر عنده فيها يوم الوجوب، وقيل يوم الاداء اهـ وفي المحيط : يعتبر يوم الاداء بالاجماع وهو الاصح اهـ فهو تصحيح للقول الثاني الموافق لقولهما وعليه فاعتبار يوم الاداء يكون متفقا عليه عنده وعندهما.

وفي الفقه الاسلامي (۱۸۷۱/۳): يقوم التاجر العروض أو البضائع التجارية في آخر كل عام بحسب سعرها في وقت اخراج الزكاة لا بحسب سعر شرائها كثياب وجلود ومواد تموينية وتجب الزكاة بلا خلاف في قيمة العروض لافي عينها لان النصاب معتبر بالقيمة فكانت الزكاة منها.

(۹۸) زکوٰۃ دیتے وقت مستحق کو بتانا ضروری نہیں

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ کسی آدمی کو زکوٰۃ کی رقم دیتے ہوئے یہ کہنا ضروری ہے کہ یہ زکوٰۃ کی رقم ہے اسکو قبول کرلو یا نہیں؟ اسی طرح اگر کسی طالبعلم کو بطور انعام کے زکوٰۃ کی رقم دیدی جائے تو کیا اس طرح کہنے اور دینے سے زکوٰۃ ادا ہو جائیگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً......کسی آدمی کو زکوٰۃ دیتے وقت یہ کہنا ضروری نہیں ہے کہ یہ زکوٰۃ کی رقم ہے اسکو قبول کرلو بلکہ صرف نیت کرلینا کافی ہے اس سے زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے اور اگر کسی طالبعلم کو بطور انعام زکوٰۃ کی رقم دیدی جائے تو زکوٰۃ ادا ہو جائیگی بشرطیکہ وہ طالبعلم مستحق زکوٰۃ ہو یعنی سیّد یا صاحبِ نصاب نہ ہو۔

لما في الشامية (۲۶۸/۲): (قوله نية) اشار الیٰ انه لااعتبار للتسمية، فلو سماها هبة او قرضا تجزيه في الأصح والى أنه لو نوى الزكاة والتطوع وقع عنها عند الثاني لان نية الفرض اقوى وعند الثالث يقع عنه والى انه ليس للفقير اخذها بلا علمه الا اذالم يكن في قرابته أو قبيلته احوج منه فيصح حكما لا ديانة.　　والله اعلم بالصواب

(۹۹) قیدی کو رہائی کے واسطے مال زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید جیل میں ہے اور جیل والے رہائی کیلئے رشوت کے طور پر پیسے مانگتے ہیں، اب عمرو اپنی زکوٰۃ کی رقم کے ذریعہ سے زید کو رہا کروانا چاہتا ہے تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ عمرو کا اس طرح رشوت کے طور پر زکوٰۃ کی رقم ادا کرنے سے زکوٰۃ شرعاً ادا ہو جائے گی یا زکوٰۃ کے علاوہ پیسوں سے زید کو رہا کروائے۔ براہِ کرم قرآن وسنت کے مطابق جواب تحریر فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......رشوت کا لین دین حرام اور ناجائز ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے راشی (رشوت دینے والا) اور مرتشی (رشوت لینے والا) پر لعنت فرمائی ہے البتہ اگر کوئی دفع ظلم یا اپنی اور اپنے اہل وعیال کی عزت وآبرو کے دفاع کیلئے یا اپنا حق وصول کرنے

کیلئے رشوت دیتا ہے تو اس کی گنجائش ہے لیکن لینا اس صورت میں بھی حرام ہے۔لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر زید کو بے گناہ قید کر رکھا ہے اور عمرو اس کی آزادی کیلئے رقم دینا چاہتا ہے تو اس کی گنجائش ہے۔ چونکہ ادائیگی زکوٰۃ کیلئے تملیک فقیر شرط ہے لہٰذا اگر عمرو زکوٰۃ کی رقم سے آزاد کرانا چاہتا ہے تو عمرو کی زکوٰۃ اس وقت ادا ہوگی کہ زید مستحق زکوٰۃ ہو، اور اس کو یا اس کے وکیل کو اس رقم کا مالک بنا دیا جائے۔ یا پھر اس کی اجازت سے خود وکیل بن کر ادا کر دی جائے۔

لما فی الولو الجیة(۴/۶): ان کان یرشوه لانه قدخوّفه فیعطیه الرشوة لیدفع الخوف عن نفسه فهذه الرشوة لایحل للآخذ أخذه لان الکف عن التخویف کف عن الظلم وانه واجب بدین الاسلام فلا یحل أخذ الرشوة لذالک ویحل للمعطی الاعطاء لانه جعل المال وقایة للنفس وهذا جائز موافق للشرع وکذالک اذا طمع ظالم فی ماله فرشاه ببعض ماله لایحل للآخذ ویحل الاعطاء.

وفی بدائع الصنائع(۲/۴۵۷): ولو قضی دین حی فقیر، ان قضی بغیر أمره، لم یجز، لانه لم یوجد التملیک من الفقیر) لعدم قبضه وان کان بأمره یجوز عن الزکاة لوجود التملیک من الفقیر لأنه لما امره به صار وکیلاً عنه فی القبض فصار کأن الفقیر قبض الصدقة بنفسه وملکه من الغریم.

(۱۰۰) حاجتمند ماں باپ کو زکوٰۃ دینا

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ایک دوست کی شادی ہوئی دو سال تک وہ اپنے والدین کے ساتھ ہی رہا پھر ان دو سالوں میں جیسا کہ اکثر گھروں میں ساس بہو کا جھگڑا ہوتا رہتا ہے ان کے ہاں بھی اکثر ہو جاتا تھا جس کی وجہ سے انہیں والدین نے اپنے کاروبار اور گھر سے الگ کر دیا، اس نے جا کر کاروبار شروع کر دیا اللہ نے کافی نوازا بڑا مالدار ہو گیا، اب اس کے والدین بہت غریب ہیں تو کیا یہ اپنے والدین کو زکوٰۃ دے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... والدین کو زکوٰۃ دینا از روئے شرع جائز نہیں، اگر والدین غریب ہیں تو اس شخص کے ذمہ والدین کا نان ونفقہ واجب ہے اور صلہ رحمی کے طور پر بھی والدین کی امداد کی جائے۔

وفی الدر المختار مع رد(۲/۳۴۶): (ولا) الی (من بینهما ولاد) ای بینه وبین المدفوع الیه لان منافع الاملاک بینهم متصلة فلا یتحقق التملیک علی الکمال.

(۱۰۱) بذریعہ حیلہ والدین تک زکوٰۃ کا مال پہنچانے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں میں ایک شخص ہے جو کہ غریب ہے لیکن اُس کا بیٹا مالدار ہے، تو اس کا بیٹا اس طرح کرتا ہے کہ وہ زکوٰۃ کی رقم کسی غریب کو دیتا ہے اور بعد میں وہی غریب آدمی اس زکوٰۃ کی رقم

اس مالدار کے والد کو ہبہ کرتا ہے۔ تو کیا اس مالدار شخص کا زکوٰۃ دینا صحیح ہوتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... والدین کے ساتھ حسن سلوک اور ان کے ساتھ ہر طرح سے بھلائی کا حکم کلام پاک میں اور احادیث نبویہ میں متعدد بار دیا گیا ہے اور شرعاً والدین کا نفقہ اولاد کے ذمہ واجب ہے اسی وجہ سے والدین کو زکوٰۃ کا مال دینا شریعت میں ناجائز قرار دیا گیا ہے لہٰذا والدین تک حیلہ کے ذریعے سے مالِ زکوٰۃ پہنچانا، بہت زیادہ قبیح عمل ہے اور والدین کے واجبی حق ادا نہ کرنے کے مترادف ہے البتہ اگر کسی نے ایسا حیلہ اختیار کرلیا تو اس کی زکوٰۃ کی ادائیگی درست ہو جائے گی۔

لما في الشامية(۲/۳۴۶): فرع يكره ان يحتال في صرف الزكاة الى والديه المعسرين بان تصدق بها على فقير ثم صرفها الفقير اليهما كما في القنية قال في شرح الوهبانية وهي شهيرة مذكورة في غالب الكتب.

(۱۰۲) اپنے غریب بیٹے کو زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک بیٹا ہے جو بہت ہی غریب ہے اس کے چار بچے ہیں تو کیا میں اس کو زکوٰۃ دے سکتا ہوں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اپنے اصول وفروع کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں اگر چہ وہ غریب ہوں، لہٰذا صورت مسئولہ میں اپنے بیٹے کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں۔

لما في الهندية(۱/۱۸۸): ولايدفع إلى أصله وإن علا وفرعه وإن سفل كذا في الكافي.

وفي الشامية(۲/۳۴۶): (قوله وإلى من بينهما ولاد) اى بينه وبين المدفوع إليه لأن منافع الاملاک بينهم متصلة فلا يتحقق التمليک على الكمال ......اى أصله وإن علا كابويه وأجداده وجداته من قبلهما وفرعه وإن سفل...... كاولاد الاولاد...... .

(۱۰۳) بھائی کا بھائی کو زکوٰۃ دینا اور اس پر وارد ہونے والے اعتراض کا جواب

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فقہ کی کتابوں میں مصرح ہے کہ آدمی اپنے باپ کو یا اپنے بیٹے کو یا اپنی بیوی وغیرہ کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا ہے اور اس کی علت کتابوں میں یہ بیان کی جاتی ہے کہ چونکہ ان رشتوں میں آپس میں منافع مشترک ہوتے ہیں لہٰذا اس وجہ سے آدمی ان کو زکوٰۃ ادا نہیں کرسکتا ہے اب فقہاء احناف نے اس معاملہ میں اصل علت ''منافع مشترک'' کو بیان کیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر اسی علت کو مدار بنالیا جائے تو اگر کسی کا بھائی اس کے ساتھ رہتا ہے اور اس نے اپنے بھائی کو اپنے مال وغیرہ میں تصرف کرنے کی اجازت دی ہوئی ہے اور منافع مشترک ہیں تو کیا یہ شخص اپنے اس بھائی کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا ہے کیونکہ

علت جو کہ ”منافع مشترک“ ہے اس میں بھی پائی جارہی ہے اور اگر دے سکتا ہے تو پھر اس علت کا کیا جواب ہوگا جو کہ کتب فقہ میں مصرح ہے۔ برائے مہربانی اس اشکال کا تشفی بخش جواب عنایت فرمائیں۔ شکریہ۔

الجواب حامداً ومصلیاً ...... صورت مسئولہ میں آپ کا بہن بھائیوں کو والدین پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ اس لئے کہ والدین کو اور اپنی اولاد کو اور شوہر کا اپنی بیوی کو زکوٰۃ نہ دینا یہ اجماعی مسئلہ ہے۔ اور بیوی اپنے شوہر کو زکوٰۃ دے سکتی ہے یا نہیں؟ اس صورت میں حضرات فقہاء کرام کے درمیان اختلاف ہے، حضرات احناف کے نزدیک نہیں دے سکتی، اس لئے کہ بیوی کا نفقہ شوہر کے ذمہ شرعاً واجب ہوتا ہے اور جب بیوی شوہر کو زکوٰۃ دے گی تو شوہر وہی مال نفقہ کی صورت میں بیوی کو دے گا تو گویا بیوی کا اپنی ذات کو زکوٰۃ دینا لازم آئے گا جو کہ جائز نہیں ہے۔ بخلاف بہن بھائیوں کے کہ ان کا نفقہ قضاء قاضی کے بغیر لازم نہیں ہوتا اس لئے ان کو زکوٰۃ دینے کی صورت میں مذکورہ بالا علت بھی نہیں پائی جارہی ہے تو ان کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں۔

لما في الشامية (۲/۳۴۶): (قوله وإلى من بينهما ولاد) اى بينه وبين المدفوع اليه لان منافع الاملاک بينهم متصلة فلا يتحقق التمليک على الكمال هداية والولاد .... أى اصله وان علا كأبويه واجداده وجداته من قبلهما وفرعه وان سفل ...... وشمل الولاد بالنكاح والسفاح فلا يدفع الى ولده من الزنا ولا إلى من نفاه كما سيأتي .... وقيد بالولاد لجوازه لبقية الاقارب كالإخوة والاعمام والاخوال الفقراء بل هم اولىٰ لانه صلة وصدقة. وفي الظهيرية: ويبدأ في الصدقات بالاقارب، ثم الموالي ثم الجيران .... الخ.

وفي اعلاء السنن(۹/۸۸): قوله: عن علي رضي الله عنه. الخ ...... قال المؤلف: دلالته على ان الزكاة الولد للوالد وبالعكس لاتجوز ظاهرة، والولد عام لجميع الفروع، والوالد عام لجميع الاصول، قال ابن قدامة في المغني: قال ابن المنذر: اجمع اهل العلم على ان الزكاة لايجوز دفعها الى الوالدين في الحال التي يجبر الدافع اليهم على النفقة عليهم......اهـ. وفي رحمة الامة: واتفقوا على انه لا يجوز دفع الزكاة إلى الوالدين وان علوا، والمولودين وان سفلوا ...... قلت: ولكن لفظ الاثر يعم كل والد وان علا، وكل ولد وان سفل، والله تعالىٰ اعلم قال ابن المنذر: اجمعوا على ان الرجل لايعطي زوجته من الزكاة واما اعطاؤها للزوج فاختلف فيه، قال المؤلف، لم يجز اداء الزكاة إلى الزوج عند امامنا الاعظم رحمة الله عليه .... الخ.

(۱۰۴) بیوی یا مطلقہ معتدہ کو نفقہ کی رقم بنیت زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری شادی آج سے دس سال پہلے ہوئی تھی، میری بیوی

غریب گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ لیکن اس سے میری کوئی اولاد نہیں ہوئی، اور ہماری بنتی بھی زیادہ نہ تھی۔ پچھلے ماہ میں نے اسے سنت کے مطابق طلاق دیدی، بچاری چونکہ غریب گھرانے کی ہے اس لئے اس کی حالت ابھی صحیح نہیں ہے۔ وہ مستحق زکوٰۃ بھی ہے۔ تو کیا میں نفقہ والی رقم اسے زکوٰۃ کی نیت سے دے سکتا ہوں؟ یا اس کے علاوہ رقم زکوٰۃ کی نیت سے اسے دیدوں تو کیسا ہے؟ اس مسئلہ کو جلد بتادیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... بیوی یا مطلقہ معتدہ کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ اپنی اس مطلقہ بیوی کو نفقہ کی رقم زکوٰۃ کی نیت سے نہیں دے سکتے۔ البتہ عدت ختم ہونے کے بعد اگر وہ مستحق ہے تو اس کی اعانت زکوٰۃ سے کی جا سکتی ہے۔

لمافي البحر الرائق(۲/۲۴۴): (قوله وزوجته وزوجها) اى لا يجوز الدفع لزوجته ولا دفع المرأة لزوجها..... أطلق الروجة فشمل الزوجة من وجه فلا يجوز الدفع الى معتدة من بائن ولو بثلاث.

وفي الهندية(۱/۴۶۸): الرجعة ابقاء النكاح على ما كان مادامت في العدة.

وفي الدر المختار (۳/۳۹۷): باب الرجعة: (هي استدامة الملك القائم) بلا عوض ما دامت (في العدة).

وفيه ايضاً(۲/۳۴۶): (ولا) الى (من بينهما ولاد) ولو مملوكا لفقير (أو) بينهما (زوجية) ولو مبانة.
(قوله ولو مبانة) اى في العدة ولو بثلاث.

(۱۰۵) کیا سید کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک دوست ہے جو اپنے آپ کو سید ظاہر کرتا ہے اور وہ بہت غریب ہے میرا ارادہ ہے کہ اس سال زکوٰۃ کی رقم اس کو دوں تاکہ وہ ضروریات پوری کر سکے تو کیا اس کو زکوٰۃ دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... زکوٰۃ کی رقم سید کو دینا جائز نہیں۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں ایسے دوست کو جو اپنے آپ کو سید ظاہر کرتا ہو، اور وہ واقعتاً سید بھی ہو تو اس کو زکوٰۃ کی رقم دینا جائز نہیں تاہم ان کی مدد ہدیہ وغیرہ سے کرنا چاہئے جو کہ ان شاء اللہ باعث ثواب اور پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا موجب ہوگا۔

لمافي التبيين (۲/۱۲۶): أو هاشمي: أى لا يجوز دفعها إلى بني هاشم لقوله عليه السلام "ان هذه الصدقات انما أوساخ الناس وانها لاتحل لمحمد ولا لأل محمد" رواه مسلم وقال عليه السلام نحن اهل بيت لا تحل لنا الصدقة رواه البخارى.

وفي الهندية(۱/۱۸۹): ولا يدفع الى بنى هاشم وهم آل على وآل عباس وآل جعفر وآل عقيل وآل الحرث بن عبدالمطلب كذا في الهداية.

وفي الشامية(۲/۳۵۰): (قوله و الى بنى هاشم الخ) اعلم ان عبدمناف وهو الاب الرابع للنبى ﷺ

أعقب أربعة وهم: هاشم والمطلب ونوفل وعبدالشمس. ثم هاشم أعقب اربعة انقطع نسل الكل الا عبدالمطلب فأنه أعقب اثنى عشر تصرف الزكاة الى اولاد كل اذا كانوا مسلمين فقراء الا اولاد عباس وحارث واولادابى طالب من على وجعفر وعقيل.

(۱۰۶) سیدہ کی غیر سید اولاد کو زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے پڑوس میں ایک صاحب رہتے ہیں ان کے تین بچے ہیں انتہائی غربت اور کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ میں نے اپنے چند دوستوں کے ساتھ مل کر ان کے لئے کچھ زکوٰۃ کی رقم جمع کی ہے اب کل جب یہ رقم میں ان کو دینے جارہا تھا تو اباجی کو معلوم ہوگیا کہ وہ کہنے لگے کہ بیٹا نہیں زکوٰۃ کی رقم دینا درست نہیں؟ کیونکہ ان کی والدہ سیدہ تھیں۔ اور میری امی جان کہنے لگیں کہ ماں کا اعتبار نہیں ہوتا، باپ کو دیکھا جاتا ہے اور ان کا باپ سید نہیں ہے۔ میں عجیب تذبذب کا شکار ہوگیا۔ پھر ذہن میں آیا کہ کیوں نہ تحریراً اس کا فتویٰ ہی نکلوالوں۔ اسی لئے آپ کو زحمت دے رہا ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً ...... نسب باپ سے ثابت ہوتا ہے اگر باپ سید ہے تو اولاد سادات میں شمار ہوگی ان کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہوگا اور اگر صرف ماں سیدہ ہے تو اولاد سادات نہیں ہوگی ان کو زکوٰۃ دینا جائز ہے۔ صورت مسئولہ میں آپ کی والدہ کی بات درست ہے آپ ان کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں۔

لمافي تفسير روح البيان(۱/۳٦۴): (وعلى المولود له) اى وعلى الذى يولدله وهو الوالد وانما لم يقل على الوالد ليعلم ان الاولاد للآباء لأن الزوجة انما تلدالولد للزوج ولذلك ينسبون اليهم لا الى الامهات.

وفي التاتارخانيه(۳/۸٦): وفي الظهيرية: امرأة ولدت بعد موت زوجها مابينها وبين الموت سنتان ان صدقها الورثة في الولادة يثبت النسب من الميت في حق من صدقها.

وفي الشامية(۳/۵۴۰): فصل في ثبوت النسب:..... ذكر ما يلزم من اعتداد ذوات الحمل وهو ثبوت النسب وهو مصدر نسبه الى ابيه.

(۱۰۷) وکیل کا غیر مستحق کو زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا دبئی میں بہت بڑا کاروبار ہے جس کی وجہ سے مجھے اکثر دبئی جانا پڑتا ہے اس بار میں نے دبئی جانے سے قبل جتنی مجھ پر زکوٰۃ بن رہی تھی اس تمام رقم کا اپنے دوست کو وکیل بنادیا کہ میری طرف سے اس کو مستحقین میں تقسیم کردینا لیکن وکیل نے زکوٰۃ کی رقم ایک صاحب جو کہ ہاشمی تھے ان کو دیدی تو کیا وکیل پر ضمان آئے گا یا

نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً اگر وکیل کو اس کے مستحق (غیر ہاشمی وغیرہ) ہونے کا غالب گمان تھا یا وکیل کو شک ہو لیکن پوچھنے پر مستحق معلوم ہوا یا اس کو فقراء کی صف میں ان کی ہیئت میں دیکھ اور مستحق سمجھ کر زکوۃ دیدی تو ان صورتوں میں زکوۃ ادا ہوگئی لہٰذا وکیل پر کوئی ضمان نہیں آئے گا اور اگر وکیل کو اس کے غیر مستحق (ہاشمی وغیرہ) ہونے کا غالب گمان تھا یا اس کو شک ہوا لیکن تحقیق کئے بغیر زکوۃ اس کے حوالے کر دی تو ان صورتوں میں زکوۃ ادا نہیں ہوئی لہٰذا وکیل پر اس کا ضمان آئے گا۔

لما فی الهندية(۱/۱۸۹): اذا شک وتحری فوقع فی اکبر رأيه أنه محل الصدقة فدفع اليه أو سأل منه فدفع أو رآه فی صف الفقراء فدفع فان ظهر أنه محل الصدقة جاز بالاجماع وكذا ان لم يظهر حاله عنده. وأما إذا ظهر انه غنی أو هاشمی ... فإنه يجوز و تسقط عنه الزكاة فی قول أبی حنيفة ومحمد رحمهما الله تعالی هكذا فی شرح الطحاوی واذا دفعها ولم يخطر بباله أنه مصرف أم لا فهو علی الجواز الا اذا تبين أنه غير مصرف وإذا دفعها اليه وهو شاک ولم يتحر أو تحری ولم يظهر له انه مصرف أو غلب علی ظنه أنه ليس بمصرف فهو علی الفساد إلا اذا تبين أنه مصرف.

وفی الشامية(۲/۳۵۲): أما لو تحری فدفع لمن ظنه غير مصرف أو شک ولم يتحر لم يجز حتی يظهر أنه مصرف فيجزيه فی الصحيح واعلم أن المدفوع اليه لو كان جالساً فی صف الفقراء يصنع صنعهم أو كان عليه زيهم او سأله فأعطاه كانت هذه الاسباب بمنزلة التحری..... حتی لو ظهر غناه لم يعد (قوله ولو دفع بلا تحر) ای ولا شک كما فی الفتح وفی القهستانی بأن لم يخطر بباله أنه مصرف أو لا (وقوله لم يجز ان اخطأ) ای إن تبين له أنه غير مصرف فلولم يظهر له شیء فهو علی الجواز.

(۱۰۸) وکیل کا اصل رقم اپنے پاس رکھ کر اپنی طرف سے رقم ادا کرنے سے زکوۃ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ایک ماموں زاد بھائی ہیں جو کہ دبئی میں کاروبار کرتے ہیں کچھ عرصہ پہلے وہ پاکستان آئے ہوئے تھے تو میں ان سے ملنے کیلئے ان کے گھر گیا خیریت دریافت کرنے کے بعد انہوں نے اپنے کاروبار کے متعلق کچھ تفصیل بتائی۔ان کا بہت اچھی پیمانے پر کاروبار تھا۔آخر میں میں نے ان کو مال تجارت کی زکوۃ کے متعلق بتایا کہ مال تجارت پر زکوۃ واجب ہوتی ہے تو انہوں نے کہا ٹھیک ہے میں ہر سال ضرور زکوۃ ادا کروں گا۔اس سال کی زکوۃ جتنی بنتی تھی انہوں نے حساب لگا کر مجھے بطور وکیل دے دی کہ تم میری طرف سے زکوۃ ادا کر دینا تو میں نے وہ رقم ان سے لے لی۔پھر بعد میں میں نے اپنی رقم سے بطور وکالت کے ان کی طرف سے زکوۃ ادا کی۔اب پوچھنا یہ ہے کہ اگر کسی نے وکیل کو زکوۃ کی رقم دی تاکہ وہ کسی مستحق

آدمی کو دیدے، لیکن وکیل نے وہ معینہ رقم مستحق آدمی کو نہیں دی بلکہ اس نے اپنے پاس سے روپے ادا کر دیئے اور یہ خیال کیا کہ وہ روپے خود لے لے گا تو کیا اس صورت میں زکوٰۃ ادا ہو جائے گی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً صورت مسئولہ میں بہتر یہ ہے کہ اصل رقم ہی مستحق آدمی تک پہنچائی جائے البتہ اگر وکیل اصل رقم خود رکھ لیتا ہے اور اپنی طرف سے دوسرے روپے ادا کر دیتا ہے تو اس صورت میں بھی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

لمافی الدر المختار (٢/٢٦٩): (ولو خلط زکوة موکليه ضمن)

وفي الشامية تحته: (قوله ضمن وكان متبرعا) لانه ملكه بالخلط وصار مؤديا مال نفسه قال في التاتارخانية إلا إذا وجد الإذن أو أجاز المالكان اهـ اى أجاز قبل الدفع الى الفقير.

وفيه ايضاً (٥/١٥٣): مطلب فيما تتعين فيه النقود ومالا يتعين...... قوله (كنقود) فاذا اشترى بهذا الدرهم له دفع درهم غيره وعدم التعين النقد ليس على اطلاقه بل ذالك في المعاوضات وفي العقد الفاسد على احد الروايتين ... وفي النذر والأمانات والهبة والصدقة والشركة والمضاربة والغصب والوكالة قبل التسليم أو بعده.

وفي تقريرات الرافعي (٥/١٤٦): وفي البزازية النقود قبل التسليم الى الوكيل لاتتعين و بعده قيل لا تتعين حتى لاتبطل الوكالة بالهلاك وقال أكثر مشايخنا تتعين وتبطل بهلا كها...... وفي حاشية الحموى ذكر في غاية البيان ان المختار عدم التعين.

(١٠٩) پیش امام کو زکوٰۃ اور صدقاتِ واجبہ دینے کا حکم

سوال :کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقہ میں یہ دستور ہے کہ جب ایک عالم کو اپنا پیش امام بناتے ہیں تو اس کے لئے کسی قسم کی تنخواہ یا نفقہ مقرر نہیں کرتے۔ بلکہ علاقہ کی رسم یہ ہے کہ لوگ یعنی محلے والے اس امام کو زکوٰۃ اور دیگر چیز جو صدقہ واجبہ سے ہو جیسے صدقہ فطر وغیرہ دیتے ہیں پہلے سے یہ بات طے نہیں ہوتی کہ میں امامت کروں گا تو تم مجھ کو زکوٰۃ وغیرہ دینا اس لئے پیش امام کو زکوٰۃ دینا امام کو بھی معلوم ہے کہ یہ رسم کی وجہ سے ہے یا امامت کی وجہ سے ہے اس لئے کہ کوئی تنخواہ نہیں اور قوم کو بھی معلوم ہے۔ کیا اس طرح امامت کرنے سے قوم کی زکوٰۃ نکلتی ہے یا نہیں اور پیش امام کیلئے اس طرح امامت کرنے میں کچھ بری بات ہے یا نہیں؟ اور اگر جائز نہیں تو بسبب مجبوری حیلہ جواز کر سکتے ہیں یا نہیں یعنی حیلہ جواز کی وجہ سے یہ "صدقات واجبہ" پیش امام کو دیدیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً .... زکوٰۃ اور صدقات واجبہ کی ادائیگی کیلئے ضروری ہے کہ فقراء وغیرہم کو زکوٰۃ کے مال کا مالک بنا دیا جائے اور یہ مالک بنانا بھی بغیر کسی عوض کے ہو۔ صورت مسئولہ میں کیونکہ امام صاحب کو زکوٰۃ اور صدقات واجبہ کی رقم امامت کی وجہ سے دی جا رہی ہے اگر چہ یہ بات طے نہیں ہوتی لیکن جب معروف یہی ہے اور رسم یہی چلی آ رہی ہے کہ زکوٰۃ ہی امام صاحب کو بطورِ اجرت (تنخواہ)

کے دی جائے گی تو اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی زکوٰۃ کے مال کو اصل مال کی میل کچیل قرار دیا گیا ہے اور امامت جیسے مقدس ومحترم پیشے کیلئے "زکوٰۃ کے مال کو" بطور اجرت کے دینا درست نہیں، بلکہ اہل علاقہ کیلئے ضروری ہے کہ اس رسم کو ختم کر کے امام صاحب کیلئے الگ سے اجرت متعین کریں تاکہ امام صاحب معاش کی فکر سے فارغ ہو کر احسن طریقہ سے امامت کی خدمت سرانجام دے سکیں۔ اور امام صاحب کو بھی چاہئے کہ امامت جیسے مقدس فریضہ کیلئے زکوٰۃ کے مال کو بطور اجرت کے نہ لیں۔ کیونکہ زکوٰۃ حقیقت میں فقراء اور مساکین کا حق ہے۔ اس لئے زکوٰۃ کے مال کو بطور اجرت لینے اور دینے سے مکمل اجتناب کرنا چاہئے۔ ہاں! اگر امام صاحب کی تنخواہ الگ سے متعین کر لی جائے اور امام صاحب سید یا صاحب نصاب نہ ہوں تو ان کو زکوٰۃ اور صدقات واجبہ دینا درست ہوگا کیونکہ اب زکوٰۃ بغیر عوض کے اور مستحق (فقیر) کو دی جارہی ہے اس لئے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

لما فی القرآن المجید (سورۃ التوبہ: ٦٠): انما الصدقٰت للفقرآء والمسٰکین والعٰملین علیها والمولفة قلوبهم وفی الرقاب والغرمین وفی سبیل الله وابن السبیل ط فریضة من الله ط والله علیم حکیمo

وفی الکنز الدقائق (ص۵۵): هی تملیک المال بغیر عوض من فقیر مسلم غیر هاشمی.

وفی الهندیة (١/١٧٠): اما تفسیرها: فهی تملیک المال من فقیر مسلم غیر هاشمی ولا مولاه بشرط قطع المنفعة عن الملک من کل وجه لله تعالیٰ.

وفی الشامیة (٣/٥٥٦): قالوا المعروف عرفا کالمشروط نصاً.

(۱۱۰) ساس اور پھوپھی کو زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا اچھا خاصا کاروبار ہے تبلیغی جماعت میں وقت لگانے سے قبل اس طرف توجہ ہی نہ تھی لیکن اس کے بعد میں نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ آئندہ ہر سال زکوٰۃ ادا کروں گا آپ سے پوچھنا یہ ہے کہ میرے پاس نصاب سے زائد مال موجود ہے جس پر سال بھی گزر چکا ہے اب میرا ارادہ ہے کہ اس کی زکوٰۃ نکال دوں، تو کیا یہ زکوٰۃ میں اپنی ساس اور پھوپھی کو دے سکتا ہوں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... اگر آپ کی ساس اور پھوپھی زکوٰۃ کی مستحق ہیں (سید یا صاحب نصاب نہیں ہیں) تو ان کو زکوٰۃ دینا نا صرف جائز بلکہ اولیٰ ہے۔

لما فی الهندیة (١/١٩٠): والافضل فی الزکاة والفطر والنذور الصرف اوّلاً الی الاخوة والاخوات ثم الی اولادهم ثم الی الاعمام والعمات ثم الی اولادهم ثم الی الاخوال والخالات ثم الی اولادهم ثم الی ذوی الارحام.

وفی الشامیۃ(۲/۳۴۶): (قولہ: والی من بینھما ولاد) ای بینہ وبین المدفوع الیہ لأن منافع الأملاک بینھم متصلۃ فلا یتحقق التملیک علی الکمال ھدایۃ، والولاد بالکسر مصدر ولدت المرأۃ ولا دۃ و ولادا مغرب ای اصلہ وان علا کأبویہ واجدادہ وجداتہ من قبلھما وفرعہ وان سفل ... وقید بالولاد لجوازہ لبقیۃ الأقارب کالإخوۃ والأعمام والأخوال الفقراء بل ھم أولیٰ لأنہ صلۃ وصدقۃ.

وفی الفقہ الاسلامی وادلتہ (۳/۱۹۷۰): ویجوز دفع الزکاۃ الی بقیۃ الأقارب الفقراء غیر المذکورین کالأخ والأخت والعمۃ والعم والخال والخالۃ ونحوھم...... ویجوز دفع الزکاۃ لزوجۃ أبیہ و ابنہ وزوج ابنتہ.

(۱۱۱) بھیک مانگنے والوں کو زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ہر سال اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرتا ہوں اور میری اکثر یہی کوشش ہوتی ہے کہ میں اپنے ملک کے غریب اور فقراء کی اس زکوٰۃ کی رقم سے مدد کروں۔ چنانچہ میں اس تلاش میں رہتا ہوں کہ کوئی معذور، غریب اور نادار شخص کو دیکھوں اور اس کی زکوٰۃ کے ذریعے مدد کروں۔ لیکن بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ کافی صحت مند ہوتے ہیں مگر کام کرنے کی بجائے بھیک مانگ کر گزر اوقات کرتے ہیں تو ایسے لوگوں کو زکوٰۃ دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: ایسے لوگوں کو زکوٰۃ دینا جائز ہے جب تک ان کا صاحب نصاب ہونا معلوم نہ ہو جائے۔ تاہم بہتر اور اولیٰ یہ ہے کہ ان پیشہ ور فقیروں کی بجائے سفید پوش مستحقین لوگوں کو زکوٰۃ کی رقم دی جائے۔

لما فی الھندیۃ(۱/۱۸۹): ویجوز دفعھا الی من یملک اقل من النصاب وان کان صحیحا مکتسبا ویجوز صرفھا الی من لایحل لہ السؤال اذا لم یملک نصابا.

وفی الطحطاوی علی الدر (۱/۴۲۳): وفی شرح الملتقی ویجوز الدفع الیہ ولو کان صحیحا مکتسبا کما فی العنایۃ لکن فی المعراج انہ لایطیب لہ الاخذ لانہ لایلزم من جواز الدفع جواز الاخذ کظن الغنی فقیرا. وھو غیر صحیح لتصریحھم بجواز اخذھا لمن لا یملک نصابا نعم الاولی عدم الاخذ لمن لہ سداد من عیش.

وفی الدر المختار(۲/۳۳۹):ای مصرف الزکاۃ والعشر......(ھو فقیر وھو من لہ ادنی شئ)ای دون نصاب أو قدر نصاب غیرتام مستغرق فی الحاجۃ (ومسکین من لاشئ لہ) علی المذھب.

(۱۱۲) کام نہ کرنے والے اور فضول بیٹھے رہنے والے کو زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے پڑوس میں ایک شخص ہے جو کوئی کام وغیرہ نہیں کرتا سارا دن ہوٹل پر بیٹھا رہتا ہے۔ آمدنی کا بھی کوئی ذریعہ نہیں بچوں اور بیوی کو کچھ نہیں دیتا۔ اس کے بچے بھیک مانگتے رہتے ہیں تو کیا ایسے شخص کو زکوٰۃ دینا جائز ہے؟ نیز اس کی بیوی اور بچوں کو زکوٰۃ دینا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ......صورتِ مسئولہ میں اس شخص کو اور اس کی بیوی اور بچوں کو زکوٰۃ دینا جائز ہے بشرطیکہ وہ فقیر ہوں (یعنی نصاب سے کم مال کے مالک ہوں) لیکن اس شخص کو تنبیہ وغیرہ کی جائے کہ کام کیا کرو تا کہ وہ زکوٰۃ لینے کا عادی نہ بن جائے۔

لما في الهندية (۱۸۷/۱): (منها الفقير) وهو من له ادنى شي وهو مادون النصاب او قدر نصاب غير نام وهو مستغرق في الحاجة فلا يخرجه عن الفقر ملك نصب كثيرة غير نامية اذا كانت مستغرقة بالحاجة (ومنها المسكين) وهو من لاشي له فيحتاج الى المسئلة لقوته اوما يوارى بدنه ويحل له ذلك بخلاف الاول حيث لاتحل المسئلة له فانها لاتحل لمن يملك قوت يومه بعد سترة بدنه.

وفي الدر المختار (۳۳۹/۲): باب المصرف اى مصرف الزكوة...... (هو فقير وهو من له ادنى شى) اى دون نصاب اوقدر نصاب غير نام مستغرق في الحاجة (ومسكين من لاشى له) على مذهب.

وفي الشامية تحته: (قوله على المذهب) من انه اسوأ حالا من الفقير وقيل على العكس والاول اصح وهو قول عامة السلف.

وفي الشامية (۳۵۲/۲): (قوله الى صبيان اقاربه) اى العقلا والافلا يصح الا بالدفع الى ولى الصغير.

(۱۱۳) ماسی اور چوکیدار کو زکوٰۃ دینا

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ آجکل جو گھروں میں ماسیاں کام کرتی ہیں یا چوکیدار وغیرہ ہوتے ہیں وہ اپنے آپ کو غریب بتا کر مالکوں سے زکوٰۃ لے لیتے ہیں جبکہ ان میں سے بہت سے لوگ مستحق زکوٰۃ نہیں ہوتے، آیا ان کو زکوٰۃ دینے سے زکوٰۃ ادا ہو جائیگی یا نہیں کیونکہ مالکوں کو معلوم نہیں ہوتا کہ آیا وہ واقعی مستحق ہیں یا نہیں اور کیا اس طرح کسی کے کہنے پر یقین کر کے بلا تحقیق اسکو زکوٰۃ دینا درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ......اگر کوئی شخص اپنے آپ کو مستحق زکوٰۃ بتائے یا غریبوں کی سی حالت بنالے یا فقراء کی صف میں بیٹھ جائے اور زکوٰۃ مانگے اور زکوٰۃ دینے والوں کو انکی حقیقت کا علم نہ ہو یا ان کے بارے میں شک ہو لیکن غالب رائے میں انکے مستحق ہونیکا گمان ہو تو زکوٰۃ دینے والوں کی زکوٰۃ ادا ہو جائیگی اگر چہ زکوٰۃ دینے کے بعد معلوم ہو کہ وہ لوگ مستحق نہ تھے۔ ہاں اگر زکوٰۃ دینے والے کو اس بات کا یقین

ہو کہ سائل مستحق نہیں ہے تو اس صورت میں اسکی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔لہٰذا صورت مسئولہ میں ان ملازمین کا اپنے آپ کو مستحق بتانے پر ان کو زکوٰۃ دینے سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔البتہ یہ ماسیاں یا چوکیدار اگر واقعتاً مستحق زکوٰۃ نہیں ہیں تو ان کا اپنے آپ کو مستحق بتا کر زکوٰۃ کا مال لینا بہت گناہ کی بات ہے اس پر بہت وعید آئی ہے۔

لمافی الدر المختار (۳۵۲/۲): (دفع بتحر) لمن يظنه مصرفا (فبان انه عبده أومكاتبه أوحربي ولو مستأمنا أعادها) لما مر (وان بان غناه أو كونه ذميا أو أنه ابوه او ابنه أو امرأته أوهاشمي لا) يعيد لأنه اتى بما في وسعه، حتى لو دفع بلا تحر لم يجز ان اخطأ.

(۱۱۴) ۵۰۰۰ تنخواہ لینے والے مستحق ملازم کو زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گھر میں ایک ماسی کام کرتی ہے اور اس کو ۵۰۰۰ (پانچ ہزار) روپے مشاہرہ ملتا ہے۔تو تنخواہ کے علاوہ محتاج ہونے کی بنا پر اس کی زکوٰۃ سے مدد کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... ہر وہ شخص جو صاحب نصاب نہ ہو یعنی جس کی ملکیت میں ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت کا نقد روپیہ یا سونا یا سامان تجارت یا ان چاروں اشیاء میں سے بعض یا سب کا مجموعہ ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر نہ ہو، تو اس کو زکوٰۃ دینا جائز ہے۔لہٰذا صورت مذکورہ میں ماسی، صاحب نصاب نہ ہونے اور محتاج ہونے کی بنا پر زکوٰۃ کی مستحق ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ مالک اس کو براہ راست زکوٰۃ نہ دے اس لئے کہ بسا اوقات مالک بھی اس سے زیادہ کام لینے کیلئے زکوٰۃ دیتا ہے اور وہ بھی زکوٰۃ لینے کی وجہ سے کبھی زیادہ کام کرتی ہے اور اس سے عوض کا شبہ پیدا ہوتا ہے۔ بلکہ کسی اور شخص کے ذریعے بغیر بتائے اس کو زکوٰۃ دی جائے تو پھر کوئی حرج نہیں۔

لمافي الشامية (۳۳۹/۲): (قوله اى دون نصاب) اى تام فاضل عن الدين فلو مديونا فهو مصرف كماياتى (قوله مستغرق في الحاجة) كدار السكنى وعبيد الخدمة ثياب البذلة وآلات الحرفة وكتب العلم للمحتاج اليها تدريسا او حفظا او تصحيحا كما الخ. والحاصل ان النصاب قسمان موجب للزكاة وهو النامي الخالي عن الدين وغير موجب لها وهوغيره فان كان مستغرقا بالحاجة لمالكه اباح اخذها والاحرمه واوجب غيرها من صدقة الفطر والاضحية ونفقة القريب المحرم كما في البحر وغيره.

وفي مراقي الفلاح على صدر حاشية الطحطاوي (صـ ۵۹۱): (باب المصرف) هو الفقير وهو من يملك ما لا يبلغ نصابا ولا قيمته من اى مال ولو صحيحا مكتسبا قال في حاشية الطحطاوى اويملكه وهو مستغرق في حاجته فمن تحقق فيه هذا او هذا فهو فقير.

(۱۱۵) اس عورت کوزکوۃ دینا جس کا مہر بقدرِ نصاب ہو،لیکن شوہر بوجہ غربت ادانہ کرسکتا ہو

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ایک عورت کا مہر نصاب کے برابر یا اس سے زیادہ ہے لیکن اس کا شوہر بہت زیادہ غریب ہے،ادا نہیں کرسکتا،اور عورت بھی غریب ہے،تو کیا ایسی عورت کوزکوۃ کا پیسہ دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً صورت مسئولہ میں عورت کا مہر اگرچہ بقدر نصاب ہے لیکن اس کا شوہر غریب ہے مہر نہیں دے سکتا اس لئے یہ عورت اس مہر کی وجہ سے مالدار شمار نہیں ہوگی لہٰذا اس کوزکوۃ دینا درست ہے۔

لما في الهندية (۱/۱۸۹): والذى له دين مؤجل على انسان اذا احتاج إلى النفقة يجوز له أن يأخذ الزكاة قدر كفايته إلى حلول الأجل وإن كان الدين غير مؤجل فان كان من عليه الدين معسرا يجوز له أخذ الزكاة في أصح الاقاويل لانه بمنزلة ابن السبيل

وفي الشامية(۲/۳۴۴): وفي الفتح دفع إلى فقيرة لها مهر دين على زوجها يبلغ نصابا وهو موسر بحيث لوطلبت أعطاها لايجوز وإن كان لايعطي لوطلبت جاز. قال في البحر: المراد من المهر ماتعورف تعجيله وإلا فهو دين مؤجل لايمنع وهذا مقيد لعموم مافي الخانية ويكون عدم إعطائه بمنزلة إعساره.

(۱۱۶) صاحب نصاب کا اپنی غیر صاحب نصاب اولاد کیلئے مال زکوۃ پر قبضے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

ایک بیوہ عورت ہے اس کی تین بیٹیاں ہیں (ایک نابالغ اور دو بالغ) اب اس بیوہ کے پاس پانچ تولہ سونا ہے اور کچھ نقدی بھی موجود ہے اس عورت کا ذریعہ معاش کچھ نہیں اور نہ خاوند نے کوئی ترکہ چھوڑا ہے اس بیوہ کا تمام خرچ اس کے بھائی کرتے ہیں۔

(۱)۔اب پوچھنا یہ ہے کہ اس عورت کوزکوۃ دینا جائز ہے اور اس عورت کوزکوۃ لینا جائز ہے؟

(۲)۔کیا ان کی اولاد کوزکوۃ دینا جائز ہے جبکہ وہ بالغ ونابالغ دونوں ہیں؟

(۳)۔اس بیوہ عورت نے یہ سونا اور نقدی اپنی اولاد کی شادی بیاہ کے لئے رکھا ہے اور انہی کے نام کررکھا ہے تو کیا یہ ان کی ملکیت شمار ہوگی تو اس صورت میں زکوۃ کا کیا حکم ہوگا؟

(۴)۔اولاد کی زکوۃ پر والدہ قبضہ کرسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً کسی بھی صاحب نصاب کوزکوۃ دینا یا صاحب نصاب کا کسی دوسرے سے زکوۃ کا لینا ناجائز وحرام ہے۔نیز آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ اگر کسی نے اپنی اولاد کیلئے کوئی چیز محض نام کررکھی ہو تو اس کی دوصورتیں ہیں،اولاد بالغ ہوگی یا نابالغ۔اگر

بالغ ہوتو محض نام کرنے سے اس کی ملکیت شمار نہیں ہوگی بلکہ ان کا قبضہ کرنا ضروری ہے۔ اور اگر نابالغ ہوتو قبضہ کرنا شرط نہیں محض نام کرنے سے ہی اس کی ملکیت میں آ جائے گی۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں چونکہ بیوہ نے سونا اور نقدی اپنی اولاد کیلئے محض نام کررکھی ہے تو جو اولاد نابالغ ہے محض نام کرنے سے ہی ان کی ملکیت ثابت ہوگی لیکن جو اولاد بالغ ہے جب تک ان کے قبضہ میں نہ دے اس وقت تک ان کی ملکیت شمار نہیں ہوگی۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں مذکورہ خاتون نے چونکہ اپنا زیور اور نقدی بچیوں کے صرف نام کیا ہے اس لئے صرف چھوٹی نابالغ بچی کی ملکیت تو اس کے حصے کے بقدر میں ثابت ہوجائے گی البتہ بالغہ لڑکیوں کی ملکیت ثابت نہیں ہوئی اور خاتون اس سونے اور نقدی کی وجہ سے بدستور صاحب نصاب ہیں انھیں زکوٰۃ دینا اور ان کا دوسروں سے زکوٰۃ لینا شرعاً جائز نہیں۔ لیکن ان کی بالغ اولاد اگر مستحق زکوٰۃ ہوتو ان کو زکوٰۃ دینا جائز ہے۔ اور صاحب نصاب ماں اپنی بالغ اولاد کیلئے بطور وکیل قبضہ کرلے تو جائز ہے۔

لمافي الفقه النافع(۱/۳۶۵): ولا يجوز دفع الزكوة الى من يملك نصابا من اى مال كان لأنه غنى ويجوز دفع الزكوة الى من يملك اقل من ذلك وان كان صحيحا مكتسبا.

وفي بدائع الصنائع(۸/۱۱۳): ولو نحل ابنه الصغير شيئا جاز، ويصير قابضا له مع العقد، كما اذا باع ماله منه حتى لو هلك عقيب البيع يهلك من مال الابن لصيرورته قابضا للصغير مع العقد. وينبغي للرجل ان يعدل بين اولاده في النحلي.

وفي الولوالجية(۱/۱۷۸): رجل له مائتا درهم على انسان، هل يحل له أخذ الزكاة؟ ان كان من عليه معسرا فالمختار انه يحل، لان يده زائلة عن ماله، فصار بمنزلة ابن السبيل وان كان من عليه موسرا مقرا بالدين لا يحل، لان يده ثابتة على ماله، لانه يأخذه متى شاء، وان كان منكراً، فان كان له بينة عادلة لا يحل، لأنه في يده معنى، وان لم يكن له بينة عادلة لا يحل ايضا.

وفي الشامية (۲/۳۴۷): ولا إلى غني استثنىٰ منه القهستاني المكاتب وابن السبيل والعامل...... قوله، فارغ عن حاجته، قدر الحاجة هو ما ذكره الكرخي في مختصره فقال: لا بأس أن يعطى من الزكاة من له مسكن، وما يتأثث به في منزله وخادم وفرس وسلاح وثياب البدن ان كان من اهله فان كان له فضل عن ذلك تبلغ قيمته مائتى درهم حرم عليه اخذ الصدقة.

وفي الدر المختار(۲/۳۴۹،۳۵۰): ولا الى طفله بخلاف...... طفل الغنية فيجوز لانتفاء المانع وفي الشامية تحته: (قوله وطفل الغنية) اى ولو لم يكن له أب بحر عن القنية (قوله لانتفاء المانع) علة للجميع والمانع أن الطفل يعد غنياً بغنى ابيه بخلاف الكبير فانه لايعد غنياً بغنى ابيه ولا الأب بغنى ابنه ولا الزوجة بغنى زوجها ولا الطفل بغنى امه ح عن البحر.

(۱۱۷) مزنیہ کے بچوں کو زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے حامد کی بیوی سے کئی مرتبہ زنا کیا تھا، اب حامد فوت ہوگیا ہے اس عورت کے زید سے زنا کے تعلق سے پہلے حامد سے تین بچے ہیں جو کہ غریب ہیں تو کیا زید ان بچوں کو زکوٰۃ کی رقم دے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں جو بچے حامد کے ہیں زید کا ان سے کوئی رشتہ اور تعلق نہیں۔ لہٰذا زید اپنی زکوٰۃ کی رقم ان بچوں کو اگر وہ مستحق ہیں تو دے سکتا ہے۔ تاہم چونکہ ان بچوں کی ماں سے زید کے غلط تعلقات قائم رہ چکے ہیں اس لئے براہ راست خود نہ دے بلکہ کسی اور شخص کے ذریعے سے دلوائے تاکہ اس صلہ رحمی کی وجہ سے دوبارہ اس قسم کے فعل حرام تک نوبت نہ پہنچے۔

لما في فتاویٰ النوازل(ص ۱۴۰): اذا دفع الزکوۃ إلی صغیر عاقل وھو یعقل القبض بأن لا یرمی ولا یخدع عنه یجوز.

وفي الشامیة(۲/۳۵۴): (قوله الا اذا کان الولد الخ) علله فی العمادیة بأن النسب یثبت من الناکح: وقد ذکر فی الصیرفیة جاء ت بولد من الزنا یثبت النسب من الزوج لامن الزانی فی الصحیح فلو دفع صاحب الفراش زکوته الی ھذا الولد یجوز ولو دفع الزانی لایجوز عندنا خلافا للشافعی اھـ. فقد صرح بعدم جواز الدفع الی ولده من الزنا وان کان لھا زوج معروف...... وتصویر المسئلة بالزنی مع العلم بأنھا ذات زوج لیخرج ما اذا لم یعلم ذلک لکون الوطء حینئذ وطء شبھة لازنی ولذا قال فی البحر وخرج ولد المنعی الیھا زوجھا اذا تزوجت ثم ولدت ثم جاء الأول حیا فإن علی قول الامام المرجوع عنه الاولاد للأول ومع ھذا یجوز دفع زکوته الیھم وشھادته لھم کذا فی المعراج لعدم الفرعیة ظاھرا وعلیه فینبغی أن لایجوز ذلک للثانی لوجود الفرعیة حقیقة وان لم یثبت النسب منه لکن المنقول فی الولوالجیة جواز ذلک له علی قول الامام وروی رجوعه وعلیه الفتویٰ وعلیه فللاول الدفع إلیھم دون الثانی.

(۱۱۸) زانی کا فاحشہ عورت کو زکوٰۃ دینا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کے ایک بیوہ کے ساتھ برے تعلقات ہیں کافی مرتبہ زنا کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے اور یہ شخص کافی مالدار ہے جب یہ اپنے مال کی زکوٰۃ نکالتا ہے تو اس بیوہ عورت کو دے دیتا ہے تو کیا اس کی زکوٰۃ ادا ہوجائے گی یا دوبارہ ادا کرنی ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً......زنا اگرچہ فی نفسہٖ شرعاً مذموم وحرام ہے لیکن ادائیگی زکوٰۃ میں نیت اور مصرف کا اعتبار ہے۔ آپ کی تحریر کردہ صورت میں اگر فاحشہ عورت محتاج یعنی مصرف زکوٰۃ ہے اور زانی بنیت زکوٰۃ اسے مال دے دیتا ہے تو فریضہ زکوٰۃ کی ادائیگی ہو جائے گی، لیکن زانی کا اس فاحشہ عورت کو زکوٰۃ دینا مکروہ ہے، لہٰذا اس فاحشہ عورت کو زکوٰۃ دینے سے اجتناب کرے تاکہ ان کے درمیان روابط منقطع ہوں اور باہمی میلان پیدا نہ ہو جو کہ زنا کا سبب بنے۔ نیز یہ کہ صلحاء کو مال زکوٰۃ دے دینا "بشرط مصرف" افضل ہے۔

لما في الهندية(۱/۱۸۷): (منها الفقير) وهو من له ادنى شئ وهو ما دون النصاب او قدر نصاب غير نام وهو مستغرق في الحاجة فلا يخرجه عن الفقر ملك نصاب كثيرة غير نامية اذا كانت مستغرقة بالحاجة، كذا في فتح القدير التصدق على انفقير العالم افضل من التصدق على الجاهل كذا في الزاهدى.

وفي الدر المختار(۲/۳۳۹): اى مصرف الزكاة والعشر...... (هو فقير، وهو من له ادنى شئ) أى دون نصاب اوقدر نصاب غير نام مستغرق في الحاجة.

وفي الشامية تحته: (قوله هو فقير) قدمه تبعا للآية ولأن الفقر شرط في جميع الاصناف الا العامل والمكاتب وابن السبيل.

(۱۱۹) میڈیکل کالج کے طلباء کو زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے گھر کے قریب ایک میڈیکل کالج ہے جس میں کثیر تعداد میں طلباء زیرِ تعلیم ہیں بعض لوگ ان کو زکوٰۃ کی رقم دیتے رہتے ہیں کہ یہ مسافر طلباء ہیں تو کیا ان کو زکوٰۃ دینے سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی؟ نیز میڈیکل کالج وغیرہ کے طلباء کو زکوٰۃ دینا زیادہ افضل ہے یا مدارس دینیہ کے طلباء کو؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں اگر میڈیکل کالج کے طلباء میں کوئی مستحق زکوٰۃ (فقیر غیر ہاشمی) ہو تو اس کو زکوٰۃ کی رقم دی جا سکتی ہے اور اس طرح ان کو زکوٰۃ دینے سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ البتہ دینی مدارس کے طلباء کو زکوٰۃ دینا افضل ہے اس لئے کہ اس میں ترویج دین پر اعانت بھی پائی جاتی ہے۔

لمافي الهندية(۱/۱۸۷): (منها الفقير) وهو من له ادنى شئ وهو مادون النصاب أو قدر نصاب غير نام وهو مستغرق في الحاجة فلا يخرجه عن الفقر ملك نصب كثيرة غير نامية اذا كانت مستغرقة بالحاجة كذا في فتح القدير .التصدق على الفقير العالم أفضل من التصدق على الجاهل كذافي الزاهدى.

وفي الدر المختار(۲/۳۳۹): أى مصرف الزكاة والعشر...... (هو فقير وهو من له أدنى شئ) أى دون نصاب أو قدر نصاب غير نام مستغرق في الحاجة.

(۱۲۰) زکوٰۃ کی مد سے غریب کی شادی کروانے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل جہیز کی پریشانی کی وجہ سے لڑکیوں کی شادی میں دیر ہو جاتی ہے اور معاشرے میں طرح طرح کی برائیاں پھیل رہی ہیں اس کی روک تھام کیلئے ہم لوگوں نے ایک تنظیم بنائی ہے جس کا کام یہ ہوگا کہ وہ لوگوں سے زکوٰۃ اور صدقات وصول کرے گی پھر غریب لڑکے اور لڑکیوں کی شادیوں میں اس رقم کو خرچ کیا جائے گا تو کیا ہمارا یہ کام کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ نیز اس کام کیلئے زکوٰۃ وصول کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... یاد رکھنا چاہئے کہ اسلام نے زندگی کے ہر شعبے میں بنیادی طور پر سادگی اپنانے کی تعلیم دی ہے۔ اور بیجا فضول خرچی (چاہے وہ رسوم کے نام پر ہی کیوں نہ ہو) کی سختی سے ممانعت کی ہے۔ لہٰذا ہمارے موجودہ دور میں شادیوں میں جو رسومات کے نام پر فضول خرچی ہوتی ہے، اس سے سختی سے گریز کرنا چاہئے اور جہیز وغیرہ پر اتنا خرچہ کرنا چاہئے کہ جو استطاعت کے اندر ہو، اور اس کیلئے مقروض نہ ہونا پڑے۔ اس کے بعد یہ واضح ہونا چاہئے کہ ''زکوٰۃ کی ادائیگی کیلئے لازمی شرط یہ ہے کہ اس رقم کو بطور ملکیت کسی مستحق کے حوالہ کیا جائے۔'' اس لئے تنظیم کو چاہئے کہ اولاً کسی اور فنڈ سے اس کارِ خیر کو سرانجام دیں اور اگر کوئی اور فنڈ میسر نہ ہو تو پھر تنظیم براہ راست زکوٰۃ کی جمع کردہ رقم سے شادی کے اخراجات نہ اٹھائے۔ بلکہ جس شخص کی شادی کرانا مقصود ہو تو (اگر وہ مستحق زکوٰۃ ہے تو) ایک سادہ سی شادی کے اخراجات کا اس کو مالک بنا دیا جائے۔ یا لڑکی ہو تو اتنی مقدار کا جہیز اس کو بطور ملک دیدیا جائے۔

لما فی الهندية (۱/۱۷۰): فهي تمليك المال من فقير مسلم غير هاشمي ولا مولاه بشرط قطع المنفعة عن المملك من كل وجه لله تعالىٰ.

وفي ايضاً (۱/۱۹۰): اذا دفع الزكوٰة الى الفقير لايتم الدفع مالم يقبضها أو يقبضها للفقير من له ولاية عليه نحو الاب.

وفي الدر المختار (۲/۳۴۴): ويشترط أن يكون الصرف (تمليكا) لا إباحة، وفي الشامية تحته وفي التمليك. اشارة إلى أنه لا يصرف إلى مجنون و صبي غير مراهق. الا اذا قبض لهما من يجوز له قبضه كالأب والوصي.

وفيه ايضاً (۲/۳۴۵): (قوله فيجوز لو بأمره) أي يجوز عن الزكوٰة على أنه تمليك منه ... لأنه لابدمن كونه تمليكا وهو لايقع عند أمره بل عند اداء المامور وقبض النائب.

(۱۲۱) مہتمم کو زکوٰۃ دینے سے زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل مدارس کے مہتمم حضرات اہل خیر کے پاس جاکر

زکوٰۃ اور دیگر عطیات وصول کرتے ہیں اور بعد میں طلباء کی ضروریات میں خرچ کرتے رہتے ہیں تو کیا مہتمم کو زکوٰۃ دینے سے زکوٰۃ ادا ہوجائے گی یا جب وہ طلباء پر خرچ کرے گا اس وقت ادا ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً چونکہ عام طور پر مہتمم حضرات طلبہ کی طرف سے زکوٰۃ قبضہ کرنے کیلئے وکیل ہوتے ہیں تو ان کو زکوٰۃ دینے سے زکوٰۃ ادا ہوجائے گی کیونکہ وکیل کا قبضہ موکل کا قبضہ ہوتا ہے۔

لمافي الدر المختار(۲/۲۶۹): ولو خلط زكاة موكليه ضمن وكان متبرعا الا اذا وكله الفقراء

وفي الشامية تحته :(قوله ضمن وكان متبرعا)) لانه ملكه بالخلط وصار مؤديا مال نفسه قال في التتارخانية: الا اذا وجد الاذن او اجاز المالكان اى اجاز قبل الدفع الى الفقير.... (قوله اذا وكله الفقراء) لانه كلما قبض شيأ ملكوه وصار خالطا مالهم بعضه ببعض ووقع زكاة عن الدافع.

(۱۲۲) اگر بینک زکوٰۃ کاٹ لے تو زکوٰۃ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے چند سال قبل اپنی رقم بینک میں جمع کرادی تھی تاکہ چوری سے محفوظ ہوجائے اور ہر سال بینک والے اس کی زکوٰۃ کاٹ لیتے ہیں۔تو کیا اس سے زکوٰۃ ادا ہوجاتی ہے یا دوبارہ مجھے خود ادا کرنی ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً صورت مسئولہ میں بینک میں رقم جمع کراتے وقت یا جب انہوں نے زکوٰۃ کی رقم کاٹ لی ہو، اسی وقت اگر آپ نے زکوٰۃ کی نیت کی ہو تو اس بینک میں موجود رقم کی زکوٰۃ ادا ہوجائے گی، اور اگر آپ نے سرے سے زکوٰۃ کی نیت ہی نہیں کی تو اس طرح زکوٰۃ کی رقم آپ کے اکاؤنٹ سے کٹ جانے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔آپ کو دوبارہ زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

لمافي الهندية(۱/۱۷۱): رجل ادى زكاة غيره عن مال ذلك الغير فاجازه المالك فان كان المال قائما في يدالفقير جاز والا فلا.

وفي الشامية(۲/۲۶۹): لو ادى زكاة غيره بغير أمره فبلغه فاجاز لم يجز لانها وجدت نفاذا على المتصدق لانها ملكه ولم يصر نائبا عن غيره فنفذت عليه اهـ لكن قد يقال تجزى عن الامر مطلقا لبقاء الاذن بالدفع قال في البحر: ولو تصدق عنه بامره جاز.

(۱۲۳) بینک والوں کا مالک رقم کی اجازت کے بغیر زکوٰۃ کاٹنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے اور میرے بڑے بھائی ہاشم صاحب نے مل کر کاروبار شروع کیا تھا۔الحمدللہ کچھ ہی عرصہ کے بعد ہم نے حساب لگایا تو ہمیں خوب منافع ہوا چنانچہ ہم دونوں بھائیوں نے آپس کے

مشورے سے منافع شدہ رقم کو بینک میں جمع کروادیا پچھلے مہینے جب میں اپنی رقم نکلوانے کیلئے بینک گیا تاکہ اس کی زکوٰۃ ادا کروں تو بینک والوں نے کہا کہ ہم نے آپ کی اصل رقم پر جتنی زکوٰۃ بنتی تھی ہم نے ادا کردی۔ اب آپ سے پوچھنا یہ ہے کہ اگر حکومت یا بینک والے کھاتے داروں کی اجازت کے بغیر اصل رقم سے زکوٰۃ ادا کریں تو کیا زکوٰۃ ادا ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً صورت مسئولہ کے مطابق اگر حکومت یا بینک والے کھاتہ داروں کی اجازت کے بغیر اصل رقم سے زکوٰۃ ادا کرتے ہیں تو یہ زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔

لمافی الهندية(١/١٧١): رجل ادى زكاة غيره عن مال ذلك الغير فاجازه المالك فان كان المال قائما في يد الفقير جاز والا فلا.

وفي الشامية(٢/٢٦٩): لو أدى زكاة غيره بغير امره فبلغه فأجاز لم يجز لانها وجدت نفاذا على المتصدق لانها ملكه ولم يصر نائبا عن غيره فنفذت عليه لكن قد يقال تجزى عن الأمر مطلقا لبقاء الاذن بالدفع قال في البحر ولو تصدق عنه بامره جاز.

(۱۲۴) زلزلہ زدگان کے امدادی فنڈز میں زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ ابھی حالیہ زلزلہ میں لوگوں نے اپنی زکوٰۃ کی رقم زلزلہ زدگان کے امدادی فنڈ میں جمع کرائی تھی لیکن کوئی یقین کیساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان کی رقم مستحق تک پہنچ چکی ہے کیا اس طرح امدادی فنڈ میں رقم جمع کرانے سے زکوٰۃ ادا ہوجاتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ...زکوٰۃ کی ادائیگی کیلئے مستحق کو مالک بنانا ضروری ہے، پھر اسطرح کی ادائیگی چاہے مالک خود کرے یا کسی کو وکیل بنادے اور وہ آگے مستحق کو وہ رقم دیدے، دونوں صورتوں میں زکوٰۃ ادا ہوجائیگی۔

اب صورت مسئولہ میں اگر صاحب مال کو فنڈ جمع کرنیوالوں پر یقین واعتماد ہے کہ واقعی یہ لوگ مستحقین تک یہ مال پہنچادینگے تو انکو دینے سے زکوٰۃ ادا ہوجائیگی، اور اگر صاحب مال کو ان پر اعتماد نہیں ہے تو ان کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے اور اگر اشتباہ کے باوجود انکو زکوٰۃ کی رقم دیدی تو دوبارہ ادائیگی کرنا پڑے گی۔

لمافي الشامية(٢/٢٦٩): وهناالوكيل انمايستفيد التصرف من المؤكل وقد امره بالدفع الى فلان فلايملك الدفع الى غيره كمالواوصى لزيدبكذاليس للوصى الدفع الى غيره فتأمل.

(۱۲۵) ٹرسٹوں کو زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ پچھلے کئی سالوں سے میرے پاس مختلف ٹرسٹوں کے لوگ

زکوٰۃ وصول کرنے کیلئے آتے رہے اور میں ان کو زکوٰۃ کی رقم زکوٰۃ کی نیت سے دیتا رہا لیکن اس سال میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ یہ مختلف تنظیموں اور ٹرسٹوں والے جو زکوٰۃ اور صدقات وصول کرتے رہتے ہیں، ان کو زکوٰۃ دینے سے زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً...... آجکل ہمارے ہاں مختلف تنظیمیں اور ٹرسٹ زکوٰۃ وصول کرتے ہیں اگر تحقیق سے یقینی طور پر یہ معلوم ہو جائے کہ وہ صحیح مصارف میں خرچ کرتے ہیں تو اس صورت میں زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ اور جن ٹرسٹوں اور تنظیموں کے بارے میں معلوم نہ ہو، اُن کے بارے میں پہلے تشفی کر لی جائے اُس کے بعد اُن کو زکوٰۃ دی جائے۔ اگر بغیر تحقیق کے زکوٰۃ دی اور معلوم ہوا کہ زکوٰۃ انہوں نے صحیح مصرف میں خرچ نہیں کی تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی اور دوبارہ زکوٰۃ دینا لازم ہوگی۔

لـمـافـي الهـنـدية(۱/۱۷۱): اذا وكل في اداء الزكاة أجزأته النية عند الدفع الى الوكيل فان لم ينوى عـنـد الـتـوكـيـل...... فلو دفع الزكاة إلى رجل وأمره أن يدفع الى الفقراء فدفع ولم ينو عند الدفع جاز ولو دفعها الى الذمي ليدفعها الى الفقراء جاز لوجود النية من الآمر.

وفـي الدر المختار (۲/۲۶۹): أو دفعها لذمي ليدفعها لأن المعتبر للفقراء جاز نية الآمر ولذا لو قال هـذا تـطـوع أو عـن كـفـارتي ثم نواه عن الزكاة قبل دفع الوكيل صح ولو خلط زكاة مؤكليه ضمن وكان متبرعاً ألا اذا وكله الفقراء.

وفـي الشـامـية تـحتـه: (قـولـه ضـمـن وكـان تبرعا) لأنه ملكه بالخلط وصار مودياً مال نفسه قال في التاتارخانية إلا اذا وجد الإذن او أجاز المالكان اى أجاز قبل الدفع إلى الفقير...... ويتصل بهذا العالم اذا سأل للفقراء...... قلت مقتضاه أنه لو وجد العرف فلا ضمان لوجود الإذن حينئذ دلالة والظاهر أنه لا بد من علم المالك بهذا لعرف ليكون إذنا منه دلالة.

(۱۲۶) کسی تنظیم یا ٹرسٹ کو زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ میں کہ میں ایک تجارت پیشہ آدمی ہوں، الحمدللہ ہر سال اہتمام سے زکوٰۃ ادا کرتا ہوں اس سال کچھ سیاسی تنظیم والے زکوٰۃ لینے کیلئے میرے پاس آئے لیکن انہیں زکوٰۃ دینے میں مجھے شک پڑا کہ معلوم نہیں انہیں زکوٰۃ دینے سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی یا نہیں؟ اس لئے میں نے چاہا کہ میں پہلے مفتی صاحب سے پوچھ لوں کہ زکوٰۃ کی رقم کسی سیاسی تنظیم یا ٹرسٹ کو یا کسی مذہبی تنظیم کو دینے سے ادا ہو جائیگی؟ یا پہلے تحقیق کر لینا ضروری ہے کہ یہ لوگ صحیح جگہ خرچ کرتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً صورت مسئولہ میں صرف کسی مذہبی یا سیاسی تنظیم کو زکوٰۃ ادا کرنے سے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی بلکہ اسوقت ادا ہوگی جب مصارف میں پہنچ جائے اسلئے تحقیق کر لینا ضروری ہے اور تملیک اسوقت متحقق ہوگی جب فقراء یا ان کے وکیل اس پر قبضہ کر لینگے۔

لمافي الهندية(۱/۱۹۰):اذادفع الزكاة الى الفقير لايتم الدفع مالم يقبضهااويقبضهاللفقيرمن له ولاية عليه.

(۱۲۷) ڈکیتی کے وقت لوٹ کے مال میں ادائیگی زکوٰۃ کی نیت کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری ناظم آباد میں کپڑے کی دکان ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اچھا گزارا ہوجاتا ہے۔ میں پابندی سے صدقہ وخیرات اور زکوٰۃ بھی نکالتا ہوں۔ اب مسئلہ ہمارے ساتھ کچھ یہ ہے کہ کچھ تنظیم والے ہر ماہ آکر پیسہ ہم سے مانگتے ہیں اور زبردستی بھی کرکے لے جاتے ہیں۔ اب اگر میں ان کو پیسے دینے سے پہلے زکوٰۃ کی نیت کرلوں تو کیا وہ رقم زکوٰۃ میں شمار ہوجائے گی؟ اسی طرح اگر کبھی ڈاکو وغیرہ آکر لوٹنے لگیں تو اس وقت اس پیسے میں زکوٰۃ کی نیت کی جا سکتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... ادائیگیٔ زکوٰۃ میں تملیک فقراء ضروری ہے یعنی کسی فقیر کو مالک بنانا۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں تنظیم والے جو رقم وصول کرتے ہیں اگر تنظیم کیلئے وصول کرتے ہیں تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی کیونکہ اس صورت میں تملیک نہیں پائی جاتی اور اگر اپنے لئے وصول کرتے ہیں اور مستحق زکوٰۃ بھی ہیں تب تو ان کو بنیت زکوٰۃ پیسہ دینے سے زکوٰۃ ادا ہوگی اور اسی طرح ڈاکو اگر مستحق زکوٰۃ ہیں تو ان کو بھی زکوٰۃ کی رقم دینے سے زکوٰۃ ادا ہوگی۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ زکوٰۃ الگ طور پر ادا کی جائے کیونکہ یہ اہم عبادت ہے اس لئے مناسب یہ ہے کہ خالصتاً للہ ادا کی جائے۔

لمافي الهندية(۱/۱۹۰): وأما أخذ ظلمة زماننا من الصدقات والعشور والخراج والجبايات والمصادرات فالاصح انه يسقط جميع ذالک عن أرباب الأموال اذا نووا عند الدفع التصدق عليهم.

وفي الشامية(۲/۳۱۰): اعلم أن بعض فسقة التجار يظن أن ما يؤخذ من المكس يحسب عنه اذا نوى به الزكاة وهذا ظن باطل وقدمر ايضاً انه لا بدمن شرط أن يأمن به التجار من اللصوص ويحميهم منهم وهذا نقعد على نواب البلدة ويؤذى التجار أكثر من اللصوص...... ولذا قال في البزازية اذا نوى أن يكون المكس زكاة فالصحيح أنه لا يقع على الزكاة...... وأشار بالصحيح إلى القول بأنه اذا نوى عند الدفع التصدق على المكاس جاز لأنه فقير بما عليه من التبعات الخ.

وفيه ايضا(۲/۲۸۹): وكذا اذا دفع الى كل جائر بنية الصدقة لأنهم بما عليهم من التبعات صاروا فقراء والأحوط الإعادة الخ

وفي الدر المختار (۲/۳۴۴): ويشترط أن يكون الصرف (تمليكاً)...... (لا) يصرف (إلى بناء) نحو (مسجد الخ).

﴿جن جگہوں پر زکوٰۃ کی رقم نہیں دی جاسکتی﴾

(۱۲۸) زکوٰۃ کی رقم سفیر کو بطور تنخواہ دینے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک دینی ادارہ ہے جس کی کوئی ذاتی آمدنی نہیں ہے ہم اخراجات پورے کرنے کیلئے ایک سفیر مقرر کرتے ہیں جو لوگوں سے زکوٰۃ، صدقات وغیرہ وصول کرتا ہے جس کو ہم تنخواہ دیتے ہیں تو کیا سفیر کو زکوٰۃ کی رقم سے تنخواہ دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... چونکہ زکوٰۃ کی رقم بطور عوض دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی اس لئے زکوٰۃ کی رقم سفیر کو بطور تنخواہ وکمیشن کے دینا جائز نہیں اور آجکل دینی اداروں میں جو سفارتی نظام رائج ہے اس میں دیگر مفاسد بھی پائے جاتے ہیں مثلاً سفیروں میں امانت داری کا کمیاب ہونا اور چمٹ چمٹ کر مانگنا اور غلط بیانی سے کام لینا اور زکوٰۃ ہی کی رقم سے کھانا پینا وغیرہ لہٰذا اہل مدارس کو اس معاملے میں احتیاط سے کام لینا چاہئے۔

لما في الهندية(۱/۱۹۰): ولو نوى الزكاة بما يدفع المعلم الى الخليفة ولم يستأجره ان كان الخليفة بحال لو لم يدفعه يعلم الصبيان ايضاً اجزأه والا فلا.

وفي الطحطاوي على الدر(۱/۴۳۲): (قوله ولو دفعها المعلم لخليفته) أي من هو نائب عنه ونظيره اذا دفعها المؤجر لمن استاجره أو الشيخ لمن يحضره.

وفي الشامية(۲/۳۵۶): (قوله او مهدى الباكورة) وقيده في التتار خانية بالتي لاتساوي شيئاً ومفهومه انها لولها قيمة لم يصح عن الزكوة لان المهدى لم يدفعها الا للعوض فلا يجوز اخذها الا بدفع مايرضى به المهدى والزائد عليه يصح عن الزكوٰة.

(۱۲۹) مدارس کے سفراء کی شرعی حیثیت اور ان کیلئے مالِ زکوٰۃ سے کمیشن لینے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مدارس کے جو سفیر حضرات ہوتے ہیں وہ مدارس کے طلباء کیلئے زکوٰۃ وغیرہ وصول کرتے ہیں، کیا زکوٰۃ کی رقم سے ان کا کمیشن لینا صحیح ہے؟ محصل رقم میں اجرت طے کرنا کیسا ہے؟ کیا مدارس کے سفیر حضرات عاملین زکوٰۃ کے حکم میں ہیں؟ اگر کوئی فرق ہو تو مبرہن ومدلل انداز میں واضح فرمائیں۔ بینوا توجروا

الجواب حامداً ومصلیاً...... مدارس کے سفراء کو زکوٰۃ وصول کرنے کی اجازت ہے۔ لما في البدائع: ولا يجوز قبض الاجنبي

للفقیر البالغ العاقل الابتو کیله(۲/۵۷)

لیکن سفراء حضرات جو زکوٰۃ کی رقم وصول کرتے ہیں اس میں صرف طلباء کا حق ہے۔ لقوله تعالیٰ: انما الصدقات للفقراء والمساکین الایة (التوبه: ۶۰) ''صدقات تو صرف حق ہے غریبوں اور محتاجوں کا''۔ البتہ زکوٰۃ کی وصولیابی پر سفراء کو متعین اجرت لینا درست ہے۔ لمافی الملتقی الابحر: الاجیر الخاص ..... یستحق الاجر (۲/۱۶۵)۔ لیکن وصول ہونے والی زکوٰۃ کی رقم سے نہ تو اجرت متعین کرنا درست ہے۔ لمافی البدائع: خصّ ﷺ النهی باستئجاره ببعض الخارج منه(۵/۵۱۴) اور نہ ہی ان رقموں سے حیلۂ تملیک کے بغیر اجرت دینا درست ہے۔ لما فی البنایة: والزکاة لاتجوز ان تدفع عوضا عن شئ (۳/۱۸۱)۔ البتہ زکوٰۃ کی رقم سے اجرت متعین کرنے کی صورت میں سفیر حضرات اجرِ مثل کے مستحق ہوں گے، جو کہ متعین اجرت سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔ لمافی الشامیة: ویجب اجر المثل لایجاوز به المسمی (۶/۵۶) اگر حیلۂ تملیک کے بغیر زکوٰۃ کی رقم سے اجرت دیدی گئی تو اتنی رقم کے بقدر زکوٰۃ دینے والوں کی زکوٰۃ بھی ادا نہ ہوگی۔ لمافی الشامیة: ولا یخرج عن العهدة بالعزل بل بالاداء للفقراء. (۲/۲۷۰) نیز:

سفراء حضرات کو عاملین پر قیاس کرنا مندرجہ ذیل چند وجوہات کی بناء پر درست نہیں۔

۱)۔ عاملین زکوٰۃ (عاشر وساعی) وہ ہوتے ہیں جنہیں حاکم وقت نے زکوٰۃ وغیرہ وصول کرنے کیلئے متعین کیا ہو، بخلاف سفراء حضرات کے، کہ وہ طلباء یا زکوٰۃ دینے والوں کے نمائندے اور وکیل ہوتے ہیں۔

لمافی البدائع: واما العاملون علیها فهم الذین نصبهم لجبایة الصدقات (۲/۴۶۷). وفی الهندیة: (ومنها العامل) وهو من نصبه الامام لاستیفاء الصدقات والعشور کذا فی الکافی. (۱/۱۸۸)

۲)۔ جس طرح حاکم وقت کو مزکین (زکوٰۃ دینے والوں) سے جبراً زکوٰۃ وصول کرنے کا حق ہے، اسی طرح عاملین زکوٰۃ کو بھی مزکین سے جبراً زکوٰۃ وصول کرنے کا حق ہے، اس لئے کہ انہیں حاکم کی نیابت حاصل ہے، بخلاف سفراء کے کہ انہیں حاکم کی نیابت حاصل نہ ہونے کی وجہ سے کسی سے جبراً زکوٰۃ وصول کرنے کی قطعاً اجازت نہیں۔

لمافی البدائع (۲/۵۷): ولا یجوز قبض الاجنبی للفقیر البالغ العاقل الابتو کیله.

وفی البحر الرائق(۲/۳۶۹). ومن امتنع عن اداء زکاة ماله واخذها الامام کرها منه .....والمفتی به التفصیل ان کان فی الاموال الظاهرة فانه یسقط الفرض عن اربابها باخذ السلطان او نائبه، لان ولایة الاخذله

وفی الشامیة(۲/۲۹۰): وفی مختصر الکرخی اذا اخذها الامام کرها فوضعها موضعها اجزا لان له ولایة اخذ الصدقات فقام اخذه مقام دفع المالک وفی القنیة فیه اشکال لان النیة فیه شرط ولم توجد منه اهـ.

قلت: قول الکرخی فقام اخذہ الخ یصلح للجواب تامل، ثم قال فی البحر: والمفتی بہ التفصیل إن کان فی الاموال الظاھرۃ یسقط الفرض لان للسلطان او نائبہ ولایۃ اخذھا، وان لم یضعھا موضعھا لایبطل اخذہ وان کان فی الباطنۃ فلا اھ. وفیہ ایضاً (صـ۲٦۸): والی ان الساعی لواخذھا منہ کرھالا یسقط الفرض عنہ فی الاموال الباطنۃ بخلاف الظاھرۃ ھو المفتی بہ.

۳)۔کسی اجنبی شخص کیلئے جائز نہیں کہ وہ از خود زکوٰۃ وصول کرے الا یہ کہ اُسے فقراء یا مزکین وکیل بنادیں، تو جائز ہے۔ جبکہ عاملین حاکم کے نائب ہونے کی وجہ سے اس بات کے محتاج نہیں کہ انہیں کوئی فقیر یا مزکی (زکوٰۃ دینے والا) وکیل بنائے، بلکہ وہ حاکم کے نائب ہونے کی وجہ سے فقراء کے نائب اور مزکین کے موکل ہوتے ہیں۔ پس سفراء حضرات کو جب تک کسی کی طرف سے وکالت برائے زکوٰۃ کی اجازت نہ ہو، تب تک زکوٰۃ وصول کرنے کا حق وجواز نہیں۔

لمافی البدائع(۲/۵۷): ولا یجوز قبض الاجنبی للفقیر البالغ العاقل الا بتوکیلہ.

وفی (صـ۴۲۱): لان یدہ کید الامام وھو نائب عن الفقراء.

وفی (صـ۳۸٦): فصار ارباب الاموال کالوکلاء عن الامام.

وفی البحر: لان یدہ کیدا الفقراء (۲/۳٦۸)، وفی (صـ۳٦۹): فقام اخذہ مقام دفع المالک.

۴)۔اگر عاملین کے ہاتھ سے زکوٰۃ کا مال ضائع ہوجائے تو اربابِ اموال (اصحاب زکوٰۃ) سے زکوٰۃ ساقط ہوجاتی ہے کیونکہ اسے حاکم کی ولایت حاصل ہونے کی وجہ سے وہ فقراء کا نائب اور منجملہ مصارف زکوٰۃ میں سے ہے، بخلاف اُن سفراء کے جو اربابِ اموال کی طرف سے وکیل ہوتے ہیں ان کو حاکم کی ولایت حاصل نہ ہونے کی وجہ سے وہ فقراء کے نائب اور منجملہ مصارف زکوٰۃ میں سے نہیں ہیں۔

لمافی البحر(۲/۳٦۸): لو افرز من النصاب خمسۃ ثم ضاعت لاتسقط عنہ الزکاۃ ولو مات بعد افرازھا کانت الخمسۃ میراثا عنہ اھ بخلاف اذا ضاعت فی ید الساعی، لان یدہ کیدا الفقراء.

وفی الھندیۃ (۱/۱۸۸): ولو ھلک المال فی ید العامل اوضاع، سقط حقہ واجزأ عن الزکاۃ عن المؤدّین کذا فی السراج الوھاج.

وفی الشامیۃ (۲/۳۴۰): ولو ھلک ماجمعہ من الزکاۃ...... الا ان فیہ شبھۃ الصدقۃ بدلیل سقوط الزکاۃ عن ارباب الاموال.

وفی (صـ۳۰۹): (قولہ لمافیہ من شبھۃ الزکاۃ) ای وھو من جملۃ المصارف.

۵)۔عاملین زکوٰۃ کیلئے آزاد و مسلمان ہونا شرط ہے، غلام اور غیر مسلم کو عامل بنانا حرام ہے، کیونکہ عمالۃ بھی ایک منصب اور ولایتِ اسلام ہے جو کہ غلام اور غیر مسلم کے لائق نہیں۔ بخلاف سفارت ووکالت کے، کہ غلام اور ذمی بھی اس کا اہل ہوسکتا ہے چنانچہ ذمی اور غلام کو زکوٰۃ کی ادائیگی کیلئے وکیل وسفیر بنانا جائز ہے، برخلاف عاملین کے۔

لمافي البحر (۲/۳٦۸): ولو دفعها الى ذمى ليدفعها الى الفقراء جاز لوجود النية من الآمر.

وفي (۲/۳۵۳): ولم يشترط الحرّية. لان الدفع الى غير الحرّ جائز.

وفي (صــ۳۰۲): ويشترط في العامل ان يكون حرّا مسلما، فلا يصح ان يكون عبدا لعدم الولاية. ولا يصح ان يكون كافراً لانه لا يلي على المسلم.

وفي البدائع (۲/۲٦۰): ولهذا لو وكّل ذميا باداء الزكاة جاز، لان المؤدى في الحقيقة هو المسلم.

وفي الهندية(۱/۱۸۳): ويشترط في العامل ان يكون حرّا مسلما.

(۱۳۰) سفیر کے لئے زکوٰۃ وغیرہ کے پیسے استعمال کرنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ رمضان المبارک میں کثیر تعداد میں مدارس کے سفیر حضرات کراچی تشریف لاتے ہیں لوگوں سے چندہ وصول کرتے ہیں اور اسی سے کھانا کھاتے ہیں اور دیگر اخراجات پورے کرتے ہیں تو کیا سفیروں کیلئے چندہ سے کھانا اور خرچ کرنا جائز ہے؟ جبکہ ان کے پاس اکثر پیسہ زکوٰۃ کا ہوتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... سفیر حضرات کیلئے چندوں کے پیسوں سے کھانا پینا جائز نہیں ہے۔ البتہ اگر ان کے پاس اپنے پیسے ختم ہوگئے تو گھر سے منگوالیں یا کسی اور سے قرض لے کر استعمال کریں بعد میں ادا کردیں اور آجکل مدارس میں جو سفارتی نظام رائج ہے ان میں متعدد مفاسد پائے جاتے ہیں مثلاً سفیروں میں خیانت کی کثرت، غلط بیانی سے کام لینا، مانگنے میں اصرار کرنا، انہی پیسوں سے بطور کمیشن کے دینا اور انہی پیسوں سے کھانا پینا اور دیگر ضروریات میں استعمال کرنا وغیرہ۔ اس کے علاوہ ان میں علماء، طلباء اور مدارس کی تحقیر بھی ہے اس لئے اہل مدارس کو اس معاملے میں احتیاط سے کام لینا چاہئے۔

لمافي التاتارخانية (۲/۲۷۸): سئل عن معلم له خليفة في المكتب يعلم الصبيان و يحفظهم ويكتب ألواحهم ولم يستاجره بشئ معلوم وما اشترط شيأ والمعلم يعطيه فيّ الأحايين دراهم بنية الزكاة هل يجوز عن الزكاة؟ قال، نعم الا ان يكون بحيث لو لم يعطه لم يعمل له ذلک في مكتبه.

وفي الطحطاوى على الدر (۱/۳۳۲): قوله: (ولو دفعها المعلم لخليفته) أى من هو نائب عنه ونظيره اذا دفعها المؤجر لمن استأجره أو الشيخ لمن يحضره.

وفي الشامية (۲/۳۵٦): قوله او مهدى الباكورة...... وقيده في التاترخانية بالتى لاتساوى شيأ ومفهومه انها لولها قيمة لم يصح عن الزكاة لان المهدى لم يدفعها الا للعوض فلا يجوز اخذها الابدفع مايرضى به المهدى والزائد عليه يصح عن الزكاة. قوله لو لم يعطه صح والا لا اى لان المدفوع يكون بمنزلة العوض وفيه ان المدفوع الى المهدى الباكورة كذالک فينبغى اعتبار النية.

(۱۳۱) زکوٰۃ کی رقم سے مدرسین کو تنخواہ دینے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک دینی ادارے کا خادم ہوں ہمارے پاس مدرسہ میں زکوٰۃ کی رقم کافی مقدار میں موجود ہے لیکن نفلی صدقات وغیرہ کی رقم نہیں ہے تو کیا زکوٰۃ کی رقم سے مدرسین کو تنخواہ دینا جائز ہے جبکہ وہ بار بار مطالبات کر رہے ہیں؟

الجواب حامداً و مصلیاً صورت مسئولہ میں زکوٰۃ کی رقم سے مدرسین کو تنخواہ دینا جائز نہیں ہے کیونکہ صدقات واجبہ کی ادائگی کیلئے ضروری ہے کہ ان کو مصارف پر بطور تملیک بغیر کسی عوض کے صرف کیا جائے لہٰذا تنخواہ میں دینا جائز نہیں اگر کارکنان مدرسہ کوئی شرعی حیلہ کر کے دیں تو جائز ہے ورنہ شرعی حیلہ کے بغیر جائز نہ ہوگی۔

لما في الهندية(۱/۱۹۰): ولو نوى الزكاة بما يدفع المعلم الى الخليفة ولم يستأجره ان كان الخليفة بحال لو لم يدفعه يعلم الصبيان أيضاً أجزأه والا فلا وكذا ما يدفعه الى الخدم من الرجال والنساء في الاعياد وغيرها بنية الزكاة: كذا في معراج الدراية.

وفي الدر المختار (۳۵۶/۲): ولو دفعها المعلم لخليفته ان كان بحيث يعمل له لولم يعطه صح والا لا.

وفي الهندية(۱/۱۹۰): اذا دفع الزكوة الى الفقير لايتم الدفع مالم يقبضها أو يقبضها للفقير من له ولاية عليه نحو الأب والوصي يقبضان للصبي والمجنون كذا في الخلاصة أو من كان في عياله من الاقارب أو الاجانب الذين يعولونه والملتقط يقبض للقيط.

(۱۳۲) زکوٰۃ کی رقم قبل التملیک تجارت میں لگانے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(۱)۔ایک آدمی نے زکوٰۃ کی کافی رقم مدرسہ کو دی، اب مدرسہ والے اس رقم سے مدرسہ کی کفالت کیلئے اس رقم کو تجارت میں استعمال کر رہے ہیں جس سے پورے سال مدرسہ کی کفالت ہو جاتی ہے، تو اب آپ حضرات سے پوچھنا یہ ہے کہ کیا زکوٰۃ کی رقم مدرسہ کیلئے تجارت کی غرض سے استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں؟

(۲)۔دوسری بات آپ حضرات سے یہ پوچھنی ہے کہ زکوٰۃ کی رقم سے مدرسہ کے اساتذہ کو تنخواہ دے سکتے ہیں یا نہیں؟ نیز مدرسہ میں زکوٰۃ کی رقم کے مصرف کیا کیا ہیں اور کیا کیا نہیں؟ براہ کرم قرآن و حدیث کی روشنی میں جواب دے کر ممنون و مشکور فرمائیں۔

الجواب حامداً و مصلیاً......(۱)۔زکوٰۃ کی رقم کو قبل التملیک تجارت میں لگانا درست نہیں۔

(۲)۔اہل مدارس کیلئے مدارس میں آنے والی زکوٰۃ بلا تملیک اساتذہ کو تنخواہ کے طور پر دینا جائز نہیں ہے البتہ تملیک کرانے کے بعد طلبہ

کے ضروری مصالح مثلاً اساتذہ کی تنخواہ، یوٹیلٹی بلز، تعمیر کی درستگی، کھانے وغیرہ میں استعمال کرنا درست ہے اور عموماً مدارس میں زکوٰۃ تملیک کرانے کے بعد ہی ان امور میں استعمال کی جاتی ہے۔

لما في التاتارخانية(۲/۲۷۲): ولا تصرف في بناء مسجد وقنطرة وفي شرح الطحاوي ورباط وفي شرح المتفق ولا يبنى بها قبر ولا يقضى بها دين ميت ولا يعتق عبد ولا يكفن ميتاً، والحيلة لمن اراد ذلك ان يتصدق ينوي الزكاة على فقير ثم يامره بعد ذلك بالصرف الى هذه الوجوه فيكون لصاحب المال ثواب الصدقة ولذلك الفقير ثواب هذا الصرف.

وفي الشامية (۲/۲۶۹): (قوله اذا وكله الفقراء) لأنه كلما قبض شيئا ملكوه.

وفيه ايضاً(۲/۲۷۰): (قوله ولا يخرج عن العهدة بالعزل) فلو ضاعت لا تسقط عنه الزكاة ولو مات كانت ميراثا عنه.

(۱۳۳) مدیون کا دائن کو قرض لوٹاتے وقت زکوٰۃ کی نیت کرنے کا حکم

سوال　کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے اپنے ایک دوست سے کچھ رقم قرض لی تھی اور اسے اپنے کاروبار میں استعمال کیا تھا اب الحمدللہ میرا کاروبار چل رہا ہے اور میں اس میں سے زکوٰۃ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ میرا وہ دوست جس سے میں نے قرضہ لیا تھا وہ ایک غریب اور مستحق آدمی ہے تو کیا میں اس کو قرضہ کی ادائیگی کے ساتھ اس میں زکوٰۃ کی نیت کرلوں تو کیا میری زکوٰۃ ادا ہو جائے گی یا نہیں؟

(۲)　نیز یہ بھی بتلادیں کہ کیا مقروض (جس نے قرضہ لیا ہے) کو دائن زکوٰۃ دے اور زکوٰۃ دیتے وقت کہے کہ میں زکوٰۃ اس شرط پر دیتا ہوں کہ تم زکوٰۃ وصول کر کے فوراً مجھے میرا قرضہ واپس کروگے یا کہتا ہے اسی زکوٰۃ سے واپس کروگے تو کیا زکوٰۃ ادا ہو جائے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً　(۱)۔ مقروض کا اپنے قرض خواہ کو زکوٰۃ دینا درست ہے بشرطیکہ وہ مستحق (یعنی مصرف زکوٰۃ) ہو لیکن قرض کی ادائیگی کے وقت زکوٰۃ کی ادائیگی کی نیت کر لینا، تو یہ شرعاً درست نہیں کیونکہ زکوٰۃ کا بغیر کسی عوض کے مستحق زکوٰۃ کو مالک بنانا شرط ہے اور صورت مسئولہ میں قرض کی ادائیگی تو مقروض کے ذمہ پہلے سے واجب تھی۔ لہٰذا قرض اور زکوٰۃ میں سے ہر ایک کی مستقل ادائیگی بہر صورت ضروری ہے۔

(۲)۔ صورت مسئولہ میں نیت اور تملیک کے پائے جانے کی وجہ سے اگرچہ زکوٰۃ کی ادائیگی ہو جائے گی لیکن قرض کی ادائیگی کو کسی شرط کے ساتھ مشروط قرار دینا اور اس طرح کے حیلے اختیار کرنا مکروہ ہے ان سے اجتناب کیا جائے۔

لما في ملتقى الابحر(۱/۱۶۹): هي تمليك جزء من المال معين شرعا من فقير مسلم غير هاشمي ولامولاه مع قطع المنفعة عن المملك من كل وجه لله تعالىٰ.

وفی التاتارخانیة(۲/۲۶۵): والحیلة فی الجواز ان یتصدق عینه بخمسة دراهم عینا ونوی به زکاة المائتین ثم یأخذها منه قضاء عن دینه فیجوزله ذلک...... وفی الملتقط ولودفع الزکاة الی مطلوبه المعسر ثم دفعه المعسر الی الطالب مما علیه یباح له ذلک ان کان بغیر شرط وان کان بشرط لایباح.

وفی الفقه الاسلامی وادلته(۳/۱۹۸۰،۱۹۸۱): ان المسامحة بالدین لاتجزئ عند الحنفیة عن الزکاة، وانما یجب اعطاء الزکوة للفقیر ویمکن استیفاء الدین منه بعد ذلک فیعطیه الزکاة، ثم بعد أن یستلمها یقول له: اعطنی دینی، وکذلک أجاز الحنابلة الاعطاء للمدین ثم یستوفی منه حقه، مالم یکن حیلة أی بأن شرط علیه ان یردها علیه من دینه.

(۱۳۴) مالِ زکوٰۃ سے غیر مسلم کی مدد کرنے کا حکم

سوال ...کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے چچازاد بھائی نے کینیڈا میں ایک رفاہی ادارہ کھولا ہے۔اس ادارے میں جس طرح لوگ بطورِ امداد کے پیسے دیتے ہیں اسی طرح مسلمان اپنی زکوٰۃ بھی اس ادارے کو دیتے ہیں اس ادارے میں ہر قسم کی رقم کا علیحدہ علیحدہ حساب کتاب ہے۔اب مسئلہ یہ ہے کہ زکوٰۃ کی رقم اس ادارے کے پاس کافی مقدار میں جمع ہوگئی ہے،اب غیر مسلم مستحق پر اس رقم کو خرچ نہیں کرتے تو حکومت کی طرف سے پکڑے جانے کا خطرہ ہے کہ یہ رفاہی ادارہ نہیں بلکہ خاص طبقے کو پال رہا ہے۔اور اگر لگاتے ہیں تو شرعاً صحیح نہیں ہے۔آپ شرعی اعتبار سے روشنی ڈال کر بتادیں کہ آیا اس صورت میں غیر مسلم مستحق پر زکوٰۃ لگانا درست ہے۔اگر نہیں تو اب انھیں کیا صورت اختیار کرنا چاہئے۔

الجواب حامداً ومصلیاً......ان کے اس رفاہی ادارے میں زکوٰۃ اور اس کے علاوہ جو رقم بطورِ امداد کے عطیات وغیرہ یا جواجناس،آٹا،چینی وغیرہ آتا ہے ان سب کو زکوٰۃ اور عطیات کے اعتبار سے علیحدہ علیحدہ کرکے رکھ دیں،اگر کوئی کافر محتاج مدد طلب کرنے آئے تو عطیات والے حصے سے اس کی مدد کریں اس لئے کہ نفلی صدقات اور عطیات سے کافر کی مدد کرنا بالاتفاق صحیح ہے۔باقی زکوٰۃ کی رقم یا اجناس والا جو حصہ ہے وہ صرف مسلمان فقیر کو ہی دے سکتے ہیں زکوٰۃ والا حصہ نہ تو رفاہی کاموں میں خرچ کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی کافر کو دینا جائز ہے لہٰذا کافر کی مدد صرف امداد وعطیات والے حصے سے ہی کریں اور مسلمان محتاجوں کی مدد ان میں سے ہر ایک حصے سے کرسکتے ہیں۔اس طرح آپ کا یہ ادارہ حکومت کی پکڑ سے بچ سکتا ہے۔واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب۔

لمافی التاتارخانیة(۲/۲۷۳): ولا یجوز ان یدفع الزکاة الی ذمی وفی الخانیة: ولا الی الحربی وفی شرح الطحاوی: فالجملة فی هذا ان جنس الصدقة یجوز صرفها الی المسلم ولا یجوز صرفها الی الحربی وامّااهل الذمة لا یجوزصرف الزکاة الیهم بالاتفاق ویجوزصرف التطوع الیهم بالاتفاق....

وفی فتاوی الهندیة(۱/۱۸۸):وامّا اهل الذمة فلا یجوز صرف الزکاة الیهم بالاتفاق ویجوز صرف

صدقة التطوع اليهم بالاتفاق و اختلفوا فی صدقة الفطر والنذور والكفارات قال ابو حنيفة ومحمد رحمهما الله يجوز الا ان فقراء المسلمين احب الينا .... ولايجوز ان يبنى بالزكاة المسجد وكذا القناطر والسقايات واصلاح الطرقات وكرى الانهار .... وكل مالا تمليك فيه۔

وفي الشامية (۳۵۲/۲): ذكر محمد في السير الكبير: لا بأس للمسلم أن يعطى كافرا حربيا او ذميا و ان يقبل الهدية منه، لما روى "ان النبی ﷺ بعث خمسمائة دينار الى مكة، حين قحطوا، و امر بدفعها الى ابی سفيان بن حرب وصفوان بن اميه ليفرقا علی فقراء اهل مكة" ولان صلة الرحم محمودة في كل دين والا هداء الى الغير من مكارم الاخلاق ....

(۱۳۵) صدقہ نافلہ غیر مسلم کو دینے اور زکوٰۃ اور صدقہ واجبہ نہ دینے میں فرق کی وجہ

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک بڑے عالم سے سنا ہے کہ صدقہ نافلہ تو غیر مسلم کو دیا جا سکتا ہے البتہ زکوٰۃ اور صدقہ واجبہ غیر مسلم کو دینا درست نہیں۔ کیا یہ بات صحیح ہے؟ اور اس میں فرق کی کیا وجہ ہے۔ اور زکوٰۃ کے علاوہ بھی صدقہ واجبہ ہوتا ہے؟ ان دونوں کی تعریف کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً زکوٰۃ لغت میں بڑھنا اور شرع میں زکوٰۃ مسلمان فقیر کو مال (کے اس حصہ) کا مالک بنا دینا ہے (جس کو شارع نے معین کیا ہے) بشرطیکہ وہ فقیر ہاشمی اور اس کا آزاد کردہ غلام نہ ہو، اور مالک بنانے والے کی منفعت ہر اعتبار سے منقطع ہو جائے اور یہ مالک بنانا بہ نیت تعمیل حکم خداوندی ہو۔ اور زکوٰۃ کے علاوہ بھی صدقہ واجبہ ہوتا ہے اور صدقہ واجبہ وہ صدقہ ہے کہ اس کو ادا کرنا لازم وضروری ہے جب تک ادا نہ کرے اس کے ذمہ سے ساقط نہیں ہوتا چاہے صدقہ الفطر ہو چاہے کفارات ہوں چاہے نذر ہو۔ چونکہ زکوٰۃ کے مصارف نص سے ثابت ہیں **قوله تعالى "اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا الخ** اور صدقہ واجبہ زکوٰۃ کے مال کی طرح ہے اس لیے اس کا مصرف بھی زکوٰۃ کے مصارف میں سے ہے۔ زکوٰۃ اور صدقہ واجبہ مفتی بہ قول کے مطابق غیر مسلم کو نہیں دے سکتے۔ کیونکہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "**ان الله فرض عليهم صدقة توخذ من اغنيائهم وترد على فقرائهم**" (ترجمہ: بیشک اللہ تعالیٰ نے ان پر صدقہ کو فرض کیا کہ لیا جائے گا مسلمان مالداروں سے اور لوٹایا جائے گا مسلمان فقراء کی طرف)۔ اور صدقہ نافلہ تو بطور حصول ثواب لوگوں کی خیر خواہی کرنا ہے، صدقہ نافلہ کے بارے میں باری تعالیٰ کا فرمان ہے کہ "**لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ الخ**" (ترجمہ: اللہ تعالیٰ تم کو ان لوگوں کے ساتھ احسان اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے) اور حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے مروی ہے حضرت اسماء کہتی ہیں کہ میری ماں عہد قریش میں اونٹنی پر سوار ہو کر آئی ہیں اس حال میں کہ وہ مشرکہ تھیں تو میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی ماں کی صلح رحمی کے بارے میں دریافت کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی۔ مذکورہ آیت اور حدیث سے معلوم ہوا کہ صدقہ نافلہ غیر مسلم کو بھی دیا جا سکتا ہے۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ نے جو سنا ہے کہ صدقۂ نافلہ تو غیر مسلم کو دیا جا سکتا ہے البتہ زکوٰۃ اور صدقۂ واجبہ غیر مسلم کو دینا درست نہیں یہ صحیح ہے۔

لمافي الدر المختار(۲/۳۵۱): (ولا) تدفع (الى ذمي) لحديث معاذ (وجاز) دفع (غيرها وغير العشر) والخراج (اليه) اى الذمي ولو واجباً كنذر وكفارة وفطرة خلا فالثاني وبقوله يفتى حاوى القدسي. واما الحربي ولو مستأمنا فجميع الصدقات لاتجوز له اتفاقاً بحر عن الغاية وغيرها لكن جزم الزيلعي بجواز التطوع له.

وفي الشامية (۲/۳۵۵): ما ذكره في شرح السير الكبير للسرخسي بقوله لا بأس أن يصلي الرجل المسلم المشرک قريبا كان او بعيد امحاربا كان أو ذميا. واستدل عليه بأحاديث منها"انه بعث رسول الله ﷺ خمسمائة دينا إلى مكة حين قحطوا وأمر بدفع ذلک إلى أبي سفيان بن حرب وصفوان بن أمية ليفرقا على فقرا أهل مكة فقبل ذلک ابو سفيان وابو صفوان" قال وبه نأخذ ولأن صلة الرحم محمودة عند كل عاقل وفي كل دين والإهداء الى الغير من مكارم الأخلاق...... فعرف أن ذلک حسن في حق المسلمين والمشركين جميعا اهـ.

وفي الشامية(۲/۳۵۲): (قوله خلافا للثاني) حيث قال ان دفع سائر الصدقات الواجبة اليه لا يجوز اعتباراً بالزكاة، وصرح في الهداية وغيرها بان هذا رواية عن الثاني وظاهره ان قوله المشهور لقولهماوقوله وبقوله يفتى الذى في حاشية الخير الرملي عن الحاوى وبقوله ناخذ. قلت لكن كلام الهداية وغيرها يفيد ترجيح قولهما وعليه المتون.

وفي الفقه الاسلامي وادلته(۳/۲۰۴۸): وقال الحنفية: صدقة الفطر كالزكاة في المصارف وفي كل حال، الا في جواز الدفع الى الذمي مع الكراهة، وعدم سقوطها بهلاک المال، لكن الفتوى على قول ابي يوسف وهو عدم جواز صرفها للذمي كزكاة المال للحديث المتقدم في الزكاة صدقة توخذ من اغنيائهم وترد على فقرائهم.

وفي القاموس الفقهي(صـ۲۰۹): الصدقة: ما يعطى على وجه القربى لله تعالى وفي القرآن المجيد. اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ.

والصدقة تعم صدقة التطوع، وصدقة الفرض التى هي الزكاة.

والحنفية: هي العطية التى تبتغى بها المثوبة من الله تعالىٰ.

وفی الدر المختار(۲/۲۵۶): هی تملیک جزء مال عینه الشارع من مسلم فقیر غیر هاشمی ولا مولاه مع قطع المنفعة عن المملک من کل وجه لله تعالیٰ.

(۱۳۶) وکیل کا کسی دوسرے کو زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ میں کہ میں نے ایک صاحب کو زکوٰۃ کی رقم دی کہ فلاں شخص کو دیدینا لیکن وہ اپنے کسی رشتہ دار کو دیکر آ گئے تو اب اس صورت میں میری زکوٰۃ ادا ہوئی کہ نہیں؟ اور جس شخص کو میں نے زکوٰۃ دی تھی یعنی میرا وکیل وہ خود بھی اور اسکا رشتہ دار بھی دونوں مستحق زکوٰۃ ہیں۔ اب کیا کیا جائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورت مسئولہ میں آپکی زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی اور وکیل پر ضمان آئیگا، کیونکہ وکیل کو ملکیتِ تصرف، مؤکل کی طرف سے ملا ہے جس نے معین شخص کو زکوٰۃ کی رقم ادا کرنیکا حکم دیا ہے لہٰذا وکیل کو اسکی مخالفت کرنی جائز نہیں ہے۔

لمافی الشامیة(۲/۲۶۹): وهنا الوکیل انمایستفیدالتصرف من المؤکل وقدامره بالدفع الی فلان فلایملک الدفع الی غیره کمالو اوصی لزیدبکذالیس للوصی الدفع الی غیره. والله اعلم بالصواب

(۱۳۷) زکوٰۃ کی رقم سے قرآن مجید یا کتابیں خرید کر مدرسہ کے طلبہ کو دینے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلے میں ایک مدرسہ ہے اور اس میں غریب بچے اور بچیاں قرآن مجید حفظ کررہے ہیں۔ تو کیا ہم زکوٰۃ کی رقم سے قرآن مجید خرید کران بچوں کو دے سکتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً صورت مسئولہ میں غریب، مستحق بچوں اور بچیوں کو زکوٰۃ کی رقم سے قرآن مجید خرید کر دینا جائز ہے بشرطیکہ ان کے قبضہ وملکیت میں دے دیا جائے، جن چھوٹے بچوں کے والد غنی ہیں ان کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں کیونکہ چھوٹا بچہ والد کے غنی ہونے کے سبب حکماً غنی سمجھا جاتا ہے۔ چھوٹے بچے چونکہ قبضہ کی اہلیت نہیں رکھتے بہتر یہ ہے کہ قرآن مجید خرید کر مہتمم صاحب یا سرپرست کو دے دیئے جائیں پھر وہ خود تقسیم کردیں گے۔

لمافی فتاوی النوازل (ص ۱۴۰): إذا دفع الزکوة الیٰ صغیر عاقل وهو یعقل القبض بأن لا یرمی ولا یخدع عنه جاز.

وفی الهندیة(۱/۱۷۰): أما تفسیرها فهی تملیک المال من فقیر مسلم..... بشرط قطع المنفعة عن المملک من کل وجه لله تعالیٰ هذا فی الشرع کذا فی التبیین.

وفی الشامیة(۲/۲۸۶): أما اذا أدی من خلاف جنسه فالقیمة معتبرة اتفاقا.

وفی الدر المختار(۲/۳۴۹): (ولا) إلی (طفله) بخلاف ولده الکبیر.

نقیہ طلباء میں تقسیم کر سکتا ہے۔

لمافی خلاصة الفتاوی(۱/۲۴۳): ولو دفع الی صبیان اقاربه دراهم فی ایام العید یعنی عیدی بنیة الزکوة او دفع الی من یبشر بقدوم صدیق یجوز.

وفی الشامية(۲/۲۶۸): وشرط صحة ادائها نية مقارنة له) اشار الی ان الاعتبار للتسمية فلو سمّاها هبة او قرضاً تجزيه فی الاصح.

وفی الدر المختار(۲/۲۶۹): ولو خلط زکوة موکليه ضمن وکان متبرّعاً الا اذا وکله الفقراء)

وفی الشامية تحته: (قوله اذا وکله الفقراء) لانه کلما قبض شيأ ملکوه وصار خالطاً مالهم بعضه ببعض ووقع الزکوة عن الدافع.

(۱۴۰) زکوٰۃ کی رقم سے قبرستان خرید کر وقف کر دینے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں کے لوگوں نے اپنی اپنی زکوٰۃ کی رقم ملا کر اس سے زمین خریدی اور اسے قبرستان کیلئے وقف کر دیا۔ تو کیا قبرستان کی زمین زکوٰۃ کی رقم سے خریدنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز نہیں تو پھر اس قبرستان کا کیا جائے جبکہ اس میں مردے دفنا دیئے گئے ہوں؟

الجواب حامداً ومصلیاً چونکہ ادائیگی زکوٰۃ کے صحیح ہونے کیلئے یہ شرط ہے کہ زکوٰۃ کی رقم کا کسی مستحق کو مالک بنایا جائے جبکہ قبرستان ومسجد وغیرہ کی زمین براہِ راست مالِ زکوٰۃ سے خریدنے کی صورت میں یہ شرط نہیں پائی جاتی اس لئے قبرستان ومسجد وغیرہ کی زمین زکوٰۃ کی رقم سے نہیں خریدی جاسکتی لہٰذا صورتِ مسئولہ میں زکوٰۃ کی رقم سے جو قبرستان خریدا گیا ہے اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی بلکہ دوبارہ زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے البتہ قبرستان کی زمین چونکہ مردے دفنانے کیلئے وقف کر دی گئی ہے اور مردے دفنائے بھی جاچکے ہیں لہٰذا اس میں زمین خریدنے والوں کی ملکیت ختم ہونے کی وجہ سے کوئی تصرف کرنا مثلاً خرید وفروخت جائز نہیں ہے۔

لمافی الهندية(۱/۱۸۸): ولا يجوز أن يبنی بالزكاة المسجد وكذا القناطر والسقايات واصلاح الطرقات وكری الانهار والحج والجهاد وكل مالا تمليک فيه.

وفی الدر المختار(۲/۳۴۴):(لا)يصرف(الی بناء)نحو (مسجدو) لا الی (کفن میت وقضاء دينه)

وفی الشامية تحته: (قوله نحو مسجد) کبناء القناطر والسقايات واصلاح الطرقات وکری الانهار والحج والجهاد وکل مالا تمليک فيه.

وفی الدر المختار(۴/۳۳۸،۳۳۷): (هو) لغة الحبس وشرعاً (حبس العين علی) حکم (ملک الواقف والتصدق بالمنفعة) ولو فی الجملة والاصح انه (عنده) جائز غير لازم کالعارية (وعندهما

(۱۳۸) مال زکوۃ سے کتب شائع کرانے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اس سال میں نے زکوۃ نکالی اور میرا ارادہ تھا کہ کسی دینی ادارے میں جمع کراؤں گا لیکن ایک دوست نے مجھے مشورہ دیا کہ آپ مدرسے میں دینے کی بجائے کوئی دینی کتاب شائع کرا کے لوگوں میں تقسیم کرادیں تاکہ آپ کی زکوۃ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ ہو۔ اب آپ سے معلوم یہ کرنا ہے کہ کتاب شائع کرانے سے میری زکوۃ ادا ہو جائے گی یا دوبارہ زکوۃ دینی ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً: ادائیگی زکوۃ کیلئے کسی مستحق کو مال زکوۃ کا مالک بنانا ضروری ہے، اگر مال زکوۃ سے کتب شائع کروا کے عام لوگوں میں تقسیم کرائی گئیں تو مستحقین کو مال زکوۃ کا مالک نہ بنانے کی وجہ سے زکوۃ ادا نہیں ہوگی۔ البتہ اگر یہ کتب کسی مستحق کی ملکیت میں دے دی گئیں یا کسی مدرسہ کے مستحق طلبہ کو دیدی گئیں تو اس سے زکوۃ ادا ہو جائے گی۔ لیکن مستحق کی حاجات کو مدنظر رکھ کر زکوۃ ادا کرنا بہتر اور عمدہ طریقہ ادائیگی ہے۔

لمافي الهندية(۲/ ۳۹۲): من عليه الزكاة اذا اراد ان يكفن ميتاً عن زكاة ماله لايجوز (والحيلة فيه ان يتصدق بها على فقير من اهل الميت) ثم هو يكفن به الميت فيكون له ثواب الصدقة ولاهل الميت ثواب التكفين وكذلك في جميع ابواب البر التي لايقع بها التمليك كعمارة المساجد وبناء القناطر والرباطات لايجوز صرف الزكاة الى هذه الوجوه.

وفي الدر المختار(۲/ ۲۵۶): وشرعا (تمليك) خرج الاباحة فلو أطعم يتيما ناويا الزكاة لايجزيه الا اذا دفع اليه المطعوم كما لو كساه بشرط ان يعقل القبض

وفي الشامية تحته: (قوله الا اذا دفع اليه المطعوم) لانه بالدفع اليه بنية الزكاة يملكه فيصير آكلاً من ملكه.

(۱۳۹) زکوۃ میں کتابیں دینا، نیز وہی کتابیں انعام کے طور پر طلباء کو دینا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض مکتبہ والے اپنی زکوۃ، اپنی کتابوں کو دینے کی صورت میں نکالتے ہیں، آیا اس طرح ان کی زکوۃ ادا ہو جائے گی؟ اور کیا یہ کتابیں مدرسہ میں پوزیشن لینے والے طلباء میں تقسیم کی جاسکتی ہیں؟ براہ کرم جلد جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً: مکتبہ والے کتابوں کی زکوۃ فقراء کو کتابیں دینے کی صورت میں ادا کر سکتے ہیں اس طرح سے زکوۃ ادا ہو جائے گی۔ مہتمم حضرات طلباء کی جانب سے زکوۃ وصدقات وصول کرنے میں وکیل ہوتے ہیں اور طلباء کی جانب سے اجازت ہوتی ہے کہ مہتمم مدرسہ یہ مال طلباء کی ضروریات میں جس طرح مناسب سمجھے خرچ کرے لہٰذا مہتمم مدرسہ یہ کتابیں بطور انعام کے پوزیشن لینے والے غریب

ھو حبسھا علی) حکم (ملک اللہ تعالی وصرف منفعتھا علی من احب) ولو غنیا فیلزم فلا یجوز له ابطاله ولا یورث عنه وعلیه الفتوی.

وفی الشامیة (۴/ ۳۳۹): (قوله وعلیه الفتوی) ای علی قولھما یلزمه: قال فی الفتح والحق ترجح قول عامة العلماء بلزومه لان الاحادیث والآثار متظافرة علی ذالک واستمر عمل الصحابة والتابعین ومن بعدھم علی ذالک فلذا ترجح خلاف قوله اھ.

(۱۴۱) زکوٰۃ کے پیسوں سے مدرسے کے کتب خانے کی کتابیں خریدنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم ملتان کے ایک چھوٹے سے قصبے میں رہتے ہیں پچھلے دو سالوں سے ہم نے اپنے گاؤں میں مدرسہ بنایا ہے جس میں تقریباً ۲۰۰ طالبعلم ہیں۔ طالبعلموں کیلئے اور اساتذہ کرام کیلئے مدرسے کا ایک کتب خانہ بھی بنایا ہوا ہے۔ جس میں کتابیں بہت ہی کم ہیں جس کی وجہ سے اساتذہ کرام اور طالبعلموں کو بہت پریشانی ہوتی ہے چنانچہ ہم زکوٰۃ کے پیسوں سے کتابیں خریدنا چاہتے ہیں۔ آپ سے یہ معلوم کرنا تھا کہ آیا ہم زکوٰۃ کے پیسوں سے مدرسے کے کتب خانے کیلئے کتابیں خرید سکتے ہیں یا نہیں؟ قرآن اور سنت کی روشنی میں اس مسئلے کا شرعی حل فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً زکوٰۃ نکالنے کے بعد بغیر تملیک کے کتابیں خرید کر کتب خانے میں وقف کرنا درست نہیں ہاں اگر زکوٰۃ کی رقم مدرسے میں جمع کرادی جائے تو چونکہ عام طور پر مہتمم صاحب طلبہ کی طرف سے وکیل ہوتے ہیں تو جو زکوٰۃ کی رقم وکیل بن کر مہتمم صاحب وصول کرتے ہیں وہ مدرسے کے وقف کی ملک میں آجاتی ہے اور عام طور پر مدرسے والے اس رقم سے طلبہ کے تمام اخراجات پورے کرتے ہیں مثلاً قیام، طعام، معاش وغیرہ تو پھر اس رقم سے طلبہ کے استعمال کیلئے کتب خانے کے واسطے کتابیں خریدنا بھی درست ہو جائے گا۔

لما فی الدر المختار (۲/ ۲۶۹): ولو خلط زکاة موکلیه ضمن وکان متبرعا الا اذا وکله الفقراء)

وفی الشامیة تحته: (قوله اذا وکله الفقراء) لانه کلما قبض شیئا ملکوه وصار خالطا مالھم بعضه ببعض ووقع زکاة عن الدافع.

(۱۴۲) زکوٰۃ کی رقم سے قبرستان کیلئے جگہ خریدنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں ایک قبرستان ہے جس کا رقبہ بہت کم ہے۔ ہمارا ارادہ ہے کہ اس سال لوگوں سے زکوٰۃ کا پیسہ وصول کرکے کچھ زمین قبرستان کیلئے خرید لیں تو کیا زکوٰۃ کی رقم سے قبرستان کیلئے جگہ لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً زکوٰۃ کی رقم کا کسی مستحق کو مالک بنانا ضروری ہے اس لئے صورت مسئولہ میں زکوٰۃ کی رقم سے قبرستان کیلئے جگہ

لینا جائز نہیں اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی۔

لما فی الهندية (۱/۱۸۸): ولا يجوز ان يبنى بالزكاة المسجد وكذا القناطر والسقايات واصلاح الطرقات وكرى الانهار والحج والجهاد وكل مالا تمليك فيه.

وفی الدر المختار(۲/۳۴۴): (لا)يصرف (الى بناء) نحو (مسجد).

وفی الشامية تحته:(قوله نحو مسجد) كبناء القناطر والسقايات واصلاح الطرقات وكرى الانهار والحج والجهاد وكل مالا تمليك فيه زيلعی.

(۱۴۳) مسجد میں زکوٰۃ کی رقم نہیں لگانے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلے کی مسجد انتہائی خستہ حالت میں ہے، میں نے اپنے خاندان والوں اور دوست احباب سے کہہ سن کر تقریباً اسی ہزار روپے جمع کیے ہیں، ان روپوں میں پچاس ہزار روپے میرے ایک دوست کے ہیں جو کہ کویت میں مقیم ہیں۔ لیکن یہ رقم انہوں نے مجھے زکوٰۃ کی مد میں دی ہے۔ اب جب میں نے یہ رقم اپنی مسجد کے امام صاحب کو دی تو وہ کہنے لگے کہ زکوٰۃ کی رقم مسجد میں نہیں لگائی جاسکتی۔ لیکن کیوں نہیں لگائی جاسکتی اس کی کوئی معقول وجہ وہ مجھے نہیں بتا سکے۔ براہ کرم آپ میری اس سلسلے میں رہنمائی فرمائیں کہ آخر کیا وجہ ہے کہ اپنی زکوٰۃ کی رقم مسجد میں نہیں لگا سکتے۔ مجھے انہی امام صاحب نے آپ سے پوچھنے کا مشورہ دیا تھا۔ براہ مہربانی تسلی بخش جواب مرحمت فرمادیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً .... ادائیگی زکوٰۃ کیلئے ضروری ہے کہ کسی مستحق کو اس مال کا مالک بنایا جائے، اور مسجد میں چونکہ یہ شرط مفقود ہے، اس وجہ سے مسجد میں زکوٰۃ کی رقم نہیں لگائی جاسکتی۔

لما فی القرآن الكريم(التوبة): اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وفی الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِی سَبِيْلِ اللهِ وابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِنَ اللهِ وَاللهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ○

وفی الصحيح للإمام البخاری(۱/۲۰۳): عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ وفيه "ان الله قد افترض عليهم صدقة تؤخذ من اغنيائهم وترد على فقرائهم."

وفی الهندية(۱/۱۸۸): ولا يجوز ان يبنى بالزكاة المسجد..... وكل مالا تمليك فيه .. الخ.

وفی الدر المختار(۲/۳۴۴): ويشترط ان يكون الصرف (تمليكا) لا اباحة كمامر (لا) يصرف (الى بناء) نحو (مسجد)

وفی الشامية تحته: لعدم صحة التمليك منه.

(۱۴۴) زکوٰۃ کی رقم سے ہسپتال بنانے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ارادہ ہے کہ اس سال رمضان المبارک میں لوگوں سے زکوٰۃ وغیرہ کی رقم وصول کر کے ایک ہسپتال بنوالوں جس میں غریب لوگوں کا مفت علاج کیا جائے تو کیا زکوٰۃ کی رقم سے ہسپتال بنوانا جائز ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ..... چونکہ زکوٰۃ میں تملیک یعنی کسی مستحق کو خالص اللہ کی رضا کیلئے اپنے مال کا مالک بنانا شرط ہے لہٰذا صورت مسئولہ میں یعنی زکوٰۃ کے مال سے ہسپتال بنانا جائز نہیں۔ کیونکہ یہاں تملیک نہیں پائی جاتی۔ بلکہ ایسے کاموں کو عطیات وغیرہ سے کرنا چاہئے۔

لمافي الهندية(۱/۱۸۸): ولا يجوز ان يبني بالزكاة المسجد وكذا القناطر والسقايات واصلاح الطرقات وكرى الانهار والحج والجهاد وكل مالا تمليك فيه.

وفي الشامية(۲/۳۴۴): (قوله نحو مسجد) كبناء القناطر والسقايات واصلاح الطرقات وكرى الانهار وكل مالاتمليك فيه.

(۱۴۵) زکوٰۃ کی رقم سے میت کا قرض ادا کرنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے دادا کا انتقال ہوگیا ہے ان کے اوپر قرضہ تھا اور ان کی کوئی جائیداد بھی نہیں کہ اس سے قرضہ ادا کیا جائے تو کیا میں اپنی زکوٰۃ کی رقم سے ان کا قرضہ ادا کرسکتا ہوں؟

الجواب حامداً ومصلیاً زکوٰۃ کی رقم میت کی طرف سے اس کے قرضے کی ادائیگی میں خرچ کرنا جائز نہیں اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی۔

لمافي الهندية(۱/۱۸۸): ولايجوز ان يكفن بها ميت ولا يقضى بها دين الميت كذا في التبيين.

وفي حاشية الطحطاوي على الدر المختار(۱/۴۲۵): (قوله وقضاء دينه) اى الميت لعدم التمليك.

وفي الدر المختار(۲/۳۴۴): (لا) يصرف (الى بناء) نحو(مسجد و) لا الى(كفن ميت وقضاء دينه) اما دين الحي الفقير فيجوز لو بامره ولو اذن فمات فاطلاق الكتاب يفيد عدم الجواز وهو الوجه نهر.

وفي الشامية تحته: (قوله وهو الوجه) لانه لابد من كونه تمليكا وهو لايقع عند امره بل عند اداء المامور وقبض النائب وحينئذ لم يكن المديون اهلا للتملك لموته.

(۱۴۶) زکوٰۃ کے مال سے افطار کروانے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ گزشتہ کئی سالوں سے میں دیکھ رہا ہوں کہ ہمارے شہر کراچی

میں رمضان المبارک کے مہینے میں مختلف جگہوں پر عوامی افطاری کا انتظام بھی ہوتا ہے، مجھے یہ بہت اچھا لگتا ہے، میں اس سال سے سوچ رہا تھا کہ کیوں نہ میں بھی اسی طرح کا انتظام کراؤں، لیکن اس کیلئے ایک بڑی رقم کی ضرورت ہے۔ میرے دوست نے مجھے مشورہ دیا کہ تم رمضان میں زکوٰۃ کی مد میں ایک بڑی رقم نکالتے ہو، اسی رقم سے یہ کام کرلیا کرو، اس طرح تم زکوٰۃ بھی دے دو گے اور لوگوں کا روزہ بھی افطار کرادو گے، لیکن میرا دل مطمئن نہ ہوا، تو سوچا پہلے آپ سے تحریری طور پر پوچھ لوں۔ برائے کرم اس مسئلے کو جلد حل فرمادیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً ...... زکوٰۃ کی ادائیگی کیلئے ضروری ہے کہ جس کو زکوٰۃ کا مال دیا جارہا ہے وہ زکوٰۃ کا مستحق ہو، اور اس کو زکوٰۃ کے مال کا مالک بنایا جائے اور مکمل اختیار دیا جائے۔ صورت مسئولہ میں جن لوگوں کو زکوٰۃ کے مال سے افطار کروایا جارہا ہے اگر وہ زکوٰۃ کے مستحق ہیں اور ان کو مکمل اختیار اور مال کا مالک بنادیا جاتا ہے وہ الگ الگ تھیلیوں میں ڈال کر ہو یا الگ الگ پلیٹوں میں ڈال کر ہو، تو اس صورت میں زکوٰۃ کی ادائیگی ہوجائے گی اور اگر ان کو ساتھ لے جانے کی اجازت نہ ہو تو اس صورت میں زکوٰۃ کی ادائیگی نہ ہوگی تاہم عام طور پر ان مقامات میں غیر مستحق لوگ زیادہ ہوتے ہیں۔ اس لئے زکوٰۃ کے مال سے افطار ایسی جگہوں پر کروایا جائے کہ جہاں مستحق لوگ موجود ہوں جیسا کہ مدارس کے طلباء اور ایسی آبادیاں کہ جہاں غریب اور مستحق افراد رہتے ہوں۔

لما في الشامية(۲/۲۵۷): اذا كان يعول يتيما ويجعل ما يكسوه ويطعمه من زكوة ماله، ففي الكسوة لاشك في الجواز لوجود الركن وهو التمليك واما الطعام فما يدفعه اليه بيده يجوز ايضا لما قلنا بخلاف مايأكله بلادفع اليه

وفي الهندية(۱/۱۸۹، ۱۹۰): اذاشك وتحرى فوقع في اكبر رأيه انه محل الصدقة فدفع اليه اوسأل منه فدفع أو راه في صف الفقراء فدفع فان ظهر أنه محل الصدقة جاز بالاجماع وكذا ان لم يظهر حاله عنده واما اذا ظهر انه غني أو هاشمي أو كافر أو مولى الهاشمي أو الوالدان أو المولودون أو الزوج أو الزوجة فانه يجوز وتسقط عنه الزكوة واذا دفعها ولم يخطر بباله انه مصرف أم لافهو على الجواز الا اذا تبين انه غير مصرف واذا دفعها اليه وهو شاك ولم يتحرأ وتحرى ولم يظهر له أنه مصرف أو غلب على ظنه انه ليس بمصرف فهو على الفساد الا اذا تبين انه مصرف.

وفي الدر المختار(۲/۳۵۲،۳۵۳): (دفع بتحر) لمن يظنه مصرفاً(فبان انه عبده أومكاتبه أو حربي ولو مستأمنا أو عادها) لمامر (وان بان غناه أو كونه ذميا او انه ابوه أو ابنه او امراته او هاشمي لا) يعيد لانه أتى بما في وسعه حتى لو دفع بلا تحرلم يجز ان أخطأ.

(۱۴۷) مالِ زکوٰۃ سے بینک اور ڈاکخانے کے اخراجات ادا کرنے کا حکم

سوال ...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ارادہ ہے کہ اس سال ایک دوسرے شہر کے بڑے

مدرسے کے طلباء کے پاس زکوٰۃ بھیج دوں ظاہر ہے کہ بینک یا ڈاکخانے کے ذریعے بھیجنے سے کچھ اخراجات آئیں گے تو کیا ان اخراجات کو زکوٰۃ کی رقم سے کاٹنا صحیح ہے یا اپنی جیب سے یہ اخراجات ادا کرنے ہوں گے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... بینک اور ڈاکخانے کے اخراجات مال زکوٰۃ میں سے خرچ کرنا جائز نہیں کیونکہ ادائیگی زکوٰۃ کیلئے مستحقین زکوٰۃ کو مال زکوٰۃ کا مالک بنانا ضروری ہے۔ صورت مسئولہ میں مستحق زکوٰۃ ڈاکخانے اور بینک کے اخراجات کا مالک نہیں بنتا لہٰذا مال زکوٰۃ کو مذکورہ اخراجات کیلئے استعمال کرنا درست نہیں۔

لما في الهندية(۲/۳۹۲): من عليه الزكاة اذا اراد ان يكفن ميتاً عن زكاة ماله لايجوز (والحيلة فيه ان يتصدق بها على فقير من اهل الميت) ثم هو يكفن به الميت فيكون له ثواب الصدقة ولاهل الميت ثواب التكفين وكذلك في جميع ابواب البرالتي لايقع بها التمليك كعمارة المساجد وبناء القناطر والرباطات لايجوز صرف الزكاة الى هذه الوجوه

وفي الدر المختار(۲/۲۵۶): وشرعا (تمليك) خرج الاباحة فلواطعم يتيماناويا الزكاة لايجزيه الا اذا دفع اليه المطعوم كما لو كساه بشرط ان يعقل القبض

وفي الشاميه تحته:(قوله الااذادفع اليه المطعوم)لانه بالدفع اليه بنية الزكاة يملكه فيصير آكلامن ملكه.

وفي الطحطاوي(۱/۳۸۸): (قوله تمليك) هو ما عليه المحققون من أهل الاصول لانها وصفت بالوجوب الذى هومن صفات الافعال وموضوع علم الفقه فعل المكلف.

(۱۴۸) مال زکوٰۃ سے لائبریری بنانے اور کتابوں کو اجرت پر دینے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی کے مادۂ منویہ سے بچے پیدا نہیں ہو سکتے، ڈاکٹروں نے بھی اس کی تصدیق کردی ہے کیا اب عورت تنسیخ نکاح کا دعویٰ دائر کرسکتی ہے یا نہیں؟

(۲)......ایک آدمی لائبریری بنانا چاہتا ہے تاکہ ہر کوئی آکر اس میں مطالعہ کرسکے تو کیا وہ آدمی زکوٰۃ صدقات واجبہ ونافلہ کو اس لائبریری میں لگا سکتا ہے؟ نیز اگر وہ کتاب اجرت پر دے تو پھر کیا حکم ہوگا؟ جزاکم اللہ تعالیٰ فی الدارین۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... کسی کو اولاد دینا نہ دینا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے وہ جس کو چاہے اولاد عنایت فرمادے اور جس کو چاہے نہ دے۔ جراثیم کا ختم ہونا کوئی عیب نہیں ہے اور نہ ہی ڈاکٹری رپورٹ حکم قطعی ہے لہٰذا جس عورت کا شوہر نفس جماع پر قادر ہو تو اس کو فسخ نکاح کا دعویٰ کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

(۲) زکوٰۃ اور صدقات واجبہ میں کسی کو مالک بنانا ضروری ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں زکوٰۃ وصدقات واجبہ کو بغیر تملیک کے لائبریری پر لگانا درست نہیں ہے۔ البتہ صدقات نافلہ کی رقم کو اس پر لگا سکتے ہیں۔ باقی کتابوں کو اجرت پر دینے کو فقہاء نے منع کیا ہے اور

اس اجارہ کو باطل قرار دیا ہے۔

لما في المحيط البرهاني(٣/٢٢١): وان وجدت زوجها خصيا فان كان بحال تنتشر آلته وتصل الى المرأة لاخيار لها وان كان لا تنتشر آلته ولا تصل الى المرأة فالجواب فيه كالجواب في العنين.

وفي الهندية(١/١٨٨): ولا يجوز ان يبنى بالزكاة المسجد وكذا القناطر والسقايات واصلاح الطرقات وكرى الانهار والحج والجهاد وكل مالا تمليك فيه ولا يجوز ان يكفن بها ميت ولا يقضى بها دين الميت كذا في التبيين.

وفي الشامية(٦/٥٥):(قوله او كتابا الخ) لان القراءة ان كانت طاعة كالقرآن او معصية كالغناء فالاجارة عليها لاتجوز وان كانت مباحة كالأدب والشعر فهذا مباح له قبل الاجارة فلا تجوز، ولو انعقدت تنعقد على الحمل وتقليب الاوراق، والاجارة عليه لا تنعقد ولونص عليه لانه لافائدة فيه للمستاجر ولوالجية.

(١٤٩) زکوۃ کی رقم سے مکان بنا کردینے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گھر کے سامنے ایک چھوٹا سا گھر ہے جو کہ بہت ہی خستہ حالت میں ہے اس میں ایک بیوہ خاتون رہتی ہے، اس بیچاری کا خاوند چند سال پہلے فوت ہوگیا ہے اور وہ لوگوں کے گھروں میں کام کاج کرکے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پال رہی ہے اور وہ بیوہ عورت ہمارے گھر میں بھی کام کرنے آتی ہے اور اسے معلوم ہے کہ میں ہر سال اپنے مال کی زکوۃ ادا کرتا ہوں اس لئے وہ بیوہ عورت میرے سے مکان کا مطالبہ کررہی ہے تو کیا زکوۃ کی رقم سے اس کیلئے مکان بنوا کردینا جائز ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: زکوۃ میں کسی کو اتنا مال دینا جس سے نصاب کی مقدار پوری ہوجاتی ہو، مکروہ ہے۔ اس لئے احتیاط وبہتر یہ ہے کہ مکان بنا کر نہ دیا جائے کیونکہ اس میں زر کثیر خرچ ہوگا لیکن اگر کوئی شخص کسی بیوہ کو جو مستحق زکوۃ بھی ہو مکان بنا کر دیدے اور اس کا قبضہ وملک بھی کرادے تو زکوۃ کراہت کے ساتھ ادا ہوجائے گی، اعادہ کی ضرورت نہیں۔

لمافي الهندية(١/١٨٨): ويكره أن يدفع إلى رجلٍ مائتي درهم فصاعدا وإن دفعه جاز كذا في الهداية هذا اذا لم يكن الفقير مديونا فان كان مديونا فدفع إليه مقدار مالو قضى به دينه لايبقى له شئ أو يبقى دون المأتين لابأس به وكذا لو كان معيلا جاز أن يعطى له مقدار مالو وزع على عياله يصيب كل واحد منهم دون المأتين.

وفي الدر المختار(٢/٣٥٣): (وكره إعطاء فقير نصابا) أو اكثر (إلا اذا كان)المدفوع اليه (مديونا

أو) كان (صاحب عيال) بحيث (لو فرقه عليهم لايخص كلا) أو لايفضل بعد دينه (نصاب) فلا يكره. (وفي الشامية تحته) والظاهر أنه لافرق بين كون النصاب ناميا أو لاحتى لو أعطاه عروضا تبلغ نصابا فكذلك.

(۱۵۰) بیٹے کا غریب باپ کیلئے زکوٰۃ لینے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بندہ محمد عمر ولد محمد بخش جو کہ مزدور ہے دن بھر مزدوری کرتا ہے۔ہم سب کُل 7 افراد ہیں، بیوی بچے، والد والدہ سمیت۔خرچ واخراجات بندہ کے ذمہ ہیں، چھوٹے چھوٹے بچے ہیں کچھ عرصہ پہلے والد صاحب بیمار ہوئے تھے دماغی توازن بالکل کھو بیٹھے تھے گھر کے اندر جو کچھ تھا لگا دیا اور دوسروں سے بیس ہزار قرض لیا ہے اور وہ بھی لگا دیا علاج ابھی بھی جاری ہے اور اب آنکھیں بھی بالکل خراب ہوگئی ہیں، دوسرا بندہ پکڑ کر لے جاتا ہے تقاضے کیلئے۔ان کی آنکھوں کا علاج بھی کروانا ہے اور ان کی رہائش کیلئے جو جھونپڑا بنا ہوا ہے اس کی چھت بانسوں کی ہے جو بالکل کمزور ہے کسی بھی وقت اگر بارش ہوگئی تو سارا پانی پانی ہوجائے گا اور اب ویسے بھی سردی کا موسم ہے۔والد صاحب کیلئے اور گھر کی چھت درست کرنے کیلئے لوگوں سے زکوٰۃ کی رقم لی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً بصورت مسئولہ میں اگر واقعتاً آپ کے والد غریب اور مستحق زکوٰۃ ہیں، تو زکوٰۃ لینے میں کوئی حرج نہیں۔

لما في الهندية (۱/۱۸۷): (ومنها المسكين) وهو من لاشئ له فيحتاج الى المسئلة لقوته أو مايواري بدنه ويحل له ذالك.

وفي الشامية (۲/۳۳۹): (قوله مستغرق في الحاجة) كدار السكنى وعبيد الخدمة وثياب البذلة و آلات الحرفة. وكتب العلم للمحتاج اليها تدريساً اوحفظا أو تصحيحاً كما مرّ اول الزكاة. ويحل صرف الزكاة لمن لاتحل له المسالة بعد كونه فقيراً.

(۱۵۱) تملیک کے بعد زکوٰۃ کی رقم تعمیرات وغیرہ جیسی مد میں استعمال کرنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مدرسہ کے مہتمم نے طلبہ وطالبات (رہائشی) کیلئے اپنے آپ کو وکیل بنایا کہ ان کی طرف سے زکوٰۃ وصدقات عشر وغیرہ وصول کر کے ضروریات مدرسہ وطلبہ میں اپنی صوابدید پر خرچ کرے گا۔اب لوگ عشر وزکوٰۃ، نفلی وواجبی صدقات دیتے ہیں جس سے مہتمم مدرسہ خورد ونوش کے علاوہ تعمیرات، زمین کی خریداری برائے مدرسہ اور کتب برائے مدرسہ کی خریداری میں بھی خرچ کردیتے ہیں، طلبہ وطالبات نے اس کیلئے بھی اجازت دی ہوئی ہے کہ مدرسہ کے کمرے اور اس کیلئے زمین کی خریداری اور مدرسہ کیلئے کتب وغیرہ کی خریداری پر اپنی صوابدید پر خرچ کرسکتے ہیں۔اب حل طلب مسئلہ یہ

ہے کہ مہتمم صاحب زکوۃ وصدقات واجبہ کا پیسہ اس طرح تملیک کر کے مدرسہ کی ان ضروریات پر لگا سکتا ہے یا نہیں؟ رہنمائی فرما کر اس مسئلہ میں تشفی فرمائی جائے۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں جب تملیک ہوگئی تو مہتمم صاحب کو ضرورت شدیدہ کے وقت دوسرے مصارف میں خرچ کرنے کی گنجائش ہے۔

لمافي الهندية (۱/۱۷۰): وتعتبر نية الموكل في الزكاة دون الوكيل كذا في معراج الدراية.

وفي الشامي(۲/۲۶۹): (قوله اذا وكله الفقراء) لأنه كلما قبض شيئاً ملكوه وصار خالطا مالهم بعضه ببعض ووقع زكاة عن الدافع.

(۱۵۲) زکوۃ میں کسی چیز کی جگہ اس کی قیمت دینے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے پاس ستر بکریوں کا ایک ریوڑ ہے، میں ان بکریوں کو سال کا اکثر حصہ جنگل وغیرہ میں چراتا ہوں۔ اب چونکہ مجھ پر زکوۃ میں بکری واجب ہے لیکن میں شہر آیا ہوا ہوں اور چاہتا ہوں کہ بجائے بکری کے اس کی قیمت کسی غریب مستحق کو دیدوں، کیا یہ میرے لئے درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... زکوۃ میں جس طرح عین چیز دینا جائز ہے اسی طرح اس کی قیمت دینا بھی جائز ہے لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ کیلئے بکری کی بجائے اس کی قیمت زکوۃ میں دینا بالکل جائز ہے۔

لمافي الهندية(۱/۱۸۱): ويجوز دفع القيم في الزكوة عندنا.

وفي الشامية(۲/۲۸۵): (جاز دفع القيمة في الزكاة)...... وتعتبر القيمة يوم الوجوب وقالا يوم الاداء وفي السوائم يوم الاداء اجماعا، وهو الاصح، بقول رد المختار، ان المعتبر عند محمد الانفع للفقير من القدر والقيمة وعدهما القدر...... لان المقصود اغناء الفقير و به تحصل القربة وهو يحصل بالقيمة.

(۱۵۳) لوگوں سے مالی تعاون حاصل کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم دو میاں بیوی ہیں اور لڑکے کے مکان میں رہتے ہیں، مکان کا کرایہ اور بجلی کا بل لڑکا خود ادا کرتا ہے اور وہ میرے ساتھ کوئی تعاون نہیں کرتا، میری چھوٹی لڑکی مہینے کے 1000 روپے مجھے دیتی ہے اور میرے جاننے والے حضرات میرے ساتھ مالی تعاون کرتے رہتے ہیں کیا میرے لئے ان سے لینا جائز ہے یا نہیں؟ اور کچھ حضرات کپڑے بھی دیتے ہیں اگر میرے لئے جائز ہے تو میں لوں ورنہ میں انہیں منع کردوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً مذکورہ لوگ اگر آپ سے تعاون بطور صدقات نافلہ کرتے ہیں، تو آپ کے لئے ان سے نقدی اور کپڑے وغیرہ لینا مطلقاً جائز ہے۔ البتہ اگر بطور زکوٰۃ امداد کرتے ہیں تو پھر اگر آپ مستحق زکوٰۃ ہیں یعنی ساڑھے سات تولہ (۷.۵) سونا یا ساڑھے باون تولہ چاندی (۵۲.۵) یا ضرورت اصلیہ سے زائد اتنی مالیت کا سامان یا رقم آپ کی ملکیت میں نہیں ہے تو اس صورت میں آپ کے لئے ان سے زکوٰۃ کی رقم وغیرہ قبول کرنا جائز ہے۔

لما في هندية (۱/۱۸۷): الباب السابع في المصارف: (منها الفقير) وهو من له ادنى شيئ وهو ما دون النصاب ......

وفي الدر المختار (۵/۲۹۸): لان الصدقة على الغني هبة.

(۱۵۴) پندرہ ہزار تنخواہ لینے والے کا لوگوں سے مال زکوٰۃ کا سوال کرنا

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں میں ایک آدمی ہے جس کی تقریباً پندرہ ہزار روپے ماہانہ تنخواہ ہے وہ کہتا ہے کہ آپ اپنے گندم، جَو وغیرہ کی زکوٰۃ مجھے دے دو، لیکن جب اس کو منع کیا جاتا ہے کہ آپ اتنی تنخواہ بھی لیتے ہیں پھر بھی آپ زکوٰۃ کی درخواست کرتے ہیں تو وہ آگے سے کہتا ہے کہ یہ چیزیں میرے کھیت میں نہیں ہوتی ہیں۔ تو آپ حضرات سے گزارش ہے کہ ایسے شخص کو زکوٰۃ دینا جائز ہے یا نہیں؟ اس کے ساتھ یہ بات بھی یاد رہے کہ یہ آدمی اتنی طاقت اور استطاعت رکھتا ہے کہ یہ چیزیں خرید لے۔ براہ کرم اس سوال کا جواب عنایت فرمائیں قرآن وحدیث کی روشنی میں تفصیل کے ساتھ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کے علم میں اضافہ فرمائے۔

الجواب حامداً ومصلیاً .....صورت مسئولہ میں ذکر کردہ شخص کیلئے سوال کرنا ناجائز ہے البتہ اگر اس شخص کے پاس حوائج اصلیہ کے علاوہ نصاب (ساڑھے باون تولہ چاندی (۶۱۲.۳۶ گرام) یا ساڑھے سات تولہ سونا (۸۷.۴۸ گرام) یا سونا چاندی اور نقدی ملا کر ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر نصاب) پورا نہ ہو تو اس کو زکوٰۃ دینا جائز ہے اور اس کیلئے لینا بھی جائز ہے اور اگر نصاب پورا ہو تو اس کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں اور اس کیلئے زکوٰۃ لینا بھی ناجائز ہوگا۔

لما في الهندية (۱/۱۸۹): ولا يجوز دفع الزكاة إلى من يملك نصابا أى مال كان دنانير او دراهم أو سوائم أو عروضاً للتجارة أو لغير التجارة فاضلا عن حاجته في جميع السنة.. ولايشترط النماء اذ هو شرط وجوب الزكاة لاالحرمان كذا في الكافي ويجوز دفعها إلى من يملك أقل من النصاب وإن كان صحيحاً مكتسبا كذا في الزاهدي.

وفي الشامية (۲/۳۳۹): والحاصل أن النصاب قسمان: موجب للزكاة وهو النامي الخالي عن الدين وغير موجب لها وهو غيره فإن كان مستغرقا بالحاجة لمالكه أباح أخذها والاحرمه..... (قوله من

لاشئ له) فيحتاج إلى المسئلة لقوته وما يوارى بدنه ويحل له ذلك بخلاف الاوّل ويحل صرف الزكاة لمن لاتحل له المسألة بعد كونه فقيرا.

(۱۵۵) طلبہ کے قیام وطعام نہ ہونے کے باوجود مدرسہ کیلئے بذریعہ حیلہ زکوٰۃ لینے کاحکم

سوال... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بندہ ایک مسجد میں خطیب ہے جہاں محلے کے بچے صبح اور شام ناظرہ قرآن کریم پڑھنے آتے ہیں۔ اب محلے والوں کا ارادہ ہے کہ شعبہ حفظ شروع کیا جائے۔ اس کے لئے ایک پلاٹ بھی خریدا گیا ہے جسے تعمیر کرنے کا ارادہ ہے کہ بچے وہاں قرآن کریم کی تعلیم حاصل کریں۔ لیکن قیام وطعام نہیں ہوگا بچے صبح آئیں گے اور شام کے وقت گھروں کو واپس چلے جائیں گے۔ پوچھنا یہ ہے کہ ایسے حالات میں مدرسہ والوں کیلئے زکوٰۃ، صدقات واجبہ اور چرم قربانی وغیرہ لوگوں سے وصول کر کے مدرسہ کی عمارت اور تنخواہ وغیرہ پر خرچ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ زکوٰۃ میں تملیک ضروری ہے اور اس کے لئے مدارس والے اپنے فارم کے اندر ایک تحریر طلباء سے پڑھوا کر دستخط کروالیتے ہیں جس کے بعد وہ طلبہ کی طرف سے بطور وکیل زکوٰۃ وصول کرتے ہیں اور پھر مدرسہ کی ضروریات پر خرچ کر دیتے ہیں۔ لہٰذا آپ لوگ بھی ایک فارم بنوا کر اس میں درج ذیل تحریر شامل کرلیں کہ "میری طرف سے صدر مدرسہ یا جس کو وہ اجازت دیں تا مدت تعلیم اس کا اختیار ہوگا کہ زکوٰۃ وصدقات واجبہ کی رقم یا اشیاء وصول کر کے طلباء کی ضروریات تعلیم وغیرہ میں حسب صوابدید خرچ کریں یا مدرسہ کو عطیہ دیں" اور مستحق بالغ طلباء سے دستخط کروالیں اس طرح زکوٰۃ کی رقم کو مدرسہ پر خرچ کر سکتے ہیں۔ اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ ایسا کرنا ان مدارس کیلئے تو درست ہے جو قیام وطعام کی ذمہ داری اٹھاتے ہیں لیکن جہاں قیام وطعام نہ ہو، ان مدارس کیلئے ایسا کرنا درست نہیں۔

براہ کرم شریعت کی روشنی میں بتائیں کہ کیا مذکورہ تحریر ہم فارم میں شامل کرلیں اور مستحق طلبہ سے دستخط کروالیں تو ایسا کرنے سے ہمارے لئے زکوٰۃ اور صدقات واجبہ، چرم قربانی وغیرہ لوگوں سے وصول کر کے مدرسہ کی تعمیر اور دیگر طلبا کی ضروریات پر خرچ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ ہمارے ہاں قیام وطعام نہیں ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً... زکوٰۃ اور دیگر صدقات واجبہ کے مصارف میں ایک مصرف فقیر غیر ہاشمی ہے۔ اور مسجد ومدرسہ کی تعمیر وبل وغیرہ ان مصارف میں داخل نہیں تاہم طلباء کی ضروریات کے پیش نظر اور دین کی تعلیم جاری رکھنے کی وجہ سے وہ مدارس جن میں طلباء کے قیام وطعام کا بندوبست ہو۔ وہاں طلباء کے طعام کے علاوہ دیگر ضروریات جو کہ مصرف زکوٰۃ نہیں مثلاً اساتذہ کی تنخواہیں، تعمیرات کا کام، بجلی کا بل وغیرہ کیلئے یہ حیلہ کرنا کہ بالغ غیر ہاشمی طلباء سے ان کی رضامندی کے ساتھ دستخط لے کر ان کی طرف سے وکیل ہونا اور پھر اس مال کو مصرف زکوٰۃ کے علاوہ دیگر ضروریات میں خرچ کرنا ضرورت کی بناء پر درست ہوگا۔ البتہ وہ مدارس جن میں قیام وطعام کا بندوبست نہ ہو وہاں پر یہ حیلہ کرنا مکروہ ہوگا۔

لما في الهندية (۶/۳۹۰): فنقول مذهب علمائنا رحمهم الله تعالىٰ ان كل حيلة يحتال بها الرجل

لابطال حق الغير اولاد خال شبهة فيه اولتمويه باطل فهي مكروهة.

وفي الفقه الاسلامي(۱۹۶۳/۳): وتحل الزكاة لطالب العلوم الشرعية، لان تحصيل العلم فرض كفاية ويخاف من الاقبال على الكسب الانقطاع عن التحصيل.

وفي الاشباه والنظائر (صـ۲۰۶): الثالث في الزكاة، من له نصاب اراد منع الوجوب عنه فالحيلة ان يتصدق بدرهم منه قبل التمام او يهب النصاب لابنه الصغير قبل التمام بيوم، واختلفوا في الكراهة و مشايخنا رحمهم الله تعالىٰ اخذوا بقول محمد رحمه الله تعالىٰ دفعاً للضرر عن الفقراء.

(۱۵۶) غیر رہائشی مستحق طلباء کیلئے زکوٰۃ وصول کرنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دینی ادارے کے اندر تقریباً چار سو غیر رہائشی بچے قرآن مجید کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور نو اساتذہ تدریس کیلئے مقرر ہیں۔ ادارے نے انتظام کی غرض سے پچیس روپے فیس مقرر کی ہے لیکن پچاس سے زیادہ بچے ایسے ہیں جو کہ یہ بھی ادا کرنے کی سکت نہیں رکھتے۔ ادارہ اب تک لوگوں سے صدقات غیر واجبہ وصول کر کے اس کے ذریعے سے مدرسہ کے اخراجات مکمل کرنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن موجودہ حالات کے پیش نظر ضروریات صرف اس سے مکمل نہیں ہو رہی ہیں۔ کیا ادارہ مفت تعلیم حاصل کرنے والے مستحق بچوں کا وکیل بنتے ہوئے صدقات واجبہ کی مد سے رقم وصول کر سکتا ہے؟ اس کی صحیح شرعی صورت سے آگاہ فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... زکوٰۃ کے اموال فقراء ومساکین کا حق ہے۔ اور فقیر جہلاء کی بنسبت علماء اور طلباء (جو کہ صاحب نصاب نہ ہوں) زکوٰۃ کے زیادہ مستحق ہیں۔ چونکہ مدارس کے طلباء جب مدارس کے مہتممین حضرات کے اہتمام کو قبول کرتے ہیں تو گویا یہ ان کی طرف سے صدقات وغیرہ کے وصول کرنے کے لئے وکیل بن جاتے ہیں، اس لئے مہتمم حضرات یا ان کے نائبین طلباء کی طرف سے وکیل بن کر زکوٰۃ وغیرہ کو قبول کرتے ہیں، جو کہ طلباء کی ضروریات مثلاً کھانے، پینے، کپڑے، وظیفے وغیرہ میں خرچ کیا جاتا ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر مدرسہ کے اندر طلباء کے لئے کھانے پینے، کپڑے، وظیفے، علاج وغیرہ کا نظام موجود ہو، تو اس مدرسہ کا مہتمم فقیر طلباء کی طرف سے وکیل بن کر زکوٰۃ وصول کر سکتا ہے، اور اگر مدرسہ کے اندر اس طرح کا نظام موجود نہ ہو تو مہتمم کو زکوٰۃ وصول کرنے سے اجتناب کرنا چاہئے۔ اسی طرح طلباء کے لئے لی ہوئی رقم سے تنخواہ، تعمیر اور بل ادا کرنا بھی جائز نہیں۔

لمافي المحيط البرهاني (۲۱۲/۳): ولا يصرف في بناء مسجد وقنطرة ولا يقضى بها دين ميت ولا يعتق عبدا ولا يكفن ميتا. والحيلة لمن اراد ذلك ان يتصدق بمقدار زكوته على فقير ثم يأمره بعد ذلك بالصرف لهذه الوجوه، فيكون لصاحب المال ثواب الصدقة وللفقير ثواب هذه القربة.

وفي الهندية (۱۸۷/۱): التصدق على الفقير العالم افضل من التصدق على الجاهل.

وفی الشامیة (۲/۲۶۹): "قوله اذا وکله الفقراء" لانه کلما قبض شیئا ملکوه وصار خالطا مالهم بعضه ببعض ووقع زکوٰۃ عن الدافع. لکن بشرط ان لا یبلغ المال الذی بیده الوکیل نصابا. فلو بلغه وعلم به الدافع لم یجزه اذا کان الأخذ وکیلا عن الفقیر...... قلت هذا اذا کان الفقیر واحداً، فلو کانوا متعددین لابد ان یبلغ لکل واحد نصابا لان مافی یدالوکیل مشترک بینهم.

(۱۵۷) مستحق یا وکیل مستحق کے مالِ زکوٰۃ کو وصول کر لینے کے بعد مال کے ہلاک ہو جانے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ رمضان المبارک میں ایک ادارے کے مہتمم صاحب میرے پاس آتے رہتے ہیں، ان کو زکوٰۃ کی مد سے رقم دیتا ہوں اس مرتبہ جب وہ زکوٰۃ کی رقم لے کر گئے تو ان سے کسی نے زبردستی چھین لی تو اب آپ سے معلوم یہ کرنا ہے کہ میری زکوٰۃ ادا ہوگئی یا دوبارہ مجھے زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... زکوٰۃ کی رقم جب کسی مستحق یا وکیل مستحق کو بنیت زکوٰۃ ادا کی جائے اور وہ قبضہ بھی کر لے تو زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے اور مہتمم حضرات عام طور پر طلباء کی طرف سے وکیل ہوتے ہیں۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں مہتمم صاحب کے قبضہ کر لینے سے آپ کی زکوٰۃ ادا ہوگئی دوبارہ زکوٰۃ دینے کی ضرورت نہیں۔

لمافی الشامیة(۲/۲۶۹): (قوله اذا وکله الفقراء) لانه کلما قبض شیئاً ملکوه وصار خالطا مالهم بعضه ببعض ووقع الزکاة عن الدافع.

وفی الدر المختار(۲/۲۷۰): ولا یخرج عن العهدة بالعزل بل بالاداء للفقراء.

وفی الشامیةتحته (قوله ولا یخرج عن العهدة بالعزل) فلو ضاعت لاتسقط عنه الزکاة ولومات کانت میراثا عنه بخلاف ما اذا ضاعت فی یدالساعی لان یده کید الفقراء.

(۱۵۸) مستحق زکوٰۃ یا اس کے وکیل سے زکوٰۃ کی رقم ضائع ہو جانے سے ادائیگی زکوٰۃ کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم لوگ ڈیفنس میں رہائش پزیر ہیں اللہ کے فضل وکرم سے مال بہت ہے، کاروبار بھی اچھا چل رہا ہے۔ ہم ہر سال رمضان المبارک میں زکوٰۃ نکالتے ہیں اکثر تو پنجاب کے ایک مولانا صاحب کا مدرسہ ہے ان کو دیتے ہیں باقی اپنے شہر کے مدارس میں دیتے ہیں اس مرتبہ جب ہم نے زکوٰۃ نکالی اور مولانا کے سپرد کی تو جب وہ واپسی سفر میں سندھ پہنچے تو گاڑی لٹ گئی مولانا صاحب کی بھی ساری رقم ڈاکو لے گئے جس میں ہماری زکوٰۃ والی رقم بھی تھی جب انہوں نے خبر دی تو بہت افسوس ہوا، اب پریشانی یہ ہے کہ ہماری زکوٰۃ ادا ہوئی ہوگی یا نہیں؟ اس لئے آپ سے رجوع کا سوچا آپ حضرات یہ بتائیں کہ جب زکوٰۃ کی رقم مدرسے پہنچنے سے پہلے پہلے ڈاکو لے گئے تو کیا ہماری زکوٰۃ ادا ہوگئی یا دوبارہ ادا کرنی پڑے گی؟ برائے مہربانی

جلدی جواب عنایت فرما کر شکریہ کا موقع عطا فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر کوئی شخص اپنے مال میں سے بنیت زکوٰۃ رقم کی ادائیگی کرتا ہے اور مستحق زکوٰۃ یا اس کے وکیل کو دیدیتا ہے تو اس کی زکوٰۃ ادا ہوجاتی ہے چاہے وہ ہلاک ہی کیوں نہ ہوجائے ہاں اگر ابھی صرف رقم الگ کی تھی اور اس کی ادائیگی نہیں کی تھی پھر وہ اسی کی ملکیت میں ہلاک ہوجاتی ہے تو اس صورت میں زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی، پس صورت مسئولہ میں جب آپ نے مذکورہ مولانا صاحب کو زکوٰۃ کی مد میں رقم دیدی تو آپ کی زکوٰۃ ادا ہوگئی درمیان راستے میں رقم کے ہلاک ہونے کی بناء پر آپ کی زکوٰۃ کی ادائیگی پر کوئی فرق نہیں آئے گا لہٰذا آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

لـمافي المحيط البرهاني(۳/۲۱۰): وقال القدوری فی کتابه: لو هلک المال في يد العامل سقط حقه، واجزأت عنه الزکاة، اما سقوط حقه فلان حقه في المال الذی في يده فيسقط بهلاکه کمال المضاربة اذا هلک في يد المضارب بعد العمل واما جواز الزکاة فلان قبض العامل بعد الحول واقع للفقير وکان کقبض الفقير بنفسه.......... لايجوز الزکاة الا اذا قبضها الفقير او قبضها من يجوز القبض له لولايته عليه.

وفي الشامية (۲/۲۶۸): (وشرط صحة أدائها نية مقارنة له) ای للاداء (ولو) کانت المقارنة (حکما) کما لو دفع بلانية ثم نوی والمال قائم في يد الفقير أو نوی عند الدفع للوکيل ثم دفع الوکيل بلانية .... ولا يخرج عن العهدة بالعزل بل بالاداء للفقراء (قوله الشامي ولا يخرج عن العهدة بالعزل فلو ضاعت لاتسقط عنه الزکاة ولو مات کانت ميراثا عنه، بخلاف ما اذا ضاعت في يد الساعي لان يده کيد الفقراء بحر عن المحيط.

وفي الشامية (۲/۲۶۹): (قوله اذا وکله الفقراء) لانه کلما قبض شيئا ملکوه وصار خالطا مالهم بعضه ببعض ووقع زکاة عن الدافع لکن بشرط ان لايبلغ المال الذی بيده الوکيل نصابا فلو بلغته وعلم به الدافع لم يجزه اذا کان الاخذ وکيلا عن الفقير کما في البحر عن الظهيرية قلت: وهذا اذا کان الفقير واحدا فلو کانوا متعددين لابد ان يبلغ لکل واحد نصابا لان مافي يد الوکيل مشترک بينهم، فاذا کانوا ثلاثة ومافي يد الوکيل بلغ نصابين لم يصيروا اغنياء فتجزی الزکاة عن الدافع .... واما اذا لم يکن الاخذ وکيلا عنهم فتجزی وان بلغ المقبوض نصبا کثيرة لانهم لم يملکوا شيئا مما في يده.

(۱۵۹) نصابِ زکوٰۃ، صدقۂ فطر اور قربانی میں قیمتی کپڑوں کو شامل کرنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک جامعہ کا فاضل ہوں، اپنے مطالعے میں مختلف

کتابیں رکھتا ہوں، اور جس مسئلے کے بارے اکابر علماء کی رائے معلوم ہوتی ہے، کسی کے پوچھنے پر بتا دیتا ہوں، ایک دن میں بیٹھا زکوۃ وغیرہ کے مسائل سوچ رہا تھا تو ایک مسئلہ ذہن میں آیا اور اس سے متعلق ایک سوال، اپنے پاس موجود کتابوں میں کافی تلاش کے بعد بھی مجھے اس کا جواب نہ مل سکا تو آنجناب کو زحمت دے رہا ہوں، مسئلہ یہ تھا کہ عام طور پر زکوۃ کے مسئلے میں کہا جاتا ہے کہ حاجت اصلیہ اور ضرورت سے زائد مال میں اگر وہ نصاب کو پہنچ رہا ہو، تو زکوۃ فرض ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ حاجت اصلیہ میں فقہائے کرام نے کپڑوں کو بھی داخل کیا ہے۔ لیکن اس کی تعداد اور مقدار ذکر نہیں کی۔ ہمارے زمانے میں تو ہر ایک کے پاس خصوصاً خواتین کے پاس تو کپڑوں کا ایک ڈھیر ہوتا ہے اور بہت سے کپڑے تو ان کے روزمرہ استعمال میں آتے ہی نہیں۔ اب ان قیمتی کپڑوں کو نصاب میں شامل کیا جائے گا یا نہیں؟ اگر نہیں تو صدقۂ فطر میں کیوں شامل کیا جاتا ہے۔ اسی طرح آیا قربانی کے نصاب کے سلسلے میں بھی انہیں شامل کیا جائے گا؟ براہ کرم مدلل و مفصل جواب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... سونے چاندی کے علاوہ باقی تمام اشیاء عروض (سامان) میں داخل ہیں۔ اور سامان میں جب تک تجارت کی نیت نہ ہو، وہ مال نامی نہیں ہوسکتا ہے اور زکوۃ کے نصاب میں مال نامی کا ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا کپڑوں کو نصاب زکوۃ میں شامل نہیں کیا جائے گا چاہے جتنے جوڑے بھی ہوں۔ البتہ نصاب صدقۂ فطر اور قربانی میں صرف "غنا" (مالداری) ضروری ہے جو بقدر نصاب مال سے حاصل ہو جاتا ہے۔ اگرچہ وہ نصاب غیر نامی ہو۔ اس وجہ سے صدقۂ فطر اور قربانی کے نصاب میں ان کپڑوں کو شامل کیا جائے گا جو روزمرہ استعمال کے نہ ہوں، یعنی وہ کپڑے جو آدمی کے پاس استعمال سے زائد ہوں۔ اور بقدر نصاب ہوں اور اس پر عید الفطر یا ایام قربانی آئیں تو صدقۂ فطر اور قربانی واجب ہوگی۔

لما فی الهندية (۱/۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۹۰): اما شروط وجوبها...... (فمنها فراغ المال) عن حاجته الاصلية فليس في دور السكنى وثياب البدن واثاث المنازل ودواب الركوب وعبيد الخدمة وسلاح الاستعمال زكاة وكذا طعام اهله...... وكذا الجوهر واللولوء والياقوت...... ونحوها اذا لم يكن للتجارة......

(ص ۱۷۳) (ومنها كون النصاب ناميا) حقيقة بالتوالد والتناسل والتجارة او تقديرا بان يتمكن من الاستنماء الى قوله والنماء خلقي وفعلي وفعلي ماسوا الذهب والفضة ويكون الاستنماء فيه بنية التجارة والاسامة ونية التجارة والاسامة لاتعتبر مالم تتصل بفعل التجارة.

صدقة الفطر هي واجبة على الحر المسلم المالك لمقدار النصاب فاضل عن حوائجه الاصلية ولا يعتبر فيه وصف النماء ويتعلق بهذا النصاب وجوب الاضحية ووجوب نفقة الاقارب.

وفي الدر المختار مع الرد (۲/۲۵۹، ۲۶۲، ۲۶۳): (وسببه) اى سبب افتراضها (ملك نصاب حولي) (تام) الى قوله (و) فارغ (عن حاجته الاصلية) لان المشغول بها كالمعدوم وفسره ابن ملك بما

بدفع عنه الهلاک تحقيقا كثيابه او تقديراً كدينه (نام لوتقديراً) بالقدرة على الاستنماء ولو بنائبه.

وفي الشامية (۲/۲۶۲): (قوله وفارغ عن حاجته الاصلية) اشار الى انه معطوف على قوله عن دين الى ان قال وليس في دور السكنى وثياب البدن وأثاث المنازل ودواب الركوب وعبيد الخدمة وسلاح الاستعمال زكاة لأنها مشغولة بحاجته الاصلية، وليست بنامية أيضاً وقال الشاميّ ايضاً في تفصيل ما قبل فيكون التقييد بالنماء احترازاً عن اعيانها والتقييد بالحوائج الاصلية احترازا عن اثمانها فاذا كان معه دراهم امسكها بنية صرفها الى حاجته الأصلية لاتجب الزكاة فيها اذا حال الحول وهي عنده.

وفيه ايضاً (۲/۲۶۳): (قوله نام ولو تقديرا) النماء في اللغة بالمد الزيادة الى قوله وفي الشرع وهو نوعان حقيقي وتقديري فالحقيقي الزيادة بالتوالد والتناسل والتجارات والتقديري تمكنه من الزيادة بكون المال في يده او يد نائبه.

وفيه ايضاً (۲/۳۰۰): (قوله ويشترط فيه النية) اى تعتبر قيمته ان نوى فيه التجارة نهر وتقدم قبيل باب السائمة شرط نية التجارة.

قال الشامي في ذيله وعن النقدين لا يحتاج الى نية التجارة كمافي الشمني وغيره وكذا ما كان مما نحن فيه فبقي اشتراط النية لماسوى ذلك.

وفي الدر المختار (۲/۳۵۹،۳۶۰): (تجب) (على كل) حر (مسلم) ولو صغيراً مجنونا......

(ذي نصاب فاضل عن حاجته الاصلية) كدنيه وحوائج عياله (وان لم ينم) كمامر (وبه) اى بهذا النصاب (تحرم الصدقة) كمامر وتجب الاضحية ونفقة المحارم على الراجح.

وفي الشامية (۲/۳۶۰): (قوله كمامر) اى في قوله وغني يملك قدر نصاب وقدمنا بيانه ثمة.

وفي الشامية (۲/۳۶۰): قال في التلويح وكذا النصاب الغير النامي في الفطرة.

(۱۶۰) زکوۃ، صدقات اور سود وغیرہ کے مصارف

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام درج ذیل مسائل کے بارے میں کہ

(۱) سودی رقم کس مد میں لگا سکتے ہیں (مسجد، مدرسہ، غریب ومسکین وغیرہ)

(۲) صدقہ کی رقم کا مصرف (کار خیر کے کاموں میں مسجد ومدرسہ وغیرہ)

(۳) زکوۃ کی رقم کا مصرف (مسجد، مدرسہ، تعمیرات وغیرہ)

(۴) جائز آمدنی یا ماہانہ تنخواہ میں سے کتنے فیصد مسجد و مدرسہ کو دے سکتے ہیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً ... (۱)۔سود کے ذریعے سے حاصل شدہ رقم حرام ہے اس سے بچنا لازمی اور ضروری ہے اگر خدانخواستہ ایسا مال ہاتھ میں آ جائے تو اسے اصل مالک کو واپس لوٹانا واجب ہے اگر لوٹانا ممکن نہ ہو تو اس رقم کو غرباء اور مساکین پر بغیر نیت ثواب کے صدقہ کرنا لازم ہے۔(۳،۲)۔زکوٰۃ اور صدقہ واجبہ میں تملیک یعنی مالک بنانا شرط ہے بغیر تملیک کے مسجد یا مدرسہ کے تعمیراتی امور یا کار خیر میں لگانا جائز نہیں ہے البتہ مسجد یا مدرسہ کے اندر مستحق طلباء موجود ہوں ان پر خرچ کرنا جائز ہے۔اور صدقہ نافلہ بغیر تملیک کے کسی بھی کار خیر میں لگا سکتے ہیں۔(۴)۔اپنی جائز آمدنی اور ماہانہ تنخواہ میں سے اپنی بنیادی ضروریات کا خرچہ نکالنے کے بعد جتنا ہو سکے مسجد یا مدرسہ کے ساتھ تعاون کیا جائے باعث سعادت ہے۔

لمافی البحر الرائق (۲/۲۳۹): واما رکنها فهو نفس الاداء الی المصرف فهی التمليک کالزکاۃ.

وفي بدائع الصنائع(۲/۵۰): واما صدقة التطوع فيجوز دفعها الی هولاء والدفع اليهم اولیٰ لان فيه اجرين اجر الصدقة واجر الصلة وکونه دفعاً الی نفسه من وجه لايمنع صدقة التطوع، قال النبی ﷺ نفقة الرجل علی نفسه صدقة وعلی عياله صدقة وکل معروف صدقة.

وفي الشامية(۵/۹۹): والحاصل انه إن علم ارباب الاموال وجب رده عليهم والافان علم عين الحرام لايحل له ويتصدق به بنية صاحبه الخ.

(۱۶۱) عورت کیلئے صدقات دینے کا حکم

سوال ... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے صدقہ خیرات کے بارے میں پوچھنا تھا کہ گھر میں رہنے والی عورت کیسے صدقہ خیرات دے سکتی ہے، کہنے کا مطلب ہے کہ جو ہم بنا مشکل کے ادا کر سکے۔آخر مفتی صاحب ہمارے اسلام میں صدقہ خیرات کیا امیر لوگ ہی کیلئے تو حکم نہیں ہے سب کیلئے ہے۔عورت پر جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......سوال میں مذکور صدقہ خیرات سے اگر صدقات واجبہ مثلاً زکوٰۃ مراد ہے تو چونکہ زکوٰۃ کے واجب ہونے میں انفرادی ملکیت کا اعتبار ہے،لہٰذا اگر گھر میں رہنے والی عورت کی اپنی ملکیت میں بقدر نصاب مال موجود ہے تو حولان حول یعنی ایک سال کا عرصہ گزرنے پر اس کے ذمے اس مال کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

لما في الهندية(۱/۱۸۱): فان کان نصيب کل واحد منها يبلغ نصاباً وجبت الزکاة والا فلا...... فان کان نصيب احدهما يبلغ نصابا ونصيب الاخر لايبلغ وجبت الزکاة علی الذی يبلغ نصيبه نصاباً دون الاخر.

اگر صدقہ خیرات سے مراد صدقہ نافلہ ہے تو گھر میں رہنے والی عورت یعنی بیوی کے لئے اپنے مال سے دینا جائز ہے لیکن شوہر کے مال سے

صدقہ خیرات کرنا چاہے تو شوہر کی رضامندی ضروری ہے، لما فی الحدیث: "لا یحل مال امرء الا بطیب نفسہ" (یعنی کسی شخص کا بھی مال اس کی دلی رضامندی کے بغیر حلال نہیں ہے)

فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر شوہر کی طرف سے عورت کو صریحی طور پر یا عرفی طور پر اجازت حاصل ہو (یعنی اگر عورت مرد سے پوچھے بغیر صدقہ خیرات کردے اور اس سے مرد کو خوشی ہوتی ہو تو یہ عرفی اجازت شمار ہوتی ہے) تو عورت کیلئے صدقہ خیرات کرنا درست ہے ورنہ گنہگار ہوگی۔

لما فی معارف السنن (۲۹۸/۵): ان کانت المرءۃ مجازۃ من الزوج صراحۃ او دلالۃ او عرفاً جاز لها الانفاق من بیت زوجها ولها الاجر والا فلا وعلیها وزر اذا انفقت.

(۱۶۲) فقہاء کرام کا لفظ صدقہ کو زکوٰۃ کے معنی پر محمول کرنے کی وجہ

سوال ...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک مسجد کا امام ہوں، لوگ چھوٹے موٹے مسائل مجھ سے پوچھنے آجاتے ہیں جو معلوم ہوتا ہے بتا دیتا ہوں ورنہ کتاب سے دیکھ کر بتا دیتا ہوں۔ رمضان المبارک میں زکوٰۃ وغیرہ مسائل سے بہت سابقہ پڑا۔ انہی مسائل کے دیکھنے میں ایک اشکال ذہن میں آیا۔ خود تلاش کیا لیکن نہ مل سکا، اس لئے آپ کی خدمت میں پیش کررہا ہوں، مسئلہ یہ تھا کہ احادیث میں تو مطلق صدقہ کے دینے کا حکم آیا ہے۔ اور فقہاء کرام اس کو یعنی حدیث میں آنے والے لفظ صدقہ کو زکوٰۃ کے معنی پر محمول کردیتے ہیں۔ اس تخصیص کی کیا وجہ ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ...... لفظ صدقہ لغت میں مال کے اس جز کو کہا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے خرچ کیا جائے۔ اور لفظ صدقہ اپنے اصلی معنی کی رو سے عام ہے نفلی صدقہ کو بھی کہا جاتا ہے اور صدقۃ الفرض (زکوٰۃ) پر بھی بولا جاتا ہے۔ لیکن جب لفظ صدقہ مطلق بولا جائے اور نفلی صدقہ کا کوئی قرینہ موجود نہ ہو تو اسے زکوٰۃ پر ہی محمول کریں گے جیسا کہ قرآن مجید میں لفظ صدقہ کو زکوٰۃ پر محمول کیا گیا ہے۔ (اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ ...... سورۃ توبہ: ۶۰) اور اسی طرح (خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ ...... سورۃ توبہ: ۱۰۳) اس لئے لفظ صدقہ جب حدیث طیبہ میں فرمایا جاتا ہے اور نفلی صدقہ کا کوئی قرینہ موجود نہیں ہوتا بلکہ قرائن سے یہ بات واضح ہو رہی ہوتی ہے کہ یہاں صدقات واجبہ (زکوٰۃ) ہی مراد ہیں تو اسے فقہاء کرام بطرز قرآن مجید صدقات واجبہ (زکوٰۃ) پر محمول کرتے ہیں۔ اور جہاں قرائن سے یہ بات واضح ہو رہی ہوتی ہے کہ یہاں صدقات نافلہ مراد ہیں تو اسے زکوٰۃ نافلہ پر ہی محمول کیا جائے گا۔ اس سے زکوٰۃ مراد نہیں لیا جائے گا۔ جیسا کہ آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا بہترین صدقہ بھوکے کو پیٹ بھر کر کھانا کھلانا ہے۔ واضح سی بات ہے کہ یہاں صدقہ سے مراد زکوٰۃ نہیں کہ جس شخص پر زکوٰۃ فرض ہے وہ بھوکے کو کھانا کھلائے بلکہ یہاں صدقہ سے مراد نفلی صدقہ ہے کہ جو شخص بھی صدقہ کرنا چاہتا ہے اسے چاہئے کہ وہ بھوکے کو پیٹ بھر کر کھانا کھلائے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ فقہاء کرام ہر جگہ صدقہ کو زکوٰۃ پر محمول نہیں کرتے بلکہ جہاں قرائن سے یہ بات واضح ہو رہی ہوتی ہے تو بااسلوب قرآن زکوٰۃ پر محمول کرتے ہیں۔

لمافي التفسير للقرطبي (٣/١٦٩): "انما الصدقات للفقراء والمسكين ..."(التوبة: ٦٠) والصدقة متى اطلقت في القرآن فهي صدقة الفرض.

وفي الصحيح لمسلم (١/٣٢٢): عن ابي هريرة رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ: قال لا يتصدق احد بتمرة من كسب طيب الا أخذها الله بيمينه فيربيها كما يربي احدكم فلوّه او قلوصه حتى تكون مثل الجبل او اعظم

وفي التبيين الحقائق (٢/٣٣): المراد بالصدقة الزكاة، وانما عبر عنها بالصدقة اقتداء بقوله تعالى "انما الصدقات للفقراء قوله المراد بالصدقة الزكاة" سميت بها لدلالتها على صدق العبد العبودية.

وفي العناية على هامش فتح القدير (٢/١٧١): ذكر في المبسوط أن محمد (رحمه الله) بدأ في كتاب الزكاة بزكاة [illegible] اقتداء بكتاب رسول الله ﷺ وذكر الصدقة واراد بها الزكاة اقتداء بقوله "انما الصدقات"

وفي قاموس الفقهي (ص ٢٠٩): الصدقة: ما يعطى على وجه القربى لله تعالى ... والصدقة تعم صدقة [illegible] وصدقة الفرض هي الزكاة

﴿باب العشر والخراج﴾

(عشر اور خراج کے مسائل کا بیان)

(۱۶۳) زکوٰۃ، عشر اور خراج کی تعریف، حکم اور ان کے درمیان فرق

سوال ... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے آپ سے چند چیزوں کی شرعی تعریف اور حکم پوچھنا ہے، اور ان میں فرق۔ وہ یہ کہ آپ بتادیں کہ زکوٰۃ، عشر وخراج میں کیا فرق ہے؟ ان کا حکم کیا ہے؟ اور ان کی شرعی تعریفیں کیا ہیں؟ برانہ مانیں تو جلدی جواب دیجئے گا۔

الجواب حامداً ومصلیاً ... اصطلاح شریعت میں زکوٰۃ مال مخصوص کا مخصوص اشخاص کو اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے مالک بنانے کا نام ہے، زمین سے جو پیداوار حاصل ہوتی ہے اس پر جو زکوٰۃ آتی ہے اس کو عشر کہتے ہیں اور جس زمین کو مسلمان فتح کرنے کے بعد ان کے اصل مالکان کے حوالے کر کے اس کی پیداوار کا ایک مخصوص حصہ ان سے لیں یا اس زمین پر مخصوص ٹیکس عائد کردیں تو اس کو اصطلاح شریعت میں خراج کہتے ہیں۔ زکوٰۃ اور عشر کا حکم یہ ہے کہ یہ دونوں مسلمانوں پر فرض ہیں اور خراج ذمیوں پر ایک ٹیکس ہے جو اُن پر لازم ہے۔

عشر زکوٰۃ ہی کی ایک قسم ہے، لیکن مال تجارت اور سائمہ جانوروں میں مقدار واجب کو زکوٰۃ کہا جاتا ہے، اور زمین کی پیداوار میں مقدار واجب عشر کہلاتا ہے، زکوٰۃ کیلئے صاحب نصاب ہونا اور مال پر حولان حول ہونا (سال کا گزرنا) شرط ہے۔ جبکہ عشر میں دونوں شرطیں نہیں۔ زکوٰۃ سال میں ایک مرتبہ واجب ہوتی ہے جبکہ عشر جتنی مرتبہ زمین سے پیداوار حاصل ہوتی ہی مرتبہ واجب ہوتا ہے۔ دین مانع زکوٰۃ ہے، لیکن مانع عشر نہیں۔

خراج بھی زکوٰۃ اور عشر کی طرح وظیفہ مالیہ ہے لیکن زکوٰۃ اور عشر میں عبادت کا معنی پایا جاتا ہے اور خراج میں عقوبت کا۔ زکوٰۃ وعشر ابتداء، مسلمانوں پر لازم ہے جبکہ خراج ابتداءً کافروں پر لازم ہے اور انتہاءً مسلمانوں پر بھی لازم ہوسکتا ہے۔

لمافي خلاصة الفتاوى(۱/۲۳۵): الزكوة انما تجب اذا ملك نصابا تاما ناميا حولا كاملا المال النامي نوعان السايمة ومال التجارة.

وفي الدر المختار(۲/۳۲۶): (و)تجب في(مسقى سماء)اى مطر (وسيح) كنهر (بلا شرط نصاب) راجع للكل (و) بلا شرط (بقاء) وحولان حول لان فيه معنى المؤنة ولذا كان للامام اخذه جبراً ويوخذ من التركة ويجب مع الدين وفي ارض صغير ومجنون ومكاتب.

وفي الفقه الاسلامي وادلته(۳/۱۹۰۵-۱۹۰۶): بان الخراج والعشر حقان مختلفان ذاتا ومحلا

وسببا ومصرفا ودليلا اما اختلافهما ذاتا فلان العشر فيه معنى العبادة والخراج فيه معنى العقوبة واما اختلافهما محلا فلان العشر يجب في الخارج والخراج يتعلق بالذمة واما اختلافهما سببا فلان سبب العشر نفس الخارج فلا يجب بدونه وسبب الخراج الارض النامية اى الصالحة للزراعة بدليل وجوبه وان لم تزرع الارض

(١٦٤) کن صورتوں میں عشر ہوتا ہے اور کن میں نصف عشر ہوتا ہے؟

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے والد صاحب کی کئی ایکڑ زمینیں ہیں جس پر مختلف چیزوں کی کاشت ہوتی ہے، میں مدرسے میں پڑھتا ہوں، والد صاحب کو میں نے یہ مسئلہ بتایا کہ زمین کی پیداوار پر عشر آتا ہے تو انہوں نے تفصیل جاننا چاہی، وہ مجھے معلوم نہ تھی اس لئے آپ کو زحمت دے رہا ہوں۔ آپ بتادیں کہ کن صورتوں میں عشر ہوتا ہے اور کن میں نصف عشر ہوتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً جو زمین ایسے پانی سے سیراب کیا جائے جس میں خرچہ آتا ہو اس میں نصف عشر ہے اور اگر خرچہ نہ آتا ہو تو اس میں عشر ہے۔ لہذا بارانی زمین میں اور جس زمین کو نہروں کے ذریعے سے سیراب کیا جائے ان میں عشر ہے اور جن کو کنویں، ٹیوب ویل وغیرہ کے ذریعے سیراب کیا جائے جس میں مؤنت (خرچہ) ہو تو ان میں نصف عشر ہے اور اگر پانی دونوں طرح ہو تو اس میں غالب کا اعتبار ہے اور اگر پانی خرید کر زمین کو سیراب کیا جائے تو اس میں بھی نصف عشر واجب ہوتا ہے۔

لما في الدر المختار (٢/٣٢٦): (و) يجب في (مسقى سماء) اى مطر (وسيح) كنهر (ص٣٢٨) (و) يجب (نصفه في مسقى غرب) اى دلو كبير (ودالية) اى دولاب لكثرة المؤنة وفي كتب الشافعية او سقاه بماء اشتراه وقواعدنا لا تأباه.

وفي الشامية تحته: (قوله وقواعدنا لا تأباه) كذا نقله الباقاني في شرح الملتقى عن شيخه البهنسي لان العلة في العدول عن العشر الى نصفه في مسقى غرب ودالية هي زيادة الكلفة كما علمت وهي موجودة في شراء الماء ولعلهم لم يذكروا ذلك لان المعتمد عندنا ان شراء الشرب لا يصح وقيل ان تعارفوه صح فهل يقال عند عدم الصحة انه يوجب عدم اعتباره ام لا تامل نعم لو كان محرزا باناء فانه يملك

وفي الفقه الاسلامي وادلته (٣/١٨٩٢): اتفق الفقهاء على أن العشر يجب فيما سقي بغير مؤنة (مشقة) كالذي يشرب من السماء (الأمطار) وما يشرب بعروقه، وهو الذي يشرب من ماء قريب منه. ويجب نصف العشر فيما سقي بالمؤن كالدوالي (النواعير) النواضح.

وفی الهندية(۱/۱۸۶): وما سقي بالدولاب والدالية ففيه نصف العشر وان سقى سيحا وبدالية يعتبر أكثر السنة فان استويا يجب نصف العشر.

(۱۶۵) نصف عشر کی علت پانی کی مؤنت (خرچہ) ہے

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک سوال کافی عرصے سے مجھے پریشان کر رہا ہے از خود میں نے بڑی کوشش کی تو بھی کوئی صحیح حل نہ ڈھونڈ سکا، براہ کرم آپ اس مسئلے پر اپنی تحقیق سے مجھے آگاہ فرمادیں۔ سوال یہ تھا کہ نصف عشر کی اصل علت کیا ہے؟ پانی کا خرید کر زمین سیراب کرنا؟ یا مؤنت کو دیکھا جائے گا؟ اگر پانی تو مفت کا ہو، البتہ دوسری چیزوں کے اخراجات زیادہ ہوں تو پھر کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ...نصف عشر کے وجوب کی علت پانی کی مؤنت ہے اور مؤنت سے مراد یہ ہے کہ پانی خریدا گیا ہو، یا پانی تو مفت کا ہو لیکن زمین تک پہنچانے پر خرچہ آتا ہو، مثلاً ٹینکر یا مشینری کے ذریعہ پانی زمین تک پہنچایا جاتا ہو تو اس میں نصف عشر واجب ہوگا البتہ نہر کی کھدائی، دوائیاں وغیرہ کی مؤنت کا اعتبار نہیں ہے۔

لمافي المحيط البرهاني(۳/۲۷۳): ماسقته السماء او سقي سيحا ففيه العشر، وما سقي بغرب او دالية او سانية ففيه نصف العشر، به ورد الاثر عن رسول الله ﷺ، والمعنى في التفاوت اختلاف قدر المؤنة وكربها.

وفي الدرالمختار(۲/۳۲۸): (و) يجب(نصفه في مسقي غرب) (ودالية)... (بلا رفع مؤن)

وفي الشامية تحته: (قوله بلا رفع مؤن) اى يجب العشر في الاول ونصفه في الثاني بلا رفع اجرة العمال ونفقة البقر وكرى الانهار واجرة الحافظ ونحوذلك... بل يجب العشر في الكل لأنه عليه الصلاة والسلام حكم بتفاوت الواجب لتفاوت المؤنة ولو رفعت المؤنة كان الواجب واحدا وهو العشر دائما في الباقي.

(۱۶۶) عشر وخراج کی شرائط، نیز تاجکستان، ازبکستان وغیرہ میں عشر وخراج کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کچھ عرصہ قبل روس کے تسلط سے آزاد ہونے والے ممالک مثلاً تاجکستان، ازبکستان، کرغستان وغیرہ کی زمینوں میں جو پیداوار ہوتی ہے، ان میں عشر وخراج واجب ہوگا یا نہیں؟ پیداوار میں عشر وخراج کے وجوب کیلئے کیا شرائط ہیں۔ آیا ان ممالک کا اسلامی ہونا بھی ضروری ہے یا نہیں؟ نیز ان ممالک کی زمین عشری متصور ہوگی یا خراجی؟

الجواب حامداً ومصلیاً......(۱)... صورت مسئولہ میں مذکور ممالک کی زمین پر عشر وخراج واجب ہوگا، تفصیل اس کی یہ ہے کہ جو زمینیں روس کے تسلط سے پہلے عشری تھیں ان پر عشر واجب ہوگا اور جو خراجی تھیں ان پر خراج واجب ہوگا۔ اب عشری زمینوں کا معیار یہ ہے کہ جو زمینیں اس وقت مسلمانوں کے پاس ہیں اور مسلمانوں سے ارثاً یا شراءً ان تک پہنچی ہیں یا جن کو عشری پانی (یعنی بارش، کنوؤں، قدرتی چشموں یا بڑے بڑے دریا جن پر کسی کا عمل دخل نہیں یا وہ نہریں جو مسلمانوں کی حکومت نے یا جماعت نے کھودیں ہوں) سے سیراب کرکے مسلمانوں نے آباد کیا ہو یہ سب عشری زمینیں کہلائیں گی۔

اور جو زمینیں کافروں کی ملک میں فی الحال موجود ہوں یا کسی دور میں کافر کی ملکیت میں رہی ہوں فی الحال اگرچہ مسلمان کے پاس ہوں یا وہ زمینیں جن کو خراجی پانی (یعنی ان نہروں کا پانی جن کو کافروں نے کھودا ہو، ان کی ملک میں فی الحال موجود ہوں یا کسی وقت میں موجود رہی ہوں) سے سیراب کرکے آباد کیا گیا ہو اس قسم کی تمام زمینیں خراجی زمینیں کہلائیں گی۔

(۲) عشر کے وجوب کی شرائط میں سے پیداوار کا حاصل ہونا ہے اگر کسی تقدیری سبب سے یا اپنی غفلت سے پیداوار نہ ہوسکی تو عشر واجب نہ ہوگا بلکہ ساقط ہوجائے گا۔ اسی طرح پیداوار ایسی چیز ہو جس کو اُگانے کا عام رواج ہو یعنی جس کو کاشت کرکے نفع اٹھایا جاتا ہو، لہٰذا خودرو گھاس اور بے کار قسم کے درختوں پر عشر نہ ہوگا، باقی عاقل بالغ ہونا شرط نہیں۔

(۳) عشر وخراج کے وجوب کے بارے میں تفصیل یہ ہے کہ عشر کے وجوب کیلئے راجح یہی ہے کہ دارالاسلام شرط نہیں جیسا کہ ہندوستان کو علماء نے دارالحرب قرار دیا ہے اس کے باوجود وہاں کے مسلمانوں پر وجوب عشر کا قول کیا ہے البتہ خراج کے وجوب کیلئے دارالاسلام ہونا شرط ہے۔

لمافي الصحيح البخاري(۱/ ۲۰۱): عن سالم بن عبدالله عن ابيه عن النبي ﷺ قال فيما سقت السماء والعيون اوكان عثريا العشر وماسقي بالنضح نصف العشر.

وفي الولوالجية(۱/ ۲۰۲): والارض العشرية ستة: الاولىٰ: ارض العرب. والثانية: اذا اسلم عليها اهلها طوعا. والثالثة: اذا فتحت عنوة وقسمت بين الغانمين. والرابعة: اذا أحييت الارض بماءٍ عشري. والخامسة: أرض خراجية انقطع عنها ماء الخراج وصارت تسقى بما العشر. والسادسة: اذا جعل دارة بستانا وسقاة بماء عشري. والماء العشري: ماء السماء والآبار والعيون والبحار التي لاتقع عليها الايدي وليست تحت حماية أحد.

وفيه ايضاً(۱/ ۲۰۸): والأراضي الخراجيه ستة: الاولىٰ: ارض فتحت عنوة وتركت في أيديهم فضرب الخراج عليهم وهو سواد العراق. والثانيه: أرض الكفارا ذا اتخذوا دورهم بساتين. والثالثة: ارض طلب الكفار من الامام ان يضرب عليهم الخراج من غير قهر. والرابعة: أرض أُحيت بماء الخراج. والخامسة: ارض مسلم اشتراها من الكافر. والسادسة: أرض عشرية انقطع عنها ماء

العشر فصارت تسقى بماء الخراج وماء الخراج، ماء هذه الانهار الصغار التي حفرتها الأعاجم.

واما ماء السيحون والجيحون والدجلة والفرات خراجي عند ابي يوسف رحمه الله تعالىٰ عشري عند محمد رحمه الله تعالىٰ.

(۱۶۷) فصل بونے سے پہلے یا بونے کے بعد اور اُگنے سے پہلے عشر ادا کرنے کا حکم

سوال ... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں کے اکثر لوگ زمیندار ہیں اور الحمدللہ دیندار بھی ہیں زکوٰۃ عشر وغیرہ زمینوں کا ادا کرتے ہیں۔لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جو بیج بونے سے پہلے ہی فصلوں کا عشر ادا کر دیتے ہیں اب آپ یہ بتلا دیں کہ کیا ایسا کرنا جائز ہے۔اور اگر کوئی شخص بیج بونے کے بعد اور فصل اگنے سے پہلے عشر ادا کر دے تو کیا اس سے عشر ادا ہو جاتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....(۱)۔اگر کوئی شخص فصل بونے سے پہلے عشر ادا کرے تو اس صورت میں اس کا عشر ادا نہیں ہوگا۔

(۲)۔اگر کوئی شخص فصل بونے کے بعد اور اُگنے سے پہلے عشر ادا کرتا ہے تو اس صورت میں بھی اس کا عشر ادا نہیں ہوگا اگرچہ اس میں اختلاف ہے لیکن راجح یہی ہے کہ اس کا عشر ادا نہیں ہوگا۔

(۳)۔اگر کسی شخص نے فصل اُگنے کے بعد عشر ادا کیا تو اس صورت میں اس کا عشر ادا ہو جائے گا۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں فصل بونے سے پہلے یا بونے کے بعد اور اُگنے سے پہلے عشر ادا کرنا درست نہیں اس سے عشر ادا نہیں ہوا لہٰذا دوبارہ عشر ادا کرنا لازم ہوگا۔

لما في الهندية(۱/۱۸۶): ووقته وقت خروج الزرع وظهور الثمر عند ابي حنيفة رحمه الله تعالىٰ كذا في البحر الرائق، فلو عجل عشر أرضه قبل الزرع لايجوز ولو عجل بعد الزراعة بعد النبات فانه يجوز ولو عجل بعد الزراعة قبل النبات فالاظهر أنه لايجوز.

وفي الشامية(۲/۲۹۴): (قوله والاظهر الجواز) في نسخة عدم الجواز وهي الصواب قال في النهر. والاظهر انه لايجوز في الزرع قبل النبات وكذا قبل طلوع الثمر في ظاهر الرواية.

(۱۶۸) عشر میں پیداوار کی جنس یا رقم دینے کا حکم

سوال ....کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ میں دیہات کا رہنے والا شخص ہوں میرے کئی باغ ہیں پہلے زکوٰۃ ادا نہیں کی اس سال ادائیگی کی فکر ہوئی اور سنا ہے کہ باغ کے پھل پر عشر واجب ہوتا ہے اب آپ سے معلوم کرنا ہے کہ باغ میں پھل آنے کے بعد اس میں عشر کی ادائیگی کی کیا صورت ہوگی؟ نیز اگر باغ کو فروخت کر دیا جائے تو اسکی قیمت کا چالیسواں حصہ دیا جائیگا یا عشر کے اعتبار سے اسکی

قیمت کا بیسواں حصہ نکالا جائیگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً ...... باغ میں پھل آنے کے بعد کل پیداوار کا دسواں حصہ دیا جائیگا، اس صورت میں بہتر یہ ہے کہ کھڑے درخت میں سے پھل کا دسواں حصہ علیحدہ کرلیا جائے اور بعد میں اسکو مستحقین میں تقسیم کردیا جائے۔ اور اگر پھل آنے کے بعد باغ کو فروخت کردیا اور قیمت دے رہا ہے تو اس صورت میں اگر مالک کی مشقت کا دخل نہیں یعنی نہری یا بارانی پانی سے آبپاشی ہوئی تو اس صورت میں قیمت کا دسواں حصہ دیا جائیگا اور اگر مالک کی مشقت کا اسمیں دخل ہے یعنی ڈول یا ٹیوب ویل سے اسکی آبپاشی ہوئی تو اس صورت میں قیمت کا بیسواں حصہ دیا جائیگا اور یہ روپیہ حقِ عشر کا بدل ہوگا نہ کہ زکوٰۃ۔

لما فی الدر المختار(۲/۲۸۵): (وجاز دفع القیمة فی زکاة وعشر وخراج)...... وتعتبر القیمة یوم الوجوب وقالا یوم الاداء وفی السوائم یوم الاداء اجماعا وهو الاصح ویقوم فی البلد الذی المال فیه ولو فی مفازة ففی أقرب الامصار الیه.

وفی الشامیة(۲/۲۷۲): لو اشتری ارضا خراجیة أو عشریة لیتجر فیها فانها لا تجب فیها زکاة التجارة .(صـ۲۷۳) لا زکاة فیما نواه للتجارة من نحو ارض عشریة أو خراجیة لئلا یؤدی الی تکرار الزکاة لان العشر أو الخراج زکاة ایضا.

(۱٦۹) فصل کا عشر رقم سے ادا کرنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک زمیندار آدمی ہوں میرے کچھ کھیت وغیرہ ہیں۔ میں ہر سال ان کھیتوں سے حاصل ہونے والی فصلوں کا عشر ادا کرتا ہوں۔ اب آپ سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا یہ عشر اسی فصل سے ادا کرنا ضروری ہے یا رقم سے بھی ادا کرسکتا ہوں؟ کیونکہ اب میرے پاس کچھ رقم بھی ہوتی ہے تو میں چاہتا ہوں کہ رقم سے ہی ادا کردیا کروں۔ برائے مہربانی آپ میری اس مسئلے میں رہنمائی فرمائیں، شکریہ۔

الجواب حامداً ومصلیاً فصل کا عشر جس طرح اس کی جنس سے ادا کرنا جائز ہے اسی طرح فصل کا عشر رقم سے بھی ادا کرنا جائز ہے۔

لما فی الهندیة(۱/۱۸۱): ویجوز دفع القیم فی الزکوة عندنا وکذا فی الکفارات وصدقة الفطر والعشر والنذر کذا فی الهدایة واذا کان لرجل مائتا قفیز حنطة قیمتها مائتا درهم فصاحبها بالخیار ان شاء اذی زکاتها من العین وهی خمسة اقفزة حنطة وان شاء ادی زکاتها من القیمة.

وفی الدر علی هامش الطحطاوی(۱/۴۰۲): (وجاز دفع القیمة فی زکوة وعشر) وخراج وفطرة (ونذر وکفارة غیر الاعتاق).

(۱۷۰) قرض کو عشر سے مستثنیٰ کرنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اس سال میری زمین سے دو سو من گندم ہوا ہے۔ میں ہر سال اس میں سے عشر نکالتا ہوں، اس سال مجھ پر کافی قرضہ ہوگیا ہے، میں نے ایک مولوی صاحب سے سنا تھا کہ جس پر قرض ہوتا ہے اس پر زکوٰۃ نہیں، کیا میں اس سے بھی زمین کا عشر نکالوں، مجھ پر قرضہ بھی ہے۔ براہ کرم صحیح بات سے جلد مجھے آگاہ فرمادیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً اگر کوئی آدمی مقروض ہو تو یہ قرضہ وجوب زکوٰۃ کیلئے تو مانع ہے لیکن وجوب عشر کیلئے مانع نہیں ہے۔ لہٰذا آپ پر ہر سال کی طرح امسال بھی عشر کا نکالنا واجب ہے۔

لمافی التاتارخانیة (۲/۳۳۰): ویجب العشر علی المدیون بخلاف الزکاۃ.

وفی الشامیة(۲/۲٦۱): (قوله) ولا یمنع الدین وجوب عشر وخراج) والکلام الآن فی موانع الزکاۃ. لکن لما کان کل من العشر والخراج زکاۃ الذروع والثمار قدیتوهم ان الدین یمنع وجوبهما نبه علی دفعه (قوله لانهما مؤنة الارض النامیة) حتی یجب فی الارض الموقوفة وارض المکاتب، بدائع.

(۱۷۱) کرایہ، آڑھتی، منشی وغیرہ کے کمیشن سے پہلے عشر ہوگا یا بعد میں؟

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم لوگ فصلیں کاشت کرتے ہیں اور انہیں دوسرے شہر میں فروختگی کیلئے بھیج دیتے ہیں اور دوسرے شہر بھیجنے میں کافی سارے اخراجات بھی ہوجاتے ہیں مثلاً اگر کل پیداوار کی قیمت بنتی ہے ۹۰ ہزار لیکن اس میں کرایہ ہے گاڑی وغیرہ کا، آڑھتی اور منشی کا کمیشن ہے۔ یہ سب نکالنے کے بعد ہمیں ۸۰ ہزار روپے پہنچتے ہیں۔ تو اب ہم عشر میں ۹۰ ہزار کی قیمت کا اعتبار کریں گے یا ۸۰ ہزار کی قیمت کا۔ برائے مہربانی جلد جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً چونکہ عشر کل پیداوار پر واجب ہوتا ہے اس لئے صورت مسئولہ میں عشر نکالنے کیلئے کل پیداوار کی قیمت کا "جو کہ ۹۰ ہزار ہے" اعتبار کیا جائے گا۔

لمافی الشامیة(۲/۳۲۸):(قوله بلا رفع مؤن) ای یجب العشر فی الاول ونصفه فی الثانی بلا رفع اجرة العمال ونفقة البقر وکری الانهار واجرة الحافظ ونحوذالک درر. قال فی الفتح یعنی لایقال بعدم وجوب العشر فی قدر الخارج الذی بمقابلة المؤنة بل یجب العشر فی الکل لانه علیه الصلوة والسلام حکم بتفاوت الواجب لتفاوت المؤنة ولورفعت المؤنة کان الواجب واحداً وهو العشر دائما فی الباقی لانه لم ینزل الی نصفه الا للمؤنة والباقی بعد رفع انمؤنة لامؤنة فیه فکان الواجب

دائماً العشر لكن الواجب قد تفاوت شرعاً فعلمنا انه لم يعتبر شرعاً عدم عشر بعض الخارج وهو القدر المساوی للمؤنة اصلاً.

وفي الهندية (۱/۱۸۰): المال الذی تجب فيه الزكاة ان ادى زكاته من خلاف جنسه ادى قدر قيمة الواجب اجماعاً.

(۱۷۲) پیداوار کے اخراجات عشر کے بعد نکالے جائیں

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری بہت ساری عشری زمینیں ہیں جن پر میرے بہت اخراجات آتے ہیں میں ان میں کام کرتا ہوں اور فصلوں کے تیار ہونے پر عشر بھی ادا کرتا ہوں، اب دریافت یہ کرنا ہے کہ آیا عشر اخراجات نکالنے کے بعد ادا کیا جائے گا یا اخراجات نکالنے سے پہلے میرے اخراجات چونکہ بہت زیادہ ہو جاتے ہیں کھیتوں میں بہت سارے مزدور بھی کام کرتے ہیں ان کی تنخواہیں دینی ہوتی ہیں اور بعض دفعہ اخراجات کل پیداوار سے بھی بڑھ جاتے ہیں تو ایسی صورت میں مجھے کیا کرنا چاہئے۔ برائے مہربانی قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً عشر اخراجات نکالنے سے پہلے پوری پیداوار سے ادا کیا جائے گا۔

لما في الشامية (۳۲۸/۲): (قوله بلا رفع مؤن) ای يجب العشر في الاول ونصفه في الثاني بلا رفع اجرة العمال ونفقة البقر وكرى الانهار وأجرة الحافظ ونحو ذلك درر قال في الفتح يعني لايقال بعدم وجوب العشر في قدر الخارج الذى بمقابلة المؤنة بل يجب العشر في الكل لانه عليه الصلاة والسلام حكم بتفاوت الواجب لتفاوت المؤنة ولو رفعت المؤنة كان الواجب واحدا وهو العشر دائما في الباقي لأنه لم ينزل الى نصفه الاللمؤنة والباقي بعد رفع المؤنة لامؤنة فيه فكان الواجب دائماً العشر لكن الواجب قد تفاوت شرعا فعلمنا أنه لم يعتبر شرعا عدم عشر بعض الخارج وهو القدر المساوی للمؤنة اصلاً.

(۱۷۳) کھاد اور دوائی وغیرہ کا خرچہ عشر سے پہلے نکالا جائے یا بعد میں؟

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں ایک نہر ہے جس سے ہم لوگ کھیت سیراب کرتے ہیں اور اس پر ابھی تک آبیانہ معاف ہے لیکن بیماریوں کی وجہ سے کھاد اور دوائی وغیرہ کا بہت خرچہ آجاتا ہے تو کیا ایسی صورت میں ہم لوگ پیداوار کا دسواں حصہ دیں گے یا بیسواں؟

الجواب حامداً ومصلیاً صورت مسئولہ میں کھاد، دوائی وغیرہ کا خرچہ نہیں نکالا جائے گا۔ بلکہ پوری پیداوار میں سے عشر (دسواں حصہ) دینا ہوگا۔

لما فی الشامیة (۲/۳۲۸): (قوله بلا رفع مؤن) أی یجب العشر فی الأول و نصفه فی الثانی بلا رفع أجرة العمال ونفقة البقر و کری الأنهار و أجرة الحافظ ونحو ذلک درر قال فی الفتح یعنی لایقال بعدم وجوب العشر فی قدر الخارج الذی بمقابلة المؤنة بل یجب العشر فی الکل لأنه علیه الصلاة و السلام حکم بتفاوت الواجب لتفاوت المؤنة ولو رفعت المؤنة کان الواجب واحداً وهو العشر دائماً فی الباقی، لأنه لم ینزل إلی نصفه إلا للمؤنة والباقی بعد رفع المؤنة لامؤنة فیه فکان الواجب دائماً العشر لکن الواجب قد تفاوت شرعاً فعلمنا أنه لم یعتبر شرعا عدم عشر بعض الخارج وهو القدر المساوی للمؤنة أصلاً.

(۱۷۴) اجرت پردی ہوئی زمین پر عشر کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک آدمی سے زمین کرائے پر لی ہے اور میں اس زمین میں فصلیں وغیرہ لگاتا ہوں اور بیچتا ہوں تو کیا عشر کی ادائیگی مجھ پر لازم ہے یا مالک پر جس سے میں نے زمین کرائے پر لی ہے؟ برائے مہربانی رہنمائی فرمائیں۔ شکریہ

الجواب حامداًومصلیا...... چونکہ عشر زمین کی پیداوار پر واجب ہوتا ہے اور پیداوار کا مالک اجارے کی صورت میں مستأجر ہوتا ہے اور مالک زمین کو صرف کرایہ ملتا ہے، اس لئے عشر مستأجر پر واجب ہوگا نہ کہ مالک زمین پر۔

لما فی الشامیة (۲/۳۳۴): (قوله وبقولهما ناخذ) ...... قلت لکن فی زماننا عامة الاوقاف من القری والمزارع لرضا المستأجر بتحمل غراماتها ومؤنها یستأجرها بدون أجر المثل بحیث لاتفی الأجرة، ولا أضعافها بالعشر او الخراج المقاسمة فلا ینبغی العدول عن الافتاء بقولهما فی ذلک لانهم فی زماننا یقدرون أجرة المثل بناء علی ان الأجرة سالمة لجهة الوقف ولاشیء علیه من عشر وغیره اما لو اعتبر دفع العشر من جهة الوقف وان المستأجر لیس علیه سوی الاجرة فان أجرة المثل تزید اضعافا کثیرة کما لایخفی فان امکن اخذ الأجرة کاملة یفتی بقول الامام والافبقولهما لما یلزم علیه من الضرر الواضح الذی لایقول به احد والله تعالیٰ اعلم.

(۱۷۵) زمین کے اجارہ کی صورت میں عشر کا حکم

سوال　کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ میں کہ میں نے ایک آدمی کو ۴۰ ہزار پر زمین اجارہ پر دی اب اس رقم میں زکوٰۃ فرض ہے یا عشر؟ حالانکہ میرے اوپر قرض بھی تھا جس وقت اس رقم کو میں نے وصول کیا اسی وقت دائن کو دیدی۔

یہ آجکل عشر کا حساب پیٹیوں سے ہوگا یا غلہ سے ... علاقے میں یہ دستور ہے کہ مثلاً اخروٹ اگر کم ہو تو اس پر دسواں دانہ الگ کر کے عشر شمار کرتے ہیں اور اگر اخروٹ زیادہ ہوں تو پھر ایک برتن کے حساب سے دسویں برتن کو عشر میں شمار کرتے ہیں اسی طرح اگر غلہ وغیرہ بیچ دیں تو اس کی قیمت مثلاً سو میں سے دس روپے عشر میں شمار کرتے ہیں کیا یہ طریقہ شریعت کے مطابق ہے؟ تفصیل کیساتھ جواب تحریر فرمائیں تاکہ کمی زیادتی سے بچ جائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً صورت مسئولہ میں آپ نے پہلا سوال زمین سے جو رقم بطور اجارہ حاصل ہوئی ہے اس کی زکوۃ یا عشر کے بارے میں کیا ہے تو اس کے متعلق تفصیل یہ ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک بصورت اجارہ عشر مؤجر یعنی زمین کے مالک پر آئیگا لیکن حضرت امام ابو یوسف اور حضرت امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک عشر مستاجر یعنی اجرت پر زمین لینے والے پر آئیگا، علامہ شامی اور صاحب درمختار رحمہما اللہ نے ترجیح صاحبین کے قول کو دی ہے یعنی عشر مستاجر پر آئیگا نہ کہ زمین کے مالک پر، اب چونکہ زمین کے مالک پر عشر نہیں ہے اور اس نے زمین کو اجارہ پر دیکر جو پیسے ... آپ وصول کئے ہیں اسلئے اس پر اگر سال گزر گیا اور بقدر نصاب بھی ہو تو اس پر زکوۃ آئیگی لیکن چونکہ اس پر قرض بھی تھا اور اس کو قرض میں دیا تو اب یہ دیکھنا ہے کہ قرض میں ادا کرنے کے بعد اگر بقدر نصاب رقم بچ گئی تو زکوۃ ہوگی ورنہ نہیں۔

دوسرے سوال کے متعلق تفصیل یہ ہے کہ چونکہ آجکل عام طور سے عشر میں غلہ ہی دیا جاتا ہے اور اگر کوئی شخص اس غلہ کو بیچ کر اسکی رقم سے عشر ادا کرنا چاہے تو رقم سے بھی دسواں حصہ بطور عشر ادا کرنا ہوگا، اور اخروٹ کے متعلق جو طریقہ آپ نے لکھا ہے یہ بھی درست ہے لیکن یہ بات ذہن نشین رہے کہ جس برتن سے اپنے نو حصوں کو الگ کیا جاتا ہے اسی برتن کے حساب سے دسواں حصہ پورے غلہ سے یعنی مزدور وغیرہ کی اجرت اٹھانے سے قبل لیا جائیگا تاکہ عشر کے بغیر کوئی غلہ باقی نہ رہ جائے۔(لتصريحهم بالعشر في كل الخارج كذافي الدر المختار ٢: ٣١٩) یہ سب تفصیل اس وقت ہے جبکہ کھیت کو ایسے پانی سے سیراب کیا جاتا ہو جو کسی کی ولایت میں نہ ہو یعنی بغیر پیسہ ادا کئے اس پانی سے سیراب کریں یا خود بخود سیراب ہو جائے جیسے بارش، چشمہ وغیرہ کا پانی (فيما سقت السماء والعيون او كان عثريا العشر وفيما سقي بالنضح نصف العشر، بخاری ١/ ٢٠١) اور اگر ایسے پانی سے سیراب کیا جاتا ہے جس پر وہ پیسہ ادا کرتا ہے جیسے آجکل نہروں سے جو سیراب کیا جاتا ہے اس پر زمیندار لوگ حکومت کو مالیہ ادا کرتے ہیں تو اس صورت میں بیسواں حصہ ادا کیا جائیگا۔

لمافي الدر المختار (٢: ٣٣٤): والعشر على المؤجر كخراج مؤظف وقالا على المستأجر كمستعير مسلم: وفي الحاوي وبقولهما نأخذ والله اعلم بالصواب

(١٧٦) پکی فصل اگر فروخت کی جائے تو عشر کا وجوب کس شخص پر ہے؟

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ایک دوست ہیں جن کی بہت زیادہ عشری زمینیں

ہیں وہ ہر سال ان کا عشر ادا کرتے ہیں اس سال انہوں نے کچھ عشری زمینیں فصلوں سمیت فروخت کر دی ہیں اور کچھ زمینیں ایسی ہیں کہ جن کی صرف فصلیں فروخت کی ہیں تو کیا دونوں صورتوں میں عشر کی ادائیگی ان پر ہوگی یا خریدنے والے پر ہوگی براہ کرم مسئلہ کا جواب بتلا کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً..... تیار فصل چاہے عشری زمین سمیت فروخت کی جائے یا صرف فصل بغیر زمین کے فروخت کی جائے۔ ہر دو صورت عشر، بیچنے والے کے ذمہ واجب ہے نہ کہ خریدار کے۔

لما في الهندية(۱/۱۸۷): واذا باع الارض العشرية وفيها زرع قد ادرك مع زرعها او باع الزرع خاصة فعشره على البائع دون المشترى. ولو باعها والزرع بقل ان قصله المشترى في الحال يجب على البائع.

وفي الشامية (۲/۳۳۳): وبقي مالو باع الارض مع الزرع او بدونه قال في البزازية: باع الارض وسلمها للمشترى ان بقي مدة يتمكن المشترى فيها من الزراعة فالخراج عليه والا فعلى البائع، والفتوى على تقدير المدة بثلاثة اشهر. هذا لوباعها فارغة ولو فيها زرع لم يبلغ فعلى المشترى بكل حال وقال ابو الليث، ان باعها لزرع انعقد حبه وبلغ ولم تبق مدة يتمكن المشترى من الزرع فالخراج على البائع.

(۱۷۷) کسی سال زمین کو صرف بارش سے سیراب کیا جائے تو عشر کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی کے پاس زمین ہے جس کی فصل کو یہ آدمی نہر کے پانی سے سیراب کرتا ہے اب پوچھنا یہ ہے کہ اگر کسی سال بارش کے پانی کی وجہ سے نہر کے پانی کی بالکل ضرورت ہی نہ پڑے تو اس صورت میں اس فصل میں عشر واجب ہوگا یا نصف عشر؟

الجواب حامداً ومصلياً...... وہ زمین جس کی فصل کو بارش کے پانی سے سیراب کیا جاتا ہے اس میں عشر واجب ہوتا ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں پورے سال صرف بارش کے پانی سے سیراب کرنے کی وجہ سے اس فصل میں عشر واجب ہوگا نہ کہ نصف عشر۔

لما في القرآن الكريم(الانعام: ۱۴۱): وآتوا حقه يوم حصاده.

وفي الدر المختار(۲/۳۲۶): (و) تجب في (مسقى سماء) اى مطر(وسيح) كنهر ...... (و) يجب (نصفه في مسقى غرب) اى دلو كبير (ودالية) اى دولاب لكثرة المؤنة.

وفي الشامية(۲/۳۲۶): (قوله اى مطر) سمى بذلك مجازا من تسمية الشئ باسم مايجاوره اويحل فيه نهر (قوله وسيح) بالسين والحاء المهملتين بينهما مثناة تحتية قال في المغرب: ساح

الماء سيحا جرى على وجه الارض ومنه ماسقى سيحا يعني ماء الانهار والاودية اهـ.

(۱۷۸) درختوں کی زکوٰۃ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے کچھ عرصہ قبل اپنے کھیت میں درخت لگائے تھے جواب بڑے ہو چکے ہیں اور ان کی قیمت تقریباً تین لاکھ کے قریب ہے تو کیا میرے اوپر ان درختوں کی زکوٰۃ لازم ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ......صورت مسئولہ میں آپ پر ان درختوں کا عشر یعنی دسواں حصہ ادا کرنا لازم ہوگا۔

لمافي الهندية(۱/۱۸۶): فلا عشر في الحطب والحشيش والقصب والطرفاء والسعف لان الاراضي لاتستنمي بهذه الاشياء بل تفسدها حتى لو استنمى بقوائم الخلاف والحشيش والقصب وغصون النخل او فيها دلب او صنوبر ونحوها وكان يقطعه ويبيعه يجب فيه العشر كذافي محيط السرخسي.

وفي الطحطاوي(۱/۴۱۹): قال في شرح الملتقى الا ان قصدالزرع اوشغل ارضه بشئ مماذكر فيجب العشر فظاهره ان الموجب للعشر احد الشيئين فبالشغل بهذه الاشياء يجب.

(۱۷۹) گندم کی زکوٰۃ کب ادا کی جائے؟

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم لوگ گندم کی زکوٰۃ گندم کی کٹائی سے پہلے ہی گزشتہ سال میں فروخت کی ہوئی رقم سے ادا کردیتے ہیں تو کیا ہمارا گندم کی کٹائی سے پہلے اس کی زکوٰۃ ادا کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً گندم کی زکوٰۃ، گندم کے اُگنے کے بعد، اور اُس کی کٹائی سے پہلے، ادا کرنا صحیح ہے۔ ہاں اگر گندم کی فصل پیدا ہی نہ ہوئی ہو، تو اُس وقت گندم کی زکوٰۃ نکالنا صحیح نہیں، اس سے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

لما في فتاوىٰ الهندية(۱/۱۸۶): ووقته وقت خروج الزرع وظهور الثمر عند أبي حنيفة رحمه الله تعالى، كذا في البحر الرائق فلو عجل عشر أرضه قبل الزرع لايجوز ولو عجل بعد الزراعة بعد النبات فانه يجوز ولو عجل بعد الزراعة قبل النبات فالاظهر أنه لايجوز.

و في الشامية(۲/۳۲۱): واختلفوا في وقت العشر في الثمار والزرع فقال ابو حنيفة وزفر: يجب عند ظهور الثمرة والأمن عليها من الفساد، وإن لم يستحق الحصاد اذا بلغت حداً ينتفع بها وقال ابو يوسف عند استحقاق الحصاد وقال محمدٌ اذا حصدت وصارت في الجرين.

(۱۸۰) مونگ پھلی پر عشر کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ میں کہ ہمارے علاقے میں مونگ پھلی کی کاشت ہوتی ہے، ٹریکٹروں کے ذریعہ کٹائی کی جانے کے بعد مونگ پھلی کی تھوڑی سی مقدار ٹریکٹر چلنے کی وجہ سے زمین میں دب جاتی ہے جسکو بعد میں نکالا جاتا ہے، تو جو مونگ پھلیاں زمین میں دب جاتی ہیں اور بعد میں نکالی جاتی ہیں ان میں عشر دینا لازم ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......زمین سے نکلنے والی ہر چیز پر خواہ قلیل ہو یا کثیر عشر لازم ہوتا ہے۔ لہٰذا تمام مونگ پھلیوں پر عشر آئیگا خواہ پہلے حاصل ہوئی ہوں یا بعد میں۔

لمافي الهندية(۱/۱۸۶): ويجب العشر عندابي حنيفةرحمه الله في كل ماتخرجه الارض من الحنطة والشعير والدخن والأرز ...واشباه ذالک مماله ثمرة باقية أوغير باقية قل أو كثر هكذافي فتاوى قاضيخان.

(۱۸۱) عشر اور خراج موت سے ساقط ہوتے ہیں یا نہیں؟

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں میں ایک صاحب کھیتی باڑی کا کام کرتے تھے اور اپنے کھیتوں میں ہر سال سبزیاں اور ترکاریاں وغیرہ اُگایا کرتے تھے ابھی پچھلے ہفتے ہی جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے بیٹے مجھ سے پوچھنے لگے کہ ہمارے ابا جان تو ان سبزیوں وغیرہ کا عشر نہیں ادا کیا کرتے تھے کیا اب ہم پر ان کی طرف سے عشر ادا کرنا ضروری ہے۔ تو میں نے سوچا کہ اس مسئلے کے بارے میں آپ سے دریافت کروں کہ کیا موت کے بعد عشر اور خراج ساقط ہو جاتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......عشر اور خراج مقاسمہ (خراج مقاسمہ سے مراد یہ ہے کہ امام کل پیداوار کا ایک خاص حصہ جزء شائع کے طور پر مقرر کردے مثلاً نصف، ثلث وغیرہ) اگر پچھلے سالوں کا ہو، اور اب تک ادا نہیں کیا ہو تو اس میں وصیت کرنا ضروری ہے اور وصیت کی ہو تو اس وصیت کو ثلث مال میں نافذ کرلیا جائے گا اور اگر وصیت نہیں کی اور مر گیا تو یہ عشر اور خراج دونوں ساقط ہوں گے لیکن اگر یہ عشر اور خراج موجودہ سال کی کھیتی کا ہو تو اس میں وصیت کرنا ضروری نہیں مرنے کے بعد اس کے ترکہ سے ادا کیا جائے گا۔ اور خراج موظف (خراج موظف سے مراد یہ ہے کہ امام زمین کی حیثیت کے مطابق سالانہ کوئی متعینہ مقدار مقرر کردے) یہ خواہ پچھلے سالوں کا ہو یا موجودہ سال کا مرنے کے بعد مطلقاً ساقط ہو جائے گا۔

لمافي بدائع الصنائع (۲/۲۹۲): أن من عليه الزكوة إذا مات قبل أدائها، فلا يخلو إما ان كان أوصى بالأداء، وإما إن كان لم يوص فإن كان لم يوص تسقط عنه في حق احكام الدنيا حتى لا تؤخذ من تركته ولا يؤمر الوصي أو الوارث بالأداء من تركته عندنا وعنده: تؤخذ من تركته على هذا

الخلاف: إذا مات من عليه صدقة الفطر ...... او الخراج أو الجزية لانه لا يستوفى من تركته عندنا وعنده يستوفى من تركته وإن مات من عليه العشر فإن كان الخارج قائما فلا يسقط بالموت في ظاهر الرواية ...... وان كان أوصى بالأداء لايسقط ويؤدى من ثلث ماله عندنا.

وفي الهداية(۴/ ۴۲۵،۴۲۶): (كتاب المزارعة) ...... ومعاملة النبى عليه السلام اهل خيبر كان خراج مقاسمة بطريق المن والصلح.

وفي حاشيته (۸)(صـ۴۲۶): قوله كان خراج مقاسمة، الخراج نوعان: خراج وظيفة وهو ان يوظف الامام عليهم كل سنة ويضع عليهم ما يطيق اراضيهم. والثانى خراج مقاسمة: وهو ان يشترط عليهم بعض ما يخرج كالنصف والثلث ونحو ذلك جزأ شائعا.

وفي الدر المختار (۲/ ۳۳۲): (من عليه العشر او خراج ومات اخذ من تركته وفي رواية لا) بل يسقط بالموت والاول ظاهر الرواية.

وفي الشامية تحته: (قوله والاوّل ظاهر الرواية) اقول: قال في الذخيرة: ولا يسقط العشر بموت من عليه في ظاهر الرواية وروى ابن المبارك عن ابى حنيفة انه يسقط ثم قال بعد ورقتين ويسقط خراج الارض بموت من عليه اذا كان خراج وظيفة في ظاهر الرواية وروى ابن المبارك انه لايسقط فوقع الفرق بين الخراج والعشر على الرّوايتين ويظهر من تقييده السقوط بخراج الوظيفة ان خراج المقاسمة لايسقط كالعشر في ظاهر الرّواية فافهم.

(۱۸۲) دیسی اور فارمی شہد میں عشر کا حکم

سوال ...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ شہد میں عشر واجب ہوتا ہے پوچھنا یہ ہے کہ شہد کا یہ حکم عام ہے یعنی دیسی اور فارمی دونوں قسم کے شہد کے بارے میں ہے یا فارمی شہد میں مؤنت (یعنی چینی وغیرہ کے اخراجات) کی وجہ سے نصف عشر واجب ہوگا؟

(۲)۔ شہد کی مکھیوں میں عشر یا زکوۃ ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ...... شہد میں عشر کے وجوب کیلئے جتنی روایات مروی ہیں۔ وہ تمام مطلق ہیں اس میں مؤنت اور غیر مؤنت کی کوئی قید نہیں۔ اور فقہاء کرام کی عبارات بھی وجوب عشر کے بارے میں مطلق ہیں اس میں بھی مؤنت کی قید مذکور نہیں ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں روایات اور عبارات کے عموم کی بناء پر شہد میں وجوب عشر کا حکم عام ہوگا۔ دیسی اور فارمی دونوں قسم کے شہد میں عشر واجب ہوگا فارمی شہد میں مؤنت (یعنی چینی وغیرہ کے اخراجات) کی وجہ سے نصف عشر واجب نہ ہوگا۔ نیز شہد کی مکھیوں میں بھی فی نفسہ نہ عشر واجب ہے

اور نہ زکوۃ۔ البتہ اگر مکھیوں کو تجارت کی نیت سے بیچنے خریدنے کیلئے اپنے پاس رکھا ہے تو پھر مال تجارت کی مد سے اس میں زکوۃ واجب ہوگی بشرطیکہ نصاب کے برابر ہوں۔

لمافی سنن ابی داؤد(۱/۲۲۶): عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده قال جاء هلال احد بنی متعان الی رسول الله ﷺ بعشور نحل له وكان سأله ان يحمي واديا يقال له سلبة فحمی له رسول الله ﷺ ذلک الوادی فلما ولی عمر بن الخطاب رضی الله عنه كتب سفيان ابن وهب الی عمر بن الخطاب يسأله عن ذلک فكتب عمر ان ادى اليک ما كان يؤدى الی رسول الله ﷺ من عشور نحله فاحم له سلبة والا فانما هو ذباب غيث ياكله من يشاء.

وفی مصنف عبدالرزاق(۴/۶۳): عن ابی هريرة قال كتب رسول الله ﷺ الی اهل اليمن ان يؤخذ من اهل العسل العشور.

وفی الشامية (۲/۳۲۵):(يجب) العشر (فی عسل) وان قل (ارض غير الخراج) ولو غير عشرية كجبل ومفازة بخلاف الخراجية لئلا يجتمع العشر والخراج (وكذا) يجب العشر (فی ثمرة جبل او مفازة ان حماه الامام) لانه مال مقصود.

(قوله فی عسل) بغير تنوين لان قوله وان قل معترض بين المضاف والمضاف اليه (الی قوله) وصرح بالعسل اشارة الی خلاف مالک والشافعی حيث قالا ليس فيه شئی لانه متولد من حيوان فاشبه الابريسم ودليلنا مبسوط فی الفتح ..... (الی قوله) (قوله ان حماه الامام) الضمير عائد الی المذكور وهو العسل والثمرة.

وفيه ايضاً(۲/۲۷۶): كما لو اسامها للحمل والركوب ولو للتجارة ففيها زكاة التجارة، ولعلهم تركوا ذلک لتصريحهم بالحكمين.

(قوله ولعلهم تركوا ذلک) ای ترک اصحاب المتون من تعريف السائمة مازاده المصنف تبعا للزيلعی والمحيط لتصريحهم ای تصريح التاركين لذلک بالحكمين ای بحكم مانوی به التجارة من العروض الشاملة للحيوانات وبحكم السامة للحمل والركوب.

وهو وجوب زكاة التجارة فی الاول وعدمه فی الثانی.

﴿زکوٰۃ کے متفرق مسائل﴾

(١٨٣) حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر زکوٰۃ کا حکم

سوال ... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری مسجد کے مفتی صاحب ہر روز بعد نماز عصر ایک کتاب کی کچھ عبارت پڑھتے ہیں اور پھر دو چار مسائل بتاتے ہیں۔ ایک روز زکوٰۃ کے سلسلے میں فرمایا کہ جس شخص کے پاس بھی اپنی ضرورت اصلیہ سے زائد رقم ہو، اور وہ نصاب کے برابر ہو تو سال گزرنے پر اس رقم پر زکوٰۃ فرض ہے۔ میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ آیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی کبھی زکوٰۃ فرض ہوئی تھی؟ اور کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی زکوٰۃ کی فرضیت کیلئے نصاب کا ہونا اور سال کا گزرنا شرط تھا۔ آپ اس بارے میں اپنی تحقیق سے سرفراز فرمادیجئے۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... زکوٰۃ اس شخص پر فرض ہوتی ہے جو مال کا مالک ہو، اور چونکہ حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ السلام کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتی۔ بلکہ جو کچھ بھی ان کے پاس ہوتا ہے، وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے امانت ہوتا ہے۔ اس وجہ سے انبیاء علیہم الصلوٰۃ السلام پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔

لـمـا فـي الطحطاوی علی الدر المختار (١/٣٨٨): (قوله ولا تجب علی الانبیاء) لانهم لاملک لهم مع الله تعالیٰ انما کانوا یشاهدون مافي ایدیهم ودائع عندهم یبذلونه فی اوان بذله ویمنعونه عن غیر محله ولان الزکاة طهرة لمن عساه أن یتدنس والانبیاء مبرّؤن من الدنس لعصمتهم اهـ ابو السعود.

وفـي الشـامیة (٢/٢٥٦): (قولـه ولا تـجـب علـی الانبیـاء) لان الزکاة طهرة لمن عساه أن یتدنس والانبیاء مبرؤن منه.

وفـي الفقه الاسلامي وادلته (٣/١٧٩٢): ولکن لاتجب علی الانبیاء اجماعاً لان الزکاة طهرة لمن عساه أن یتدنس والانبیاء مبرؤون منه ولان مافي ایدیهم ودائع لله ولانهم لاملک لهم ولا یورثون ایضاً.

(١٨٤) انبیاء علیہم السلام کے نسبی وعلمی ورثاء کو زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال ... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زکوٰۃ وصدقات واجبہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام لینا جائز نہیں تھا تو جولوگ انبیاء علیہم السلام کے وارث (باعتبار علم) ہیں ان کیلئے یہ صدقات وزکوٰۃ لینا اور ان کو مصرف میں داخل کرنا ہے؟ اگر ان کیلئے زکوٰۃ وصدقات واجبہ کا لینا جائز نہیں تو ضروریات زندگی کس طرح پورے کریں۔ اور اگر اپنی ضروریات زندگی کی

دنیوی مشاغل میں مصروف ہوجائیں تو دینی خدمات پر برا اثر پڑتا ہے۔ برائے مہربانی قرآن وسنت کی روشنی میں راہ نمائی فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......وارثین انبیاء علیہم السلام کی دو قسمیں ہیں: (۱)...... باعتبار نسب، (۲)...... باعتبار علم۔

جو حضرات نسب کے اعتبار سے انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کے وارث ہیں ان کے لئے زکوٰۃ لینا جائز نہیں کیونکہ احادیث شریفہ کے اندر زکوٰۃ کو مال کا میل کہا گیا ہے جو انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کے نسب کے تقدس کے منافی ہے۔ لیکن جو حضرات باعتبار علم کے وارث ہیں (جیسا کہ طلباء وعلماء کرام) اگر وہ مستحق زکوٰۃ ہوں تو ان کو زکوٰۃ دینا افضل ہے۔

لما فی ترمذی (۱/۲۹۰): باب ماجاء فی ترکة النبی ﷺ......عن ابی هريرة قال جاءت فاطمة الی ابی بکر فقالت من یرثک قال اهلی وولدی قالت فمالی لاارث ابی فقال ابوبکر سمعت رسول الله ﷺ يقول لانورث...... الخ. قال المحشی تحت قوله لانورث، بفتح راء ويصح الكسر وحكمة انهم كالاباء للامة فمالهم لكلهم اولئلايظن بهم الرغبة فی الدنيا لوراثتهم ونزاع علی وعباس قبل علمهما بالحديث وبعده رجعا واعتقدا انه محق بدليل ان عليا لم يغير الامر حين استخلف ...... وكره عمر القسمة حزراً من دعوى الملک.

وفی الدر المختار (۲/۳۴۳): (وفی سبيل الله وهو منقطع الغزاة) وقيل الحاج وقيل طلبة العلم

وفی رد المحتار (۲/۳۴۳):(قوله وقيل طلبة العلم)...... فالتفسير بطالب العلم وجيه خصوصاً وقد قال فی البدائع فی سبيل الله جميع القرب فيدخل فيه كل من سعى فی طاعة الله وسبيل الخيرات اذا كان محتاجاً.

وفی الهندية (۱/۱۸۷): التصدق على الفقير العالم افضل من التصدق على الجاهل.

(۱۸۵) زکوٰۃ کے بارے میں حضرت ابوذر غفاریؓ کا مذہب

سوال ...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے دینی کتابیں پڑھنے کا بڑا شوق ہے۔ پچھلے دنوں ہمارے امام صاحب نے ایک کتاب مجھے دی جس کا نام تھا ''سوانح حضرت ابوذر غفاریؓ'' میں نے یہ کتاب پوری پڑھی، بڑی اچھی کتاب تھی، البتہ یہ کتاب پڑھ کر ایک سوال میرے ذہن میں آیا، میں نے امام صاحب سے بھی عرض کیا لیکن انہوں نے مجھے آپ سے پوچھنے کا کہا، سوال یہ تھا کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے بارے میں اس کتاب میں لکھا تھا کہ وہ مال جمع کرنے کو بہت ناپسند سمجھتے تھے، یہاں تک کہ ایک روز کے علاوہ اگر گزر بسر کسی کے پاس ہوتا تو اس پر بھی ناراضگی کا اظہار فرماتے، اب پوچھنا یہ ہے ان کا اصل مذہب کیا تھا؟ اور کیا کسی اور صحابی کا بھی یہی مذہب تھا؟ ان کے نزدیک زکوٰۃ کس پر واجب ہوتی ہے؟ نیز کیا یہ مذہب اپنانا درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ زہاد صحابہ میں شمار ہوتے ہیں اسی غلبۂ زہد کی بنا پر فرمایا کرتے تھے کہ انسان پر

ضرورت سے زائد مال جمع کرنا حرام ہے اور فرمایا کرتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں میری غذا ایک صاع تمر ہوا کرتی تھی، لہٰذا مرنے تک اس مقدار میں اضافہ نہیں کروں گا اسی تفرد کی بنا پر صحابہ کرامؓ سے ان کا اختلاف ہوا کرتا تھا لیکن کسی صحابی نے ان کی شہرت کو قبول نہیں فرمایا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی شکایت پر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ان کو مدینہ پاک بلوالیا اور پھر مدینہ پاک میں بھی اختلاف کی وجہ سے ان کو ربذہ کے مقام پر منتقل ہونے کا حکم فرمادیا اسی قسم کی بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں فرمائی تھی کہ یہ ایک صحراء میں وفات پائیں گے خلاصہ یہ کہ ان کا قول زہد کے غلبہ کی بنا پر تھا البتہ کسی اور صحابی کا یہ قول تلاش بسیار کے باوجود نہ مل سکا۔ باقی رہا زکوٰۃ کا مسئلہ تو اس کا نصاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمادیا ہے جو اس نصاب کا مالک ہوگا اسی پر زکوٰۃ ہوگی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بہت سے صحابہ کرام اس نصاب کے مالک تھے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر اتنا مال جمع کرنے پر نکیر نہیں فرمائی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مذہب حضرت ابوذر غفاریؓ کے علاوہ کسی اور صحابی کا نہیں تھا۔

لمافي عمدة القاري (۱/۲۰۵): ومن مذهبه أنه يحرم على الانسان ادخار ما زاد على حاجته من المال.

وفي سير اعلام النبلاء (۳/۱۹۱): أنه جاء يستأذن على عثمان فأذن له وبيده عصاً فقال عثمان يا كعب ان عبدالرحمن توفي وترک مالاً فماترى، قال ان كان فضل فيه حق الله تعالىٰ فلا بأس عليه فرفع ابو ذرّ عصاه وضرب كعباً وقال سمعت رسول الله ﷺ يقول ما أحب أن لي هذا الجبل ذهباً أنفقه ويتقبل مني أذر خلفي منه ستة اواق انشدک الله ياعثمان أسمعته قال مراراً، قال نعم قلت: هذا دال على فضل انفاقه وكراهية جمعه لا يدل على تحريم.

وفي الاستيعاب في معرفة الاصحاب (۱/۳۲۱): ثم قدم على النبي ﷺ المدينة فصحبه إلى أن مات ثم خرج بعد وفات أبي بكر رضي الله عنه إلى الشام فلم يزل بها حتى ولي عثمان رضي الله عنه ثم استقدمه عثمان لشكوى معاوية به وأسكنه الربذة فمات بها وصلى عليه عبدالله بن مسعودؓ.

وفي عقد الجيد (صـ۳٦): اعلم أن في الأخذ بهذه المذاهب الاربعة مصلحة عظيمة وفي الاعراض عنها مفسدة كبيرة ... ولما اندرست المذاهب الحقة إلا هذه الاربعة كان اتباعها اتباعاً للسواد الاعظم والخروج عنها خروجا عن السواد الاعظم.

وفي منن الكبرى (۱/۵۵): فقد بان لک يا أخي مما نقلناه عن الائمة الاربعة وغيرهم ان جميع الائمة المجتهدين من دائرون مع ادلة الشرعية حيث دارت وانهم كلهم منزهون عن القول بالرأى في دين الله وان مذاهبهم كلها محررة على الكتاب والسنة كتحرير الذهب والجوهر.

وفي الفقه الاسلامي (۳/۱۸۲۳): واجمع العلماء على أنه إذا كان اقل من عشرين مثقالا ولا يبلغ مئتي درهم فلا زكوة فيه لعدم بلوغ النصاب وقال عامة الفقهاء نصاب الذهب عشرون مثقالا الخ.

(۱۸۶) زکوٰۃ میں دوجنسوں کا اجتماع

سوال ... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے پاس ۳۹ بکریاں تھیں جن پر سال گزر گیا ہے اور ۴ گائے بھی ہیں تو کیا میرے اوپر زکوٰۃ واجب ہوگی جبکہ ایک صاحب کا فرمانا ہے کہ اگر کسی کے پاس دوجنس کے مال ہوں لیکن دونوں نصاب سے کم ہوں تو ان کو ملا کر زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے تو کیا ان کی بات صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورتِ مسئولہ میں جبکہ آپ کے پاس موجود گائے اور بکریوں میں سے ہر ایک حدِ نصاب سے کم ہے تو اس صورت میں (اگر یہ بغرضِ تجارت کے نہیں ہیں) تو آپ پر ان کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ کیونکہ گائے اور بکریوں کا نصاب علیحدہ علیحدہ شمار ہوتا ہے۔ ان کو باہم ملایا نہیں جاتا۔

لمافی الهندية (۱/۱۷۵): ومن كان له نصاب فاستفاد في اثناء الحول من جنسه. ضمه اليه وزكاة.

وفی الدر المختار (۲/۲۸۸): (والمستفاد) ولو بهبة أو إرث (وسط الحول يضم الى نصاب من جنسه)

وفی الشامية تحته: واحترز عن المستفاد من خلاف جنسه كالإبل مع الشياه فلا تضم بحر.

(۱۸۷) اولاد وغیرہ کا نکاح کرانا ضرورت اصلیہ میں سے ہے یا نہیں؟

سوال... کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم دو بھائی ہیں بڑا بھائی گورنمنٹ میں ملازم ہے اور میرا کپڑے کا کاروبار ہے اور میں ہر سال اپنے مال تجارت کی زکوٰۃ ادا کرتا ہوں۔ جب سے میں نے اپنے بیٹے کی منگنی اپنے بھائی کی لڑکی سے کرائی تو کچھ رقم بیٹے کی شادی کرانے کیلئے الگ سے رکھ لی اب جب میں نے اس سال اپنے مال تجارت کی زکوٰۃ نکالی تو میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ بیٹے کا نکاح کرانا ضرورت اصلیہ میں سے ہے یا نہیں؟ کیا جو رقم میں نے بیٹے کے نکاح کرانے کیلئے رکھی ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اولاد وغیرہ کا نکاح کرانا ضرورت اصلیہ میں سے نہیں ہے اسلئے جو رقم آپ نے ان کے نکاح کیلئے رکھی ہے اس میں سے بھی زکوٰۃ نکالتے وقت زکوٰۃ نکالنا ضروری ہے۔

لما فی الهنديه (۱/۱۷۲): (ومنها فراغ المال) عن حاجته الاصلية فليس في دور السكنى وثياب البدن واثاث المنازل ودواب الركوب وعبيد الخدمة وسلاح الاستعمال زكاة و كذا طعام اهله وما يتجمل به من الاوانى اذا لم يكن من الذهب والفضة وكذا الجوهر واللؤلؤ والياقوت والبلخش والزمرد ونحوها اذا لم يكن للتجارة.

وفی الشامية (۲/۲۶۲): قوله في التاتارخانية نوى التجارة أولا لكن حيث كان ما قاله ابن ملك

موافقا لظاهر عبارات المتون كما علمت وقال ح انه الحق فالأولى التوفيق بحمل مافي البدائع وغيرها على ما اذا امسكه لينفق منه كل ما يحتاجه فحال الحول وقد بقي معه منه نصاب فانه يزكي ذلك الباقي وان كان قصده الانفاق منه ايضاً في المستقبل لعدم استحقاق صرفه الى حوائجه الاصلية وقت حولان الحول بخلاف ما اذا حال الحول وهو مستحق الصرف إليها لكن يحتاج الى الفرق بين هذا وبين ما حال الحول عليه وهو محتاج منه الى اداء دين كفارة أو نذر أوحج فانه محتاج اليه ايضاً لبراءة ذمته وكذا ما سياتي في الحج من انه لو كان له مال و يخاف العزوبة يلزمه الحج به اذا خرج اهل بلده قبل ان يتزوج وكذا لو كان يحتاجه لشراء داراوعبد فليتامل والله اعلم.

(۱۸۸) سادات کوزکوٰۃ نہ دینے کی علت اور موجودہ دور کے سادات کے بارے میں زکوٰۃ کا حکم

سوال ... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ سادات کوزکوٰۃ کی رقم دینا جائز نہیں ہے؟ میں نے ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ موجودہ دور کے سادات کو دینا درست ہے کیا یہ صحیح ہے؟ اور ایک عالم کے بارے میں بھی سنا تھا کہ وہ اس کے جواز کے قائل ہیں۔ براہ کرم اپنی تحقیق سے ہمیں اس بارے میں صحیح طرح آگاہ فرمادیں۔ نیز جن عالم صاحب نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے اس کی کیا حقیقت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ... زکوٰۃ کی رقم کو حدیث میں میل کچیل سے تعبیر فرمایا ہے۔ اور سادات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسبا قرابت ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم اور قرب قرابت کی وجہ سے سادات کوزکوٰۃ کی رقم دینا جائز نہیں، اور موجودہ دور کے سادات کا بھی یہی حکم ہے کیونکہ منع زکوٰۃ کی روایات مطلق ہیں البتہ جو حضرات جواز کے قائل ہیں (جن میں حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ صاحب بھی شامل ہیں کمافی فیض الباری ۳/۵۲) وہ حضرات موجودہ دور میں علت عدم خمس الخمس بتاتے ہیں۔ لیکن آج بھی مفتی بہ قول عدم جواز کا ہے۔ جوکہ اکابرین کی عبارات اور فتاویٰ جات سے معلوم ہوتا ہے۔

لمافي التبيين (۲/۱۲٦): أو هاشمي: أي لايجوز دفعها إلى بني هاشم لقوله عليه السلام "إن هذه الصدقات إنما أو ساخ الناس وإنها لاتحل لمحمد ولا لأل محمد رواه مسلم وقال عليه الصلاة والسلام نحن أهل بيت لاتحل لنا الصدقة رواه البخاري.

وفي اعلاء السنن(۹/۹۵): واعلم ان ماامر من حرمة الصدقة الواجبة على بني هاشم هو ظاهر الرواية كمافي فتح القدير قوله ولا يدفع الى بني هاشم هذا ظاهر الرواية. وروى ابو عصمة عن ابى حنيفة انه يجوز في هذا الزمان وان كان ممتنعا في ذالك الزمان. قال المؤلف والمعمول به هو ظاهر الرواية فانه مطابق للنص.

وفی الشامیة (۲/۳۵۰): (قوله اطلاق المنع) یعنی سواء فی ذالک کل الازمان وسواء فی ذالک دفع بعضهم لبعض ودفع غیرهم لهم وروی ابو عصمة عن الامام انه یجوز الدفع الی بنی هاشم فی زمانه لانه عوضها وهو خمس الخمس لم یصل الیهم لإهمال الناس امر الغنائم وایصالها الی مستحقیها وإذا لم یصل الیهم العوض عادوا الی المعوض کذا فی البحر.

وقال فی النهر وجوز أبو یوسف دفع بعضهم الی بعض وهو روایة عن الامام وقول العینی والهاشمی یجوز له ان یدفع زکاته الی هاشمی مثله عند ابی حنیفة خلافا لابی یوسف صوابه لایجزی ولا یصح حمله علی اختیار الروایة السابقة عن الامام لمن تأمل.

ووجهه انه لو اختار تلک الروایة ماصح قوله خلافا لابی یوسف لما علمت من انه موافق لها وفی اختصار الشارح بعض ایهام.

وفی الدر المختار (۲/۳۵۱): (وجازت التطوعات من الصدقات و) غلة (الاوقاف لهم) ای لبنی هاشم سواء سماهم الواقف اولا علی ماهو الحق کما حققه فی الفتح لکن فی السراج وغیره ان سماهم جاز والا لا

وفی الشامیة تحته: (قوله وجازت التطوعات) قیدبها لیخرج بقیة الواجبات کالنذر والعشر والکفارات وجزاء الصید الاخمس الرکاز فانه یجوز صرفه الیهم کمافی النهر عن السراج.

وفی فیض الباری(۳/۵۱): باب ما یذکر فی الصدقة للنبی ﷺ وآله: واعلم ان الصدقات النافلة یجوز دفعها الی ال النبی ﷺ وان تردد ابن الهمام والزیلعی فی النافلة ایضا ....ونقل الطحاوی عن امالی ابی یوسف انه جاز دفع الزکاة الی ال النبی ﷺ عند فقدان الخمس فان فی الخمس حقهم فاذا لم یوجد صح صرفها الیهم، وفی البحر عن محمد بن شجاع الثلجی عن ابی حنیفة ایضا جوازه و"فی عقد الجید" ان الرازی ایضا اتی بجوازه.

قلت واخذ الزکاة عندی اسهل من السوال فافتی به ایضاً.

(۱۸۹) کسی کی آمدنی کے بارے میں سوال کرنا آیا حلال ہے یا حرام؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک مدرسہ ہے جس میں چارسو کے قریب مسافرو مقیم طلباء پڑھتے ہیں۔ مخیر حضرات مختلف انداز میں امداد کرتے ہیں۔ بعض لوگ نقد رقم بھی دیتے ہیں۔ آپ سے پوچھنا یہ ہے کہ جب ہم ان مخیر حضرات سے رقم لیتے ہیں تو آیا شرعاً ہمارے ذمہ لازم ہے کہ ہم ان کی آمدنی کے بارے میں کہ حلال ہے یا حرام، سوال کیا کریں۔

براہ کرم مدلل انداز میں جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... قرآن مجید اور احادیث مبارکہ میں کسی شخص کی اچھائی یا برائی یا ذاتی معاملات کے بارے میں بلا وجہ تفتیش کرنا اور اس کی ٹوہ میں لگے رہنا اس سے منع کیا گیا ہے۔ پس صورت مسئولہ میں آپ کے مدرسے کے جو مخیر حضرات مختلف انداز میں امداد کرتے ہیں ان کی آمدنی وغیرہ کے بارے میں تفتیش کرنا تو درست نہیں، البتہ اگر کسی قرینے سے یہ معلوم ہو کہ اس کی آمدنی حرام ہے مثلاً بینک کی نوکری کرتا ہے یا مشہور رشوت خور ہے تو اس سے لینا جائز نہیں یا کسی کے بارے میں معلوم ہے کہ اس کے مال میں ملاوٹ ہے اور غالب آمدنی حرام ہے تو اولیٰ یہ ہے کہ اس سے بھی قبول نہ کیا جائے۔

لما في عمدة القاري (۱/۲۲۱): والشبهة مالا يدرى أهوله او لغيره فالورع اجتنابه ثم الورع على اقسام واجب كالذي قلناه ومستحب كاجتناب معاملة مناكثر ماله حرام ومكروه كالاجتناب عن قبول رخص الله والهدايا.

وفي تكملة فتح الملهم (۵/۳۶۰): ان كان لا يتعدى ضرره الى غيره فلا حاجة للمحتسب ان يتجسس في امره...... اما اذا تعدى ضرره الى احد غيره او الى المجتمع بصفة عامة فانه يجوز للمحتسب او لموظف اخر منصوب من قبل الحكومة لهذا الغرض ان يهجم عليه وعلى ذلك يحمل قول ابي يوسف رحمه الله ويحتمل ان يوفق بذلك فيما بين الوقائع المختلفة لسيدنا عمر رضي الله عنه فالتجسس الممنوع هو ما كان لمجرد الاطلاع على عورات الناس وهتك سترهم لإخزاءهم اما ما كان لغرض اجتماعي مقبول مثل ما ذكرنا فليس من التجسس المحظور والله سبحانه اعلم.

وفي الشامية(۶/۳۸۵): قال الشيخ عبدالوهاب الشعراني في كتاب المنن وما نقل عن بعض الحنفية من ان الحرام لا يتعدى الى ذمتين سالت عنه الشهاب ابن الشلبي فقال هو محمول على ما اذا لم يعلم بذلك اما من رأى المكاس ياخذ من احد شيئا من المكس ثم يعطيه اخر ثم يا خذ من ذلك الاخر فهو حرام وفي الذخيرة سئل ابو جعفر عمن اكتسب ماله من امر السلطان والغرامات المحرمة وغير ذلك هل يحل لمن عرف ذلك ان ياكل من طعامه قال احب الي في دينه ان لا يأكل ويسعه حكما ان لم يكن غصبا او رشوة وفي الخانية: امرأة زوجها في ارض الجور اذا اكلت من طعامه ولم يكن عينه غصبا او اشترى طعاما او كسوة من مال اصله ليس بطيب فهي في سعة من ذلك والاثم على الزوج.

وفي الشامية(۵/۲۳۵): (قوله اكتسب حراما الخ) توضيح المسألة مافي التتارخانية حيث قال رجل

اکتسب مالا من حرام ثم اشتری فهذا علی خمسة اوجه: اما ان دفع تلک الدراهم الی البائع اولاً ثم اشتری منه بها او اشتری قبل الدفع بها ودفعها او اشتری قبل الدفع بها ودفع غیرها او اشتری مطلقا ودفع تلک الدراهم او اشتری بدراهم اخر ودفع تلک الدراهم قال ابو نصر یطیب له ولا یجب علیه ان یتصدق الا فی الوجه الاول......وقال الکرخی: فی الوجه الاول والثانی لا یطیب ...... ولکن الفتوی الیوم علی قول الکرخی دفعا للحرج لکثرة الحرام......

وفی البحر الرائق (۹۵/۲): ثم اعلم ان المشتری فاسدا لا یطیب للمشتری ویطیب لمن انتقل الملک منه الیه لکون الثانی ملکه بعقد صحیح بخلاف المشتری الاول فانه یحل له التصرف فیه ولا یطیب له لانه ملکه بعقد فاسد.

وفی الهندیة(۲۱۰/۳):رجل اشتری من التاجر شیئا هل یلزمه السؤال انه حلال ام حرام قالوا ینظر ان کان فی بلد وزمان کان الغالب فیه هو الحلال فی اسواقهم لیس علی المشتری ان یسال انه حلال ام حرام.

(۱۹۰) زکوٰۃ کا ادا نہ کرنا کفر نہیں ہے

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگ دیندار ہوتے ہیں، نماز، روزہ وغیرہ کے پابند ہوتے ہیں اور اللہ پاک نے ان کو مال بھی خوب دیا ہوتا ہے لیکن یہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے جب کوئی ان سے زکوٰۃ کے متعلق سوال کرے تو کہتے ہیں دعا کرو اللہ توفیق دے۔ کیا ان لوگوں کا زکوٰۃ ادا نہ کرنا کفر ہوگا نیز ان سے بائیکاٹ کرنا چاہیے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......زکوٰۃ چونکہ اہم ترین عبادت ہے اور جس کے پاس نصاب ہو تو اس شخص پر زکوٰۃ کا ادا کرنا فرض ہے اور جو شخص بلا عذر زکوٰۃ ادا نہ کرے تو اس صورت میں یہ شخص گنہگار ہوگا اور فاسق کہلائے گا البتہ اس شخص کا یہ فعل کفر نہ ہوگا ایسے شخص کے متعلق حدیث میں سخت وعید وارد ہوئی ہے۔ ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کو اللہ نے مال دیا ہو، اور وہ شخص اس کی زکوٰۃ ادا نہ کرتا ہو تو اس کیلئے قیامت کے دن اس کا مال گنجے سانپ کی صورت میں آئے گا اور اس سانپ کو اس کے گلے میں طوق بنا کر پہنایا جائے گا پھر وہ سانپ اس کو دونوں جبڑوں سے پکڑے گا اور یہ کہے گا کہ میں ہی تیرا مال ہوں میں ہی تیرا خزانہ ہوں۔'' لہٰذا صورت مسئولہ میں مذکورہ شخص کا یہ کہنا درست نہیں ہے اور اگر اس شخص کے ساتھ قطع تعلقی رکھنے سے اس شخص کے اس فعل سے باز آنے کی امید ہو تو اس کے ساتھ قطع تعلقی رکھنا جائز ہے۔

لمافی البخاری(۱۸۸/۱): عن ابی هریرة رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ من آتاه الله مالا فلم یؤد زکوته مثل له یوم القیامة شجاعاً أقرع له زبیبتان یطوقه یوم القیامة ثم یاخذ بلهزمتیه یعنی

بشدقیه ثم یقول ان مالک انا کنزک ثم تلی ولا تحسبن الذین یبخلون (الایة).

وفی فتح الباری (۱۰/۴۰۸): (باب مایجوز من الهجران لمن عصی) أراد بهذه الترجمة بیان الهجران الجائز لان عموم النهی مخصوص بمن لم یکن لهجره سبب مشروع فتبین هنا السبب المسوغ للهجر وهو لمن صدرت منه معصیة فیسوغ لمن اطلع علیها منه هجره علیها لیکف عنها .....

وفی الهندیة(۱/۱۷۰): وتجب علی الفور عند تمام الحول، حتی یأثم بتاخیره من غیر عذر.

وفی الفقه السلامی وادلته(۳/۱۷۹۴): وان منعها جهلا بوجوبها او بخلاً بها لم یکفر فان کان مانع الزکوة جاحداً لوجوبها فقد کفر کما تبین وقتل کما یقتل المرتد......

(۱۹۱) زکوٰۃ نہ ادا کرنیوالے کی دعوت قبول کرنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک جگہ پڑھا تھا اگر کسی کا مال حرام ہو، وہ کسی کی دعوت کرے تو اس کی دعوت قبول نہیں کرنی چاہئے اب مسئلہ یہ ہے کہ میرے بعض رشتہ دار ایسے ہیں جن کو اللہ پاک نے مال بہت دیا ہے لیکن وہ اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتے، اب بعض اوقات وہ میری دعوت کرتے ہیں۔ ان کی دعوت قبول کرنا کیسا ہے؟ جبکہ یقینی طور پر معلوم ہے کہ انہوں نے زکوٰۃ ادا نہیں کی فقراء کا حق کھا رہے ہیں، ان کی دعوت قبول کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... اگر کوئی شخص صاحب نصاب ہے اور ادائیگی زکوٰۃ کی تمام شرائط پائی جاتی ہیں لیکن اس کے باوجود زکوٰۃ ادا نہیں کرتا تو ایسے شخص سے متعلق حدیث میں بڑی سخت وعید آئی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایسے شخص پر اللہ تبارک وتعالیٰ بروز قیامت ایک گنجا سانپ مسلط فرمادیں گے۔ جو اسے ڈستا رہے گا اور کہے گا کہ میں تیرا مال ہوں میں تیرا خزانہ ہوں۔ تاہم اگر ایسا شخص کسی کی دعوت کرتا ہے تو اس کے ہاں دعوت کھانا جائز ہے۔ البتہ اسے اس فعل شنیع پر تنبیہ بھی کرتا رہے۔

لمافی تکملة فتح الملهم(۱/۹۱۲): فاذا وجد بنک معظم دخله حلال جاز فیه التوظف للنوع الثانی من الاعمال.

وفی قاضی خان(۴/۳۶۳): رجل اشتری بالدراهم المغصوبة طعاما ان لم یضف الشراء الی الغصب ولکنه نقد الثمن منها حل له ان یأکله ویوکل غیره.

وفی خلاصة الفتاویٰ(۴/۳۵۸): قال فضل بن غانم سألت ابا یوسف عن آکل الربا وانا اعلم یدعونی الی طعامه قال اجبه. وفی روضة الزندویسی: یجوز للرجل ان یجیب دعوة الفاسق والاورع ان لا یجیب.

(۱۹۲) واجب الذمہ زکاۃ دینے کی وصیت کرنا

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے والد صاحب کے ماموں نے بوقت انتقال یہ وصیت کی تھی کہ میرے ذمہ جتنی زکوٰۃ واجب ہے وہ فلاں مدرسہ میں دینا، اب جبکہ ان کا انتقال ہوگیا ہے اوران کے ورثاء یہ زکوٰۃ کی رقم نکال رہے ہیں، تو ایک مولوی صاحب نے انہیں مشورہ دیا کہ آپ زکوٰۃ کی یہ رقم اپنے علاقے کے مدرسہ میں دیدیں۔ ورثاء بھی اس پر راضی ہیں لیکن وہ ڈر رہے ہیں کہ کہیں وصیت پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے گنہگار تو نہ ہوں گے۔ آپ ہماری رہنمائی فرمادیں کہ اب ہم کیا کریں؟ کیا علاقے کے مدرسہ میں زکوٰۃ کی رقم دینے سے مرحوم سے فریضۂ زکوٰۃ ختم ہوجائے گا اور ورثاء کو اس میں کوئی گناہ تو نہیں ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....صورت مسئولہ میں دونوں صورتوں میں آپ کے والد کے ماموں کی زکوٰۃ ادا ہوجائے گی۔ اوران کے ورثاء گناہگار بھی نہیں ہوں گے۔ لیکن مرحوم کی وصیت کا احترام کرتے ہوئے افضلیت اسی میں ہے کہ مرحوم کی زکوٰۃ اُس مدرسہ میں دیں جس کو مرحوم نے متعین کیا ہے۔

لما فی خلاصة الفتاویٰ (۲۳۴/۴): فلو اوصى بأن يتصدق بثلث ماله فى فقراء بلخ فالافضل أن يصرف اليهم، وان اعطى غيرهم جاز، وهذا قول ابى يوسف، وعليه الفتوىٰ وقال محمدؒ لا يجوز.

وفی الشامية (۶/۶۷۵): قال فى الدر المختار: ولو اوصى لفقراء بلخ فاعطى غيرهم جاز عند ابى يوسفؒ وعليه الفتوى. وقال فى الشامية: قوله جاز لكن الافضل الصرف اليهم.

(۱۹۳) دینار کی مقدار کے متعلق تحقیق

سوال ... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فقہ کی کتابوں میں سونے کا نصاب زکوٰۃ بیس دینار لکھا ہوا ہے آجکل چونکہ سونے کا نصاب ساڑھے سات تولے ہوتا ہے تو معلوم یہ کرنا ہے کہ ۲۰ دینار کے ساڑھے سات تولے کس طرح بنتے ہیں اور ایک دینار میں کتنے گرام، کتنے رتی اور ماشے آتے ہیں؟ ذرا وضاحت کے ساتھ بیان فرمادیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....شریعت میں سونے کی زکوٰۃ کا نصاب وہ بیس (۲۰) دینار مقرر کیا گیا ہے جس کو علماء وفقہاء کرام ساڑھے سات تولہ سونے سے تعبیر کرتے ہیں، موجودہ دور میں بیس دینار سے ساڑھے سات تولہ کس طرح بنتا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک دینار میں بیس قیراط ہوتے ہیں اور ایک قیراط پانچ جو کا ہوتا ہے جن کا وزن ۰٫۲۱۸۷ ملی گرام ہوتا ہے۔ اور ایک رتی کا وزن ۰٫۱۲۱۵ ملی گرام ہوتا ہے اس اعتبار سے ۰٫۱۲۱۵ ÷ ۰٫۲۱۸ = ایک قیراط میں ۱٫۸ رتی آتی ہے اور ایک دینار میں بیس قیراط ہوتے ہیں اس اعتبار سے ۲۰x۱٫۸ = ایک دینار میں ۳۶ رتیاں ہوتی ہیں اور اس اعتبار سے ۲۰ دینار میں ۲۰x۳۶ = ۷۲۰ رتیاں ہوتی ہیں اور ایک ماسہ ۸ رتی کا ہوتا ہے لہٰذا ایک دینار میں ۸ ÷ ۳۶ = ۴٫۵ ماشے ہوتے ہیں لہٰذا ۲۰ دینار میں ۲۰x۴٫۵ = ۹۰ ماشے ہوتے ہیں اور ایک تولہ وہ بارہ ماشوں کا بنتا ہے لہٰذا

۲۰ دینار میں ۹۰ ÷۱۲=۵۔۷ تولے بنتے ہیں اس وجہ سے موجودہ دور میں ۲۰ دینار کو ۵۔۷ تولے سے تعبیر کیا جاتا ہے اور چونکہ ایک قیراط ۰٫۲۱۸۷ ملی گرام کا ہوتا ہے لہٰذا ایک دینار ۲۰x۰٫۲۱۸۷ = ۴٫۳۷۴ گرام کا ہوا، خلاصہ یہ کہ ایک دینار میں ۳۶ رتیاں اور ۴٫۵ ماشے ہوتے ہیں اور ایک دینار ۴٫۳۷۴ گرام کا ہوتا ہے اور ۲۰ دینار میں ۲۰x۴٫۳۷۴=۸۷٫۴۸ گرام ہوتے ہیں۔

نقشہ درج ذیل ہے:

ایک قیراط پانچ جو وزن ۰٫۲۱۸۷، ایک رتی کا وزن ۰٫۱۲۱۵

ایک قیراط میں رتی ۰٫۲۱۸۷÷۰٫۱۲۱۵=۱٫۸

ایک دینار میں رتیاں ۱٫۸x۲۰=۳۶

۲۰ دینار میں رتیاں ۳۶x۲۰=۷۲۰

ایک دینار میں ماشے ۳۶÷۸=۴٫۵

۲۰ دینار میں ماشے ۴٫۵x۲۰=۹۰

۲۰ دینار میں تولے ۹۰÷۱۲=۷٫۵

قیراط ماشہ اور تولے میں گرام اور ملی گرام

ایک قیراط میں ملی گرام ۰٫۲۱۸۷

ایک دینار میں گرام ۰٫۲۱۸۷x۲۰ = ۴٫۳۷۴ گرام

۲۰ دینار میں گرام ۴٫۳۷۴x۲۰ = ۸۷٫۴۸ گرام

ایک ماشے میں ملی گرام ۰٫۱۲۱۵x۸ = ۰٫۹۷۲ ملی گرام

ایک تولے میں گرام ۰٫۹۷۲x۱۲ = ۱۱٫۶۶۴ گرام

۷٫۵ تولے میں گرام ۷٫۵x۱۱٫۶۶۴ = ۸۷٫۴۸ گرام

لمافی مجمع الانہر (۱/۳۰۳): (عشرون) ای مقدر بعشرین(مثقالا) ھو لغة ما یوزن بہ قلیلا کان او کثیرا و عرفا ما یکون موزونہ قطعة ذھب مقدر بعشرین قیراطا والقیراط خمس شعیرات متوسطة غیر مقشورة مقطوعة ما امتد من طرفھا فالمثقال مائة شعیرة وھذا علی رای المتأخرین.

وفی الھندیة(۱/۱۷۹): والمثقال ھو الدینار عشرون قیراطا والدرھم اربعة عشر قیراطا والقیراط خمس شعیرات کذا فی التبیین.

وفی الدر المختار مع ردالمحتار (۲/۲۹۵): (نصاب الذھب عشرون مثقالا والفضة مائتا درھم) والدینار عشرون قیراطا والدرھم اربعة عشر قیراطا والقیراط خمس شعیرات فیکون الدرھم

الشرعی سبعین شعیرۃ. المثقال مائۃ شعیرۃ.

(۱۹۴) درہم کی مقدار کے متعلق تحقیق

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری کتابوں میں نصاب زکوٰۃ چاندی ۲۰۰ درہم لکھے ہوئے ہیں آجکل دراہم تو موجود نہیں ہیں بلکہ گرام اور رتی ماشے ہیں تو موجودہ پیمانوں کے لحاظ سے ایک درہم کتنے گرام کتنے ماشے اور کتنی رتی کا ہوگا۔ جلد جواب دیکر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......ایک قیراط ۵ جو کے برابر ہوتا ہے اور ایک درہم ۷۰ جو کے برابر ہوتا ہے۔ اور ایک جو تین چاول کے برابر ہوتا ہے۔ اب رتیوں کے حساب سے ایک قیراط ۱٫۸ رتی کے برابر ہے تو ایک درہم ۱۴ قیراط x ۱٫۸ رتی = ۲۵٫۲ رتی کے برابر ہوا۔

اس ایک ماشہ ۸ رتی کے برابر ہوتا ہے اور ایک تولہ ۱۲ ماشہ کے برابر ہوتا ہے۔ لہٰذا اس حساب سے ایک درہم ۲۵٫۲ رتی ÷ ۳٫۱۵ ماشہ کے برابر ہوگا۔

رہا گرام کا مسئلہ تو ایک قیراط ۲۱۸٫۷ ملی گرام کے برابر ہوتا ہے۔ لہٰذا ایک درہم میں ۲۱۸٫۷ ملی گرام x ۱۴ قیراط = ۳۰۶۱٫۸ ملی گرام ہوئے۔ اور ایک گرام میں ۱۰۰۰ ملی گرام ہوتے ہیں تو اس طرح ایک درہم میں ۳۰۶۱٫۸ ملی گرام ÷ ۱۰۰۰ ملی گرام = ۳٫۰۶۱۸ گرام ہوئے۔ اب چونکہ چاندی کا نصاب ۲۰۰ دراہم ہیں لہٰذا مذکورہ حساب سے چاندی کا نصاب ۳٫۰۶۱۸ گرام x ۲۰۰ دراہم = ۶۱۲٫۳۶ گرام ہوا۔ اور تولہ کی تفصیل یہ ہے کہ تمام دراہم سے رتیاں بنائی جائیں اس طرح ایک درہم = ۲۵٫۲ رتی x ۲۰۰ دراہم = ۵۰۴۰ رتی ہوئے پھر ان رتیوں سے ماشے بنائے جائیں اس طرح کہ ۵۰۴۰ رتی ÷ ۸ رتی = ۶۳۰ ماشہ ہوئے پھر ان ماشوں سے تولہ بنائے جائیں اس طرح ۶۳۰ ÷ ۱۲ ماشہ = ۵۲٫۵ تولہ ہوئے۔ اب چونکہ ۲۰۰ دراہم برابر ہیں ۵۲٫۵ تولہ کے اور برابر ہیں ۶۱۲٫۳۶ گرام کے۔ لہٰذا ایک تولہ ۶۱۲٫۳۶ گرام ÷ ۵۲٫۵ تولہ = ۱۱٫۶۶۴ گرام ہوا۔

لما فی شرح الوقایۃ(۱/۲۲۹): والمثقال عشرون قیراطا والدرھم اربعۃ عشر قیراطا والقیراط خمس شعیرات.

وفی الدرالمختار(۲/۲۹۶): والدینار عشرون قیراطا والدرھم أربعۃ عشر قیراطا والقیراط خمس شعیرات فیکون الدرھم الشرعی سبعین شعیرۃ والمثقال مائۃ شعیرۃ.

(۱۹۵) صاع کی تحقیق

سوال... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جس کتاب کو اٹھایا جائے تو اس میں صدقۃ الفطر کے متعلق لکھا ہوا ہے کہ گندم سے نصف صاع اور کشمش، جو اور کھجور سے ایک صاع جبکہ ہمارے زمانے میں صاع کا رواج نہیں ہے آجکل تو

کلوگرام اور گرام تولے وغیرہ چلتے ہیں اور آجکل صدقۃ الفطر بھی اسی مقدار سے نکالا جاتا ہے اور علماء کہتے ہیں کہ پونے دو سیر گندم کی قیمت ادا کرنا لازم ہے اب معلوم یہ کرنا ہے کہ موجودہ پیمانوں کے لحاظ سے صاع کی کیا مقدار ہوگی، اور وہ کس طرح بنے گی مثلاً ایک صاع میں کتنے رطل کتنے کلو اور کتنے لیٹر وغیرہ آتے ہیں اور یہ کس طرح بنتے ہیں ان کو تفصیل سے لکھ کر شکریہ کا موقع دیں؟ جواب جلد مطلوب ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً ... صورت مسئولہ میں ایک صاع ۱۰۴۰ درہم کا ہوتا ہے لیکن چونکہ آجکل اس کا وجود نہیں اس لئے موجودہ پیمانوں کے لحاظ سے اس کی مقدار درج ذیل ہے۔

اجمالاً موجودہ پیمانوں کی مقداریں:

ایک قیراط ۵ جو=۲۱۸۷ء، ملی گرام اور ۱ء۸ رتی کیونکہ ایک رتی کا وزن ۱۲۱۵ء ملی گرام ہے، ۲۱۸۷ء ÷ ۱۲۱۵ء = ۱ء۸ رتی ہوئی، ۸ رتی ایک ماشہ، ۱۲ ماشہ ایک تولہ، ایک درہم ۱۴ قیراط، ایک کلو ۱۰۰۰ گرام۔

تفصیل: ایک صاع آٹھ رطل اور ایک رطل ۱۳۰ درہم لہٰذا ایک صاع ۱۳۰ x ۸ = ۱۰۴۰ درہم کا ہوا، ایک درہم میں ۱۴ قیراط اور ایک قیراط ۱ء۸ رتی کو ہوتا ہے لہٰذا ۱۴x۱.۸ = ۲۵ء۲ رتی ہوئے اور ۱۰۴۰ درہم میں ۱۰۴۰x۲۵ء۲=۲۶۲۰۸ رتی ہوئیں اور ۱۰۴۰ درہم میں ۲۶۲۰۸ ÷ ۸ رتی یا ایک ماشہ = ۳۲۷۶ ماشے ہوئے اور اس کے ۳۲۷۶ ÷ ۱۲ = ۲۷۳ تولے ہوئے۔

باقی وزن تو چونکہ ایک صاع میں ۱۰۴۰ درہم اور ایک درہم میں ۱۴ قیراط اور ایک قیراط کا وزن ۲۱۸۷ء ملی گرام ہوتا ہے تو ۱۴ قیراط یا ایک درہم کا وزن ۱۴x۲۱۸۷ء = ۳ء۰۶۱۸ گرام ہوا اور ایک صاع یا ۱۰۴۰ درہم کا وزن ۳ء۰۶۱۸x۱۰۴۰ = ۳۱۸۴ء۲۷۲ گرام ہوا اور ایک کلو ۱۰۰۰ گرام کا ہوتا ہے لہٰذا ایک صاع میں ۳۱۸۴ء۲۷۲÷۱۰۰۰ = ۳ء۱۸۴۲۷۲ کلو ہوا اور ایک لیٹر ۹۰۰ء گرام کو ہوتا ہے لہٰذا ایک صاع میں ۳ء۱۸۴۲۷۲÷۹۰۰ء=۳ء۵۳۸۰۸ لیٹر ہوا۔

نقشہ ملاحظہ فرمائیں۔

ایک قیراط ۵ جو کا وزن= ۲۱۸۷ء ملی گرام اور ایک رتی کا وزن= ۱۲۱۵ء ملی گرام

ایک قیراط میں رتی = ۲۱۸۷ء÷۱۲۱۵ء=۱ء۸ رتی۔

ایک درہم میں رتیاں= ۱۴x۱ء۸=۲۵ء۲ رتیاں۔

۱۰۴۰ درہم میں رتیاں=۱۰۴۰x۲۵ء۲=۲۶۲۰۸ رتیاں۔

ایک درہم میں ماشہ=۲۵ء۲÷۸=۳ء۱۵ ماشے

۱۰۴۰ درہم میں ماشے= ۱۰۴۰x۳ء۱۵=۳۲۷۶ ماشے

۱۰۴۰ درہم میں تولے= ۳۲۷۶÷۱۲=۲۷۳ تولے

ایک قیراط میں ملی گرام= ۲۱۸۷ء ملی گرام

ایک درہم میں گرام= ۱۴x۲۱۸۷ء=۳ء۰۶۱۸ گرام

۱۰۴۰ درہم میں گرام= ۱۰۴۰x۳٫۰۶۱۸=۳۱۸۴٫۲۷۲ گرام

۱۰۴۰ درہم میں کلوگرام= ۳۱۸۴٫۲۷۲÷۱۰۰۰=۳٫۱۸۴۲۷۲ کلوگرام

ایک ماشہ میں ملی گرام= ۸x۰٫۱۲۱۵ = ۰٫۹۷۲ ملی گرام

ایک تولہ میں گرام= ۱۲x۰٫۹۷۲=۱۱٫۶۶۴ گرام

ایک صاع میں لیٹر= ۳٫۱۸۴۲۷۲÷۰٫۹۰۰=۳٫۵۳۸۰۸ لیٹر

لمافی بدائع الصنائع(۲/ ۵۴۱): والصاع ثمانية ارطال بالعراقی عند أبی حنيفةؒ ومحمدؒ وعند أبی يوسفؒ خمسة ارطال وثلث رطل بالعراقی وهو قول الشافعیؒ...... والصاع ثمانية ارطال وهذا نص لأن هذا صاع عمرؓ.

وفی عالمگيری(۱/ ۱۹۲): والصاع ثمانية ارطال بالبغدادی والرطل البغدادی عشرون استاراً والإستار أربعة مثاقيل ونصف مثقال كذا فی شرح الوقاية ثم يعتبر نصف صاع من بر أوصاع من غيره بالوزن فيما روی أبو يوسفؒ عن أبی حنيفةؒ لأن اختلاف العلماء فی الصاع بأنه كم رطلا وهو اجماع منهم بأنه معتبر بالوزن كذا فی التبيين.

وفی الشامية(۲/ ۳۶۵): اعلم أن الصاع أربعة أمداد والمد رطلان والرطل نصف من والمنّ بالدرهم مائتان وستون درهماً وبالاستار أربعون والإستار بكسر الهمزة بالدراهم ستة ونصف بالمثاقيل قيل أربعة ونصف.

وفی الدر المختار(۲/ ۲۹۶): والدينار عشرون قيراطاً والدرهم أربعة عشر قيراطاً، والقيراط خمس شعيرات، فيكون الدرهم الشرعی سبعين شعيرة والمثقال مائة شعيرة فهو درهم وثلاث أسباع درهم.

وفی عالمگيری(۱/ ۱۷۹): والمثقال هو الدينار عشرون قيراطاً والدرهم أربعة عشر قيراطاً والقيراط خمس شعيرات كذا فی التبيين.

(۱۹۶) وسق کی تحقیق

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عشر کے متعلق ایک کتاب میں لکھوا ہوا دیکھا کہ صاحبین کے نزدیک پانچ وسق سے کم میں صدقہ نہیں ہے میں نے کافی معلومات کیں لیکن اس کی صحیح مقدار کا علم نہیں ہوسکا اس لئے آپ حضرات کو زحمت دے رہا ہوں آپ مہربانی فرما کر یہ بتائیں کہ وسق میں کتنے کلو کتنے تولے اور کتنے گرام وغیرہ آتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... وسق قدیم پیمانے کے لحاظ سے ساٹھ صاع ہوتا ہے جبکہ صاع آٹھ رطل کا ہے اور ایک رطل (۱۳۰) درہم کا ہوتا ہے لہٰذا ایک صاع ۱۳۰x۸=۱۰۴۰ درہم کا ہوا، اور ایک درہم میں ۱۴ قیراط اور ایک قیراط کا وزن ۲۱۸۷ء ملی گرام کا ہوتا ہے تو ۱۴ قیراط یعنی ایک درہم کا وزن ۲۱۸۷x۱۴ء ملی گرام = ۰۶۱۸ء۳ گرام ہوا، اور ایک صاع یعنی ۱۰۴۰ درہم کا وزن ۰۶۱۸ء۳x۱۰۴۰ = ۲۷۲ء۳۱۸۴ گرام ہوا جبکہ ۶۰ میں ضرب دینے سے ایک وسق (۱۹۱۰۵۶.۳۲) کے گرام کا ہو گیا۔ پھر اس وسق کے گرام کو ۱۰۰۰ پر تقسیم کر کے ایک وسق (۱۹۱،۰۵۶۳۲) کلو کا ہو گیا۔

باقی رہا ایک وسق کے تولے، تو ایک قیراط ۸ء۱ رتی کا ہے لہٰذا ایک درہم میں ۱۴ قیراط ۱۰۸x۱۴ء=۲ء۲۵ رتی ہوئے اور ایک صاع میں ۱۰۴۰x ۲ء۲۵ رتی = ۲۶۲۰۸ رتی ہوئے اور ایک صاع میں ۲۶۲۰۸ ÷ ۸ رتی یا ایک ماشہ = ۳۲۷۶ ماشے ہوئے اور اس کے ۳۲۷۶ ÷ ۱۲ ماشے یا ایک تولہ = ۲۷۳ تولے ہوئے جبکہ ۶۰ میں ضرب دینے سے ایک وسق (۱۶۳۸۰) تولے کا ہو گیا۔

خلاصۂ جواب یہ ہے کہ صورت مسئولہ میں ایک وسق آجکل کے پیمانے کے لحاظ سے ایک وسق ایک لاکھ اکانوے ہزار چھپن (۱۹۱۰۵۶) گرام، ایک سو اکانوے (۱۹۱) کلو اور سولہ ہزار تین سو اسی (۱۶۳۸۰) تولے کا ہے۔

لما في الدر المختار (۲/۲۹۶): والدينار عشرون قيراطاً، والدرهم اربعة عشر قيراطاً والقيراط خمس شعيرات، فيكون الدرهم الشرعي سبعين شعيرةً.

وفي معارف السنن (۱/۲۷۱): واتفقوا (اى علماء الهند) على أن تولجة تنقسم الىٰ التى عشر جزء كل منه يسمّى ماهجة (ماشه) وما هجة تنقسم الىٰ ثمانية اجزاء كل جزء منها يسمى الاحمر (سرخ) فكانت تولجة (۹٦) احمر.

هكذا فى اوزان الشرعية (صـ ۲۲): للشيخ المفتى محمد شفيع رحمه الله تعالىٰ،

(۱۹۷) رطل کی تحقیق

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک دن ایک کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا اس میں لکھا ہوا تھا کہ ایک صاع آٹھ رطل کا ہوتا ہے میرے ذہن میں آیا کہ آجکل رطل وغیرہ تو نہیں بلکہ گرام اور تولے وغیرہ اوزان رائج ہیں تو ان کے بارے میں معلوم کر لینا چاہئے تاکہ صدقۃ الفطر ادا کرنے میں آسانی ہو اس لئے آپ یہ ارشاد فرمائیں کہ رطل کس کو کہتے ہیں، اس میں کتنے گرام کتنے تولے اور کتنے رتی اور ماشے آتے ہیں۔ مکمل تفصیل سے وضاحت کریں تاکہ سمجھنا آسان ہو اور کوئی اشکال باقی نہ رہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں ایک رطل ۱۳۰ دراہم کا ہوتا ہے، جس میں گرام، تولہ، ماشہ، رتی کی تفصیل درج ذیل ہے:

رطل میں گرام کی تفصیل...... ایک رطل = ۱۳۰ دراہم، ایک درہم = ۱۴ قیراط، ایک قیراط = ۵ جو، ۵ جو کا وزن ۲۱۸۸ء ملی گرام، لہٰذا ایک درہم ۲۱۸۸x۱۴ء = ۰۶۳۲ء۳ گرام ہوا، جب ایک درہم ۰۶۳۲ء۳ گرام ہے تو ۱۳۰ دراہم ۰۶۳۲ء۳x۱۳۰=۲۱۶ء۳۹۸ گرام ہوں

گے۔پس ایک رطل میں ۳۹۸،۲۱۶ گرام ہوں گے۔

رطل میں رتی کی تفصیل......ایک رطل=۱۳۰دراہم، ایک درہم=۱۴قیراط، ایک قیراط=۵جو،اور ایک قیراط میں ۱،۸رتی ہے۔اور یہ اس طرح معلوم ہوا کہ ایک رتی ۱۲۱۵،ملی گرام ہوتا ہے اور ایک قیراط کا وزن ۲۱۸۸،ملی گرام ہوتا ہے پس ۲۱۸۸،کو ۱۲۱۵،پر تقسیم کیا۔

۲۱۸۸، ÷ ۱۲۱۵، = ۱،۸۰۰ تقریباًواحتیاطاً ۱،۸۔

جب ایک قیراط ۱،۸ رتی تو ایک درہم(۱۴قیراط) ۱،۸x۱۴=۲۵،۲ رتی ہوا اور جب ایک درہم=۲۵،۲ رتی تو ۱۳۰ دراہم ۲۵،۲x۱۳۰=۳۲۷۶رتی ہوں گے۔

معلوم ہوا کہ ایک رطل میں ۳۲۷۶ رتی ہوں گے۔

رطل میں ماشہ کی تفصیل......ماشہ کی تفصیل یہ ہے کہ جب ایک درہم میں ۲۵،۲ رتی ہوتی ہیں اور یہ بات مسلم ہے کہ ۸رتی کا ایک ماشہ ہوتا ہے پس ۲۵،۲÷۸=۳،۱۵ پس جب ایک درہم میں ۳،۱۵ماشہ تو ۱۳۰دراہم میں ۳،۱۵x۱۳۰=۴۰۹،۵ ماشے ہوئے پس ایک رطل میں ۴۰۹،۵ماشے ہوئے۔

رطل میں تولہ کی تفصیل......یہ بات متفق علیہ ہے کہ ۱۲ماشہ کا ایک تولہ ہوتا ہے لہٰذا رطل میں تولہ معلوم کرنے کیلئے ۴۰۹÷۱۲=۳۴،۱۲۵تولہ ہوا۔معلوم ہوا کہ ایک رطل میں ۳۴ تولہ ہوں گے۔

الحاصل......خلاصہ یہ کہ ایک رطل میں ۱۳۰ دراہم،۳۹۸گرام،۳۲۷۶رتی اور ۴۰۹ماشے اور ۳۴تولہ ہوں گے۔

لما فی المعارف السنن(۲۶۸/۱): لاخلاف بین ابی حنیفۃ وابی یوسف الافی وزن الرطل لان عند ابی حنیفۃ الرطل عشرون استاراً وعند ابی یوسف ثلاثون استارا.

وفی عالمگیریۃ(۱۹۲/۱): والصاع ثمانیۃ ارطال باالبغدادی والرطل البغدادی عشرون أستاراً والاستار اربعۃ مثاقیل ونصف مثقال.

وفی الشامیۃ(۱۵۸/۱): الرطل مائۃ وثلاثون درھما وقیل مائۃ وثمانیۃ وعشرون درھما واربعۃ اسباع درھم.

(۱۹۸) استار کی تحقیق

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک مرتبہ اوزان شرعیہ کا مطالعہ کررہا تھا کہ اس میں لکھا تھا ایک صاع میں آٹھ رطل ہوتے ہیں اور ایک رطل میں ۱۲۰استار ہوتے ہیں صاع اور رطل تو میں سمجھ گیا لیکن استار کے بارے میں مجھے بالکل سمجھ نہ آیا کہ یہ کیا چیز ہے اس میں کتنے گرام اور کتنے تولے اور کتنے رتی اور ماشے آتے ہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً......ایک قیراط میں ۵جو،اس کا وزن ۲۱۵،ملی گرام اور ایک دینار میں بیس(۲۰) قیراط لہٰذا ۲۱۵x۲۰،ملی گرام تو ایک

دینار کا وزن ہوا ۳ء۴ گرام ایک استار میں ساڑھے چار (۴٫۵) دینار ہوتے ہیں تو اس حساب سے ایک استار میں ۱۹٫۳۵ گرام ہوئے۔ ایک قیراط کا وزن ۲۱۵ء ملی گرام اور ایک رتی کا وزن ۱۲۱۵ء ان کو تقسیم کیا تو ایک قیراط میں ۱ء۸ رتی ہوئی اور ایک دینار میں ۲۰ قیراط ۲۰x ۱ء۸ اگرام ۳۶ رتی ایک دینار میں اور ایک استار میں ساڑھے چار (۴٫۵) دینار تو اس حساب سے ایک استار میں ۱۶۲ رتی ہوئی ایک دینار میں ۴٫۵ ماشہ ایک استار (۴٫۵) دینار اور دونوں کو ضرب دیا تو ایک استار میں ۲۰٫۲۵ ماشہ ہوئے ایک تولہ میں ۱۲ ماشہ اور ایک استار میں ۲۰٫۲۵ ماشہ تو اس حساب سے ایک استار میں ایک تولہ ۸٫۲۵ ماشہ ہوئے۔

نقشہ اوزان استار

گرام	رتی	ماشہ	تولہ اور ماشہ
۱۹٫۳۵	۱۶۲	۲۰٫۲۵	ایک تولہ اور ۸٫۲۵ ماشہ

لمافی فتاویٰ عالمگیری (۱/۱۹۲): والاستار اربعة مثاقيل ونصف مثقال.

وفي الشامية (۲/۳۶۵): والاستار بكسر الهمزة بالدراهم ستة ونصف بالمثاقيل قيل اربعة ونصف.

(۱۹۹) قیراط کی تحقیق

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قدیم کتب میں قیراط کا ذکر کرتی ہوا ہے معلوم کرنے پر بتایا جاتا ہے کہ یہ ایک پیمانہ ہے اس کی مقدار کا کوئی ذکر نہیں کیا جاتا آپ مہربانی فرما کر یہ بتائیں کہ قیراط کس کو کہتے ہیں اور موجودہ پیمانوں کے لحاظ سے کس طرح بنتا ہے یعنی ایک قیراط میں کتنے گرام کتنے ماشے اور کتنے رتی کا ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... قیراط ایک قسم کا پیمانہ ہے جس کا وزن حسب تصریح فقہاء پانچ جو کے برابر ہے۔ اور موجودہ پیمانوں کے لحاظ سے ایک قیراط دو سو اٹھارہ ملی گرام (۲۱۸ء) اور رتی کے حساب سے ۱ء۸ کا بنتا ہے۔

لمافي شرح الوقاية (صـ ۲۲۹): والمثقال عشرون قيراطاً والدرهم أربعة عشر قيراطاً والقيراط خمس شعيرات.

وفي الدر المختار شرح تنوير الابصار (۲/۲۹۶): والدينار عشرون قيراطاً، والدرهم أربعة عشر قيراطاً، والقيراط خمس شعيرات، فيكون الدرهم الشرعي سبعين شعيرة الخ.

(۲۰۰) قفیز کی تحقیق

سوال .... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری فقہ کی کتابوں میں بیوعات میں قفیز کا اکثر ذکر ملتا رہتا ہے ہر استاد یہ بتا دیتا ہے کہ یہ پیمانہ ہے جو قدیم زمانے میں رائج تھا لیکن یہ نہیں بتاتے کہ موجودہ پیمانوں کے لحاظ سے یہ کتنا ہے آپ

حضرات مجھے یہ بتادیں کہ موجودہ کلو وغیرہ کے اعتبار سے قفیز میں کتنے کلو اور لیٹر اور گرام آتے ہیں؟ جواب جلد مطلوب ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً　ایک قفیز میں بارہ (۱۲) صاع ہوتا ہے ایک صاع ایک ہزار چالیس (۱۰۴۰) درہم کا ہوتا ہے ایک درہم میں چودہ (۱۴) قیراط ہوتے ہیں ایک قیراط میں پانچ جو ہوتے ہیں پانچ جو کا وزن ۰٫۲۱۵ ملی گرام ہوتا ہے لہٰذا صورت مسئولہ میں ایک درہم کے گرام = ۳٫۰۱ = ۱۴×۰٫۲۱۵ ہوتے ہیں ایک صاع کے گرام = ۳۱۳۰٫۴ = ۱۰۴۰×۳٫۰۱ ہوتے ہیں اور ایک قفیز کے گرام = ۳۷۵۶۴٫۸ = ۱۲×۳۱۳۰٫۴ ہوتے ہیں اور ایک کلو میں ہزار گرام ہوے ہیں، لہٰذا ایک قفیز کے کلو = ۳۷٫۵۶۴۸ = ۳۷۵۶۴٫۸÷۱۰۰۰ ہوتے ہیں اور ایک کلو میں ۰٫۹۰۰ لیٹر ہوتے ہیں لہٰذا ایک قفیز کے لیٹر ۴۱٫۷۳۸۶۶ = ۰٫۹۰۰ ÷ ۳۷٫۵۶۴۸ ہوتے ہیں۔

لمافي البناية(۶/۲۲۲): والقفيز مكيال وجمعه قفزان...... وقال الجوهري القفيز ثمانية مكاكيك...... وفي هامشها: وفي بعض كتب اللغة إن القفيز مكيال قدّر اثني عشر صاعا.

وفي الشامية(۵/۱۵۳): والقفيز ثمانية مكاكيك والمكوك صاع ونصف. مصباح

وفي الشامية(۲/۳۶۵): ثم اعلم ان الدرهم الشرعي اربعة عشر قيراطا والمتعارف الآن ستة عشر فاذا كان الصاع الفاو أربعين درهما شرعيا يكون بالدرهم المتعاف تسعمائة وعشرة وقد صرّح الشارح في شرحه على الملتقى في باب زكاة الخارج.

(۲۰۱) زیورات میں جب کھوٹ اصل سے کم ہو تو وہ اصل کے حکم میں ہے

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری بیوی کے پاس کچھ زیور ہے۔ اب جب زکوٰۃ نکالنے کا وقت آیا تو میں نے ایک سنار سے اس کا وزن کروایا۔ سنار نے کہا کہ اصل سونے اور کھوٹ کو ملا کر ساڑھے آٹھ تولے بنتا ہے۔ اور نگینہ وغیرہ کو بھی ملالیا جائے تو گیارہ بارہ کے قریب وزن بن جاتا ہے۔ اب آپ سے پوچھنا یہ ہے کہ زکوٰۃ نکالتے وقت کس وزن کا اعتبار کروں، آیا کھوٹ اور نگینوں کا وزن شامل ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... زیورات میں جب کھوٹ اصل سونے سے جدا نہیں کیا جاسکتا اور وہ وزن میں سونے کے وزن سے کم ہے۔ تو وہ بھی اصل سونے کے حکم میں ہے۔ زکوٰۃ نکالتے وقت کھوٹ اور اصل دونوں کا وزن معتبر ہوگا۔ جبکہ نگینہ وغیرہ کا وزن معتبر نہیں ہوگا کہ وہ سونے کے حکم میں نہیں ہیں۔ تو صورت مسئولہ میں، اصل سونے اور کھوٹ کو ملا کر جو ساڑھے آٹھ تولے بنتا ہے اسی وزن کا اعتبار ہوگا اور اسی کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

لمافي الفتاوى الهندية(۱/۱۷۹): الدراهم اذا كانت مغشوشة فان كان الغالب هو الفضة فهي كالدراهم الخالصة وان غلب الغش فليس كالفضة كالستوقة فينظر ان كان رائجة او نوى التجارة

اعتبرت قیمتها فان بلغت نصابا من ادنی الدراهم التی تجب فیها الزکوة وهی التی غلبت فضتها وجبت فیها الزکاة والا فلا و ان لم تکن اثمانا رائجة ولا منویة للتجارة فلا زکاة فیها الا ان یکون مافیها من الفضة یبلغ مائتی درهم بان کانت کثیرة وتتخلص من الغش فان کان ما فیها لا یتخلص فلا شیء علیه کذا فی کثیر من الکتب وحکم الذهب المغشوش کالفضة المغشوشة ولو استویا ففیه اختلاف و اختار فی الخانیة و الخلاصة الوجوب احتیاطا کذا فی البحر الرائق.

وفی الشامیة (۲/۳۰۰): (وغالب الفضة والذهب فضة وذهب وما غلب غشه) منهما (یقوم) کالعروض، ویشترط فیه النیة الا اذا کان یخلص منه ما یبلغ نصابا اواقل. وعنده مایتم به او کانت اثمانا رائجة وبلغت نصابا من ادنی فقد تجب زکاته فتجب والا فلا. تنویر الابصار مع الدر (قوله وغالب الفضة الخ) لان الدراهم لاتخلو عن قلیل غش لانها لاتنطبع الابه فجعلت الغلبة فاصلة نهر، ومثلها الذهب ط (قوله فضة وذهب) لف ونشر مرتب، ای فتجب زکاتهما لازکاة العروض وان اعدهما للتجارة کما افاده فی النهر الخ.

(۲۰۲) سامانِ تعیش کیلئے لیے گئے قرضوں کو زکوٰۃ کے واجب ہونے کیلئے منہا کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل بہت سے لوگ مختلف بینکوں اور حکومت سے بڑے بڑے قرض لے کر کروڑ پتی بن چکے ہیں۔ اور بڑی وسعت اور عیاشی کی زندگی گزار رہے ہیں کروڑوں کی املاک کے مالک ہیں۔ لیکن اگر ان کے قرضوں کو دیکھا جائے جو انہیں مختلف بینکوں اور حکومت کو دینا ہیں تو یہ مستحق زکوٰۃ بن جائیں گے، ان کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے، آیا قاعدہ اور ضابطہ کو دیکھ کر ان کو مستحق زکوٰۃ سمجھا جائے یا پھر ان کی موجودہ حالت کو دیکھ کر انہیں صاحب نصاب جانا جائے اور ان پر زکوٰۃ فرض ہو؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... قرض کو اگر چہ اکثر اصحاب متون وشروحات اور اہل فتاویٰ نے مطلقاً چاہے معجّل ہو یا مؤجل مانع وجوب زکوٰۃ شمار کیا ہے اور یہی مذہب ہے۔ مگر علامہ شامیؒ نے قہستانی کے حوالے سے ایک روایت نقل کی ہے کہ قرض موجل مانع وجوب زکوٰۃ نہیں ہے، موجودہ دور میں جو لوگ بینکوں سے یا حکومت سے قرضے لے کر عیش وعشرت کی زندگی گزارتے ہیں عام طور پر ان کے قرضوں کی مدت بہت زیادہ ہوتی ہے تو علامہ شامیؒ کی اس روایت کو ان پر محمول کرلیا جائے اور ان صاحب نصاب مقروضین پر زکوٰۃ فرض ہو تو یہ احتیاط کے زیادہ قریب ہے، ورنہ تو زکوٰۃ کا دروازہ ہی بند ہو جائے گا۔ ہمارے زمانے کے بعض حضرات کی بھی یہی رائے ہے چنانچہ فتاویٰ بینات (۲/۶۱۶) پر لکھتے ہیں، ہماری رائے یہ ہے کہ ایسے قرضوں کو تو منہا کردینا ضروری ہے جو عام ضروریات زندگی کی بنا پر ہوں ورایسے قرضے جو کہ مسرفانہ اخراجات یا سامان تعیش خریدنے کی بنا پر ہوں ان کو منہا نہیں کیا جائے گا بلکہ اس قسم کے صاحب نصاب مقروض پر

زکوۃ فرض ہوگی۔

لمافی الدر المختار مع ردالمحتار (۲/ ۲۶۰): فارغ عن دین له مطالبٌ من جهة العباد سواء کان لله کزکاة　ولو کفالة او موجلا قال ابن عابدین رحمه الله تحت قوله او موجلا عزاه فی المعراج الی شرح الطحاوی وقال وعن ابی حنیفة لایمنع وقال الصدر الشهید لاروایة فیه، زاد القهستانی عن الجواهر والصحیح انه غیر مانع.

(۲۰۳) زکوٰۃ ادانہ کرنے کیلئے حیلہ کرنا

سوال　کیافرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ اگرکسی نے تجارت کیلئے سامان خریدا لیکن جب سال پورا ہونے میں ایک ہفتہ باقی رہ گیا تو اس نے وہ سامان کسی دوسرے شخص کوبطور کرایہ کے دیدیا اور پھر ایک مہینہ بعد واپس لے لیا اور سال بھر تجارت کرتا رہا، آیا اس طرح حیلہ کرکے زکوۃ ادانہ کرنا جائز ہے اگر نہیں تو کیا زکوۃ فرض ہوگی جبکہ زکوۃ کے وجوب کیلئے ایک سال گزرنا ضروری ہے۔

الجواب حامداًومصلیاً　صورت مسئولہ میں وجوب زکوۃ کی شرائط میں سے ایک یہ ہے کہ سامان تجارت پرایک سال گزرگیا ہو اور سال کی ابتداء اور انتہا میں نصاب بھی مکمل ہوتب زکوۃ فرض ہوگی لیکن صورت مسئولہ میں کیونکہ سامان پرایک سال مکمل نہیں گزرا، اسلئے زکوۃ تو فرض نہ ہوگی البتہ اسقاط زکوۃ کیلئے اس طرح کا حیلہ مفتی بہ قول کے مطابق مکروہ تحریمی ہے کیونکہ اس میں فقراء کا نقصان ہے۔

لمافی حاشیة الطحطاوی علی مراقی الفلاح (ص ۷۱۸): قال فی البحر: اعلم أنه لو وهب النصاب فی خلال الحول، ثم تم الحول وهو عند الموهوب له ثم رجع الواهب بعد الحول بقضاء أو بغیره فلا زکوة علی واحد منهما کما فی الخانیة وهی من حیل إسقاط الزکوة قبل الوجوب وفی المعراج: ولو باع السوائم قبل تمام الحول بیوم فراراً عن الوجوب قال محمد رحمه الله تعالیٰ: یکره وقال أبویوسف رحمه الله تعالی: لا یکره وهو الأصح ولو باعها للنفقة لایکره بالإجماع ولو احتال لإسقاط الواجب یکره بالإجماع ولو فرمن الوجوب بخلا لا تأثما یکره بالاجماع.

وفی الشامیة (۲/ ۲۸۴): وإذا فعله حیلة لدفع الوجوب کان استبدل نصاب السائمة بآخر أو أخرجه عن ملکه ثم أدخله فیه، قال أبو یوسف لا یکره لأنه امتناع عن الوجوب لا إبطال حق الغیر وفی المحیط أنه الأصح وقال محمد: یکره، واختاره الشیخ حمید الدین الضریر لأن فیه إضرار بالفقراء وإبطال حقهم مالا وکذا الخلاف فی حیلة دفع الشفعة قبل وجوبها. وقیل الفتوی فی الشفعة علی قول أبی یوسف وفی الزکاة علی قول محمد وهذا تفصیل حسن شرح درالبحار.

وفیه ایضاً (۱/ ۱۳۲): اذا ذکروا مکروها فلا بدمن النظر فی دلیله فإن کان نهیا ظنیا یحکم لکراهة

التحريم إلا لصارف للنهي عن التحريم إلى الندب.

وفي الهندية(۶/۱ ۳۹): رجل له مائتادرهم اراد ان لاتلزمه الزكاة فالحيلة له في ذالک أن يتصدق بدرهم قبل تمام الحول بيوم حتى يكون النصاب ناقصافي آخر الحول......قال الخصاف كره بعض اصحابناالحيلة في اسقاط الزكاة ورخص فيهابعضهم.قال الحلواني الذي كرههامحمد بن الحسن والذي رخص فيهاأبويوسف...... ومشايخناأخذوابقول محمد. والله اعلم بالصواب

(۲۰۴) حیلے کے ذریعے زکوٰۃ ساقط کرنے کا حکم

سوال...... کیافرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک ملازمت پیشہ آدمی ہوں، میری آمدنی اتنی ہے کہ بڑی مشکل سے ہماری گزر بسر ہوجاتی ہے، اب عیدالاضحیٰ کا زمانہ قریب ہے پچھلے سال انہی دنوں میں میری شادی بھی ہوئی تھی۔ میری بیوی کو شادی کے موقع پر کچھ سونے کے زیورات بھی ملے تھے۔ جس کی زکوٰۃ اس پر واجب ہوتی ہے اور بقرعید پر قربانی بھی، لیکن صورتحال یہ ہے کہ آج کل عام طور پر بیویوں کا مکمل خرچہ شوہر ہی اٹھاتا ہے۔ اور اس کی طرف سے زکوٰۃ کی ادائیگی وقربانی بھی اسے ہی کرنا پڑتی ہے۔ اور میری حالت یہ ہے کہ میں زکوٰۃ وقربانی کی ادائیگی کرنا تو دور کی بات میں خود مستحق زکوٰۃ ہوں۔ اب اس تمام صورتحال کو سامنے رکھ کر اگر میں اس بقرعید پر اپنی بیوی پر نصاب کا سال پورا ہونے سے پہلے اس کا سونا صرف اپنی ملکیت میں لے لوں، تو اس طرح نہ وہ صاحب نصاب رہے گی اور چونکہ میں مقروض بھی ہوں تو میں بھی صاحب نصاب نہ رہوں گا۔ آپ بتائیں میرے لئے اس طرح کرنا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......حیلہ ایک ایسا ذریعہ ہے جس کے استعمال سے بندہ خفیہ طور پر اپنے مقصود تک پہنچتا ہے۔ پھر اگر کسی حرام سے چھٹکارا یا حلال کا حصول مقصود ہے تو بلاشبہ جائز ہے اور اگر غیر کے حق کا ابطال مقصود ہے تو مکروہ ہوگا۔ پس صورت مسئولہ میں چونکہ زکوٰۃ فقراء کا حق ہے اور صاحب نصاب نے زکوٰۃ ادا نہ کرنے سے ان کے حق کا ابطال لازم آتا ہے۔ لہٰذا حیلے بہانے سے زکوٰۃ ساقط کرنا کراہت سے خالی نہیں۔ جبکہ آپ کی اہلیہ کیلئے اسی سونے سے بعض کو فروخت کرکے زکوٰۃ ادا کرنا ممکن بھی ہے۔

لمافي الهندية(۶/۱ ۳۹): قال الخصافؒ كره بعض أصحابنا رحمهم الله الحيلة في اسقاط الزكاة ورخص فيها بعضهم قال الشيخ الامام الاجل شمس الائمة الحلوانيؒ الذي كرهها محمد بن الحسنؒ والذي رخص فيها ابو يوسفؒ فقد ذكر الخصاف رحمه الله تعالىٰ الحيلة في اسقاط الزكوة وأراد به المنع عن الوجوب لا الاسقاط بعد الوجوب ومشايخنا اخذوا بقول محمدؒ دفعا للضرر عن الفقراء.

وفي الدر المختار(۶/۲۴۲): وأما الحيلة لدفع ثبوتها ابتداء فعندابي يوسف لاتكره وعند محمدؒ تكره ويفتي بقول ابي يوسفؒ في الشفعة قيده في السراجية بما اذا كان الجار غير محتاج اليه واستحسنه محشي الاشباه (وبضده) وهو الكراهة (في الزكاة)

وفی الشامیة تحته:بل نقل فی النهاية أن منهم من قال انه لاخلاف فيها وفی البزازية: وان قبل الثبوت لاباس به عدلا كان يعنی الشفيع أو فاسقا فی المختار لانه ليس بابطال.

(۲۰۵) زکوٰۃ کی نیت سے الگ رکھی ہوئی رقم کو استعمال کرنے کا حکم

سوال ... کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ زید صاحب نصاب ہے اور پابندی سے زکوٰۃ ادا کرتا ہے جب سال پورا ہو جاتا ہے تو زکوٰۃ کی رقم الگ کر کے جب بھی کوئی مستحق اسکے پاس آتا ہے اس رقم میں سے اسکو دیدیتا ہے اور بسااوقات اسی رقم میں سے مزدور کی مزدوری بھی دیدیتا ہے اور یہی سلسلہ سال بھر چلتا رہتا ہے تو کیا زکوٰۃ کا اسطرح ادا کرنا درست ہے؟ نیز زکوٰۃ کی نیت سے جو رقم علیحدہ کر رکھی ہے اسمیں دوسرے تصرفات جیسے مزدور کو مزدوری دینا اور بعد میں دوبارہ اتنی رقم زکوٰۃ کی رقم میں شامل کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ... صورت مسئولہ میں زکوٰۃ کی ادائیگی کی مذکورہ صورت درست ہے نیز صدقات کیلئے رقم متعین کرنے سے متعین نہیں ہوتی۔لہٰذا اگر اس متعین کردہ رقم میں سے کچھ رقم کسی اور کام میں خرچ کر لی جائے اور پھر اس میں دوسری رقم زکوٰۃ کی نیت سے ملالی جائے تو یہ بھی صحیح ہے۔

لمافی الخانية علی هامش الهندية (۱/۲۶۳): رجل وجب عليه زكوة المائتين فافرز خمسة من ماله ثم ضاعت منه تلك الخمسة لا تسقط عنه الزكوة ولو مات صاحب المال بعد أن افرز الخمسة كانت الخمسة ميراثا عنه.

وفی الشامية (۲/۲۷۰): وفيه اشارة الی انه لا يشترط الدفع من عين مال الزكوة.

وفی الشامية(۲/۳۳۶):قوله فخالفای فی بعضها أو كلها بأن تصدق فی غيريوم الجمعة ببلد آخر بدرهم آخر علی شخص آخروانماجازلان الداخل تحت النذر ماهوقربة وهواصل التصدق دون التعيين فبطل التعيين ولزمته القربة. والله اعلم بالصواب

(۲۰۶) خون کے ذریعے زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ پچھلے سالوں میں آزاد کشمیر اور شمالی علاقہ جات میں ایک خوفناک زلزلہ آیا تھا۔تو ان میں سے بہت سے لوگ ایسے تھے جن کو خون کی اشد ضرورت تھی اور میرے پاس زکوٰۃ کی کچھ رقم پڑی ہوئی تھی۔تو میں نے اُس سے خون خرید کر زخمیوں کا علاج کرایا۔لیکن اب مجھے یہ اندیشہ لاحق ہوا ہے کہ شاید زکوٰۃ کی رقم سے خون خرید کر زخمیوں کو دینے سے زکوٰۃ ادا نہ ہوتی ہو۔آپ سے گزارش تھی کہ آپ مجھے اس بارے میں اطمینان دلادیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً .....آپ کی تحریر کردہ صورت میں مالِ زکوٰۃ کی ادائیگی نہیں ہوئی۔اس لئے کہ ادائیگی زکوٰۃ مال کے ذریعہ سے کی

جاتی ہے، اور خون قرآن وحدیث کی رُو سے مال نہیں، اس لئے خون کی خرید وفروخت شرعاً ناجائز ہے۔ لہٰذا آپ دوبارہ اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کریں۔ البتہ آپ نے بحالت اضطراری انسانی ہمدردی کے پیشِ نظر مفت خون دستیاب نہ ہوتے ہوئے خون خرید کر زخمیوں کو فراہم کیا، اس پر عنداللہ آپ ماجور ہوں گے۔

وفی الهندية(٣/١١٧): ولو اشترى بميتة او دم لايملكه لانه ليس بمال لعدم تموّلهما.

وفی الشامية(٥/٥٠): ان احد العوضين اذا لم يكن مالا فی دين سماوی فالبيع باطل سواء كان مبيعا او ثمنا، فبيع الميتة والدم والحر باطل، وكذا البيع به، وان كان فی بعض الاديان مالا دون البعض ان امكن اعتباره ثمنا فالبيع فاسد فبيع العبد بالخمر أو الخمر بالعبد فاسد وان تعين كونه مبيعا فالبيع باطل فبيع الخمر بالدراهم او الدراهم بالخمر باطل ..... وفی (ص ٥١) وقدمنا اول البيوع تعريف المال بما يميل اليه الطبع ويمكن ادخاره لوقت الحاجة.

(٢٠٧) ایک مدرسہ کی زکوٰۃ کا دوسرے مدرسہ میں استعمال کرنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مولانا صاحب نے دوسرے مولانا صاحب سے فرمایا کہ کوئی آدمی آپ کے مدرسہ کیلئے تعاون کرنا چاہتا ہے جس کے اور آپ کے درمیان رابطہ میں ہوں، لیکن اس معطی کے دیئے ہوئے عطیہ میں سے اتنی رقم آپ مجھے دیں گے جس سے میں بھی اپنا مدرسہ قائم کرنا چاہتا ہوں اور وہ رقم اس پر لگاؤں گا تاکہ میرے ہاں بھی دین کا کام چلے اور اس بارے میں اس معطی کو اس کا علم بھی نہیں ہوگا۔ تو کیا اس طرح کیا جاسکتا ہے؟ موصوف مولانا (ثانی) بھی چاہتے ہیں کہ کوئی حیلہ نکل آئے تاکہ دین کا کام چلتا رہے۔ شریعت مقدسہ کی روشنی میں اس صورت کے جائز وناجائز ہونے میں رہنمائی فرما کر عنداللہ ماجور ہوں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ..... مہتمم مدرسہ عطیات وصدقات دینے والوں کی طرف سے وکیل ہوتا ہے۔ لہٰذا مؤکل (عطیات دینے والے) جہاں چاہیں وہاں خرچ کرنا لازم ہے۔ اس لئے صورت مسئولہ میں چونکہ یہ شخص اسی متعین مدرسہ کیلئے دینا چاہتا ہے اس لئے اس کو دوسرے مدرسہ میں خرچ کرنا جائز نہیں۔ البتہ اگر اس کو بتایا جائے کہ کچھ رقم فلاں مدرسے میں خرچ کریں گے اور وہ اس پر راضی ہو جائے تو پھر دوسرے مدرسے میں خرچ کرنے میں کوئی مضائقہ نہ ہوگا۔

لما فی الفقه الاسلامی وادلته(٥/٤١٠٩): ......ومجمل القول فی سبب الحكم: هو أن الوكيل امين فلا ضمان عليه لمؤكله إلّا اذا حدث منه تعد أو تفريط ويتحمل المؤكل الخسارة العارضة اذا لم تكن بتعد اوتفريط من الوكيل.

وفی الشامی(٤/٣٥٩): قال الزيلعی وعلى هذا حصير المسجد و حشيشه اذا استغنى عنهما يرجع الى مالكه عند محمدؒ وعند ابی يوسفؒ ينقل إلى مسجد آخر وصرح فی الخانية بان الفتوى على قول محمدؒ قال فی البحر وبه علم ان الفتوى على قول محمد فی الات المسجد وعلى قول ابی يوسف فی تأبيد المسجد.

﴿کتاب الصوم﴾

(روزے کے مسائل کا بیان)

﴿رمضان کا چاند دیکھنا اور اختلاف مطالع کا بیان﴾

(۱) رؤیت ہلال کمیٹی کی شرعی حیثیت

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ رؤیت ہلال کمیٹی حکومت کے آرڈر کے مطابق چاند کا فیصلہ کرتی ہے۔اگر چہ بہت سے ایسے لوگ شہادت دیدیں جنکی شہادت مقبول ہو تب بھی یہ اعلان نہیں کرتے آیا ایسی صورت میں رؤیت ہلال کمیٹی کے فیصلہ کا اعتبار کیا جائیگا یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً.....چاند کی رؤیت کیلئے شرعی شہادتوں کا پایا جانا ضروری ہے صرف رؤیت ہلال کمیٹی کا اعلان کافی نہیں جسکی تفصیل یہ ہے کہ سب سے پہلے مطلع صاف ہونیکی صورت میں رمضان وعید کے چاند کیلئے اتنی تعداد میں لوگوں کی گواہی ضروری ہے کہ جس سے چاند دیکھنے کا ظنِ غالب ہوجائے اور یہ شہادت اپنے علاقہ کے قاضی یا رؤیت ہلال کمیٹی کے چیئرمین کے سامنے دیجائے۔اسی طرح مطلع اگر ابر آلود ہو تو رمضان کے چاند کیلئے صرف ایک مسلمان کی خبر کافی ہے لیکن عید کے چاند کیلئے دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کا گواہی دینا ضروری ہے تب انکی شہادت مقبول ہوگی۔رؤیت ہلال کمیٹی اگر شرعی قوائد کے مطابق گواہوں کی مکمل چھان بین کے بعد فیصلہ کرتی ہو اور حکومت کی مداخلت بھی یقینی نہ ہو تو کمیٹی کا فیصلہ ہی معتبر سمجھا جائیگا جیسا کہ موجودہ دور میں ہمارے ملک میں رؤیت ہلال کا نظام اسی پر مبنی ہے۔

لمافی الشامية(۲/۳۸۹): ونصه؛ويقبل شهادة المسلم والمسلمة عدلاكان الشاهدأوغير عدل بعد أن يشهد أنه رأى خارج المصرأوأنه رآه في المصروفي المصرعلة تمنع العامة من التساوى في رؤيته و ان كان ذالك في مصرولاعلة في السماء لم يقبل في ذالك الاالجماعة.

(۲) غیر اسلامی ممالک میں رؤیت ہلال کمیٹی کی حیثیت

سوال.....کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ میں کہ ہمارے ملک میں رؤیت ہلال کی ایک کمیٹی مقرر ہے،کمیٹی کے ممبر ہر گاؤں میں موجود ہوتے ہیں.کئی مرتبہ دیکھا گیا ہے کہ گاؤں کے لوگ کمیٹی کے ممبر کو چاند دیکھنے کی گواہی دیدیتے ہیں لیکن جب ممبر بڑی کمیٹی کو چاند دیکھنے کی اطلاع کرتے ہیں تو وہ لوگ نہیں مانتے،اس صورت میں گاؤں والوں کو کیا کرنا چاہئے،اپنے ممبر کی بات ماننی چاہئے یا رؤیت ہلال کمیٹی کے اعلان کا انتظار کرنا چاہئے؟اور ہمارے ملک برما میں (جو اسلامی ملک نہیں ہے) کبھی کبھار گاؤں کے لوگ دارالافتاء والوں کو چاند کی شہادت دیدیتے ہیں تو وہ تفتیش کے بعد اعلان کردیتے ہیں حالانکہ رؤیت ہلال کمیٹی والوں نے اعلان نہیں

کیا ہوتا تو اس صورت میں دارالافتاء کے اعلان پر عمل ضروری ہے یا رؤیت ہلال کے اعلان پر؟ مزید براں دارالافتاء والے رمضان کا چاند دیکھنے کی صورت میں فتویٰ دیتے ہیں کہ جس نے آج روزہ نہیں رکھا وہ اسکی قضا کرے گا اور عید کے چاند کی صورت میں اعلان کرتے ہیں کہ روزہ رکھنا حرام ہے جو روزہ رکھے گا سخت گناہ گار ہوگا، اس صورت میں دارالافتاء کا اعلان معتبر ہوگا یا رؤیت کمیٹی کا؟ اگر ہم نے رؤیت کمیٹی والوں کے اعلان پر عمل کر لیا تو ہم گناہ گار تو نہ ہونگے؟

الجواب حامداً ومصلیاً صورت مسئولہ میں آپ کے علاقے کی بڑی کمیٹی کی حیثیت گویا کہ امام کی ہے لہٰذا کمیٹی جو اعلان کرے اس پر عمل کرنا چاہئے، البتہ جن لوگوں نے رمضان کا چاند دیکھا ہے ان کو روزہ رکھنا چاہئے لیکن وہ اسکی تشہیر نہ کریں جب تک کہ کمیٹی والے اعلان نہ کر دیں، اسی طرح اگر عید کا چاند دیکھا ہے اور کمیٹی والوں نے شہادت قبول نہ کی تو ان لوگوں کے ذمہ بھی روزہ رکھنا ضروری ہے اسلئے کہ اجتماعی اعلان کا اعتبار کیا جاتا ہے نہ کہ انفرادی۔ لہٰذا ایسے معاملات میں افہام وتفہیم سے کام لینا چاہئے، نزاع سے بچنا چاہئے۔ خاص طور سے دیار غیر میں اتحاد واتفاق سے رہنا چاہئے تا کہ مسلمانوں کی اجتماعی حیثیت برقرار رہے ورنہ ایسی صورت میں مسلمان اپنا تشخص کھو بیٹھتے ہیں اور پھر غیروں کے شکنجے میں گرفتار ہو کر رہ جاتے ہیں۔

(۳) رؤیت ہلال کمیٹی کی شرعی حیثیت اور اس کے اعلان نہ کرنے پر روزے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماءِ کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ موجودہ رؤیت ہلال کمیٹی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اگر کچھ لوگ چاند دیکھ لیں لیکن کمیٹی اعلان نہ کرے تو کیا اس دن کا روزہ فرض ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً موجودہ رؤیت ہلال کمیٹی میں ہر مکتبہ فکر کے علماء ہیں اور حاکم وقت کی طرف سے رؤیت ہلال کے منتظم ہیں اور شرعی شہادت کے بعد چاند کے نظر آنے یا نہ آنے کا اعلان کرتے ہیں اس لئے ان کے اعلان پر عمل کرنا ضروری ہے۔

صورت مسئولہ میں جب رؤیت ہلال کمیٹی نے چاند نظر نہ آنے کا اعلان کیا تو کسی شرعی شہادت کے نہ ملنے کی وجہ سے کیا ہوگا تو جن لوگوں کو چاند نظر آیا ہے صرف انہی پر روزہ رکھنا ضروری ہے باقی لوگ کمیٹی کے اعلان کا انتظار کریں جب وہ اعلان کریں اس وقت روزہ رکھیں۔

لما في البدائع الصنائع(۲ ۳۰ د): وجه "ظاهر الرواية" ان المطالع لاتختلف الاعند المسافة البعيدة الفاحشة وعلى هذا الرجل الذى اخبر ان يصوم لان عنده أن هذا اليوم من رمضان والانسان يؤاخذ بما عنده فان شهد فرد الامام شهادته ثم أفطر يقضي لانه أفسد صوم رمضان في زعمه فيعامل بما عنده.

وفي البحر الرائق(۲/۴۶۳): (قوله ومن رأى هلال رمضان أو الفطر ورد قوله صام فان أفطر قضى فقط) لقوله تعالىٰ في هلال رمضان فمن شهد منكم الشهر فليصمه (البقرة:۱۸۵) وهذا قد شهده والحديث في هلال الفطر ((صومكم يوم تصومون وفطركم يوم تفطرون)) والناس لم يفطروا في

هـذا اليـوم فـوجـب عـليـه موافقتهم ولان تفرده مع شدة حرص الناس على طلبه دليل غلطه وانما لم تـجـب الكفارة فيما اذا رأى هلال رمضان ولم يصم لأن القاضي رد شهادته بدليل شرعي وهو تهمة الغلط فأورث شبهة وهذه الكفارة تندرئ بالشبهات.

وفـي قاضي خان(۱/۹۵): وان رأى هلال رمضان وحده فشهد ولم يقبل شهادته كان عليه أن يصوم فـان أفـطـر فـي ذلک اليـوم كـان عـليـه الـقـضـاء دون الكفارة وان افطر قبل ان يرد القاضي شهادته احتلفوا فيه والصحيح انه لاتجب عليه الكفارة.

وفـي التـاتارخانية(۳۵۲/۲): ثم الواحد اذا رأى هلال رمضان وحده هل يلزمه ان يشهد عند الحاكم، لا ذكـر لهـذا في المبسـوط، قال الشيخ شمس الائمة الحلواني اذا كان عدلا يلزمه أن يشهد حرا كان أوعـبـدا أوأمة حتـى الـجارية المخدرة ان تشهد بغير اذن وليها، فأما اذا كان الرائي فاسقا تكون فيه سبهة قال الطحاوی ان علم ان القاضي يميل الى قوله ويقبل شهادته يلزمه أن يشهد.

وفـي الهـنـدية(۱۹۷-۱۹۶/۱): اذا رأى الـواحـد الـعدل هلال رمضان يلزمه ان يشهد بها في ليلته حـرا كان أو عبدا. رجل رأى هلال رمضان وحده فشهد ولم تقبل شهادته كان عليه أن يصوم وان افـطـر فـي ذلک اليوم كان عليه القضاء دون الكفارة وان افطر قبل ان يرد القاضي شهادته فالصحيح انه لاتجب عليه الكفارة. كذا في فتاویٰ قاضي خان

وفي الدر المختار(۳۸۴/۲): (رأى) مكلف هلال رمضان أو الفطر ورد قوله) بدليل شرعي (صام) مطلقا وجوبا وقيل ندبا.

وفـي الشـامية تحت (قوله بدليل شرعي) هو إما فسقه أو غلطه نهر وفي القهستاني بفسقه لو السماء متغيمة أو تفرده لو كانت مصحية.

وفـي الـلـجـنـة الـدائـمـة (۹۷/۱۰): فـعـليـكم اذا ثبت لديكم بالاذاعة او غيرها ثبوت الرؤية في غير مـطـلعكم ان تجعلوا الأمر بالصيام أو عدمه الى ولي الأمر العام لدولتكم، فان حكم بالصيام أو عدمه وجـبـت عـليـكـم طـاعـتـه فـان حـكـم الحاكم يرفع الخلاف في مثل هذا وعلى هذا تتفق الكلمة على الصيام او عدمه تبعا لحكم رئيس دولتكم وتنحل المشكلة.

(۴) چاند کے موٹا یا باریک ہونے سے روزہ کی شرعی حیثیت

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اس سال ۲۹ شعبان کو چاند نظر نہیں آیا جب دوسرے دن چاند دیکھا تو کافی

موتا تھا جو دو دن کا معلوم ہو رہا تھا اس پر ہماری مسجد کے چند ساتھی کہنے لگے کہ رؤیت ہلال کمیٹی نے اس دفعہ بھی صحیح فیصلہ نہیں کیا اور ایک روزہ کھا گئے اور کہنے لگے کہ ایک روزے کی اب قضا کرنی پڑے گی کیا روزے کی قضاء کی جائے گی؟

الجواب حامداًومصلیاً......صورت مسئولہ میں اگر ۲۹ شعبان کو چاند نظر نہ آئے اور شرعی شہادت بھی نہ ہو، اور رؤیت ہلال کمیٹی یہ فیصلہ کرے کہ چاند نظر نہیں آیا تو دوسرے دن خواہ چاند موٹا ہو یا باریک ایک روزہ کی قضا نہیں کی جائیگی۔شرعی شہادت یہ ہے کہ اگر آسمان ابر آلود ہو تو رمضان المبارک کے چاند کیلئے ایک مسلمان، عاقل، بالغ، عادل کی گواہی معتبر ہوگی اور اگر آسمان صاف ہو تو پھر ایک جماعت کثیرہ کی شہادت معتبر ہوگی۔

لمافي الشامية(۳۸۹/۲): ونصه؛ويقبل شهادة المسلم والمسلمة عدلاًكان الشاهدأوغيرعدل بعد أن يشهد أنه رأى خارج المصرأوأنه رآه في المصروفي المصرعلة تمنع العامة من التساوي في رؤيته و ان كان ذالك في مصرولاعلة في السماء لم يقبل في ذالك الاالجماعة.

(۵) چاند کی اطلاع ٹیلی فون یا TCS سے دینا

سوال......کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک دوست جو کہ کراچی کا رہائشی ہے اور وہ ایک اخباری رپورٹر ہے کبھی کبھی اس کو شہر سے باہر بھی جانا ہوتا ہے اس دفعہ ایسا ہوا کہ رمضان سے پہلے وہ کراچی سے باہر گیا؛ واتھا ابھی یہاں کراچی میں چاند کا اعلان نہیں ہوا تھا اس نے موبائل سے مجھ کو چاند کی مبارکباد دی جبکہ وہ شہر سے باہر (حیدرآباد) گیا ہوا تھا اب آپ سے پوچھنا ہے کہ اگر کوئی شخص فون وغیرہ کے ذریعہ چاند کی خبر دے تو شریعت میں اس کا اعتبار ہوگا؟ اگر کراچی والوں کو کراچی سے باہر مثلاً حیدرآباد وغیرہ سے بذریعہ ٹیلی فون یا TCS چاند کی خبر دی جائے تو کیا اسکا اعتبار کیا جائیگا یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً......صورت مسئولہ میں اگر کراچی والوں کو بذریعہ ٹیلیفون یا T C S چاند کی خبر دی جائے تو اسکا اعتبار نہیں کیا جائیگا کیونکہ گواہی کے وقت گواہ کا ہونا ضروری ہے جبکہ یہاں گواہ خود موجود نہیں ہے یہ ایسا ہی ہے کہ جیسا کسی نے خط وغیرہ کے ذریعہ گواہی دی ہو۔

لمافي الهندية (۴۵۶/۳): رأى خطه ولم يتذكرالحادثة اوتذكر كتابة الشهادة ولم يتذكرالمال لايسعه ان يشهد.

(۶) چاند کی اطلاع صبح کے وقت ہونے پر روزہ کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ رمضان المبارک کے چاند کیلئے رؤیت ہلال کمیٹی کے اعلان کا انتظار کیا جاتا ہے۔بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ رات کے ساڑھے گیارہ، بارہ بجے چاند کے ہونیکا اعلان ہوا۔ایسی صورت میں جو لوگ جلدی

سو جائیں اوران کو چاند کے ہونے کے بارے میں معلوم نہ ہوسکا ہواور نہ ہی انہوں نے تراویح پڑھی ہواور نہ ہی صبح روزہ رکھ سکے ہوں تو ان کے لئے اب کیا حکم ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......صورت مسئولہ میں ایسے لوگوں کیلئے حکم یہ ہے کہ اگر انکو صبح نصف النہار سے پہلے پہلے چاند کا علم ہوگیا ہواور انہوں نے روزہ کے منافی کوئی کام (کھایا، پیا وغیرہ) نہ کیا ہوتو روزہ کی نیت کر کے روزہ رکھ لیں۔اور اگر انکو نصف النھار کے بعد معلوم ہوا یا کچھ کھاپی لیا تو ان لوگوں پر دن کے بقیہ حصہ میں روزہ داروں کی مشابہت اختیار کرتے ہوئے امساک (یعنی بغیر کھائے پیئے دن گزارنا) لازم ہوگا اور بعد میں صرف ایک دن کی قضا لازم ہوگی۔

لـمـافي حاشية الطحطاوي على المراقي(صـ۵۳۰): (قوله ولونهاراالى ماقبل نصف النهار)المراد انه من الليل الى هذاالوقت ظرف النية فمتى حصلت في جزء من هذاالزمان صح الصوم لماذكره المصنف ..... وانماتجوزقبل الضحوة اذالم يوجد قبلها مايناً في الصوم كأكل وشرب وجماع ولو ناسيافان وجدذالك بعدطلوع الفجر لاتجوزهندية.

وفي الشامية(۲/۴۰۸): وكذاكل من وجب عليه الصوم لوجود سبب الوجوب والاهلية ثم تعذرعليه المضى بأن افطرمتعمدااواصبح يوم الشك مفطرا ثم تبين انه من رمضان أوتسحر على ظن ان الفجرلم يطلع ثم تبين طلوعه فانه يجب عليه الامساك تشبها...... والله اعلم بالصواب

(۷) اختلافِ مطالع کا مطلب

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ پورے ملک پاکستان اور پاکستان میں صوبہ سرحد کے تمام اضلاع اور ایجنسیاں سعودی عرب کے رؤیت ہلال پر رمضان اور عیدیں نہیں مناتے لیکن بعض علماء کرام چھوٹے چھوٹے علاقوں میں سعودی عرب کے رؤیت ہلال پر رمضان اور عیدیں مناتے ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: **لاعبرة لاختلاف المطالع** ؛ جبکہ دوسرے علماء کرام اسکے خلاف کہتے ہیں کہ سعودی عرب کے رؤیت ہلال پر عمل کرنا جائز نہیں ہے اور انکی دلیل یہ ہے کہ سعودی حکومت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کے خلاف فیصلہ کرتی ہے: **کمافی احسن الفتاوی جلد چھارم**؛

آپ سے درخواست ہے کہ کن علماء کی رائے درست ہے اور کن کی باطل، تفصیلی دلائل کے ساتھ تحریر فرمادیں، اللہ تعالی آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے آمین۔

الجواب حامداًومصلیاً......اختلاف مطالع کے اعتبار وعدم اعتبار کے متعلق متقدمین اور متاخرین احناف کے اقوال مختلف ہیں، متقدمین کے نزدیک اختلاف مطالع کا مطلقاً اعتبار نہیں چاہے بلاد قریبہ ہوں یا بلاد بعیدہ۔یہی وجہ ہے کہ متقدمین کے نزدیک پوری دنیا میں جہاں کہیں بھی چاند نظر آجائے اور چاند کا ثبوت شرعی طریقہ سے ہوجائے تو پوری دنیا کے مسلمانوں پر روزہ رکھنا فرض ہوجاتا ہے چاہے پاکستان کے

کسی شہر میں ہو یا عرب ممالک میں لیکن عملاً متقدمین کے مذہب کا اعتبار کرنا مشکل ہے، اگر بالفرض اعتبار کر بھی لیا جائے تب بھی ساری دنیا کے مسلمانوں تک شہادت کا پہنچانا اور یہ جاننا کہ اعتبار کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہے خصوصاً ان علاقوں تک جنکے لوگ شہری آبادی سے دور پہاڑوں، جنگلوں اور جزیروں وغیرہ میں رہتے ہوں، اسی ضرورت کے پیش نظر بعض متأخرین احناف نے بلاد بعیدہ (جنکا مطلع دوسرے سے مختلف ہو) میں اختلاف مطالع کا اعتبار کیا ہے۔ لہٰذا بعض متأخرین احناف کے نزدیک جن ملکوں اور شہروں میں مسافت بعیدہ ہو وہاں ایک ملک میں چاند دیکھنے سے دوسرے ملک والوں پر روزہ رکھنا لازم نہ ہوگا اور یہی حکم عید سے متعلق ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔

لمافی البدائع الصنائع (۲/۵۷۹): هذااذاكانت المسافة بين البلدين قريبة لاتختلف فيهاالمطالع فامااذاكانت بعيدة فلايلزم احدالبلدين حكم الآخرلان مطالع البلاد عندالمسافة الفاحشة تختلف فيعتبر فى اهل كل بلد مطالع بلدهم دون البلد الآخر.

وفى معارف السنن (۵/۳۴۰): وقيل يعتبراختلاف المطالع فى البلاد البعيدة،قال الزيلعى شارح الكنزوهو الاشبه وهو الذى احتاره القدورى فى التجريدوبه قال الجرجانى قال الشيخ وهذاهو الصواب ولابدمن تسليم قول الزيلعى والالزم وقوع العيديوم السابع والعشرين والثامن والعشرين أوالحادى والثلاثين الخ.

(۸) اختلاف مطالع کے اعتبار کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اختلاف مطالع معتبر ہے یا نہیں؟ آج کے زمانہ میں فتویٰ کس پر دیا جاتا ہے؟ اور کیوں؟ اگر معتبر ہے تو ایک مطلع کو دوسرے سے ممتاز کیسے کریں گے؟ حد فاصل بیان فرمائیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اختلاف مطالع جمہور فقہاء، ائمہ مجتہدین متقدمین کے ہاں معتبر نہیں ہے۔ لیکن امام شافعیؒ اور ائمہ احناف متاخرین نے اختلاف مطالع کا اعتبار کیا ہے اور آجکل یہی قول مفتیٰ بہ ہے۔ کیونکہ اس وقت پوری دنیا میں کوئی ایسا منظم نظام موجود نہیں ہے جس کے تحت ہلال کمیٹی قائم کر کے پوری دنیا میں ایک ہی دن روزہ رکھا جائے یا عید منائی جائے۔ اس لئے لوگوں کو انتشار سے بچانے کیلئے بہتر یہ ہے کہ ہر ملک والوں کی رؤیت دوسرے ملک والوں کیلئے معتبر نہیں ہوگی۔ اور ہر ملک وسلطنت کیلئے الگ رؤیت کا ہونا ضروری ہے۔ اور علامہ شامیؒ نے اس کو اقلیم ممالک کے ساتھ مقید کیا ہے۔ چنانچہ ہر ملک کی جو مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی ہے۔ اس کے اعلان کا اعتبار ہوگا۔

لمافی الصحیح البخاری (۱/۲۵۶): عن ابن عمرؓ قال سمعت رسول الله ﷺ يقول اذا رأيتموه فصوموا واذا رأيتموه فافطروا فان غم عليكم فاقدروا له.

وفى الدر المختار (۲/۳۹۳،۳۹۲): (واختلاف المطالع) ورؤيته نهارا قبل الزوال وبعده غير معتبر

علی) ظاهر (المذهب) وعليه أكثر المشايخ وعليه الفتوى بحر عن الخلاصة (فيلزم أهل المشرق برؤية أهل المغرب) اذا ثبت عندهم رؤية أولئک بطريق موجب كمامر وقال الزيلعي الأشبه انه يعتبر لكن قال الكمال: الأخذ بظاهر الرواية أحوط.

وفي الشامية(۲/۳۹۳): (قوله على ظاهر المذهب) اعلم أن نفس اختلاف المطالع لانزاع فيه بمعنى أنه قديكون بين البلدتين بعد بحيث يطلع الهلال ليلة كذا في احدى البلدتين دون الاخرى وكذا مطالع الشمس لأن انفصال الهلال عن شعاع الشمس يختلف باختلاف الأقطار حتى اذا زالت الشمس في المشرق لايلزم ان تزول في المغرب وكذا طلوع الفجر وغروب الشمس بل كلما تحركت الشمس درجة فتلک طلوع فجر لقوم وطلوع شمس لآخرين وغروب لبعض ونصف ليل لغيرهم كمافي الزيلعي وقدر البعد الذى تختلف فيه المطالع مسيرة شهر فأكثر على مافي القهستاني عن الجواهر اعتباراً بقصة سليمان عليه السلام، فانه قد انتقل كل غدوّ ورواح من اقليم الى اقليم وبينهما شهر اهـ وفي شرح المنهاج للرملي وقدنبه التاج التبريزى على أن اختلاف المطالع لا يمكن في أقل من أربعة وعشرين فرسخاً وأفتى به الوالد والأوجه انها تحديدية كما أفتى به ايضاً اهـ.

وفي فتح الملهم (المطبوعه مكتبة الحجاز)(۳/ ۱۱۲،۱۱۳): (باب بيان ان لكل بلد رؤيتهم وانهم اذا رأو الهلال ببلد لايثبت حكمه لما بعد عنهم) عن محمد وهو ابن ابى حرملة عن كريب ان ام الفضل بنت الحارث بعثته الى معاوية بالشام قال فقدمت الشام فقضيت حاجتها واستهل عليّ رمضان وانا بالشام فرأيت الهلال ليلة الجمعة ثم قدمت المدينة في آخر الشهر فسألني عبدالله بن عباس ثم ذكر الهلال فقال متى رأيتم الهلال فقلت رأيناه ليلة الجمعة فقال أنت رأيته فقلت نعم ورآه الناس وصاموا وصام معاوية فقال لكنا رأيناه ليلة السبت فلا نزال نصوم حتى نكمل ثلاثين او نراه فقلت او لا تكتفي برؤية معاوية وصيامه فقال لا هكذا امرنا رسول الله ﷺ

(قوله هكذا أمرنا رسول الله ﷺ الخ) الحديث ظاهر الدلالة للترجمة قال الحافظؒ وقد اختلف العلماء في ذلک على مذاهب، احدها لاهل كل بلدرؤيتهم ......ثانيها مقابله اذ ارؤى ببلدة لزم اهل البلاد كلّها وهو المشهور عند المالكية لكن حكى ابن عبدالبر الاجماع على خلافه وقال اجمعوا على انه لا تراعى الرؤية فيما بعد من البلاد كخراسان والاندلس قال القرطبيؒ قد قال شيوخنا اذا كانت رؤية الهلال ظاهرة قاطعة بموضع ثم نقل الى غيرهم بشهادة اثنين لزمهم الصوم وقال ابن

الماجشون لایلزمهم بالشهادة الا لاهل البلد الذی ثبت فیه الشهادة الا ان یثبت عند الامام الاعظم فیلزم الناس کلهم لان البلاد فی حقه کالبلد الواحد اذ حکمه نافذ فی الجمیع وقال بعض الشافعیة: ان تقاربت البلاد کان الحکم واحداً وان تباعدت فوجهان لایجب عند الأکثر واختار ابو الطیب وطائفة الوجوب وحکاه البغوی عن الشافعیؒ وفی ضبط البعد اوجه عند الشافعیة.

(۹) اسلامی مہینہ اٹھائیس دن کا نہیں ہوسکتا

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ماموں اوران کی فیملی ایک غیر مسلم ملک میں رہتے ہیں لیکن الحمدللہ حتی الوسع احکام شرع کی پابندی کرتے ہیں۔ایک مرتبہ ان لوگوں نے رمضان المبارک کے اٹھائیس روزے مکمل کئے تھے کہ شام کو چاند نظر آ گیا اب آپ سے معلوم یہ کرنا ہے کہ اسلامی مہینہ اٹھائیس دنوں کا ہوسکتا ہے اگر نہیں تو پھر اگر کبھی ایسی صورتحال پیش آ جائے تو اگلے دن کیا کرنا چاہئے؟ آیا روزہ رکھیں یا عید منائیں؟اور ہمارے ماموں وغیرہ کو کیا کرنا چاہئے تھا؟

الجواب حامداًومصلیاً ..... اسلامی مہینہ اٹھائیس دن کا نہیں ہوسکتا،لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر ان حضرات نے شعبان کے مہینے کا چاند دیکھ کر تیس دن پورے کئے ہوں اوراس کے بعد رمضان کا روزہ شروع کیا ہوتو ان کے ذمہ یکم رمضان کیلئے ایک روزہ قضا رکھنا لازمی ہوگا، جو کہ ماہِ رمضان سے یقینی طور پر کم ہوا ہے،اوراگر شعبان کے مہینے کا چاند دیکھے بغیر اس کے تیس دن پورے کئے ہوں اوراس کے بعد رمضان کا روزہ شروع کیا ہوتو ان کے ذمہ شروع رمضان کے دوروزوں کی قضاء لازم ہوگی،اس لئے کہ اس صورت میں یہ احتمال موجود ہے کہ رمضان سے پہلے دونوں مہینے (رجب اور شعبان) انتیس دن کے ہوں اور رمضان تیس دن کا ہو،اب جب اٹھائیس میں چاند نظر آ گیا تو اگلا دن یکم شوال کا ہے وہ عید کا دن ہے لہٰذا آپ کے ماموں وغیرہ یکم شوال میں عید منائیں اور بعد میں جو روزے کم ہوئے ہیں ان کی قضا کریں۔

وفی الولوالجیة (۱/۲۳۶): اذا صام الناس فی شهر رمضان، فاذا هو ثمانیة وعشرون ینظر ان رأوا هلال شعبان وعدّوا شعبان ثلاثین یوماً، ثم صاموا رمضان قضوا یوماً واحدا لانه علم ان رمضان انتقص بیوم یقین، وهذا قد یکون، وان عدوا شعبان ثلاثین یوماً من غیر رؤیة هلال شعبان، ثم صاموا رمضان قضوا یومین لانه لم یعلم ان رمضان انتقص بیوم بیقین لجواز انهم غلطوا فی شعبان بیومین لما عدّوا شعبان ثلاثین یوماً من غیر رؤیة هلال شعبان.

وفی التاتارخانیة (۲/۳۵۴): ولو رأوا هلال شعبان وعدوه ثلاثین یوماً ثم شرعوا فی صوم رمضان فلما صاموا ثمانیة وعشرین یوماً رأوا هلال شوال فعلیهم ان یقضوا یوماً واحداً لانهم غلطوا بیوم واحد بیقین، وان عدوا شعبان ثلاثین یوماً من غیر رؤیة الهلال قضوا یومین لانه یحتمل انهم غلطوا

من اوّل رمضان بیومین.

وفی الهندیة(۱/۱۹۹): اذا صام اهل مصر شهر رمضان علی غیر رؤیة ثمانیة وعشرین یوماً ثم رآوا هلال شوال ان عدّوا شعبان برؤیته ثلاثین یوما ولم یرواهلال رمضان قضوا یوماً واحداً وان صاموا تسعاو عشرین یوماً ثم رأواهلال شوال لاقضاء علیهم، فان عدّوا هلال شعبان ثلاثین یوما من غیر رؤیة هلال شعبان ثم صاموا رمضان قضوا یومین کذا فی الخلاصة.

وفی الفقه الاسلامی (۱۶۵۵/۳): وان صاموا ثمانیة وعشرین یوماً، ثم رأوا الهلال، قضوا یوماً فقط، وان صاموا لاجل غیم ونحوه کقتر ودخان، لم یفطروا: لان الصوم انما کان احتیاطاً.

(۱۰) ٹی وی چینلز کی خبر، خبرِ مستفیض کے حکم میں ہے؟

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ رویت ہلال کے ثبوت کے سلسلہ میں بحث کرتے ہوئے فقہاء نے خبر مستفیض کا ذکر کیا ہے، آجکل دنیا کے مختلف ٹی وی چینلز سے، اسی طرح ریڈیو اسٹیشنوں سے رویت ہلال کے بارے میں پتا چل جاتا ہے، کیا یہ خبر مستفیض کے حکم میں شمار ہو سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟ خبر مستفیض کا تحقق کب ہوگا؟

الجواب حامداًومصلیاً ..... موجودہ دور کے ٹی وی اور ریڈیو چینلز کی خبر ''خبر مستفیض'' کے حکم میں ہے یا نہیں، اس سے پہلے چند باتیں بطور تمہید کے جاننا ضروری ہیں، ہلال کے ثبوت کیلئے چاہے وہ رمضان کا ہو یا شوال کا رؤیت ہلال کا پایا جانا ضروری ہے کیونکہ شریعت نے جس چیز کو ہلال کے ثبوت کیلئے معیار بنایا ہے وہ رؤیت ہے اس کے بغیر اس کا ثبوت نہیں ہوگا، اگر کوئی خبر اتنی عام اور مشہور ہو جائے کہ اس کے بیان کرنے والوں پر یہ گمان نہ ہو سکے کہ یہ سب جھوٹ بول رہے ہیں تو ایسی خبر کو اصطلاح میں خبر مستفیض یعنی مشہور کہا جاتا ہے ایسی خبر بھی رؤیت ہلال کے ثبوت کیلئے کافی ہے لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ مختلف اطراف سے مختلف لوگ یہ بیان کریں کہ ہم نے خود چاند دیکھا ہے اور ان کی تعداد اتنی ہو کہ ان سب کا جھوٹ پر جمع ہونا ممکن نہ ہو، پس صورت مسئولہ میں اگر مختلف جگہوں کے کئی ٹی وی اور ریڈیو چینلز مختلف اطراف سے کئی لوگوں کا بیان نشر کریں جنہوں نے چاند دیکھا ہو تو وہ خبر مستفیض کے حکم میں ہوں گے۔ اور اگر صرف ان کی خبر کو حکایتاً نقل کرتے ہیں تو وہ خبر مستفیض کے حکم میں نہیں ہوں گے۔ اسی طرح جیسا کہ آجکل ٹی وی اور ریڈیو سے حکومت کی طرف سے مقرر کردہ ''رؤیت ہلال کمیٹی'' کا اعلان نشر کیا جاتا ہے تو اس کا بھی اعتبار ہوگا بشرطیکہ کمیٹی کے سامنے چاند کا ثبوت ''شهادت علی الرویة، شهادت علی الشهادة یا شهادت علی القضاء'' ان تینوں میں سے کسی ایک ذریعے سے ہو چکا ہو، پھر وہ اعلان کریں اور یہ بھی دیکھا جائے کہ جو گواہ ہیں وہ اس قابل بھی ہیں کہ ان کی گواہی قبول کی جا سکتی ہے یا نہیں، یعنی گواہوں کا عادل، عاقل، بالغ اور ثقہ ہونا ضروری ہے جس چیز کی گواہی دے رہے ہیں اس کو خود دیکھا ہو، اور لفظ شہادت بھی استعمال کیا ہو، پس ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد اگر ''رؤیت ہلال کمیٹی'' اعلان کرے تو وہ بھی قابل قبول ہے بالفرض اگر وہ اعلان غلط ہوا تو اس کا وبال اعلان کرنے والے پر ہوگا نہ کہ

عوام پر۔ اور اس ''خبر مستفیض'' سے یا ''رؤیت ہلال کمیٹی'' کے اعلان سے دوسری جگہ اس وقت عمل ہوگا جب اقلیم وسلطنت ایک ہو، کیونکہ اس صورت میں اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں کیا جاتا اور اگر اس کے برخلاف ہو تو اس صورت میں حکم تبدیل ہوجاتا ہے اور ہر اقلیم وسلطنت کیلئے الگ رؤیت کا ہونا ضروری ہے، چونکہ متاخرین احناف نے اختلاف مطالع کا اعتبار کیا ہے اور یہی مفتی بہ قول ہے اور علامہ شامی علیہ الرحمۃ نے اس کو اقلیم ممالک کے ساتھ مقید کیا ہے اس وجہ سے دنیا کا کوئی ٹی وی یا ریڈیو چینلز اگر خبر مستفیض کی صورت اختیار کرتے ہوئے رؤیت ہلال کا اعلان کرے تو اس خبر کا اعتبار اس ملک والوں کیلئے تو ہوگا جس ملک کا وہ چینل ہے لیکن دوسرے اقلیم وسلطنت والوں کیلئے وہ حکم لازم نہیں ہوگا، اختلاف مطالع کی بناپر اور ہر اقلیم وسلطنت کیلئے الگ رؤیت کا ہونا ضروری ہوگا، اس کے بعد چاند کا ثبوت ہوگا صرف ان چینلز کی خبر کی بناپر رؤیت ہلال کا ثبوت دوسری جگہ پر نہیں ہوگا۔

لما في سنن أبي داؤد(۱ ؍ ۳۲۰): عن ابن عمر رضي الله عنه قال ترايا الناس الهلال فاخبرت رسول الله ﷺ انی رأيته فصام و امر الناس بصيامه.

وفي ترمذی(۱ ؍ ۱۴۸): عن عكرمة عن ابن عباس رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ لا تصوموا قبل رمضان صوموا لرؤيته وأفطروا لرؤيته فان حالت دونه غيابة فاكملوا ثلثين يوماً.

وفي معارف السنن(۵ ؍ ۳۳۸): اعلم: ان الهلال يثبت بالشهادة على الرؤية او الشهادة على الشهادة او الشهادة على القضاء او استفاضة الخبر من جهات شتى وفي متون الحنفية ان هلال رمضان يثبت بخبر واحد يوم غيم، واما في الصحو فلا بدمن اخبار جماعة كثيرة يحصل بهم اليقين، وهلال العيد في الغيم لابد من شهادة رجلين، وفي الصحو لابدمن جماعة كثيرة......

قال الشيخ: ويقيد هذا الجائي من خارج البلدة بحوالي البلدة لامن بلد بعيد ولو كان هذا الجائي من غير هذه البلدة تحول المسألة الى مسألة اختلاف المطالع، هل يعتبر ذلك ام لا؟ .. وأيضاً (صـ۳۴۳) وقد دارت المسألة في هذه الايام في توحيد نظام الامة في الصيام والعيد في بلاد الهند فاضطروا الى الاعلان بواسطة الآلة التي تسمّى "راديو" وكل ذلك تنطع وتكلف ينبو عن مقاصد الشرع فضلا عن ان الاعلان بـ "راديو" لا يقوم مقام الاخبار الشرعي او الشهادة الشرعية، ولو كان القاضي يعلن نفسه لو كان هناك قاضيا شرعاً وبالجملة: هناك مغامز شرعية لا يستقيم الحكم الشرعي ابدا، ثم كيف يتصور هذا التوحيد في القرى والجبال والبوادى التي لم تبلغ اليها هذه الوسائل المادية؟ ثم كيف يمكن انتظار الخبر بهذه الآلة لرجل يرى بعيني رأسه الهلال متهللا متبسما في الافق؟ فليس ذلك الاسفه وعجرفة او سفسطة...... نعم اذا تواردت اخبار "راديو" متعددة من شتى الجهات ولا تختلف جهات الانباء عن البلد الذى لم يرفيه الهلال يبعد يختلف فيه

المطالع فيسوغ العمل بهذه الانباء المرسلة وتدخل فى حد الاستفاضة المفيدة للطمانينة ..والله ولى التوفيق والسداد.

وفى الشامية (۲/۳۹۰): (تنبيه) قال الرحمتى معنى الاستفاضة ان تاتى من تلك البلدة جماعات متعددون كل منهم يخبر عن اهل تلك البلدة انهم صاموا عن رؤية لامجرد الشيوع من غير علم بمن اشاعه كما قد تشيع اخبار يتحدث بها سائر اهل البلدة ولا يعلم من اشاعها كماورد. قبل هذه العبارت (تحت قوله نعم الخ) فى الذخيرة قال شمس الأئمة الحلوانى: الصحيح من مذهب أصحابنا أن الخبر اذا استفاض وتحقق فيما بين اهل البلدة الاخرى يلزمهم حكم هذه البلدة اهـ.

وفى الشامية(۲/۳۹۳): (تحت قوله على ظاهر المذهب) فى خمسة اسطر وقدرالبعد الذى تختلف فيه المطالع مسيرة شهر فاكثر على مافى القهستانى عن الجواهر اعتبارا بقصة سليمان عليه السلام فانه قد انتقل كل غدو ورواح من اقليم الى اقليم وبينهما شهر اهـ.

﴿روزے کی تعریف اوراس کی اقسام﴾

(۱۱) روزے کے لغوی واصطلاحی معنی،فرضیت،فوائداورنقصانات

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل دین سے دوری کی فضا بہت پیدا ہوگئی ہے دین کی موٹی موٹی باتوں سے لوگ ناواقف ہیں۔اسی سلسلے میں ہم چند دوست مل کرایک پمفلٹ شائع کرنا چاہتے ہیں جو کہ روزے کے بارے میں تحقیقی معلومات پر مشتمل ہو۔میرے ایک دوست نے یہ معلومات آپ سے لینے کا مشورہ دیا ہے۔براہ کرم آپ مجھے یہ بتادیں کہ روزہ کے لغوی واصطلاحی معانی کیا ہیں؟ روزہ کی فرضیت کب ہوئی،روزہ رکھنے کے فوائد کیا ہیں اور نہ رکھنے کے کیا نقصانات ہیں؟تفصیل سے بیان فرماکر مشکور ہوں۔

الجواب حامداومصلیا......روزے کی فرضیت ۲ھ میں تحویل قبلہ کے بعد شعبان المعظم میں ہوئی۔روزے کے لغوی معنی ہیں: رکنا۔

اوراصطلاح میں صبح صادق سے غروب آفتاب تک روزے کی نیت سے کھانے پینے اور جماع سے رکے رہنے کا نام روزہ ہے۔

روزے کے جسمانی فوائد بھی ہیں اور روحانی فوائد بھی۔

(۱)...... روزہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے اس پراللہ کی جانب سے بے حد ثواب عطا کیا جاتا ہے۔

(۲) روزے کے ذریعے انسان اللہ کی رضامندی حاصل کرتا ہے۔

(۳)...... اور جنت کے اس دروازے سے جو صرف روزہ داروں کیلئے مخصوص ہے(جس کا نام ریان ہے) داخلے کا مستحق ہوجاتا ہے۔

(۴)...... اس کے ذریعے انسان اپنے آپ کو اللہ کے عذاب سے دور کرلیتا ہے اور سال آئندہ کیلئے کفارہ ذنوب ہے۔

(۵)...... روزے کے ذریعے انسان متقی اور پرہیزکار بن جاتا ہے جیسا کہ سورۃ بقرۃ میں اللہ پاک فرماتے ہیں: یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ.

(۶) روزہ نفس کے خلاف جہاد اور خواہشات اور شیطان کے وسوسوں کے خلاف مقابلہ ہے۔

(۷) روزے کے ذریعے انسان کے اندر صبر کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔

(۸)...... روزہ امانت اور دیانتداری سکھاتا ہے۔

(۹) اس کے ذریعے خلوت میں بھی اور جلوت میں بھی اللہ کا دھیان نصیب ہوتا ہے۔

(۱۰) روزہ ارادے کو مضبوط اور عزم کو نکھارتا ہے۔

(۱۱) روزہ ذہن کی صفائی،فکر کی تیزی،روشن آراء کے الہام میں مددگار ہوتا ہے۔

(۱۲)......روزہ نظم وضبط سکھلاتا ہے۔

(۱۳)......روزے کے ذریعے مسلمانوں کی اجتماعیت کا پتہ چلتا ہے جو مشرق ومغرب میں مشاہد ہے کہ سب ایک ہی وقت روزہ رکھتے ہیں اور ایک ہی وقت افطار کرتے ہیں۔

(۱۴)...... روزہ انسان کے اندر رحمت، اخوۃ کا مادہ پیدا کرتا ہے۔

(۱۵)......روزہ رکھنے میں فقراء کی موافقت ہے۔

(۱۶)......اس کے ذریعے آدمی کو فقراء کے حال واحوال کا پتہ چلتا ہے اور پھر انسان ان کے ساتھ رحم کا معاملہ کرتا ہے اور ان کو کھلاتا پلاتا ہے۔

(۱۷)...... روزہ شہوات نفسانیہ کو توڑتا ہے جو تمام معاصی کی جڑ اور بنیاد ہیں۔اس کے علاوہ بھی روزے کے متعدد فوائد ہیں۔

اور روزے کے نقصانات میں سے سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ بغیر عذر شرعی روزہ نہ رکھنے کی وجہ سے انسان اللہ کی نافرمانی کا مرتکب ہوتا ہے روزہ نہ رکھنے سے انسان تقویٰ، شکر جیسی عظیم نعمتوں سے محروم ہوجاتا ہے۔

(۱)......روزہ نہ رکھنے سے انسان اللہ تبارک وتعالیٰ کے غضب کا مستحق بن جاتا ہے۔

(۲)......روزہ نہ رکھنے سے انسان صبر وہمت سے محروم ہوجاتا ہے۔

(۳) روزہ نہ رکھنے سے انسان کے اندر رحمت اور اخوت کا مادہ پیدا نہیں ہوتا جو انسان کیلئے بے حد ضروری ہے۔

(۴) روزہ نہ رکھ کر انسان مسلمانوں کی اجتماعیت کو توڑتا ہے۔

(۵)......روزہ نہ رکھنے سے انسان شیطان اور نفس کے حملوں سے غیر محفوظ ہوجاتا ہے۔

(۶) ......روزہ نہ رکھ کر انسان رمضان المبارک کے احترام کو پامال کرتا ہے جو عبدیت اور بندگی کے خلاف ہے۔

(۷)......روزہ نہ رکھنے سے انسان کو اللہ پاک کا دھیان نہیں رہتا۔

(۸)...... روزہ نہ رکھنے سے انسان محتاج، فقراء اور حاجتمندوں کے احوال سے بے خبر رہتا ہے۔

اس کے علاوہ بھی روزے نہ رکھنے کے متعدد نقصانات ہیں اللہ سے دعا ہے کہ ہمیں سنت کے مطابق روزہ رکھنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وفي مرقاة المفاتيح(۳۸۵/۴): ثم كانت فرضية صوم رمضان بعد ما صرفت القبلة الى الكعبة بشهر في شعبان على رأس ثمانية عشر شهراً من الهجرة كذا ذكره الشمني وقيل: لم يفرض قبله صوم وقيل كان ثم نسخ فقيل عاشوراء وقيل الأيام البيض قال ابن حجر وصح انه لما فرض استكروه وشق عليهم فخيروا بين الصوم واطعام مسكين عن كل يوم كما في اول الآية ثم نسخ بما في آخرها (فمن شهد منكم الشهر فليصمه)(البقرة:۱۸۵) ولما فرض كان يباح بعد الغروب

تعاطى المفطر مالم يحصل نوم أو يدخل وقت العشاء والاحرم ثم نسخ ذالک وابيح تعاطيه الي طلوع الفجر.

وفي البحر الرائق(۲/۲۵۹): ومحاسنه كثيرة منها شكر النعمة التي هي المفطرات الثلاثة لان بضدها تتبين الاشياء ومنها انه وسيلة الى التقوى لانها اذا انقادت الى الامتناع عن الحلال طمعاً في مرضاته تعالىٰ فالاولیٰ ان تنقاد للامتناع عن الحرام واليه الاشارة بقوله تعالىٰ لعلكم تتقون ومنها كسر الشهوة الداعية الى المعاصي ومنها الاتصاف بصفة الملائكة الروحانية ومنها علمه بحال الفقراء ليرحمهم فيطعمهم ومنها موافقته لهم......الصوم في الشرع الامساک عن المفطرات الثلاث حقيقةً اوحكماً في وقت مخصوص من شخص مخصوص مع النية.

وفي الهندية(۱/۱۹۴): أما تفسيره فهو عبارة عن ترک الأكل والشرب والجماع من الصبح الى غروب الشمس بنية التقرب من الاهل. كذا في الكافي

وفي الدر المختار(۲/۳۷۱): (هو) لغة(امساک عن المفطرات) الآتية (حقيقة أوحكماً) كمن أكل ناسياً فانه ممسک حكماً(في وقت مخصوص) وهو اليوم (من شخص مخصوص) مسلم كائن في دارنا او عالم بالوجوب طاهر عن حيض أو نفاس(مع النية) المعهودة.

وفي الفقه الاسلامي(۳/۱۶۲۹): وفرض صوم رمضان بعد صرف القبلة الى الكعبة لعشر من شعبان في السنة الثانية من الهجرة بسنة ونصف اجماعاً، وصام النبي ﷺ تسعة رمضانات في تسع سنين وتوفي النبي ﷺ في شهر ربيع الاول سنة احدى عشرة من الهجرة.

(۱۲) روزے کی اقسام اوران کا شرعی حکم

سوال ....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں روزے کے موضوع پرایک مضمون لکھ رہا تھا۔ مجھے روزے کی تمام اقسام کا صحیح نہیں پتا چل رہا۔ اس لئے آپ کو زحمت دے رہا ہوں، براہِ کرم آپ ذرا تفصیل سے مجھے یہ بتادیں کہ آیا روزے کی کتنی اقسام ہیں۔ اوران کا شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......روزہ کی آٹھ قسمیں ہیں۔ ہرایک کی تفصیل درج ذیل ہے:

فرض روزہ......اس کی دوقسمیں ہیں: معین، غیرمعین۔

۱۔معین ....وہ روزہ جس کیلئے وقت مخصوص ہے جیسے رمضان المبارک کا روزہ رکھنا۔

۲۔غیرمعین......اس روزہ کو کہتے ہیں جس کیلئے وقت مخصوص اور متعین نہیں ہے جیسے رمضان کی قضاء کا روزہ اور کفارات کا روزہ۔

یہ دونوں قسمیں فرض روزہ کی ہیں لیکن ان دونوں میں تھوڑا سا فرق ہے معین یعنی رمضان کی روزہ کی فرضیت عملاً اور علماً قطعی دلائل سے ثابت ہے چنانچہ اس کے انکار کرنے والے کو کافر کہا جائے گا جبکہ فرض کی دوسری قسم (غیر معین) اس کی فرضیت عملاً تو قطعی دلائل سے ثابت ہے لیکن علماً قطعی ثبوت نہیں اس لئے اس کے منکر کو کافر نہیں کہیں گے۔

واجب......اس کی بھی دو قسمیں ہیں: معین، غیر معین۔

۱۔معین...... اس روزہ کو کہیں گے جس میں آدمی خود کسی وقت کو روزہ کیلئے خاص کر دے جیسے کوئی آدمی یہ کہے کہ اگر میرا فلاں کام ہو گیا تو میں جمعرات کے دن روزہ رکھوں گا۔

۲۔غیر معین ......وہ روزہ جس میں آدمی اپنے اوپر روزہ کو متعین کرے لیکن دن کو خاص نہ کرے جیسے اگر کوئی آدمی یہ کہے کہ اگر میں امتحان میں کامیاب ہو گیا تو ایک دن کا روزہ رکھوں گا۔اسی طرح اگر کوئی شخص نفل روزہ کو شروع کرنے کے بعد توڑ دے تو بعد میں غیر معین دن میں اس کی قضاء واجب ہو جائے گی۔

پانچویں قسم نفل روزہ ہے اور وہ یوم عاشورہ، یعنی ۹،۱۰محرم الحرام، یا۱۰،۱۱محرم الحرام کے دنوں کے روزے رکھنا ہیں۔

مندوب......وہ یہ ہے کہ ایک دن روزہ رکھنا اور ایک دن انطار کرنا۔جن کو صوم داؤدی کہا جاتا ہے کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام کی عادت شریفہ ایک دن روزہ رکھنے اور ایک دن افطار کرنے کی تھی۔

اسی طرح ایام بیض یعنی چاند کی، تیرہ، چودہ، پندرہ تاریخوں میں تین روزے رکھنا جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص بھی روزے رکھنا چاہتا ہے پس چاہئے کہ ان تین ایام (تیرہ، چودہ، پندرہ) میں روزے رکھے۔

اور شوال کے چھ روزے رکھنا بھی مندوب ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے رمضان کے روزے رکھے اس کے بعد شوال کے روزے رکھے گویا اس نے سارا سال روزے رکھے اور حجاج کرام کے علاوہ دوسرے لوگوں کیلئے ۹/ذی الحجہ کا روزہ.........

ساتویں قسم مکروہ تحریمی ہے۔اور وہ عید الفطر، عید الاضحیٰ اور ایام تشریق میں روزہ رکھنا ہے۔کیونکہ آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ ایام کھانے پینے اور جماع (بیوی سے ہمبستری) کے دن ہیں اس لئے ان دنوں میں روزہ رکھنا مکروہ تحریمی ہے۔

آٹھویں قسم مکروہ تنزیہی ہے کہ آدمی فقط ۱۰/محرم الحرام کا روزہ رکھے یا صرف ہفتہ کے دن ہی روزہ رکھے۔ان مخصوص دنوں میں روزہ رکھنا مکروہ ہے یہود سے مشابہت کی وجہ سے۔اگر کسی شخص کی ہر مہینے میں روزہ رکھنے کی عادت ہے اور ان ایام میں روزہ رکھتا ہے تو مکروہ نہ ہوگا کیونکہ اس صورت میں تشبہ بالیہود باقی نہ رہے گا۔اسی طرح یوم شک یعنی شعبان کی تیس تاریخ میں شک ہو جائے کہ آج شعبان کی تیس تاریخ ہے یا رمضان المبارک کی یکم تاریخ تو اس دن میں روزہ رکھنا مکروہ ہوگا۔

اور اسی طرح مریض، مسافر، حاملہ، مرضعہ اور شیخ کبیر کیلئے بھی روزہ رکھنا مکروہ ہوگا جب ان کو مشقت شدیدہ کا خوف ہو۔اسی طرح عورت کا اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر نفلی روزہ رکھنا بھی مکروہ ہے۔

لما فی نصب الراية تخريج احاديث الهداية (۲/۵۱۱): عن ابن عباس رضی الله عنه أن رسول الله

ﷺ أرسل أيام منى صائحاً يصيح: أن لا تصوموا هذه الأيام، فانها أيام اكل وشرب وبعال، والبعال: وقاع النساء.

وفي الدرالمختار (۳۷۳/۲، ۳۷۴، ۳۷۵): (وهو) اقسام ثمانيه: (فرض) وهو نوعان: معين (كصوم رمضان اداء و) غير معين كصومه (قضاء و) صوم (الكفارات) لكنه فرض عملا لا اعتقادا ولذا لايكفر جاحده .... (وواجب) وهو نوعان: معين (كالنذر المعين،و) غير معين كالنذر (المطلق) ...... (ونفل كغيرهما) يعم السنة كصوم عاشوراء مع التاسع والمندوب كايام البيض من كل شهر وعرفة ولو لحاج لم يضعفه، والمكروه تحريما كالعيدين وتنزيها كعاشوراء وحده وسبت وحده.

وفي الفقه الاسلامي وادلته(۱۶۳۰/۳): الصوم انواع واجب، وتطوع، وحرام، ومكروه: وقال الحنفية: الصوم ثمانية انواع فرض معين كصوم رمضان اداء، وغير معين كقضاء رمضان، وصوم الكفارات وواجب معين كنذر معين، وغير معين كالنذر المطلق، ونفل مسنون كصوم عاشوراء وتاسوعاء ونفل مندوب او مستحب كايام البيض من كل شهر ومكروه تحريما كصوم العيدين ومكروه تنزيها كعاشوراء وحده وسبت وحده ونيروز ومهرجان.

(۱۳) چاند کی تیرہویں، چودہویں اور پندرہویں کو روزے رکھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک دوست ہے جو ہر مہینے تیرہ، چودہ، پندرہ تاریخ کو روزہ رکھتا ہے میں نے پوچھا تو کہنے لگا یہ بھی مسنون ہیں تو کیا یہ روزے مسنون ہیں؟ اگر مسنون ہیں تو کس وجہ سے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ روزے کیوں رکھتے تھے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......ہر قمری مہینہ کی تیرہ، چودہ اور پندرہ تاریخ کو روزہ رکھنا مستحب ہے اور مطلق ہر مہینہ میں تین روزے رکھنا الگ مستحب ہے تو جو شخص ان تین روزوں کو قمری مہینہ کی تیرہویں، چودہویں اور پندرھویں تاریخ کو، دونوں مستحبات کی بیک وقت ادائیگی کی نیت سے رکھتا ہے تو اس کو دو مستحبات کا ثواب ملے گا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان روزوں کو اس وجہ سے رکھتے تھے کہ جو شخص ان کی پابندی کرتا ہے تو گویا وہ پوری زندگی کے روزہ رکھتا ہے کیونکہ ایک نیکی دس کے برابر ہے، مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرَةُ أَمْثَالِهَا. (جو کوئی لاتا ہے ایک نیکی تو اس کے لئے اس کا دس گنا ہے)

لمافي الدرالمختار (۳۷۵/۲): والمندوب كايام البيض من كل شهر.

وفي الشامية تحته:(قوله كأيام البيض)أى أيام الليالي البيض وهي: الثالث عشر والرابع عشر والخامس عشر سميت بذالك لتكامل ضوء الهلال وشدة البياض فيها امداد، وفيه تبعا للفتح

وغیرہ المندوب صوم ثلاثة من کل شهر ویندب کونها البیض.

(۱۴) ایام منہیہ میں روزہ رکھنے پر ثواب نہیں ہے

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک طالب علم نے مجھ سے ایک سوال کیا تھا مجھے پتا نہیں چل رہا کہ کیا جواب دوں اس لئے آپ کی خدمت طلب کررہا ہوں، پچھلی دفعہ بھی ایک سوال کرنے پر آپ نے بڑا اچھا اور تحقیقی جواب دیا تھا، دل بڑا خوش ہوا تھا اور آپ کیلئے اور آپ کے ادارے کیلئے خوب دعائیں کیں تھیں، بہرکیف سوال یہ تھا کہ بعض فقہی کتابوں میں روزے کے حکم کے بارے میں لکھا ہے کہ" حکمه نیل الثواب ولو منهیاً عنه "اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی حرام روزہ رکھتا ہے تو بھی اسے ثواب ملے گا، حالانکہ حرام کام پر تو گناہ ملنا چاہیے۔ براہ کرم مدلل ومفصل جواب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیا......اگر کسی چیز کی اصل اور عین میں کراہت تحریمی پائی جائے تو اس پر ثواب نہیں ملتا بلکہ اس کے برعکس اس کا ارتکاب کرنے والا عقاب اور سزا کا مستحق ہوتا ہے اور اگر کوئی چیز اپنی ذات اور اصل کے اعتبار سے تو مشروع ہو مگر کسی امر خارج کی بناء پر اس میں کراہت آرہی ہو (جس کو نہی لغیرہ مجاور یا قبیح لغیرہ کہا جاتا ہے) تو اس میں بھی ثواب نہیں ملتا بعض فقہاء مثلاً صاحب مراقی الفلاح اور صاحب الدرالمختار یہ حضرات اس دوسری صورت میں ثواب کے قائل ہیں مگر محققین فقہاء جن میں علامہ ابن الھمام، علامہ ابن نجیم، علامہ شامی، محشی تلویح علامہ حسن چلپی فناری علیہم الرحمۃ وغیرہ نے رد کیا ہے اور فرمایا ہے اس میں ثواب نہیں ہے کیونکہ کراہت تحریمی کی بناء پر اس میں معصیت آرہی ہے ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ وہ چیز کراہت کے ساتھ ادا ہو جائے گی یعنی ادائیگی صحیح ہے بایں معنی کہ اس کے ذمہ قضاء نہیں ہوگی وہ بری الذمہ ہوگا مگر ثواب نہیں ملے گا پس صورت مسئولہ میں ایام منہیہ کے روزوں کا تعلق بھی اسی دوسری صورت کے ساتھ ہے اگر کوئی شخص ان ایام میں روزہ رکھ لیتا ہے تو اسکی ادائیگی کراہت کے ساتھ صحیح ہوگی مگر ثواب نہیں ملے گا۔

لما فی البحر الرائق(۲/۴۴۹): وحکمه سقوط الواجب ونیل ثوابه إن کان صوما لازما والا فالثانی کذا فی فتح القدیر وفیه بحث لأن صوم الأیام المنهیة لاثواب فیه فالأولیٰ ان یقال: والافالثانی إن لم یکن منهیا عنه والا فالصحة فقط.

وفی التلویح مع التوشیح(۱/۴۵۰): وحاصل الکلام انه ان ارید بالصحة امکان المعنی الذی یسمی فی الشرع بالصوم والصلوة والبیع ونحو ذلک فلا نزاع فیه وانما النزاع فی الصحة بمعنی استحقاق الثواب وسقوط القضاء وموافقة امر الشارع وترتب الآثار علیه کالملک ولا دلالة لشئ مما ذکرتم علی ان النهی یقتضی ان یکون المنهی عنه بهذه الصفة، وفی التوشیح (صـ۴۵۱) حاصل الکلام انه الخ ای حاصل کلام الخصم الترديد بانکم ان اردتم بالصحة المعنی الاول فلا نزاع فیه وان اردتم المعنی الثانی اعنی استحقاق الثواب وسقوط القضاء الخ فما ذکر یدل علیه وانت خبیر

بانه لاطائل تحت هذا الحاصل لانا نختار الشق الثاني سوى استحقاق الثواب فان الصحة لا تقتضيه كما في الوضوء بلانية فانه صحيح بلا ثواب وكالصلوة بالرياء فانها صحيحة مع عدم الثواب فيه.

وفي الشامية (۲/۳۷۲): قلت: صرح في التلويح بان الخلاف بيننا وبين الشافعي في ان النهي يقتضي الصحة عندنا بمعنى استحقاق الثواب وسقوط القضاء وموافقة امر الشارع ثم نقل عن الطريقة المعينة ما حاصله ان الصوم في هذه الايام ترك للمفطرات الثلاث واعراض عن الضيافة فمن حيث الاول يكون عبادة مستحسنة ومن حيث الثاني يكون منهيا لكن الاول بمنزلة الاصل و الثاني بمنزلة التابع فبقي مشروعاً باصله غير مشروع بوصفه اهـ لكن بحث محشيه الفنري في ارادة استحقاق الثواب بل المرادما سواها والصحة لا تقتضي الثواب كالوضوء بلانية والصلوة مع الرياء اهـ.

(۱۵) عاشوراء کے دن روزہ رکھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ پچھلے ہفتہ کو ہمارے خطیب صاحب نے بیان فرمایا کہ رمضان سے پہلے عاشوراء کا روزہ رکھا جاتا تھا۔ پھر جب رمضان کے روزے فرض ہوگئے تو عاشوراء کی فرضیت ختم ہوگئی۔ حالانکہ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ عاشوراء کا روزہ نفل تھا؟ براہ کرم آپ صحیح بات کی طرف ہماری راہنمائی فرمادیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً: عاشوراء کا روزہ رمضان سے پہلے بعض حضرات کے نزدیک واجب تھا پھر منسوخ ہوگیا اور بعض حضرات کے نزدیک شروع ہی سے مستحب تھا لیکن رمضان کے روزے فرض ہونے کے بعد یہ روزہ رکھنا مستحب ہے۔ البتہ یوم عاشوراء سے پہلے یا بعد میں ایک روزہ رکھنا چاہئے تاکہ اہل کتاب کے ساتھ مشابہت لازم نہ آئے۔

لمافي البناية(۳/۲۵۱،۲۵۲): وفي حديث مشهور عن النبي ﷺ انه قال في يوم عاشوراء الامن اكل فلا يأكل بقية يومه ومن لم يأكل فليصم امرهم بالصوم من النهار فثبت انه جائز...... عن معاوية سمعت رسول الله ﷺ يقول هذا يوم عاشورا لم يفرض علينا صيامه فمن شاء منكم ان يصوم فليصم فاني صائم فصام الناس قال وبدليل انه لم يأمر من أكل بالقضاء قلت معنى حديث معاوية ليس مكتوبا عليكم الآن أو لم يكتب عليكم بعد أن فرض رمضان...... الخ.

وفي الدر المختار(۲/۳۷۴،۳۷۵): (ونفل كغيرهما) يعم السنة كصوم عاشوراء مع التاسع......

وفي الشامية تحته: وهي قسمان سنة الهدى ......وسنة الزوائد...... والظاهر أن صوم يوم عاشوراء من القسم الثاني ...... ويستحب أن يصوم يوم عاشوراء بصوم يوم قبله أو يوم بعده ليكون مخالفا لاهل الكتاب ...... الخ.

(۱۶) اکیلے صوم عاشورہ رکھنا اور اس کے ساتھ روزہ نہ رکھنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اس عاشورا کو میں نے روزہ رکھا اور نیت یہ تھی کہ ایک روزہ اگلے دن رکھوں گا، لیکن اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ رات کو میری بیوی کی طبیعت بگڑ گئی اور اس چکر میں، میں صبح روزہ نہ رکھ سکا، ہمارے پڑوس میں ایک صاحب رہتے ہیں وہ کہہ رہے تھے اب آپ کا عاشورا کا روزہ مکروہ ہو گیا، اس لئے کہ اگر عاشورا کا روزہ تنہا رکھا جائے تو یہ مکروہ ہے، اب آپ سے پوچھنا یہ ہے کہ آیا واقعی عاشورا کا روزہ اکیلے رکھنا مکروہ ہے۔ اور کیا اس کے ساتھ روزہ رکھنا لازم ہے۔ آیا میرے لئے اس حالت میں بھی اس کے ساتھ روزہ ملانا ضروری تھا؟

الجواب حامداً ومصلیاً ...... صوم یوم عاشورا کے ساتھ ایک روزہ ملانا مستحب ہے تا کہ اہل کتاب کی مشابہت لازم نہ آئے اگر کسی نے عذر کی بناء پر صرف عاشورہ کے دن کا روزہ رکھا تو بھی بغیر کراہت کے جائز ہوگا۔ لہٰذا صورت مسئول میں آپ کا صرف عاشورہ کے دن کا روزہ بھی بغیر کراہت کے درست اور صحیح ہوا۔

الدر المختار مع الشامية(۲/۳۷۴): (ونفل كغيرهما) يعم السنة كصوم عاشوراء مع التاسع.

وفي الشامية تحته: وان السنة ما واظب عليها النبي ﷺ او خلفاؤه من بعده وهي قسمان سنة الهدى وتركها يوجب الاساءة والكراهة كالجماعة والاذان. وسنة الزوائد كسير النبي ﷺ في لباسه وقيامه وقعوده ولا يوجب تركها كراهة والظاهر ان صوم عاشوراء من القسم الثاني بل سماه في الخانية مستحبا.

وفي الدر المختار(۲/۳۷۵): والمكروه...... وتنزيها كعاشوراء وحده.

وفي الشامية (۲/۳۷۶): وافاد قوله وحده انه لو صام معه يوما آخر فلا كراهة لان الكراهة في تخصيصه بالصوم للتشبه وهل اذا صام السبت مع الاحد تزول الكراهة الى قوله وكذا لو صام مع عاشوراء يوما قبله او بعده مع ان اليهود تعظمه.

(۱۷) جمعہ کے دن اور نصف شعبان کے بعد روزہ رکھنے کا حکم

سوال ... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک دن اپنے آفس سے گھر واپس آ رہا تھا بس میں ایک صاحب نے ایک کتابچہ مجھے دیا وہ روزوں سے متعلق تھا اس میں کچھ باتیں ایسی تھیں جو کہ میری سمجھ میں نہیں آئیں، اب میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں ایک تو یہ بتائیں کہ جمعہ کے دن روزہ رکھنا کیسا ہے اور اس میں ایک بات یہ بھی تھی کہ ۱۵/ شعبان کے بعد روزہ رکھنا منع ہے حالانکہ میں نے اپنے محلے کے امام صاحب سے یہ سنا تھا کہ صرف ۵ دن روزے رکھنا منع ہے اور اس کے ساتھ ۱۵/ شعبان کے

روزے کی کیا حیثیت ہے آیا درست ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صرف جمعہ کے دن روزہ رکھنا بھی مستحب ہے۔ باقی پندرہویں شعبان کے بعد روزہ رکھنے کی بعض احادیث میں ممانعت آئی ہے لیکن یہ ممانعت ان کے حرام ہونے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس وجہ سے ہے تاکہ رمضان المبارک کے فرض روزے رکھنے میں آسانی ہو اور بدن کو تقویت حاصل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جس شخص کی عام عادت ہر ماہ درمیان و آخیر میں روزہ رکھنے کی ہو، اس کیلئے ماہ شعبان کے آخیر میں بھی روزہ رکھنے کی گنجائش ہے۔ ہاں عوام کو صرف یوم الشک کا روزہ نہیں رکھنا چاہئے. نیز بعض ضعیف احادیث سے پندرہویں شعبان کے روزہ کا استحباب معلوم ہوتا ہے۔

لما في الترمذی (۱/۱۵۵): عن ابی هريرة رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ اذا بقی نصف من شعبان فلا تصوموا.

وفی تحفة الاحوذی (۲/۵۱): قال القاری فی المرقاة والنهی للتنزيه رحمة علی الامة ان يضعفوا عن حق القيام بصيام رمضان علی وجه النشاط.

وفی مشكوة المصابيح (صـ۱۱۵): عن علی رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ "اذا كانت ليلة النصف من شعبان فقوموا ليلها وصوموا يومها......الخ.

وفی الشامية (۲/۳۷۵): (قوله ويوم الجمعة ولو منفردا) صرح به فی النهر وكذا فی البحر فقال ان صومه بانفراده مستحب عندالعامة كالاثنين والخميس.

(۱۸) پندرھویں شعبان کے روزے کی شرعی حیثیت اور اس سے متعلق حدیث کی تحقیق

سوال ...کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(۱)۔ شب برأت کی فضیلت کے منکر کا کیا حکم ہے؟

(۲)۔ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب آدھے شعبان (پندرہویں شعبان) کی رات ہو تو اس رات کو شب بیداری کرو اور اس کے دن میں روزہ رکھو الخ۔ (ابن ماجہ شریف، صفحہ۹۹)

محدثین کرامؒ نے اس روایت پر کلام کیا ہے حضرت علامہ حافظ ابن حجرؒ نے بھی التقریب صفحہ ۲۹۶ میں اس حدیث شریف کے ضعف کو بتاتے ہوئے فرمایا کہ اس کی سند میں ایک راوی ابن ابی سبرہ ہے۔ ان کے نام میں اختلاف ہے اور ان پر وضع حدیث کا الزام لگایا گیا ہے، اس حدیث شریف کے ضعف کی بنا پر سنیت کا اعتقاد رکھے بغیر نفل وتطوع کی نیت سے پندرہویں شعبان کا روزہ رکھنا کیسا ہے؟

(۳)۔ اس رات میں مساجد میں شب برأت کے متعلق بیانات کا پروگرام رکھا جاتا ہے۔ ان میں شب برأت کے فضائل ومسائل بتائے جاتے ہیں، لوگ ذوق وشوق سے سنتے ہیں۔ بعض جگہوں میں رواج جیسا ہوگیا ہے، اور مساجد کے متولی حضرات، کمیٹی حضرات ائمہ مساجد

اور علماء واعظین کو اس رات میں بیان کرنے کیلئے مجبور کرتے ہیں اور اکثر مساجد میں مشہور واعظین کو خصوصی دعوت دے کر بلائے جاتے ہیں لہٰذا اس رات میں شب برأت کے فضائل ومسائل بتانے کیلئے مساجد میں بیانات کا نظم ونظام کرنا کیسا ہے؟ اسی طرح رمضان المبارک میں بعد نمازِ ظہر مساجد میں بیانات کا نظم ونظام کرنا کیسا ہے؟ براہِ کرم مکمل ومدلل جوابات عنایت فرما کر صحیح راستہ کی طرف رہبری فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......(۱)۔ جمہور علماء کرام شب برأت کی فضیلت کے قائل ہیں کئی احادیث اس رات کی فضیلت کے بارے میں مروی ہیں نیز جو حضرات اس رات کی فضیلت کا انکار کرتے ہیں وہ اس تاویل کی بناپر کرتے ہیں کہ اس رات کی فضیلت کے بارے میں جتنی روایات ہیں وہ سب ضعیف ہیں لہٰذا ان حضرات کے بارے میں کوئی حکم لگانا صحیح نہیں ہے۔

(۲)۔ پورے ذخیرۂ احادیث میں پندرہویں شعبان کے روزے کے بارے میں صرف سنن ابن ماجہ کی ایک روایت ہے اور وہ بھی راوی ابن ابی سبرہ کی وجہ سے ضعیف ہے نیز فقہائے کرام نے جہاں مستحب روزوں کا ذکر کیا ہے وہاں محرم کی دس تاریخ اور یوم عرفہ کے روزوں کا ذکر تو ہے لیکن پندرہ شعبان کے روزے کا ذکر نہیں ہے لہٰذا پندرہ شعبان کے روزے کو سنت یا مستحب قرار دینا درست نہیں۔

البتہ شعبان کے مہینے میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کثرت سے روزے رکھنا صحیح احادیث سے ثابت ہے اسی طرح ہر ماہ کے ایام بیض (۱۳،۱۴،۱۵) کے روزے رکھنے کی فضیلت بھی احادیث سے ثابت ہے لہٰذا اگر کوئی شخص ان دو وجوں سے ۱۵ شعبان کا روزہ رکھ لے تو انشاءاللہ موجب اجر ہوگا۔

(۳)۔ تمام مبارک راتوں میں انفرادی طور پر گھروں میں نوافل ذکر وتلاوت وغیرہ کا اہتمام کیا جائے ان مبارک راتوں میں مسجد یا کسی اور جگہ جمع ہو کر عبادت کرنا اسے فقہاء کرام نے مکروہ قرار دیا ہے لہٰذا ان مبارک راتوں میں بیانات وغیرہ کا نظم قائم کرنا صحیح نہیں ہے البتہ بغیر اہتمام کئے اتفاقاً مسجد میں لوگ جمع ہوں اور انہیں اس رات کی فضیلت کے بارے میں بتایا جائے تو کوئی حرج نہیں۔

رمضان المبارک کے مہینے میں لوگوں میں دین کی باتیں سننے کا شوق ہوتا ہے لہٰذا رمضان المبارک میں لوگوں کی سہولت کے مطابق کسی وقت بھی بیانات وغیرہ کا نظم مقرر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

لما فی ترمذی(ص۱۵۶): حدثنا احمد بن منیع نایزید بن ھارون نا الحجاج بن ارطاۃ عن یحی بن ابی کثیر عن عروۃ عن عائشۃ قالت فقدت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیلۃ فخرجت فاذا ھو بالبقیع فقال اکنت تخافین ان یحیف اللہ علیک ورسولہ قلت یا رسول اللہ ظننت انک اتیت بعض نسائک فقال ان اللہ تبارک وتعالیٰ ینزل لیلۃ النصف من شعبان الی سماء الدنیا فیغفر لاکثر من عدد شعر غنم کلب.

وفی سنن ابن ماجہ(ص۹۹): حدثنا الحسن بن علی الخلال نا عبدالرزاق انبأ ابن ابی سبرۃ عن ابراھیم بن محمد عن معٰویۃ بن عبداللہ بن جعفر عن ابیہ عن علی بن ابی طالب قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا کانت لیلۃ النصف من شعبان فقوموا لیلھا وصوموا نھارھا فان اللہ ینزل فیھا

لغروب الشمس الی سماء الدنیا فیقول الامن مستغفرلی فاغفرله الا مسترزق فارزقه الا مبتلی فاعافیه الا کذا الا کذا حتی یطلع الفجر.

وفی تهذیب التهذیب(٢/٣٠٣): وقال صالح بن احمد عن ابیه: ابوبکر بن ابی سبرة یضع الحدیث. وکان ابن ابی جریج یروی عنه، وقال عبدالله بن احمد عن ابیه: لیس بشیٔ کان یضع الحدیث ویکذب ... وقال ابن مدینی کان ضعیفا فی الحدیث.

وفی نور الایضاح (ص٩٥): وندبَ احیاءُ لیالی العشر الاخیر من رمضان ولیلتی العیدین ولیالی عشر ذالحجة ولیلة النصف من شعبان ویکره الاجتماع علی احیاء لیلة من هذه اللیالی فی المساجد.

وفی الهندیة (١/١١٣): الافضل فی السنن والنوافل المنزل لقوله علیه السلام صلوة الرجل فی المنزل أفضل الا لمکتوبة

وفیه (١/٢٠١): ویستحب صوم ایام البیض الثالث عشر والرابع عشر والخامس عشر کذا فی فتاویٰ قاضیخان.

(١/٢٠٢): ......المرغوبات من الصیام انواع) او لها صوم المحرم والثانی صوم رجب والثالث صوم شعبان وصوم عاشورا وهو الیوم العاشر من المحرم عند عامة العلماء والصحابة رضی الله تعالی عنهم کذا فی الظهیریه

وفی الدرالمختار (٢/٢٦): ویکره الاجتماع علی احیاء لیلة من هذه اللیالی فی المساجد.

وفی فیض الباری (١/١٧٠): "باب من جعل لاهل العلم ایاماً معلومة" یرید أن مثل هذه التعینات لا تعدبدعة......

(١٩) رمضان المبارک سے قبل چھ روزوں کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماءِ کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں لوگ رمضان المبارک سے پہلے چھ روزے رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک روزے کا اتنا ثواب ہے جیسا کہ پورا سال روزے رکھنے کا تو کیا ان لوگوں کی بات صحیح ہے اور ان روزوں کا ثبوت ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً احادیث میں نصف شعبان کے بعد روزہ رکھنے سے ممانعت آئی ہے تاکہ رمضان المبارک کے فرض روزے رکھنے میں آسانی ہو، اور بدن کو تقویت حاصل ہو۔ ہاں اگر ایسا شخص جس کی عام عادت ہر ماہ درمیان و آخیر میں روزہ رکھنے کی ہو اس کیلئے

ماہ شعبان میں روزہ رکھنے کی گنجائش ہے۔ تاہم آپ کے علاقے میں رمضان المبارک سے قبل جو چھ روزے رکھے جاتے ہیں اور ہر ایک روزے کا ثواب پورے سال روزہ رکھنے کے ثواب کے برابر بتایا جاتا ہے، یہ درست نہیں اور اس کا اعتقاد رکھنا بدعت ہوگا۔ لہٰذا رمضان سے قبل مذکورہ نیت سے یہ چھ روزے رکھنے سے اجتناب کیا جائے۔

لما في الترمذی(۱/۱۵۵): عن ابی هريرة رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ اذا بقی نصف من شعبان فلا تصوموا.

وفي الاعتصام(۱/۲۲): البدعة طريقة في الدين مخترعة تضاهي الشرعية يقصد بالسلوك عليها مايقصد بالطريقة الشرعية.

وفي الشامية(۲/۳۸۲): قوله لحديث الخ)...... انه قال لا تقدموا رمضان بصوم يوم او يومين الارجل كان يصوم صوما فليصمه) والمراد به غير التطوع حتى لايزاد على صوم رمضان كما زاد أهل الكتاب على صومهم توفيقا بينه وبين ما اخرجه الشيخان.

(۲۰) عیدین کے دن روزہ رکھنا مکروہ تحریمی اور واجب الترک ہے

سوال ..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص تیس رمضان سمجھ کر روزہ رکھ لے اور دس بجے کے قریب اس کو معلوم ہو جائے کہ عید کا دن ہے تو اب اس کو کیا کرنا چاہئے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عیدین کے دن روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے اس لئے یہ روزہ رکھنا مکروہ تحریمی اور واجب الترک ہے لہٰذا صورت مسئولہ میں روزہ دار پر روزہ توڑنا واجب ہے اسی وجہ سے بعد میں اس پر قضاء بھی لازم نہ ہوگی۔

وفي الدرالمختار(۲/۴۲۸): (ولزم نفل شرع فيه قصدا)..... (اداء وقضاء) اى يجب اتمامه فان فسد ولو بعروض حيض في الأصح وجب القضاء (الافي العيدين وايام التشريق) فلا يلزم لصيرورته صائما بنفس الشروع فيصير مرتكبا للنهى أما بالصلاة فلا يكون مصليا مالم يسجد بدليل مسئلة اليمين، وفي رد المحتار(قوله فلا يلزم) اى لا اداء ولا قضاء اذا افسده.

(۲۱) شوال کے چھ روزے رکھنے کا ثبوت

سوال ..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ عید کے بعد چھ روزے رکھتے ہیں اور ان کے بڑے فضائل بتاتے ہیں تو ان روزوں کا ثبوت کہاں سے ہے، آیا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ روزے رکھے تھے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... عید الفطر کے بعد شوال کے چھ روزے رکھنا احادیث سے ثابت ہے اور احادیث میں ان کی بڑی فضیلت وارد

ہوئی ہے، البتہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ روزے رکھے ہیں یا نہیں، اس بارے میں تتبع وتلاش کے باوجود صراحت نہیں ملی۔

لما في صحيح مسلم(صـ ۳۶۹): عن ابی ایوب الانصاری انه حدثه ان رسول الله ﷺ قال من صام رمضان ثم اتبعهٗ ستاً من شوال كان كصيام الدهر.

وفي الشامية(۴۳۵/۲): إن صوم الستة بعد الفطر متتابعة منهم من كرهه والمختار انه لابأس به لان الكراهة انما كانت لانه لايؤمن من أن يعد ذلك من رمضان فيكون تشبها بالنصارى والآن زال ذلك المعنى اهـ..... وفي الغاية عن الحسن ابن زياد انه كان لايرى بصومها باسا ويقول كفى بيوم الفطر مفرقا بينهن وبين رمضان اهـ وفيها ايضا عامة المتاخرين لم يروا به بأسا.

(۲۲) مسافر کو ماہِ رمضان میں دوسرے واجب روزے کی اجازت ہونے اور مریض کو نہ ہونے کی وجہ

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کافی عرصے پہلے کی بات ہے ایک مولوی صاحب جو کہ ہماری مسجد کے امام بھی تھے، میری ان کے ساتھ کافی اچھی گپ شپ تھی، ایک دفعہ روزے کا ایک مسئلہ انہوں نے مجھے یہ بتایا کہ اگر کوئی مسافر رمضان میں رمضان کا روزہ چھوڑنا چاہے تو درست ہے اور پھر بجائے رمضان میں افطار کرنے کے رمضان کے اس دن میں نفل روزے کی نیت بھی کرسکتا ہے، البتہ مریض اس طرح نہیں کرسکتا کہ رمضان کا روزہ تو مرض کی وجہ سے چھوڑ دیا اور نفلی روزہ اس دن رکھ لیا۔ یہ مسئلہ واقعی مجھے بھی بڑا عجیب لگا، لیکن وہ مولوی صاحب بھی صحیح طرح اس کی وجہ نہیں بتاسکے، آج پھر میرے ذہن میں یہ مسئلہ گردش کر رہا تھا سوچا بذریعہ تحریر ہذا آپ سے معلوم کرلوں۔ براہ کرم آسان انداز میں مجھے یہ سمجھا دیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً.....صورت مسئولہ میں مسافر اور مریض اگر نفل کی نیت کرلیں تو رمضان ہی کا روزہ ادا ہوگا، دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ رمضان کے دن میں روزہ رکھنا ایسی عبادت ہے کہ وقت اس کیلئے معیار بن رہا ہے یعنی روزہ صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک ہو پورا ہوتا ہے کوئی اضافی وقت بچتا نہیں ہے۔ چنانچہ جب روزہ کیلئے وقت معیار ہے تو اس میں تعیین شرط نہیں بلکہ وہ پہلے ہی سے متعین ہے، لہٰذا رمضان کے دن میں اگر کوئی شخص مطلق نیت کرتا ہے یا نفل اور واجب آخر کی نیت کرتا ہے تو اس کی نیت کا کوئی اعتبار نہیں وہ رمضان کا روزہ ادا ہوگا مگر مسافر اس سے مستثنیٰ ہے اگر وہ دوسرے واجب کی نیت کرتا ہے تو اس سے دوسرا واجب ہی ادا ہوگا وجہ اس کی یہ ہے کہ اگرچہ شریعت نے مسافر اور مریض کو رمضان میں رخصت دی ہے لیکن مسافر کی رخصت کا تعلق سفر کے ساتھ ہے جب مسافر نے سفر کے ہوتے ہوئے دوسرے واجب کی نیت کرلی تو رخصت موجود ہے لہٰذا مسافر کا اس رخصت پر عمل کرتے ہوئے دوسرے واجب کی نیت کرنا صحیح ہے جبکہ مریض کی رخصت کا تعلق بیماری کے ساتھ ہے جب مریض نے دوسرے واجب کی نیت سے روزہ رکھا تو

رخصت ہی ختم ہوگئی اور واضح ہوگیا کہ وہ مریض نہیں ہے لہٰذا مریض اگر دوسرے واجب کی نیت کرے گا تو رمضان کا روزہ ہی ادا ہوگا۔
دوسری وجہ یہ ہے کہ مسافر کو افطار کی اجازت دی گئی ہے تاکہ اس اجازت کے ذریعہ اس کو منافع بدنیہ (استراحت) حاصل ہو، چنانچہ جب اس نے واجب آخر کی نیت کرلی تو اس کو اس رخصت کے ذریعے منافع دینیہ حاصل ہو رہے ہیں جو کہ منافع بدنیہ سے زیادہ بہتر ہیں کیونکہ مسافر اگر اسی رمضان میں مرجاتا ہے تو اس کو رمضان کے چھوڑنے کی وجہ سے سزا نہیں دی جائے گی۔ لیکن دوسرے واجب کے چھوڑنے کی وجہ سے سزا کا مستحق ہوگا۔ لہٰذا شریعت نے اس کے دینی فائدہ کو سامنے رکھتے ہوئے اس کی نیت کو معتبر قرار دیا ہے۔ جبکہ نفل کی نیت میں اس کا دینی فائدہ رمضان ہی کی نیت میں ہے لہٰذا یہاں بھی اس کے دینی فائدہ کو مدنظر رکھتے ہوئے رمضان ہی کا روزہ قرار دیا ہے کیونکہ اس سے فرض کی ادائیگی بھی پوری ہوجائے گی اور فرض کا ثواب نفل سے زیادہ ملتا ہے۔

لمافي الهندية(۱/۱۹٦): واذا نوى واجبا آخر في يوم رمضان يقع عن رمضان ولا فرق بين المسافر والمقيم عند ابي يوسف ومحمد رحمهما الله تعالىٰ وعند ابي حنيفة رحمه الله تعالىٰ اذا صام المسافر بنية واجب آخر يقع عنه ولو نوى النفل ففيه روايتان كذا في الكافي. والاصح انه يقع عن رمضان كذا في محيط السرخسي واما المريض فالصحيح ان صومه يقع عن رمضان كذا في الكافي.

وفي فتاوىٰ التاتارخانية (۲/۳۵۹): ولو نوى المسافر التطوع فعن ابي حنيفة روايتان في رواية يقع عن الفرض. وفي الفتاوىٰ الخلاصة وهو اصح الروايتين وفي رواية يقع عن التطوع ..... والمريض اذا نوى التطوع فالصحيح انه والمسافر سواء ... وان صام بنيةواجب آخر يكون عمانوى في الروايات كلها. اما المريض فالصحيح عندنا انه يقع صومه عن رمضان.

وفي الشامية(۲/۳۷۸): اما في حق المسافر فان نوى واجبا آخر يقع عنه عند الامام وان نوى النفل او اطلق فعنه روايتان اصحهما وقوعه عن رمضان لان فائدة النفل الثواب وهو في فرض الوقت اكثر . (قوله الصحيح وقوع الكل عن رمضان الخ) المراد بالكل هو ما اذا نوى المريض النفل او اطلق او نوى واجبا آخر وما اذا نوى المسافر كذلك الا اذا نوى واجبا آخر فانه يقع عنه لاعن رمضان لان المسافر له ان لا يصوم فله ان يصرفه الى واجب آخر لان الرخصة متعلقة بمظنة العجز وهو السفر وذلك موجود بخلاف المريض فانها متعلقة بحقيقة العجز فاذا صام تبين انه غيرعاجز.

وفي نور الانوار(ص۵۵،۵٦،۵۷): او يكون معيارا له وسببا لوجوبه كشهر رمضان..... فيصير غيره منفيا اى لما كان شهر رمضان معيارا للصوم يصير غير الفرض منفيا في رمضان كما قال عليه السلام اذا انسلخ شعبان فلا صوم الاعن رمضان..... فيصاب بمطلق الاسم ومع الخطاء في

الوصف الا فی المسافر ینوی واجبا اخر عند ابی حنیفة: استثناء من مقدر ای یصاب رمضان مع الخطاء فی الوصف فی حق کل واحد الافی المسافر حال کونه ینوی فی رمضان واجبا اخر من القضاء والکفارة فانه یقع عمانوی لاعن رمضان عند ابی حنیفة لان وجوب الاداء لما سقط فی حقه یتخیر بعد ذلک بین الاکل وبین واجب اخر ..... والدلیل الثانی انه لما رخص له باالفطر لیصرفه الی منافع بدنه بالاستراحة فلان یصرفه الی منافع دینه وهی قضاء ماوجب علیه من القضاء والکفاره اولی لانه ان مات فی هذا الرمضان لم یعاقب لاجل رمضان ویعاقب بسبب القضاء والکفاره، والنفل لیس اهم له لافی مصالح دینه ولا مصالح دنیاه.

﴿سحری اورافطاری کا بیان﴾

(۲۳) سحری کی شرعی حیثیت

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اس سال رمضان سے کچھ دنوں پہلے میں سفر پر شہر سے باہر گیا ہوا تھا، جب واپس ہوا تو رمضان المبارک شروع ہو چکا تھا۔ رات کو دیر سے پہنچنے کی وجہ سے اور سفر کی تھکن بھی تھی سحری کیلئے اٹھنا مشکل ہو رہا تھا، میری والدہ نے مجھے بہت جگایا تو میں نے کہا کہ میں تھکا ہوا ہوں سحری نہیں کروں گا، مگر انہوں نے کہا کہ سحری کئے بغیر روزہ نہیں ہوتا، میں نے اٹھ کر سحری تو کھائی لیکن ان کی اس بات نے مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے آپ بتائیں کہ کیا واقعی سحری کے بغیر روزہ نہیں ہوتا؟ جواب عنایت فرما کر میری اس الجھن کو دور فرمائیں اور عنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب حامداًومصلیاً سحری کھانا مستحب ہے فرض یا واجب نہیں کہ جس کے ترک کرنے سے روزہ ہی درست نہ ہو اس لئے اگر کسی نے سحری نہیں کی تو اس کا روزہ ہو جائے گا۔ البتہ مستحب یہ ہے کہ سحری کرلیں۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ کی والدہ صاحبہ کا یہ کہنا کہ سحری کے ترک کرنے سے روزہ نہیں ہوگا درست نہیں ہے۔

لما في المشكوة (صـ ١٨١): عن عائشة قالت دخل على النبي ﷺ ذات يوم فقال هل عندكم شي فقلنا لا قال فاني اذا صائم الخ

وفي الهندية (١: ٢٠٠): التسحر مستحب ووقته آخر الليل قال الفقيه ابو الليث وهو السدس الاخير. هكذا في السراج الوهاج.

وفي الشامية (٢: ٤١٩): (قوله ويستحب السحور) لما رواه الجماعة الا ابا داود عن انس قال قال رسول الله ﷺ "تسحروا فان في السحور بركة" قيل المراد بالبركة حصول التقوى على صوم الغد أو زيادة الثواب ولم أر صريحا في كلامهم أنه يحصل السنة بالماء وحده وظاهر الحديث يفيده وهو مارواه احمد "السحور كله بركة فلا تدعوه ولو أن يجرع أحدكم جرعة من ماء فان الله وملائكته يصلون على المتسحرين".

(۲۴) سحری کا مسنون وقت

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بندہ سلائی کا کام کرتا ہے، اپنی درزی کی دوکان ہے۔

رمضان المبارک کے مہینہ میں کام کی بہتات ہوتی ہے جس کی وجہ سے دوکان بند کرتے کرتے ڈیڑھ دو بج جاتے ہیں۔ بندہ الحمدللہ نماز روزہ کا پابند ہے۔ لیکن سحری کیلئے اٹھنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ اس لئے بسا اوقات میں سحری سونے سے پہلے ہی کر کے سو جاتا ہوں۔ اب آپ حضرات شریعت کی روشنی میں بیان فرمائیں کیا ایسا کرنا درست ہے اور ایسا کرنے سے روزہ پر کوئی اثر تو نہیں پڑے گا؟ جواب عنایت فرما کر مشکور و ممنون ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً احادیث مبارکہ میں سحری کو مستحب کیا گیا ہے سحری جس قدر دیر کر کے کھائی جائے مسنون ہے۔ بشرطیکہ صبح صادق سے پہلے کھالے اگر کسی نے بہت پہلے سحری کر لی تو اس کا روزہ تو صحیح ہوگا البتہ بلاضرورت ایسا کرنا اچھا نہیں اور اس طرح کی عادت بنالینا خلاف سنت ہے۔ آپ کو چاہیے کہ سحری کے آخری وقت میں بھی ایک دو لقمے کھانا، یا پانی وغیرہ پی لیا کریں تاکہ خلاف سنت عمل سے احتراز ہو جائے۔ تاہم اس سے روزے کی صحت پر کچھ اثر نہ پڑے گا۔

وفی البدائع الصنائع(۲/۱۰۵): السنة فیها هو التأخیر لان معنی الاستعانة فیه ابلغ وقد روی عن رسول الله ﷺ انه قال ثلاث من سنن المرسلین تأخیر السحور وتعجیل الافطار ووضع الیمین علی الشمال تحت السرة فی الصلاة.

وفی الهندیة(۱/۲۰۰): ثم تأخیر السحور مستحب...... تعجیل الأفطار أفضل.

وفی الفقه الاسلامی (۳/۱۶۹۴): یستحب للصائم مایاتی. (۱) السحور علی شیٔ وان قل ولو جرعة ماء.

(۲۵) اذانِ فجر تک سحری کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیان عظام مسئلہ کے بارے میں کہ میں اسکول میں ٹیچر ہوں۔ اور اللہ کے فضل سے صوم و صلوٰۃ کا بھی پابند ہوں، نفلی روزے بھی اہتمام سے رکھتا ہوں۔ رمضان المبارک میں تو ٹی وی وغیرہ اور سائرن کی آواز سے سحری ختم ہونے کا وقت معلوم ہو جاتا ہے اور اذانیں بھی متصلاً ہو جاتی ہیں۔ اب دریافت طلب امر آپ حضرات سے یہ ہے کہ عام دنوں میں بھی سحری کا وقت اذانوں تک ہی ہوتا ہے یا اس کا کوئی وقت مقرر ہے۔ لوگ عام طور پر یہی کہتے ہیں کہ فجر کی اذان تک سحری کا وقت ہوتا ہے۔ صحیح بات قرآن و حدیث کے موافق بیان فرما کر رہنمائی فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً سحری کا آخری وقت صبح صادق کے طلوع ہونے تک ہے، لہٰذا صبح صادق کے طلوع ہونے سے پہلے پہلے کھانا پینا ترک کر دینا چاہئے، اذان ہونے کا انتظار نہ کرنا چاہئے کیونکہ اذان صبح صادق کے طلوع ہونے کے بعد ہوتی ہے۔ لہٰذا جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب تک صبح کی اذان نہ ہو کھانا پینا درست ہے ان کی یہ بات درست نہیں۔

لمافی الهندیة(۱/۱۹۴): ووقته من حین یطلع الفجر الثانی وهو المستطیر المنتشر فی الافق الی

غروب الشمس وقد اختلف في ان العبرة لاول طلوع الفجر الثاني اولا ستطارته وانتشاره فيه قال شمس الائمة الحلواني القول الاول أحوط والثاني أوسع هكذا في المحيط واليه مال أكثر العلماء كذا في خزانة الفتاوىٰ في كتاب الصلوة.

وفي الدر المختار (۲/ ۳۷۱): (هو) لغة (امساک عن المفطرات الآتية (حقيقة أو حكماً) كمن أكل ناسياً فانه ممسک حكماً(في وقت مخصوص وهو اليوم (من شخص مخصوص) مسلم كائن في دارنا أوعالم بالوجوب طاهر عن حيض او نفاس (مع النية) المعهودة.

وفي الشامية تحته: (قوله وهو اليوم) اليوم الشرعي من طلوع الفجر الى الغروب وهل المراد اول زمان الطلوع أو انتشاره الضوء؟ فيه خلاف كالخلاف في الصلوة والاول أحوط والثاني أوسع كما قال الحلواني كما في المحيط.

(۲۶) اذان کے بعد سحری کھانے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سحری کس وقت تک کھا سکتے ہیں؟ کیونکہ میرے بھائی کا کہنا ہے کہ اذان سے پہلے سائرن کی آواز پر سحری کا وقت ختم ہوجاتا ہے جبکہ والدہ کا کہنا ہے کہ ہم نے ساری زندگی روزے رکھے ہیں جب تک کوئی اذان ہورہی ہو اس وقت تک کھانا کھا سکتے ہیں چنانچہ وہ کہتی ہیں کہ اذان کے آخری کلمہ تک سحری کھائی جاسکتی ہے لیکن بعض دفعہ اذان تاخیر سے ہو تو پھر کیا حکم ہوگا؟ اور اگر والدہ کا کہنا درست نہ ہو تو انکے روزوں کا کیا حکم ہوگا کہ زندگی بھر ایسے ہی روزے رکھے ہیں۔

الجواب حامداًومصلياً صورت مسئولہ میں سب سے پہلے یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ سحری کے وقت کے ختم ہونے کا مدار طلوع صبح صادق پر ہے نہ کہ اذان اور سائرن کی آواز پر۔ اب اگر سائرن صبح صادق کے طلوع ہوتے ہی بجادیا جاتا ہو تو کھانا پینا بند کردینا چاہئے۔ اور اذان تو صبح صادق کے بعد ہی ہوا کرتی ہے لہٰذا یہ کہنا کہ اذان شروع ہونے کے بعد بلکہ آخری کلمہ تک کھا سکتے ہیں صحیح نہیں ہے لہٰذا آپ کی والدہ نے اگر ساری زندگی اس طرح روزے رکھے کہ سحری کے بعد اذان کے ختم تک کھانا پینا جاری رکھا تو ان پر تمام روزوں کی قضاء لازم ہوئی۔ اور اگر ایسا تمام روزوں میں نہیں کیا گیا تو پھر جن روزوں کے بارے میں یقین یا گمان غالب ہو صرف ان کی قضاء لازم ہوگی۔

لمافي الهندية (۱/ ۱۹۴): تسحر على ظن أن الفجر لم يطلع وهو طالع أو أفطر على ظن أن الشمس قد غربت ولم تغرب قضاه ولا كفارة عليه لانه ما تعمد الافطار كذا في محيط السرخسي.

وفي الشامية (۲/ ۴۰۵): قوله اوتسحر :اى يجب عليه القضاء دون الكفارة لأن الجناية قاصرة وهى جناية عدم التثبت لاجناية الافطار لأنه لم يقصده.

(٢٧) سحری کا وقت ختم ہونے کے بعد کھانے پینے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دن میں اپنی گھڑی میں الارم لگانا بھول گیا جب آنکھ کھلی تو جلدی جلدی کچھ کھایا مگر جب ٹائم دیکھا تو وہ ختم ہو چکا تھا تو ایسی صورت میں روزہ رکھنا صحیح ہے یا نہیں؟ اگر روزہ نہیں ہوا تو ایسی صورت میں دن میں کچھ کھا پی سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً اگر کسی نے ماہِ مبارک میں سحری کے بعد کچھ کھا پی لیا یہ سمجھ کر کے ابھی وقت باقی ہے تو اس صورت میں روزہ کی صرف قضا لازم ہوگی نہ کہ کفارہ البتہ یہ شخص دن بھر کھانے پینے سے اجتناب کریگا اور اگر غیر ماہِ مبارک میں ایسا کیا ہے تو کچھ بھی لازم نہ ہوگا۔

لما في الهندية (١/ ٢١٤، ٢١٥): وكذا من وجب عليه الصوم في أول النهار لوجود سبب الوجوب والأهلية ثم تعذر عليه المضي فيه بأن أفطر متعمدا أو أصبح يوم الشك مفطرا ثم تبين أنه من رمضان أو تسحر على ظن أن الفجر لم يطلع ثم تبين أنه طالع فانه يجب عليه الامساك في بقية اليوم تشبها بالصائمين.

وفي الشامية (٢/ ٤٠٥): (قوله أو تسحر) أى يجب عليه القضاء دون الكفارة لان الجناية قاصرة وهي جناية عدم التثبت لاجناية الافطار لانه لم يقصده.

وفيه ايضاً (٢/ ٣٨٠): (قوله تبيت النية) فلو نوى تلك الصيامات نهارا كان تطوعا واتمامه مستحب ولاقضاء بافطاره.

(٢٨) سحری کھاتے ہوئے صبح صادق طلوع ہوجانے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص رمضان المبارک میں رات کے وقت سفر کرے اور صبح سحری کیلئے گاڑی والے کہنے کے باوجود آخری وقت میں گاڑی روکیں اور سحری کھاتے ہوئے اذان شروع ہو جائے تو سفر اور مجبوری کی وجہ سے اس شخص کا روزہ صحیح ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً سحری کھاتے ہوئے آدمی کو اگر بالیقین معلوم ہو جائے کہ صبح صادق طلوع ہو چکی ہے تو روزہ نہیں ہوا لہذا صورت مسئولہ میں شخص مذکور کا روزہ نہیں ہوا، تاہم اس پر سفر اور مجبوری کی وجہ سے گناہ بھی نہیں ہوگا۔

لما في الهداية (٣/ ٣٨٠): (قال واذا تسحر) وهو يظن ان الفجر لم يطلع فاذا هو قد طلع او افطر وهو يرى ان الشمس قد غربت فاذا هي لم تغرب امسك بقية يومه قضاء لحق الوقت بالقدر

الممکن او نفیا للتهمة وعلیه القضاء لانه حق مضمون بالمثل.

وفی الدر المختار(۲/۴۰۵): (او تسحر او افطر یظن الیوم) ای الوقت الذی اکل فیه (لیلا و)الحال ان (الفجر طالع والشمس لم تغرب) ..... وفی (صـ۴۰۶) (قضی) فی الصور کلها (فقط).

(۲۹) اگر رات سے روزے کی نیت کی تو اس کا حکم

سوال　کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گھر میں تعمیراتی کام ہو رہا تھا۔ کچھ اس کی تھکن تھی، کچھ میری بھانجی کی شادی تھی اس میں روز آنا جانا تھا اس کی تھکن تھی۔ جس روز رمضان کا چاند نظر آیا میں عشاء کی نماز پڑھ کر یہ سوچ رہا تھا کہ کل صبح سے روزہ رکھنا ہے اور اسی اثنا میں آنکھ لگ گئی۔ چونکہ کئی دن کی نیند پوری نہیں ہوئی تھی اس لئے اگلے دن ظہر کے بعد آنکھ کھلی، تو کیا یہ روزہ میرا درست ہو گیا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورت مسئولہ میں جبکہ آپ نے رات سے روزے کی نیت کر لی تھی اس لئے آپ کا روزہ درست ہو گیا۔

لمافی الهندیة(۱/۱۹۵): ولو قال نویت ان اصوم غدا ان شاء الله تعالی صحت نیته هو الصحیح کذا فی الظهیریة.

وفی الفقه الاسلامی وادلته(۳/۱۶۷۰): فمتی خطر بقلبه فی اللیل ان غدا من رمضان وانه صائم فیه فقد نوی.

(۳۰) نفلی روزے کی نیت رات کو کر لی تو صبح صادق تک سوتے رہنے کا حکم

سوال　کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ　ایک آدمی نے رات کو نفل روزہ کی نیت کر لی لیکن صبح اس کی آنکھ نہ کھلی اور روزہ نہیں رکھا تو اس پر قضا واجب ہے یا نہیں اور کیا یہ لزم النفل بالشروع کے حکم میں آتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... اگر کسی شخص نے رات کے وقت نیت کی کہ وہ کل کے دن روزہ رکھے گا پھر وہ سو گیا اور صبح صادق کے بعد اس کی آنکھ کھلی تو اس صورت میں اس شخص پر روزہ لازم ہوگا اگر اس نے افطار کر لیا تو اس پر قضاء لازم ہوگی۔ چنانچہ صورت مسئولہ میں سائل پر قضاء لازم ہوگی لیکن یہ مسئلہ لزم النفل بالشروع کے حکم میں نہیں آئے گا۔

لمافی النهر الفائق(۲/۱۰): واعلم انه یشترط فی الاجزاء بالمبیتة ان لا یرجع عنها فان رجع بان عزم علی الفطر لیلاً بعد مانواه لم یکن صائماً کذا فی الظهیریة.

وفی الفتاوی التاتارخانیة(۲/۳۶۱): ولو نوی ان یصوم غداً ثم بداله قبل الصبح ان لا یصوم لا یجب علیه القضاء، ولو نوی ان یصوم غداً فاکل بعد الصبح یجب علیه القضاء.

وفی الاشباہ والنظائر(صـ ۱۵):ولو نوی الصوم من اللیل ثم قطع النیة قبل الفجر سقط حکمہا، بخلاف ما اذا رجع بعد ما امسک بعد الفجر فانه لا یبطل، کالأکل بعد النیة من اللیل لا یبطلها۔

(۳۱) ہر روزہ کی الگ نیت ضروری ہے

سوال ...کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گھر رمضان میں اکثر اس موضوع پر بحث ہوتی رہتی ہے کہ روزے کیلئے ہر دن نیت کرنا ضروری ہے یا نہیں، گھر کے بعض افراد کہتے ہیں کہ ہر دن نیت کرنا ضروری ہے جبکہ بعض کہتے ہیں کہ روزانہ نیت کرنا ضروری نہیں اب آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ روزانہ نیت کرنا ضروری ہے یا صرف مہینہ کی ابتداء میں ایک دفعہ کر لینا کافی ہے؟ اگر اتفاق سے کسی دن نیت نہ کی اور سحری بھی کر لی تو کیا حکم ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً ...رمضان المبارک میں ہر روزہ کیلئے علیحدہ نیت کرنا ضروری ہے اور نیت زبان سے کرنا ضروری نہیں ہے اگر صرف دل سے کر لی جائے تو کافی ہے اسی طرح عام طور سے سحری کرنیوالے کی نیت روزہ رکھنے کی ہوتی ہے لہٰذا سحری کو قائم مقام نیت کے سمجھا جائیگا البتہ اگر سحری کرنیوالے نے اسکے خلاف نیت کی مثلاً روزہ نہ رکھنے کی نیت کی تو اس صورت میں روزہ نہیں ہوگا کیونکہ اصول ہے کہ الصریح ابلغ من الکنایۃ۔ ہاں اگر کوئی شخص سحری تک نیت ہی نہ کر سکا ہو تو اگر اس نے کچھ کھایا پیا نہ ہو تو نصف النہار شرعی تک نیت کر سکتا ہے۔

لمافی الدر المختار(۲/۳۷۹): (ویحتاج صوم کل یوم من رمضان الی النیة).ولو صحیحا مقیماً تمییز للعبادة عن العادة.

(۳۲) سحری میں تأخیر اور افطار میں جلدی کا مطلب

سوال ...کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں فرسٹ ائیر کا طالبعلم ہوں اور مجھے دینی کتابیں پڑھنے کا بڑا شوق ہے اس دفعہ رمضان سے پہلے میں نے ایک کتاب خریدی جو کہ روزے کے فضائل سے متعلق تھی اس میں ایک بات یہ لکھی تھی کہ افطاری میں جلدی کرنا اور سحری میں تاخیر کرنا سنت ہے اس کو پڑھنے سے میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر کوئی شخص غلطی سے وقت داخل ہونے سے ایک آدھ منٹ پہلے روزہ افطار کر لے یا وقت سحر ختم ہونے کے ایک منٹ بعد تک کچھ کھائے پیئے تو ان دونوں صورتوں میں روزہ ہوگا یا نہیں اور اگر روزہ نہیں ہوگا تو ایسے شخص پر قضا ہوگی یا کفارہ بھی؟

الجواب حامداًومصلیاً... صورت مسئولہ میں مذکورہ آدمی کے ذمہ صرف قضا لازم ہوگی کفارہ اسپر لازم نہیں ہوگا۔اسی طرح افطاری میں جلدی کرنا اور سحری میں تاخیر کرنا سنت سے ثابت ہے لیکن اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ افطار وقت سے پہلے کیا جائے اور سحری وقت کے بعد بلکہ سحری اور افطار اپنے وقت میں ہونا چاہئے۔

لـمـافـي الـمـسـلـم (۱/۳۵۰): عن زيد بن ثابت قال تسحرنا مع رسول الله ﷺ ثم قمنا الى الصلاة قلت كم كان قدرمابينهماقال خمسين اية ......وعن سهل ابن سعد رضي الله عنه ان رسول الله ﷺ قال لايزال الناس بخيرماعجلواالفطر.

وفـي الهـنـدية (۱/۱۹۴): تسحر على ظن أن الفجر لم يطلع وهو طالع أو أفطر على ظن أن الشمس قد غربت ولم تغرب قضاه ولا كفارة عليه لانه ماتعمد الافطار كذا في محيط السرخسي.

وفـي الشـامـيـة (۲/۴۰۵): قـولـه او تـسـحـر: اى يجب عليه القضاء دون الكفارة لأن الجناية قاصرة وهي جناية عدم التثبت لا جناية الافطار لأنه لم يقصده.

(۳۳) روزہ کھولنے (افطار کرنے) کا وقت

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں میں مختلف مکاتب فکر کے لوگوں کی مساجد ہیں کچھ جلدی اذان دیتے ہیں اور کچھ دیر سے تو کن کی اذان پر روزہ افطار کرنا چاہئے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ......روزے کا وقت صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک ہے۔لہٰذا افطاری کے لئے شرط آفتاب کا غروب ہونا ہے اور چونکہ مغرب کی اذان بھی غروب آفتاب کے بعد ہوتی ہے، اس لئے پہلی اذان پر آپ افطاری کر سکتے ہیں، بشرطیکہ اس مسجد والے غروب آفتاب کا لحاظ رکھتے ہوں۔

لـمـافـي الـطـحـطـاوى على الدر (۱/۴۳۹): (قوله وهو اليوم) اى من أول زمان الصبح الصادق الى المغرب أي زمان غيوبة تمام جرم الشمس بحيث تظهر الظلمة في جهة المشرق وفي البخارى عنه عليه السلام اذا اقبل الليل من هنا فقد أفطر الصائم أى اذا وجد الظلمة حسا في جهة المشرق فقد دخل في وقت الفطر أوصار مفطر افي الحكم لان الليل ليس ظرفا للصوم قهستاني.

وفـي الشـامـيـة(۲/۳۷۱): (قـولـه وهـو الـيـوم) اى اليوم الشرعى من طلوع الفجر الى الغروب وهل المراد أول زمان الطلوع او انتشار الضوء؟ فيه خلاف كالخلاف في الصلاة والاول احوط والثاني أوسع كما قال الحلواني كما في المحيط. والمراد بالغروب زمان غيوبة جرم الشمس بحيث تظهر الظلمة في جهة الشرق قال ﷺ "اذا أقبل الليل من ههنا فقد أفطر الصائم" أى اذا وجدت الظلمة حسا في جهة المشرق فقد ظهر وقت الفطر أو صار مفطرا في الحكم لان الليل ليس ظرفا للصوم.

(۳۴) گھر میں افطار کرنا چاہیے یا مسجد میں؟

سوال ...کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں یہ رواج ہے کہ رمضان المبارک میں لوگ افطاری کے وقت کھانا فروٹ وغیرہ مسجد میں بھیج دیتے ہیں اور سارے روزے دار مسجد میں جمع ہوکر افطاری کرتے ہیں پوچھنے پر بتاتے ہیں کہ افطاری مسجد میں کرنا افضل ہے۔ آپ حضرات سے معلوم یہ کرنا ہے کہ افطاری گھر میں افضل ہے یا مسجد میں؟

الجواب حامداًومصلیاً...... مسجد میں غیر معتکف کیلئے کھانا کھانے کو فقہاء نے مکروہ لکھا ہے اس لئے کہ اس سے تلویث مسجد کا اندیشہ ہے۔ لیکن اگر جماعت کے فوت ہونے کا خوف ہو تو پھر اعتکاف کی نیت کر کے مسجد کی صفائی کا خیال رکھتے ہوئے مسجد میں افطاری کرنا جائز ہوگا۔ لیکن افضلیت اور عدم افضلیت کی تعیین ذرا مشکل ہے اس لئے کہ یہ حالات اور افراد کے اعتبار سے بدلتی رہتی ہے البتہ عام حالات میں گھر پر افطار کرنا مناسب ہے۔

لما في المرقات(۴/۲۵۶): واما ما صح ان عمرو عثمان رضي الله عنهما كانا برمضان يصليان المغرب حين ينظر ان الى الليل الاسود ثم يفطر ان بعد الصلاة فهو لبيان جواز التاخير لئلا يظن وجوب التعجيل ويمكن..... او كانا غير معتكفين ورأيا الاكل والشرب لغير المعتكف مكروهين لكن اطلاق الاحاديث ظاهر في استثناء حال الافطار.

وفي الهندية(۵/۳۲۱): ويكره النوم والاكل فيه لغير المعتكف واذا اراد ان يفعل ذالك ينبغي ان ينوى الاعتكاف فيدخل فيه ويذكر الله تعالىٰ بقدر مانوىٰ او يصلي ثم يفعل ماشاء (كذا في السراجيه)

وفي الشامية(۲/۴۴۸): واعلم انه كما لا يكره الاكل ونحوه في الاعتكاف الواجب فكذالك في التطوع كمافي كراهية جامع الفتاوى ونصه يكره النوم والاكل في المسجد لغير المعتكف واذا اراد ذالك ينبغي ان ينوى الاعتكاف فيدخل فيذكر الله تعالىٰ بقدر مانوى اويصلي ثم يفعل ماشاء.

(۳۵) ریڈیو اور ٹی وی کے اعلان سے روزہ رکھنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل رمضان المبارک اور دیگر مہینوں کے متعلق ریڈیو اور ٹی وی پر خبریں نشر ہوجاتی ہیں تو کیا ریڈیو اور ٹی وی کے اعلان کو معتبر سمجھ کر روزہ رکھنا ضروری ہوگا؟

الجواب حامداًمصلیاً ..... ہلال رمضان کے ثبوت کیلئے لفظ شہادت اور دعویٰ شرط نہیں، بلکہ صرف ایک ثقہ آدمی کی خبر کافی ہے۔ اور صورت مسئولہ میں چونکہ ریڈیو اور دوسرے آلات خبر پر عام طور پر ہلال کمیٹی کی قبول شدہ شہادت کو نشر کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اگر

...سے ذرائع سے بھی اس کی توثیق ہوجائے، تو اس وقت ریڈیو اور دوسرے آلات خبر کو معتبر سمجھ کر روزہ رکھنا لازم ہوگا۔

لما فی احکام القرآن للشیخ ظفر احمد العثمانیؒ (۱/۲۰۰): لااعتبار باختلاف المطالع: مسئلة: واذا عرفت ان قوله تعالی فمن شهد منکم الشهر فلیصمه، لیس مقصوراً علی الشهود بالرویة بل یعمه والشهود بالخبر فاذا أخبر مخبر عن رؤیة بلد قریب أوبعید قبل رؤیتنا بلیلة وهو عدل وکان بالسماء علة. أو شهد عدلان أو جماعة عظیمة لایجوز تواطئها علی الکذب والسماء مضحیة لزمنا قضاء یوم.

وفی انوار المحمود (۲/۱۷): قال ابن الماجشون لایلزمهم بالشهادة الا لاهل البلد التی تثبت فیه الشهادة. الا ان یثبت عند الامام الاعظم فیلزم لان البلاد فی حقه کالبلد الواحد اذ حکمه نافذ فی الجمیع.

وفی التاتارخانیه(۲/۳۵۵): وذکر الشیخ الامام شمس الائمة الحلوانی ان الصحیح من مذهب أصحابنا أن الخبر اذا استفاض وتحقق فیما بین أهل احدی البلدتین یلزمهم حکم أهل هذه البلدة.

وفیها ایضاً (۲/۳۵۲): وتقبل شهادة الواحد علی شهادة الواحد فی هلال رمضان ولاتشترط فیه لفظة الشهادة.

وفی الهندیة(۱/۱۹۷): ولایشترط فی هذه الشهادة لفظ الشهادة ولا الدعوی ولا حکم الحاکم حتی انه لو شهد عند الحاکم وسمع رجل شهادته عند الحاکم وظاهره العدالة وجب علی السامع ان یصوم ولا یحتاج الی حکم الحاکم.

وفیه ایضاً(۱/۱۹۹): ولو شهدوا ان قاضی بلدة کذا شهد عنده اثنان برؤیة الهلال فی لیلة کذا وقضی بشهادتهما جاز لهذا القاضی ان یحکم بشهادتهما لان قضاء القاضی حجة وقد شهدوا به کذا فی فتح القدیر.

وفی الشامیة(۲/۳۸٦): قلت: والظاهر أنه یلزم اهل القری الصوم بسماع المدافع أو رؤیة القنادیل من المصر لأنه علامة ظاهرة تفید غلبة الظن وغلبة الظن حجة موجبة للعمل کما صرحوا به.

وفی الفقه الاسلامی(۳/۱٦۲۲): وهذا الرأی (رأی الجمهور) هو الراجح لدی توحیداً للعبادة بین المسلمین ومنعا من الاختلاف غیر المقبول فی عصرنا. ولان ایجاب الصوم معلق بالرؤیة دون تفرقة بین الاقطار. والعلوم الفلکیة تؤید توحید اول الشهر الشرعی بین الحکومات الاسلامیة. لان اقصی مدة بین مطلع القمر فی اقصی بلد اسلامی وبین مطلعه فی اقصی بلد اسلامی آخر هو نحو ۹

ساعات، فتكون بلاد الاسلام كلها مشتركة في اجزاء من الليل تمكنها من الصيام عند ثبوت الرؤيه والتبليغ بها برقيا او هاتفيا.

(۳۶) ریڈیو کی اذان سے روزہ افطار کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگ ریڈیو کی اذان پر روزہ افطار کرتے ہیں جبکہ ریڈیو میں اذان محلے کی مسجد سے کچھ پہلے ہوتی ہے تو ان لوگوں کا روزہ صحیح ہو جائے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......روزہ کے افطار کا وقت غروب آفتاب ہے اس لئے اگر یقین ہے کہ ریڈیو کی اذان غروب آفتاب کے بعد ہوئی ہے تو ریڈیو کی اذان پر روزہ افطار کرنا درست ہے چاہے محلے کی مسجد میں اذان ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔

لما في الشامية(۲/۴۰۷): قلت: ومقتضى قوله لا بأس بالفطر بقول عدل صدقه أنه لايجوز اذا لم يصدقه ولا بقول المستور مطلقا وبالأولى سماع الطبل أو المدفع الحادث في زماننا لاحتمال كونه لغيره ولأن الغالب كون الضارب غير عدل فلا بد حينئذ من التحرى فيجوز لأن ظاهر مذهب أصحابنا جواز الافطار بالتحرى كما نقله في المعراج عن شمس الائمة السرخسي لأن التحرى يفيد غلبة الظن وهي كاليقين كما تقدم فلولم يتحر لايحل له الفطر لما في السراج وغيره لوشك في الغروب لايحل له الفطر لأن الاصل بقاء النهاراهـ. وفي البحر عن البزازية ولايفطر مالم يغلب على ظنه الغروب وان أذن المؤذن اهـ وقد يقال ان المدفع في زماننا يفيد غلبة الظن وان كان ضاربه فاسقا لأن العادة ان الموقت يذهب الى دارالحكم آخر النهار فيعين له وقت ضربه ويعينه أيضا للوزير وغيره واذا ضربه يكون ذلك بمراقبة الوزير و أعوانه للوقت المعين فيغلب على الظن بهذه القرائن عدم الخطأ وعدم قصد الافساد والا لزم تأثيم الناس و ايجاب قضاء الشهر بتمامه عليهم فان غالبهم يفطر بمجرد سماع المدفع من غير تحرولا غلبة ظنّ.

(۳۷) سورج غروب ہونے سے پہلے افطار کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے شہر میں سورج ڈوب جانے کی وجہ سے روزہ افطار کرلیا۔ افطار کے بعد سمندر پر گیا تو سمندر میں سورج کا عکس نظر آ رہا تھا اب اس شخص پر قضاء وکفارہ دونوں لازم ہوں گے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اگر کسی شخص نے روزے کی حالت میں اپنے غالب گمان کے مطابق یہ سمجھا کہ سورج غروب ہو گیا ہے اور اس نے افطار کرلیا پھر بعد میں پتہ چلا کہ سورج غروب ہونے سے پہلے افطار کرلیا ہے تو اس پر صرف قضاء لازم ہوتی ہے کفارہ لازم نہیں ہوتا۔

بہذا صورت مسئولہ میں بھی چونکہ شخص مذکور نے یہ سمجھ کر سورج غروب ہوگیا ہے افطار کرلیا حالانکہ سورج کا عکس ابھی سمندر پر نظر آرہا تھا اس لئے اس کا روزہ فوت ہوگیا اور اس کے ذمہ صرف قضا لازم ہے کفارہ لازم نہیں ہے۔

لما في الهندية(۱/۱۹۴): تسحر على ظن ان الفجر لم يطلع وهو طالع او افطر على ظن ان الشمس قد غربت ولم تغرب قضاه ولا كفارة عليه لانه ماتعمد الافطار كذا في المحيط السرخسي.

وفي الطحطاوي على الدر(۱/۴۵۵): وإن ظنّ غروب الشمس فإن تبين عدم الغروب فعليه القضاء فقط وإن تبين الغروب او لم يتبين شئ فلا شئ عليه.

وفي الدر المختار(۲/۴۰۵): (اوتسحر او افطر يظن اليوم) اى الوقت الذى أكل فيه(ليلاو) الحال ان (الفجر) طالع والشمس لم تغرب) ... وفي(صـ۴۰۶) (قضى) في الصور كلها (فقط).

(۳۸) وقت سے پہلے روزہ افطار کرنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کل مغرب کے وقت ہمارے مؤذن صاحب نے دومنٹ پہلے اذان دیدی تو اکثر لوگوں نے روزہ افطار کرلیا اب ان پر صرف قضاء ہوگی یا کفارہ بھی ساتھ دینا ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً صورت مسئولہ میں جن لوگوں نے مؤذن کی اذان سن کر روزہ افطار کرلیا ان پر اس روزہ کی صرف قضاء لازم ہوگی کفارہ لازم نہیں ہوگا۔

لمافي التفسير المنير(۲/۱۵۸): ان ظن ان الشمس قد غربت لغيم أو غيره فافطر ثم ظهرت الشمس فعليه القضاء في رأى أكثر العلماء ومثله لو أذن المؤذن خطأ قبل الغروب أو ضرب مدفع الافطار قبل الغروب ولوبد قيقة فأفطر بناء عليهما وجب القضاء.

وفي الهندية(۱/۱۹۵): اذا شهدا ثنان ان الشمس غابت وشهد آخر ان انهالم تغب فأفطر ثم ظهر انهالم تغب فعليه القضاء دون الكفارة بالاتفاق. كذا في فتاوى قاضي خان

(۳۹) جہاز کے سفر میں سورج دکھائی دینے کی صورت میں افطار کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص مسلسل سفر کرتا ہو اور یہ مسافر حالت صوم میں ہو جب ایک ملک سے روانہ ہوا تو وہاں دن تھا اور جب دوسرے ملک پہنچ گیا تو وہاں بھی دن تھا اسی طرح مسلسل کئی ملکوں کا سفر کیا۔ اب ایسے شخص کیلئے افطاری کا کیا حکم ہے؟ کیا جس ملک میں روزہ رکھا تھا اسکے حساب سے افطار کریگا یا انتظار کریگا اور اگر انتظار کریگا تو جب سفر میں دو، تین دن لگ جاویں تو کیا افطار کریگا یا نہیں؟ نیز اگر مسافر جہاز میں سفر کرتا ہے تو جب بلندی پر جاتا ہے تو سورج کی روشنی اس پر پڑتی ہے

تو کیا یہ شخص غروب کا انتظار کریگا یا افطار کریگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں اولاً تو مسافر کو اللہ تعالیٰ نے روزہ نہ رکھنے کی رخصت عطا فرمائی ہے چاہئے کہ اس کو قبول کرکے روزہ نہ رکھے۔ لیکن اگر عزیمت پر عمل کرکے روزہ رکھ کر سفر پر روانہ ہوجائے تو اس صورت میں غروب آفتاب سے پہلے افطار کرنا جائز نہیں ہے بلکہ غروب کا انتظار کرنا ضروری ہے۔ پس اگر کسی وجہ سے کوئی مشقت پیش آجائے (جیسا کہ مذکورہ سوال میں کئی دن تک افطار کا موقع نہ ملنا) تو اس صورت میں روزہ توڑ کر دوبارہ اس کا اعادہ کرلے، اس صورت میں صرف قضا لازم ہوگی نہ کہ کفارہ۔

نیز اگر مسافر جہاز میں بلندی پر سفر کررہا ہو اور بلندی پر سورج نکلا ہوا ہو تو اس صورت میں بھی روشنی کے غائب ہونے تک انتظار کرنا ضروری ہے اس سے پہلے افطار کرنا جائز نہیں ہے۔ بخلاف اس صورت کے کہ مسافر کسی شہر میں غروب کے بعد افطار کرکے جہاز میں سوار ہوا اور اس پر سورج کی روشنی پڑنے لگی تو اس صورت میں اس پر روزے کے احکامات جاری نہ ہونگے بلکہ یہ شخص مفطر سمجھا جائیگا۔

لمافی الشامیة(۲/۳۷۱):والمرادبالغروب زمان غیوبة جرم الشمس بحیث تظهر الظلمة فی جهة الشرق قال ﷺ (اذااقبل اللیل من ههنافقدافطر الصائم) ای اذاوجدت الظلمة حسافی جهة المشرق فقدظهروقت الفطراوصارمفطرا فی الحکم لان اللیل لیس ظرفاللصوم.

وفی فتاوی اللجنة(۱۰/۱۳۶): اذاکان الصائم فی الطائرة واطلع بواسطة الساعة والتلیفون عن افطار البلد القریبة منه وهویری الشمس بسبب ارتفاع الطائرة فلیس له ان یفطر لان الله تعالی قال: (ثم اتمواالصیام الی اللیل)وهذه الغایة لم تتحقق فی حقه مادام یری الشمس واما اذاافطر بالبلد بعد انتهاء النهارفی حقه فاقلعت الطائرة ثم رای الشمس فانه یستمر مفطرا لان حکمه حکم البلدالتی اقلع منها وقدانتهی النهاروهوفیها.

(۴۰) افطاری میں حضور ﷺ کا معمول مبارک

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ روزہ کس چیز سے افطار کرسکتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول کس چیز سے افطار کرنے کا تھا؟ میں نے سنا ہے کہ نمک سے افطار کرنا بھی سنت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... کھجور سے افطار کرنا سنت ہے، اگر کھجور نہ ملے تو چھوارے سے ورنہ پانی سے، عام طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی معمول تھا، رہی بات نمک سے افطار کرنے کی تو یہ بات کسی بھی حدیث یا اثر سے ثابت نہیں ہے کہ نمک سے افطار کرنا سنت ہے۔

لمافی مشکاة المصابیح (۱/۱۷۵): عن انس رضی الله عنه قال کان النبی ﷺ یفطر قبل ان یصلی علی رطبات فان لم تکن رطبات فتمیرات فان لم تکن تمیرات حساحسوات من ماء.

﴿جن چیزوں سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے﴾

(۴۱) روزہ کن چیزوں سے ٹوٹتا ہے؟

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ رمضان میں جب میں ایک دن عصر کی نماز پڑھ کر گھر آرہا تھا تو راستے میں مجھ سے میرے ایک دوست نے یہ سوال پوچھا کہ میں نے دوپہر کو بھولے سے کھانا کھالیا کیا میرا روزہ ٹوٹ گیا؟ مجھے اس کا جواب نہیں آیا کیونکہ وہ لوگ میری نماز پڑھنے کی وجہ سے مجھے بہت دیندار سمجھتے ہیں اور مجھ سے دین کے متعلق سوالات پوچھتے ہیں لہذا آپ مہربانی فرما کر کوئی ایسا اصول روزہ کے متعلق بیان فرمادیں جس سے انسان اندازہ لگالے کہ کن چیزوں سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور کن سے نہیں ٹوٹتا؟

الجواب حامداً ومصلیاً ...... ہر وہ چیز جو منہ، کان، ناک یا دوسرے منافذ کے ذریعے پیٹ میں داخل کی جائے اور جماع یا ہر وہ فعل جس میں جماع کا معنی پایا جائے روزے کی حالت میں صادر ہو جائے تو روزہ ٹوٹ جاتا ہے خواہ غلطی سے ہو یا زبردستی سے لیکن اگر بھول کر یہ افعال صادر ہو جائیں تو روزہ نہیں ٹوٹتا۔ البتہ پھر بھی آپ کو مسائل بتانے سے گریز کرنا چاہئے اور پوچھنے والوں کی کسی مستند عالم یا مفتی کی طرف رہنمائی کر دینا چاہئے۔

لما فی الدر المختار(۲/۳۷۱): امساک عن المفطرات) الآتیه(حقیقتاً او حکماً) کمن اکل ناسیا فانه ممسک حکما (فی وقت مخصوص) وهو الیوم (من شخص مخصوص) مسلم کائن فی دارنا او عالم بالوجوب طاهر عن الحیض او النفاس (مع النیة) المعهودة.

وفی الهندیة(۵/۳۵۳): الامر بالمعروف یحتاج الی خمسة أشیاء أولها العلم لان الجاهل لا یحسن الامر بالمعروف ......الخ.

وفی الفقه الاسلامی(۳/۱۶۱۶): أن الصوم امتناع فعلی عن شهوتی البطن والفرج وعن کل شئ حسی یدخل الجوف من دواء ونحوه فی زمن معین وهو من طلوع الفجر الثانی ای الصادق الی غروب الشمس من شخص معین اهل له: وهو المسلم العاقل غیر الحائض والنفساء بنیة وهی عزم القلب علی ایجاد الفعل جز ما بدون تردد لتمییز العبادة عن العادة.

(۴۲) پان کھانے سے روزہ ٹوٹنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج جب میں اپنے کالج جا رہا تھا تو بس میں میرے آگے بیٹھے دو افراد

باتیں کررہے تھے ان میں سے ایک نے کہا کہ آج میں سحری کے بعد پان کھارہا تھا اور ایسے ہی ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا کہ میری آنکھ لگ گئی پھر جب میری اچانک آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی میں نے جلدی سے پان تھوکا اور کلی کی، اب آپ سے پوچھنا یہ ہے کہ کیا اس شخص کے روزے پر کچھ اثر پڑے گا یا روزہ صحیح ہوگا یا اس کو اس روزے کی قضاء کرنی پڑے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں اس شخص کا روزہ فاسد ہو گیا اب اس پر روزہ کی قضا لازم ہے البتہ کفارہ نہیں آئیگا۔

لـمـافـي الهـنـدية(۱/۲۰۳): اذابـقـيـت لقمة الـسـحـور في فيه فطلع الفجر ثم ابتلعها او اخذ كـسـرة خبز ليـأكـلـهـا وهـو نـاس فـلـمـا مـضـغـها ذكر انه صائم فابتلعها مع ذكر الصوم قال بعضهم ان ابتلعها قبل أن يخرجها فعليه الكفارة وان اخرجها ثم اعادها لا كفارة عليه وهو الصحيح. كذا في فتاوى قاضي خان.

(۴۳) دوائی والی روئی منہ میں رکھنے سے روزہ ٹوٹنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے چھوٹے بھائی کی داڑھ میں زخم ہے اور وہ روئی دوائی میں ڈبو کر منہ میں رکھتا ہے اب آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ اگر وہ روزے کی حالت میں روئی دوائی میں ڈبو کر منہ میں رکھے تو کیا روزہ ہوگا یا ٹوٹ جائے گا اور اسی طرح اگر کبھی خون کا ذائقہ محسوس ہو تو تھوک نگلنے پر، تو اس صورت میں کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......روئی دوائی میں ڈبو کر دانتوں یا ناک میں رکھنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اسلئے کہ اسکے اثرات دماغ تک پہنچ جاتے ہیں اور اسمیں صلاحِ بدن بھی ہے۔ اور ہر ایسی چیز کہ جسکے اثرات دماغ تک پہنچ جائیں اور وہ جسم کیلئے مفید بھی ہو تو وہ مفسد صوم ہے۔ نیز دانتوں سے خون نکل کر تھوک کے ساتھ ملنے کی تین صورتیں ہیں خون غالب ہوگا یا تھوک اور یا دونوں برابر ہونگے۔ اگر تھوک غالب ہے اور اسکو نگل گیا تو اس صورت میں روزہ نہیں ٹوٹے گا اور اگر خون غالب ہے تو اس صورت میں روزہ ٹوٹ جائیگا اور برابر ہونیکی صورت میں بھی احتیاطاً روزہ ٹوٹ جائیگا۔

لمافي مراقي الفلاح(صـ۵۵۳): (أو) أكل (نواة أو قطنا) أو ابتلع ريقه متغيرا بخضرة أو صفرة من عمل الابريسم ونحوه وهو ذاكر لصومه...... لا كفارة عليه.

وفـي الـطـحـطـاوي عـلـى مـراقـي الفلاح (صـ۵۵۴): (قوله والسعوط) بضم السين الفعل وبفتحها مايتسعط به. (قـولـه صبه) اى الـدواء فـي الأنف هذا معناه لغة والحكم لايخص صب الدواء بل لواستنشق الماء فوصل الى دماغه افطر.

(۴۴) بلا ارادہ حلق میں پانی چلے جانے سے روزہ ٹوٹنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک دن روزے سے تھا ظہر کی نماز کیلئے وضو کر رہا تھا تو کلی کرتے

وقت میرے حلق میں پانی چلا گیا تو کیا اس سے میرا روزہ ٹوٹ گیا؟ اسی طرح بعض دفعہ حلق میں پانی جانے کا صرف شک ہوتا ہے اور بعض دفعہ صرف ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے اس صورت میں کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں اگر روزہ دار کو اپنا روزہ یاد ہو، اور غلطی سے حلق میں پانی چلا جائے تو اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے لیکن اس صورت میں صرف قضا لازم ہوگی نہ کہ کفارہ۔ نیز صرف شک ہونے یا ٹھنڈک محسوس کرنے سے روزہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

لمافي الشامية(۱/۹۱۲): لأن اليقين لايرتفع بالشك.

وفي الدر المختار(۲/۱۰۴): وان الفطر خطأ؛كأن تمضمض فسبقه الماء......

وفي الشامية تحته: (قوله وإن أفطر خطأ) شرط جوابه قوله الآتي قضى فقط........... والمراد بالمخطئ من فسد صومه بفعله المقصود دون قصد الفساد.

(۴۵) نسوار رکھنے سے روزہ ٹوٹنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک چچازاد بھائی ہے وہ رمضان میں باوجود روزہ دار ہونے کے نسوار رکھتا ہے میں اس کو منع کرتا ہوں کہ بھائی نسوار نہ رکھو اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے تو وہ مجھے کہتا ہے کہ نسوار تو منہ میں ہوتی ہے پیٹ میں تو نہیں جاتی ہے اس سے روزہ تو نہیں ٹوٹتا تو میرے دل میں اس بات کے متعلق تشویش پیدا ہوئی تو اسی سلسلے میں ایک دن میں اپنے امام صاحب کے گھر ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے یہ مسئلہ پوچھا تو انہوں نے بھی یہی فرمایا کہ نسوار سے روزہ نہیں ٹوٹتا کیونکہ یہ صرف منہ کے اندر رہتی ہے پیٹ کے اندر نہیں جاتی تو میں نے سوچا کہ آپ سے بھی اس مسئلہ کے متعلق دریافت کرلوں کہ کیا ان کی بات درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......روزہ توڑنے والی چیزوں میں ایک وہ غذا ہے کہ جو اصلاح بدن کا سبب بنتی ہو، اور دوسری وہ ہے کہ جو روزہ دار کیلئے نفع اور تسکین اور لذت کا باعث بنتی ہو۔ اور طبیعت کا میلان اس کی طرف پایا جاتا ہو۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں نسوار کا مروج طریقے پر استعمال جو کہ باعث تسکین ہے اور روزہ دار کی طبیعت کا میلان بھی اس کی طرف پایا جاتا ہے مفسدِ صوم ہے۔

لمافي رد المحتار(۲/۴۱۰): اختلفوا في معنى التغذي، قال بعضهم أن يميل الطبع إلى أكله وتنقضي شهوة البطن به، وقال بعضهم هو مايعود نفعه الى صلاح البدن. وفائدته: فيما اذا مضغ لقمة ثم أخرجها ثم ابتلعها فعلى الثاني، يكفر لا على الأول وبالعكس في الحشيشة. لأنه لانفع فيها للبدن، وربما تنقض عقله ويميل اليها الطبع وتنقضي بها شهوة البطن.

وفي رد المحتار(۲/۳۹۵):وبه علم حكم شرب الدخان ونظمه الشر نبلالي في شرحه على الوهبانية، بقوله ويمنع من بيع الدخان وشربه. وشاربه في الصوم لاشك يفطر، ويلزمه التكفير لوظن نافعاً كذا دافعا شهوات بطن فقررو ا.

وفی فتاویٰ نوازل(صـ ۱۵۱): ولو اکل ورق الشجر الذی یؤکل عادة کأوراق الکروم الذی یطلع أو لا فعلیه القضاء والکفارة.

(۴۶) روزے کی حالت میں دانتوں کی فلنگ کروانے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے اپنے دانتوں کی فلنگ کروانی ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب کی رمضان کی ٹائمنگ صبح کے وقت میں ہی ہے۔ تو کیا میں روزے کی حالت میں فلنگ کرواسکتا ہوں۔ اس سے میرے روزے پر کوئی اثر پڑے گا؟ براہ کرم جلد جواب سے سرفراز فرمادیں۔

الجواب حامداًومصلیاً......فلنگ کروانے سے پہلے چونکہ عام طور پر دانتوں کی صفائی کرائی جاتی ہے جس میں پانی کا حلق سے اتر جانے کا قوی اندیشہ ہے جس سے روزہ ٹوٹتا ہے لہٰذا بہتر یہ ہے کہ روزہ کھولنے کے بعد کرائی جائے البتہ اگر بوجہ عذر روزے کی حالت میں کروانی ہے اور پانی کے حلق سے نیچے جانے سے احتراز ممکن ہو تو پھر جائز ہے۔

لمافی الهندية(۱/۱۹۹): يكره مضغ العلک للصائم كذا في فتاوى قاضي خان...... (و) كره ذوق شئ ومضغه بلا عذر كذا في الكنز ومن العذر في الأول مالو كان زوج المرأة وسيدها سيئ الخلق فذاقت المرقة ومن العذر في الثاني ان لا تجد من يمضغ الطعام لصبيها الخ.

وفي الدرالمختار(۲/۲۱۶): (وكره) له (ذوق شيئ و)كذا (مضغه بلا عذر)...... وكره (مضغ علک) أبيض ممضوغ ملتئم وإلا فيمطر)

وفي الشامية تحته : (قوله وكره مضغ علک) نص عليه مع دخوله في قوله وكره ذوق شئ ومضغه بلا عذر لأن العذر فيه لا يتضح فذكر مطلقا بلا عذر اهتمامارملي...... (قوله أبيض الخ) قيده بذالک لأن الأسود وغير الممضوغ وغير الملتئم يصل منه شيئ إلى الجوف واطلق محمد المسألة وحملها الكمال تبعاً للمتاخرين على ذالک للقطع بأنه معلل بعدم الوصول فان كان مما يصل عادة حكم بالفساد لأنه كالمتيقن.

وفي الفقه الاسلامي (۱۶۹۰/۳): ذوق الطعام والعلک خوفاً من وصول شئ إلى الجوف بالذوق ولأن العلک يجمع الريق فان ابتلعه أفطر في رأى وإن ألقاه عطشه.

(۴۷) روزے کی حالت میں مٹی کھانے سے روزہ ٹوٹنے اور نہ ٹوٹنے کے متعلق تفصیل

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے روزے کی حالت میں مٹی کھالی تو اس کا

روزہ ٹوٹے گا یا نہیں؟ اگر ٹوٹے گا تو قضاء و کفارہ دونوں لازم ہوں گے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....روزہ دار اگر روزہ کی حالت میں قصداً وہ چیزیں کھائے جو بطور دواء یا بطور غذا کے کھائی جاتی ہیں تو اس پر قضاء اور کفارہ دونوں لازم ہوں گے چاہے اس نے بطور دواء یا بطور غذا کھانے کا قصد کیا ہو یا نہیں؟ یا وہ چیزیں کھائے جو عادۃً کھائی جاتی ہیں تو اس سے بھی قضاء اور کفارہ دونوں لازم ہوں گے۔ اگر وہ چیزیں عادۃً کھائی نہیں جاتیں تو صرف قضاء لازم ہوگی کفارہ نہیں الا یہ کہ اس کو اس چیز کے کھانے کی عادت ہو (تو پھر بھی قضاء اور کفارہ دونوں کا لزوم ہوگا)

تو صورت مسئولہ میں اگر اس نے روزے کی حالت میں وہ مٹی کھالی جو عادۃً کھائی جاتی ہے یا عادۃً تو کھائی نہیں جاتی لیکن اس کو اس کے کھانے کی عادت ہو تو قضاء اور کفارہ دونوں لازم ہوں گے اور اگر عادۃً نہیں کھائی جاتی اور نہ اس کو اس کے کھانے کی عادت ہو تو پھر صرف قضاء لازم ہوگی کفارہ نہیں۔

لمافی التاتارخانیه(۳۷۵/۲): م: وان اکل الطین الأرمنی فعلیه الکفارة، (وفی الفتاوی الخلاصة: سواء یعتاد اکله اولا، م: وعن ابی یوسف انه لاتجب الکفارة) وفی الفتاوی العتابیة وفی المنتقی تجب، م: وان اکل الطین الذی یاکله الناس علی سبیل التفکه ذکر الشیخ الامام شمس الائمة الحلوانی فی صومه ان فیه اختلاف المشائخ، وذکر هو فی نوادر صومه انه لا کفارة، قال ثمة: الا ان کثیرا من مشائخنا المتأخرین استحسنوا و اوجبوا الکفارة، وفی البقالی عن ابن المبارک مطلقا انه تجب الکفارة ویرویه عن محمد، وشرط فی بعض روایات المنتقی لوجوب الکفارة الاکل للتداوی، وفی الظهیریة: والطین الذی یغسل به الرأس یفسد الصوم باکله، وان کان یعتاد اکل هذا الطین فعلیه القضاء والکفارة، وفی الخلاصة الخانیة: وکذا فی کل طین یوکل للدواء، وعلیه الفتویٰ.

وفی الهندیة (۲۰۵/۱): (النوع الثانی مایوجب القضاء والکفارة)..... وکذا اذا اکل طینا یوکل للدواء کالطین الارمنی او الطین الذی یقلی فیوکل.

وفیه ایضاً قبل هذه العبارة: اذااکل متعمدا مایتغذی به اویتداوی به یلزمه الکفارة وهذا اذا کان مما یوکل للغذاء او للدواء فاما اذا لم یقصد لهما فلا کفارة وعلیه القضاء کذا فی خزانة المفتین.

(۴۸) روزے کی حالت میں اسپرے وغیرہ کے استعمال کا حکم

سوال　کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کو دمہ کی بیماری ہے ڈاکٹر صاحب نے ایک اسپرے لکھ کر دی ہے کہ اس کو اس پر چھڑک دینا یہ صحیح ہو جائے گا، اب یہ شخص روزے سے ہے اور اس کو تکلیف ہے آیا اس کے منہ پر اسپرے چھڑک دینے سے اس کے روزے پر کچھ فرق پڑے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً دمہ کے مریض جیسے اگر ڈاکٹر نے انہیلر تجویز کیا ہو جو کہ معروف ہے، کہ اس کے ذریعے ایک گیس ناک یا منہ کے ذریعے اندر ڈالی جاتی ہے، یہ فساد صوم کا باعث ہے، اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ہاں اگر کوئی ایسا اسپرے ہو جو ظاہر بدن پر چھڑکا جاتا ہو، اور اس کی خوشبو اور ٹھنڈک سے مریض کو راحت ہو، یا دواء وغیرہ کے اجزاء واثرات منہ میں نہ جاتے ہوں تو اس سے روزے پر کچھ اثر نہیں پڑے گا۔

لما في الهندية(۲۰۳/۱): ولو دخل حلقه غبار الطاحونة أو طعم الأدوية أو غبار الهرس وأشباهه أو الدخان ... وأشباه ذلك لم يفطر وما يدخل من مسام البدن من الدهن لايفطر. هكذا في شرح المجمع ومن اغتسل في ماء وجد برده في باطنه لا يفطره. هكذا في النهر الفائق.

وفيه ايضاً(۲۰۴/۱): ومن احتقن أو استعط أو أقطر في أذنه دهنا أفطر ولا كفارة عليه، هكذا في الهداية، ولو دخل الدهن بغير صنعه فطره كذا في محيط السرخسي. ولو أقطر في أذنه الماء لايفسد صومه كذا في الهداية.

وفي الشامية(۳۹۵/۲): قوله (أنه لو ادخل حلقه الدخان) أى بأى صورة كان الإدخال، حتى لو تبخر ببخور فآواه إلى نفسه واشتمه ذاكرا لصومه أفطر. لإمكان التحرز عنه وهذا مما يغفل عنه كثير من الناس، ولا يتوهم أنه كشم الورد ومائه والمسک لوضوح الفرق بين هواء تطيب بريح المسک و شبهه وبين جوهر دخان وصل إلى حوفه بفعله.

(۴۹) روزے کی حالت میں بھول کر کھا پی لینے کے بعد قصداً کھانا

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کل کے روزے کے متعلق تو آپ کو پتہ ہی ہوگا کہ کتنا شدید روزہ تھا اور کس قدر گرمی تھی تو مجھے بھی گرمی کی شدت سے بہت محسوس ہوئی بالکل حواس باختہ ہوگیا تھا اور ظہر کی نماز کے بعد سو گیا چار بجے جب اٹھا تو باورچی خانے کی طرف بڑھا اور بھول کر کھانا کھا لیا درمیان میں یاد آ گیا لیکن میں نے یہ سمجھ کر کھا لیا کہ اب تو روزہ ٹوٹ گیا ہے بعد میں معلوم ہوا کہ بھول کر کھانا کھانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، تو اب میرے لئے کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً صورت مسئولہ میں بھول کر کھانے کے بعد قصداً کھانے کی وجہ سے روزہ فاسد ہوگیا ہے لہٰذا اس کی قضا لازم ہے البتہ کفارہ لازم نہیں ہے۔

لما في التاتارخانية(۳۹۴/۲): قال محمد في الجامع الصغير: اذا أكل أوشرب أو جامع في نهار رمضان ناسيا، في جامع الجوامع أو مكرها. م: فظن أن ذلک يفطره فأكل بعد ذلک متعمدا فلا كفارة عليه. لاتلزمه الكفارة على كل حال وهو الصحيح.

وفي الهندية(۱/۲۰٦): لو أكل أو شرب أو جامع ناسياً وظن أن ذلک فطره فأكل متعمدا لاكفارة عليه وإن علم أن صومه لايفسد بالنسيان عند أبي حنيفة رحمه الله تعالىٰ لاتلزمه هو الصحيح.

وفي الشامية(۲/۴۰۱،۴۰۲): وإنما لم تجب الكفارة بإفطاره عمدا بعد أكله أو شربه أو جماعه ناسياً لأنه ظن في موضع الاشتباه بالنظير وهو الأكل عمدا لان الأكل مضاد للصوم ساهيا أوعامدا فأورث شبهة وكذا فيه شبهة اختلاف العلماء.

(۵۰) بیوی سے بوس وکنار اور پیار ومحبت کرنے سے انزال ہوجائے تو روزہ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ایک دوست نے یہ مسئلہ معلوم کیا ہے کہ ان کی ابھی رمضان سے چار پانچ روز قبل نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ ان کے ساتھ ایک یا دو مرتبہ یہ واقعہ پیش آ گیا ہے کہ دن میں وہ اپنی بیوی سے پیار و محبت کررہے تھے کہ اُن کو انزال ہوگیا اس سے روزے پر کچھ فرق پڑے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....صورت مسئولہ میں آپ کے مذکورہ دوست کا روزہ فاسد ہوگیا اور جتنے روزوں میں ان سے یہ فعل سرزد ہوا ہے ان کی صرف قضا لازم ہوگی کفارہ نہیں۔

وفي الهندية(۱/۲۰۴): واذا قبل امراته وانزل فسد صومه من غير كفارة كذا في المحيط. قال. ولو مس المرأة وراى ثيابها فامنى فان وجد حرارة جلدها فسد والا فلا كذا في معراج الدراية.

وفي الشامي(۲/۴۰۴): (قوله ولو قبلة فاحشة) ففي غيرا لفاحشة مع الانزال لاتجب الكفارة بالاولى (قوله بأن يدغدغ) لعل المراد به عض الشفة ونحوها او تقبيل الفرج.

(۵۱) قے آنے سے روزہ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دن میں روزے سے تھا اور سفر کررہا تھا کہ گاڑی کے اندر میری طبیعت خراب ہوگئی اور قے آ گئی تو کیا اس سے میرا روزہ ٹوٹ گیا؟ اور میرے اوپر کفارہ لازم ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... قے اگر خود بخود آ جائے خواہ منہ بھر کے ہو یا نہ ہو مفسد صوم نہیں۔ البتہ اگر کسی نے قصداً قے کی ہے تو وہ اگر منہ بھر کے ہو تو بالاجماع مفسد ہے البتہ کفارہ نہیں ہے اور اگر قلیل ہے تو صحیح قول کے مطابق اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

لما في الهندية(۱/۲۰۴): اذا قاء أو استقاء ملئ الفم أو دونه عاد بنفسه أو اعاد أو خرج فلا فطر على الأصح الا في الاعادة والاستقاء بشرط ملئ الفم هكذا في النهر الفائق،

وفي الشامية(۲/۴۱۴): (قوله وان ذرعه القيئ): أي غلبه وسبقه قاموس والمسألة تتفرع إلى أربع

وعشرين صورة لأنه إما أن يقئ أو يستقئ وفي كل إما أن يملأ الفم أو دونه، وكل من الأربعة اما ان خرج او عاد او اعاده وكل اما ذاكر لصومه اولا ولافطر في الكل على الاصح الا في الاعادة والاستقاء بشرط الملئ مع التذكر شرح الملتقى.

(۵۲) قے کی مفسد صوم ہونے کی ایک صورت پر اشکال اور اس کا جواب

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بندہ نے آپ کا نقشہ سحر وافطار ۱۴۳۰ھ میں ایک مسئلہ مفسدات صوم کے متعلق پڑھا ہے کہ''تھوڑی سی بھی قے از خود آئی اور اس کو بالقصد پیٹ میں اتار دینا''۔ جبکہ اس مسئلہ میں بندہ کی دانست میں دو قیدیں اور ہونی چاہئیں: (۱) منہ بھر کر قے آئے، (۲) کم سے کم چنے کی مقدار کے برابر پیٹ میں اتارے۔ حوالہ درج ذیل ہے:

(۱)۔ مسائل بہشتی زیور حصہ اول، صفحہ ۴۰۹ (حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب) میں یہ مسئلہ لکھا ہوا ہے کہ۔ ''بلا ارادہ خود بخود منہ بھر کر قے آئی پھر روزہ یاد ہوتے ہوئے قصداً اس کو منہ کے اندر سے ہی واپس نگل لیا خواہ تمام کو نگلے یا کچھ کو نگلے جبکہ نگلی ہوئی تعداد چنے کے برابر یا اس سے زائد ہو۔ مزید تفصیل صفحہ ۴۰۲ میں بھی ہے۔

(۲)۔ نیز احسن الفتاویٰ (۴/۴۴۳) بحوالہ شامی مذکور ہے کہ''اگر قے منہ بھر آئی اور ایک چنے کی مقدار یا اس سے زائد عمداً واپس لوٹائی تو روزہ ٹوٹ گیا۔

(۳)۔ اور شامی (۲/۴۱۴، ایچ ایم سعید کمپنی) میں چنے کی مقدار کا تذکرہ اس طرح ہے: وان اعاده او قدر حمصة منه فاكثر حدادى افطر اجماعا ولا كفارة ان ملا الفم والا لا...... حاشیہ میں مزید تفصیل ہے۔

نیز دعائے تراویح اور روزے کی عربی نیت کا حوالہ چاہئے تھا، کیونکہ لوگ اس کو سنت سمجھ کر پڑھتے ہیں۔

الجواب حامداً ومصلياً...... مکرمی ومحترمی جناب...... السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ آنجناب کو بہت بہت جزائے خیر عطا فرمائے کہ آپ نے ہماری اس طرف توجہ کروائی۔ واقعتاً ہمارے نقشہ سحر وافطار میں قے کا جو مسئلہ لکھا گیا تھا وہ اجماعی صورت نہ تھی بلکہ وہ امام محمد رحمہ اللہ کا قول ہے جو شامی کی عبارت سے غیر مختار معلوم ہوتا ہے۔ اور ہمیں حیرت اس بات پر ہوئی کہ حکیم الامہ حضرت اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے بھی''بہشتی زیور''میں مفسدات صوم کے باب میں امام محمد رحمہ اللہ کے اسی قول کو لکھا ہے کہ جامعۃ الرشید کی طرف سے حال ہی میں بہشتی زیور پر جو کام ہوا اور جسے تسہیل بہشتی زیور کے نام سے شائع کیا گیا اس میں بھی یہ مسئلہ بعینہٖ اسی طرح لکھا گیا اور حاشیہ میں بھی اس پر کوئی کلام نہیں کیا گیا۔ اور''آپ کے مسائل اور ان کا حل''میں حضرت لدھیانوی شہید رحمہ اللہ نے بھی قے کے قصداً لوٹانے کو مطلقاً مفسد صوم فرمایا ہے کوئی مقدار ذکر نہ کی۔

بہر کیف آپ نے جن قیودات کو بڑھانے کیلئے فرمایا ہے واقعتاً اس صورت میں یہ مسئلہ بالا جماع مفسد صوم ہو جائے گا۔ ہم ان شاء اللہ آئندہ دفعہ اپنے نقشہ میں اجمالی صورت ہی کو لکھیں گے۔

آپ کی اس تنبیہ پر ہم نے اپنے پورے نقشہ کے مسائل کو ایک مرتبہ مزید تحقیق کیلئے دارالافتاء میں داخل کروا دیا ہے۔ نیز ہمارے نقشہ میں "دعائے تراویح" کے الفاظ شامی (۲/۴۶) سے لئے گئے ہیں مشہور دعائے تراویح کے الفاظ کا کوئی مستند حوالہ ہمیں مل نہ سکا تھا اس لئے شامی کے الفاظ کو نقل کیا۔ اور رہا مسئلہ نیت صوم کے الفاظ کا تو اصل مسئلہ تو یہی ہے کہ زبان سے نیت کے الفاظ ادا کرنا ضروری نہیں اور بدعت ممنوعہ بھی نہیں۔ ادا کرلے تو گنہگار نہیں ہوگا نہیں ادا کرے تو کوئی حرج نہیں، نیت تو مراد قلبی کا نام ہے وہ ادائے صوم کیلئے کافی ہے۔ چنانچہ درمختار (۲/۳۸۰) میں ہے والسنة أن يتلفظ بها اور علامہ شامی رحمہ اللہ نے حاشیہ میں لکھا ہے (قوله والسنة) ای سنة المشايخ لا النبی ﷺ لعدم ورود النطق بها عنه.

باقی اگر نیت صوم کی زبان سے ادائیگی ہو تو کیا الفاظ کہے جائیں؟ تو اس کی کوئی خاص تعیین نہیں ہے علامہ شامی رحمہ اللہ نے نويت اصوم غدا وغیرہ الفاظ لکھے ہیں۔ ہمارے دیار میں چونکہ عام طور پر لوگوں میں بصوم غدنويت من شهر رمضان کے الفاظ سے نیت صوم کرنا عام ہے اور حضرت مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ نے جواہر الفقہ (۱/۳۸۱) پر اور حضرت لدھیانوی شہید رحمہ اللہ نے آپ کے مسائل اور ان کا حل (۳/۲۶۳) پر نیتِ صوم کیلئے انہی الفاظ کو لکھا ہے انہی بزرگوں کی اتباع میں ہم نے بھی بغیر دعوئ مسنونیت کے ان الفاظ کو لکھا ہے۔

امید ہے کہ آئندہ بھی آنجناب ہماری کوتاہیوں، غلطیوں کی اصلاح فرماتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے علم وعمل اور عمر میں برکت عطا فرمائے۔ آمین۔

(۵۳) روزہ رکھنے کے بعد ماہواری شروع ہو جانے پر روزوں کا حکم

سوال .. کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت نے رمضان المبارک کو صبح روزہ رکھا اور دن ۱۲ بجے اس کو ماہواری خون شروع ہو گیا اب اس عورت کیلئے کیا حکم ہوگا؟ نیز یہ عورت روزے رکھے گی یا اس پر معاف ہوں گے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... جس عورت کو روزے کی حالت میں ماہواری شروع ہو جائے تو اس کا اس دن کا روزہ نہیں ہوا بعد میں اس کی قضاء کرے، اس عورت کو ماہواری کی حالت میں روزہ رکھنا جائز نہیں ہے، بلکہ ان روزوں کی بعد میں قضاء کرے گی۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں اس عورت پر ماہواری کے شروع ہونے والے دن اور دوسرے ایام کے روزوں کی قضاء لازم ہوگی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

لما في التاتارخانية(۲/۳۸۷): الخلاصة: الحائض والنفساء لا تصومان وتقضيان...... (شرح الطحاوي): ومن افطر في شهر رمضان بعذر كالمريض والمسافر والحائض وغيرها إن كان يقدر على القضاء يلزمه القضاء لاغير، ولا يجزيه الإطعام اذا كان يرجى له القدرة على الصيام في

المستقبل.

وفي الهندية(۱/ ۲۰٦): (ومنها الحيض والنفاس) وإذ حاضت المرأة أو نفست افطرت كذا في الهداية.....

فالاصل عندنا انه اذا صار في آخر النهار على صفة لوكان عليها في أول اليوم يباح له الفطر تسقط عنه الكفارة كذا في فتاوى قاضيخان.

(۵۴) روزے کی حالت میں جانور سے بدفعلی کرنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے رمضان المبارک میں روزہ رکھا اور روزہ کی حالت میں شہوت کا غلبہ ہوا تو اس نے گدھی سے بدفعلی کرلی تو اس پر کفارہ ہوگا یا نہیں؟ نیز اگر کوئی شخص ایسا ہو کہ کفارہ ادا نہ کرسکتا ہو تو شرعاً اس کیلئے کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداًومصلیاً ...اگر کوئی شخص رمضان المبارک میں حالت روزہ میں کسی جانور کے ساتھ بدفعلی کرلے اگر انزال ہوجائے تو روزہ ٹوٹ جاتا ہے اس شخص پر قضا لازم ہوتی ہے کفارہ لازم نہیں۔ اگر انزال نہ ہو تو روزہ بھی نہیں ٹوٹتا لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر اس شخص کو انزال نہیں ہوا تو روزہ بھی نہیں ٹوٹا، اگر انزال ہوا ہے تو پھر روزہ ٹوٹ گیا ہے اب اس شخص پر صرف قضا ہوگی کفارہ نہیں۔ اگر کسی شخص پر کفارہ صوم لازم ہوجائے اور کسی طریقے سے بھی اس کو ادا کرنے پر قدرت نہ رکھتا ہو تو وہ توبہ واستغفار کرتا رہے۔

لمافي الهندية(۱/ ۲۰۵): اذا جامع بهيمة او ميتة او جامع فيما دون الفرج ولم ينزل لا يفسد صومه وان انزل في هذه الوجوه كان عليه القضاء دون الكفارة......

وفي الدرالمختار(۲/ ۳۹۹): (او ادخل ذكره في بهيمة) او ميتة (من غير انزال) او (مس فرج بهيمة او قبلها فانزل او اقطر في احليله)......

وفي الشامية تحته: (قوله فانزل) وكذا لا يفسد صومه بدون انزال بالاولى.

وفي الدرالمختار(۲/ ۴۲۷): (ويفدى) وجوبا ولو في اول الشهر وبلا تعدد فقير كالفطرة لوموسرا والا فيستغفر الله.

﴿جن چیزوں سے روزہ نہیں ٹوٹتا﴾

(۵۵) روزے کی حالت میں انجکشن لگوانا

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں کہ رمضان میں ایک دفعہ مجھ کو سخت بخار ہوا میں دوائی لینے ڈاکٹر کے پاس گیا اس نے مجھ کو انجکشن لگایا جب میں گھر آیا اور شام کو اپنے گھر والوں سے اس کا تذکرہ کیا تو میرے چچا کہنے لگے کہ روزے کی حالت میں انجکشن لگانا جائز نہیں ہے۔ اب آپ سے یہ دریافت کرنا ہے کہ روزے کی حالت میں انجکشن لگوانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... روزے کی حالت میں انجکشن اگر بیماری وغیرہ کی وجہ سے لگوایا جائے تو بلا کراہت درست ہے۔ اور جب کوئی بیماری وغیرہ نہ ہو صرف طاقت کیلئے لگوانا ہو تو رات مغرب کے بعد لگوانا چاہئے روزے کی حالت میں اس طرح کا انجکشن لگوانا مکروہ ہے۔

لما في الهندية (۱/۱۹۹): ولا بأس بالحجامة ان أمن على نفسه الضعف أما اذا خاف فانه يكره وينبغي له أن يؤخر الى وقت الغروب.

وفي الهندية(۱/۲۰۳): ومايدخل من مسام البدن من الدهن لايفطر هكذا في شرح المجمع ومن اغتسل في ماء وجد برده في باطنه لا يفطره.

وفي الشامية(۲/۳۹۵،۳۹۶): والمفطر انماهو الداخل من المنافذللا تفاق على ان من اغتسل في ماء فوجدبر ده في باطنه انه لايفطر.

(۵۶) رگ میں انجکشن لگوانے سے روزے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری والدہ شوگر کی مریضہ ہیں اور ان کو انسولین کے انجکشن لگتے ہیں کبھی رمضان وغیرہ میں بھی اس کی نوبت آتی ہے یعنی انجکشن لگوانے کی، آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ انجکشن لگوانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں، میں نے بعض لوگوں سے سنا ہے کہ رگ میں لگوانے سے ٹوٹ جاتا ہے ورنہ نہیں کیا دونوں میں فرق ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورت مسئولہ کے جاننے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ روزہ کا فساد وعدم فساد اس بات پر موقوف ہے کہ معتاد ذرائع سے کوئی چیز (دواوغیرہ) دماغ یا معدہ تک پہنچ جائے تو اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اور جو چیز دماغ یا معدہ تک نہیں پہنچتی تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ پس صورت مسئولہ میں آجکل کے ماہرین طب کے مطابق انجکشن لگانے سے دوا دماغ یا معدے تک نہیں پہنچتی ہے بلکہ یہ رگوں میں حلول کر کے بدن کو راحت پہنچانے کا ذریعہ بنتی ہے۔ لہٰذا اسکے لگانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ پھر خواہ یہ انجکشن رگ میں

ہو یا گوشت میں البتہ اگر کوئی ایسا انجکشن لگائے جسکے ذریعہ دوا معدے یا دماغ تک ماہرینِ طب کے مطابق پہنچ جاتی ہو تو ایسی صورت میں انجکشن لگانے سے روزہ ٹوٹ جائیگا۔

لما في الهندية (۱/۱۹۹): ولا بأس بالحجامة ان أمن على نفسه الضعف أما اذا خاف فانه يكره وينبغي له أن يؤخر الى وقت الغروب.

وفي الهندية(۱/۲۰۳): ومايدخل من مسام البدن من الدهن لايفطر هكذا في شرح المجمع ومن اغتسل في ماء وجد برده في باطنه لا يفطره.

وفي الشامية(۲/۳۹۵،۳۹۶): والمفطر انماهو الداخل من المنافذللا تفاق على ان من اغتسل في ماء فوجدبرده في باطنه انه لايفطر.

(۵۷) انجکشن لگانے سے روزہ نہ ٹوٹنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اس سال رمضان المبارک کی ابتداء میں بیمار تھا۔لیکن رمضان المبارک کی خوشی میں میں نے اسی حالت میں روزہ رکھ لیا۔لیکن دو پہر تک میری طبیعت اور خراب ہوگئی تو میں ڈاکٹر کے پاس چلا گیا۔انہوں نے انجکشن لگانے کا کہا تو میں نے کہا کہ اس سے تو روزہ ٹوٹ جائے گا،اس پر ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میں نے اس بارے میں ایک عالم دین سے پوچھا تھا تو انہوں نے کہا کہ انجکشن سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔کیا ڈاکٹر صاحب کی یہ بات درست ہے؟ حکم شرعی بیان فرما کر اجر کے مستحق ہوں۔

الجواب حامداًومصلیاً ڈاکٹر صاحب کی بات درست ہے۔تاہم روزے میں بلا عذر طاقت کا انجکشن لگوانا مکروہ ہے۔

لما في البحر الرائق(۲/۴۷۶): والداخل من المسام لامن المسالك فلا ينا فيه كمالو اغتسل بالماء البارد ووجد برده في كبده.

وفي المقالات الفقهيه(۱/۸۵): يتحصل من المسائل والجزئيات التي ذكرها الفقهاء في فساد الصوم ان الجوف المعتبر في نفسه عند الحنفية والمالكية هي المعدة والحلق والامعاء، اما الاجواف الأخر التي توجد في باطن الجسم الانساني فما كان له مسلك الى احد هذه الثلاثة بحيث اذا وصل شيء من الخارج الى هذا الجوف وصل الى احد هذه الثلاثة عادة اما مباشرة واما بواسطة جوف آخر فهو ايضا جوف معتبر تبعالها فياخذ حكمها وما لايكون كذلك فليس بجوف معتبر عندهم لا اصالة ولا تبعا وفيه ايضاً (۱/۱۱۰) الاصول الثلاثة المتفق عليها في المنافذ.

الاصل الاول: اتفقت المذاهب الاربعة على ان الفطر انما يحصل إذا وصل الشيء المفطر الى

الجوف المعتبر من المنفذ المعتبر ولافطر اذا لم يصل اليه ولا اذا وصل اليه من منفذ غير معتبر.

الاصل الثاني: ان كل ثقبة او فتحة في ظاهر الجسم ليس لها مسلك الى "الجوف المعتبر في الصيام" لامباشرة ولا بواسطة قناة او جوف آخر فهي "منفذ غير معتبر" في المذاهب الاربعة سواء كانت الفتحة خلقية او غير خلقية فلا يفسد الصوم عند احد بما يدخل الى باطن الجسم بمثل هذا المنفذ ولا اعلم فيه خلافا وهو الموافق للقياس...... الاصل الثالث ان الثقبات والفتحات التي توجد في ظاهر الجسم الى باطنه فمنها ماهي ظاهرة النفوذ الى الجوف المعتبر كالفم والانف والدبر فلا يحتاج فيها الى رأى الطب ومنها مافي نفوذها وعدم نفوذها الى الجوف المعتبر خفاء فالجزم فيها بانها نافذة اليه او لا؟ ..... فلا بدفيها من الاعتماد على اهل الطب وخبرائه كما يظهر من عبارات الفقهاء المارة الآتية فان "لكل فن رجال".

وفي اللجنة(۲۵۲/۱۰): س: ماحكم التداوي بالحقن في نهار رمضان سواء كانت للتغذية ام التداوي؟ ج: يجوز التداوي بالحقن في العضل والوريد للصائم في نهار رمضان و لايجوز للصائم تعاطي حقن التغذية في نهار رمضان لانه في حكم تناول الطعام والشراب فتعاطي تلك الحقن يعتبر حيلة على الافطار في رمضان وان تيسر تعاطي الحقن في العضل والوريد ليلا فهو اولىٰ.

(۵۸) روزے کی حالت میں بھول کر کھانے پینے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دن میں نے روزے کی حالت میں بھول کر کھانا شروع کر دیا اتنے میں میرے ایک پڑوسی تشریف لائے جو کہ کافی دینی معلومات رکھتے ہیں انہوں نے مجھے کچھ نہیں کہا اور باتیں کرتے رہے جب میں کھانے سے فارغ ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ آپ کا تو روزہ تھا۔ میں نے کہا آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا فرمانے لگے اگر کوئی شخص روزہ دار کو کھاتے یا پیتے ہوئے دیکھ لے تو اس کو اسی وقت نہیں بتانا چاہئے تاکہ وہ کھانا کھالے بعد میں بتانا چاہئے کیا ان کی یہ بات درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ..... اگر کوئی شخص روزہ کی حالت میں بھول کر کوئی چیز کھا یا پی رہا ہو تو اس کو روزے کے بارے میں ضرور یاد دلا دینا چاہئے بشرطیکہ اس میں روزے سے پورا دن گزارنے کی قدرت ہو، خواہ بوڑھا ہو یا جوان۔ البتہ اگر بھول کر کھانے والا بیمار یا کمزور ہو تو اس کو اگر نہ بتایا جائے تو گنجائش ہے۔

لمافي الهندية(۲۰۲/۱): رجل نظر الى صائم يأكل ناسيا ان رأى فيه قوة يمكنه ان يتم الصوم الى الليل فالمختار انه يكره ان لا يذكره وان كان يضعف في الصوم بأن كان شيخا كبيرا يسعه ان لا يخبره. كذا

فی الظهيرية فی فصل الاعذار المبيحة.

وفی الشامية(۲/۳۹۵): (قوله ويذكره) ای لزوما كما فی الولوالجية فيكره تركه تحريما بحر وقوله لو قويا ای له قوة علی اتمام الصوم بلا ضعف واذا كان يضعف بالصوم ولو اكل يتقوی علی سائر الطاعة يسعه ان لايخبره فتح وعبارة غيره الاولی ان لا يخبره وتعبير الزيلعی بالشاب والشيخ جری علی الغالب، ثم هذا التفصيل جری عليه غير واحد وفی السراج عن الواقعات المختار انه يذكره مطلقا نهر.

(۵۹) روزے کی حالت میں بلغم یا ناک کی ریزش نگل لینے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص روزہ کی حالت میں بلغم یا ناک کی ریزش وغیرہ نگل لے تو اس سے روزے پر کچھ فرق پڑے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... روزہ کی حالت میں بلغم یا ناک کی ریزش وغیرہ منہ کے اندر ہی سے نگل لینے سے روزے پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔

لما فی الهندية(۱/۲۰۳): ولو دخل المخاط انفه من راسه ثم استشمه فادخل حلقه عمدا لم يفطره لانه بمنزلة ريقه كذا فی محيط السرخسی.

وفی رد المحتار(۲/۴۰۰): ومن قول الظهيرية وكذا المخاط والبزاق يخرج من فيه وانفه فاستشمه واستنشقه لايفسد صومه اهـ.

(۶۰) منہ میں گردوغبار جانے سے روزہ کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص روزے سے ہو، اور اس کے منہ میں گردوغبار چلا جائے تو اس کا روزہ ٹوٹ جائے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... بلا اختیار منہ میں گردوغبار چلے جانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

لما فی الدر(۲/۳۹۵): (او دخل حلقه غبار او ذباب او دخان) ولو ذاكرا استحسانا لعدم امكان التحرز عنه.

وفی الشامية(۲/۳۹۵): (قوله استحسانا) وفی القياس يفسد...... (قوله لعدم امكان التحرز عنه) فاشبه الغبار والدخان لدخولهما من الانف اذا اطبق الفم كما فی الفتح وهذا يفيد انه اذا وجد بدا من تعاطی مايدخل غباره فی حلقه افسد لوفعل شرنبلالية.

(۶۱) منہ میں مکھی چلے جانے کی صورت میں روزہ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ایک دوست کے ساتھ پرسوں یوں ہوا کہ اسے جمائی آئی اور وہ منہ پر ہاتھ نہ رکھ سکا، اس کے منہ میں مکھی چلی گئی، اب وہ بڑا پریشان ہوا کہ آیا اس سے اس کا روزہ تو کہیں نہیں ٹوٹ گیا؟ آنجناب اس کا تسلی بخش جواب عنایت فرمادیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... ہر وہ چیز جس کا کھانا مقصود نہ ہو، اور اس سے بچنا ناممکن ہو، اگر وہ بلا قصد واختیار روزہ دار کے منہ میں چلی جائے تو اس سے روزہ فاسد نہیں ہوتا۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں مکھی کے منہ میں چلے جانے کی وجہ سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

لما في الهندية(۱/۲۰۳): وما ليس بمقصود بالاكل ولا يمكن الا حتراز عنه كالذباب اذا وصل الى جوف الصائم لم يفطره.

وفي الدر المختار (۲/۳۹۵): (او دخل حلقه غبار او ذباب او دخان) ولو ذاكراً استحسانا لعدم امكان التحرز عنه. ومفاده انه لو ادخل حلقه الدخان افطر اى دخان كان ولو عودا او عنبرا لو ذاكرا لامكان التحرز عنه.

(۶۲) روزہ کی حالت میں خون نکالنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ایک عزیز کا رمضان المبارک میں ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ جس سے وہ کافی زخمی ہوگئے۔ جب ہم ہسپتال پہنچے تو ڈاکٹروں نے خون کا مطالبہ کیا جس پر ہم تین ساتھیوں نے خون دیا جبکہ ہم روزے سے تھے تو کیا شرعاً خون دینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟ حکم شرع بیان فرما کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... روزہ کی حالت میں خون دینے سے روزہ نہیں ٹوٹتا اور اگر عذر کی وجہ سے ہے (جیسا کہ صورت مسئولہ میں) تو مکروہ بھی نہیں۔

لما في المحيط (۳/۳۵۶): ۳۱۱۲. اذا اراد ان (يحتجم) ان امن على نفسه الضعف لا بأس به فاما ان خاف ان يضعفه فانه يكره وينبغى ان يؤخر الى وقت الغروب هكذا ذكر شمس الائمة الحلوانى رحمه الله تعالى وذكر شيخ الاسلام المعروف "بخواهرزاده" وشرط الكراهة ضعف يحتاج فيه الى الفطر والفصد يكون نظير الحجامة.

وفي الهندية(۱/۱۹۹): ولا بأس بالحجامة ان امن على نفسه الضعف اما اذا خاف فانه يكره وينبغى له ان يؤخر الى وقت الغروب وذكر شيخ الاسلام شرط الكراهة ضعف يحتاج فيه الى الفطر

والفصد نظير الحجامة هكذا في المحيط.

(۶۳) بچھو کے کاٹنے سے روزے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم خدا کی بستی میں رہتے ہیں جس کے اطراف میں کیکر اور جھاڑیاں ہیں اور جنگل نما ہے اس میں بچھو اور سانپ وغیرہ کا بسیرا ہے جس سے عوام اکثر پریشان رہتے ہیں اس رمضان میں میرا بھائی دوپہر کے وقت روزے کی حالت میں سو رہا تھا کہ اس کو بچھو نے کاٹ لیا اور زہر جسم میں داخل ہو گیا اور اس کو درد شدید ہو رہا تھا تو کیا اس سے اس کا روزہ ٹوٹ گیا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر کسی روزہ دار آدمی کو بچھو نے کاٹ لیا تو اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا اگرچہ پورے بدن میں زہر پھیل جائے۔ البتہ اگر وہ علاج کیلئے روزہ توڑنا چاہے تو توڑ سکتا ہے بشرطیکہ طبیب حاذق نے کسی دوائی کے بارے میں تصریح کی ہو کہ یہ مفید ہے۔

لما في التاتارخانية(۲/۳۸۴): سئل الشيخ ابو القاسم عمن لدغته الحية فأفطر لشرب الدواء قال: اذا قيل له إن ذلك ينفعه فلا بأس به.

وفي البزازية على الهندية(۴/۱۰۵): لدغته الحية فأفطر لشرب الدواء، والدواء ينفعه لابأس به.

وفي الدر المختار(۲/۴۲۱): "فصل في العوارض المبيحة لعدم الصوم". وقد ذكر المصنف منها خمسة وبقي الاكراه وخوف هلاک أو نقصان عقل ولوبعطش أو جوع شديد ولسعة حية.

وفي رد المحتار: جمع عارض، والمراد به هناما يحدث للإنسان مما يبيح له عدم الصوم ... عدل عن قول البدائع المسقطة للصوم لما أوردعليه في النهر من أنه لايشمل السفر فإنه لايبيح الفطر وإنما يبيح عدم الشروع في الصوم.

(۶۴) روزہ دار کا کسی دوسرے شخص کے تھوک کو نگل جانا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کا تھوک نگل لے تو اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا یا نہیں؟ اگر ٹوٹ جاتا ہے تو صرف قضاء لازم ہوگی یا قضاء اور کفارہ دونوں لازم ہوں گے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں یقیناً روزہ ٹوٹ جائے گا اور اگر تھوک کسی ایسے شخص کا ہو جس کو نگلنے سے گھن محسوس نہ ہو بلکہ تلذذ کے طور پر نگل لیا جاتا ہے (جیسے میاں بیوی کا ایک دوسرے کا تھوک نگلنا) تو اس صورت میں قضاء کے ساتھ ساتھ کفارہ بھی لازم آئے گا، ورنہ صرف قضا لازم آئے گی۔

لمافي الهندية(۱/۲۰۳): ولو ابتلع بزاق غيره فسد صومه بغير كفارة الا اذا كان بزاق صديقه

فحینئذ تلزمه الکفارة کذا فی المحیط.

وفی الدر المختار(۲/ ۴۳۹): (ابتلع الصائم بصاق محبوبه) یقضی و (یکفر والا) یکن محبوبه (لا) یکفر ومرفی الصوم.

(۶۵) روزے کی حالت میں بلغم اور آنسو نگلنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے روزے سے متعلق چند چیزوں کے بارے میں پوچھنا تھا۔(۱) ناک کی ریزش یا بلغم کو اگر کوئی حالت روزہ میں نگل جائے تو کیا حکم ہے؟ (۲) اسی طرح اگر روزے کی حالت میں روتے ہوئے نکلنے والے آنسو منہ چلے گئے تو اس صورت میں روزے کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیا...... (۱)۔ناک کی ریزش کو یا بلغم کو اگر منہ سے باہر نکالے بغیر نگل لیا تو روزہ فاسد نہ ہوگا۔اگر باہر نکال کر پھر نگلا تو روزہ فاسد ہوجائے گا۔

(۲)۔اگر ایک دو آنسو کے قطرے منہ میں چلے گئے تو اس سے روزہ فاسد نہ ہوگا،اور اگر تمام منہ میں یا اکثر منہ میں آنسو کا ذائقہ معلوم ہوا پھر ان کو نگل لیا تو روزہ فاسد ہوجائے گا۔

لما فی الهندیة(۱/ ۲۰۳): ولو دخل المخاط أنفه من رأسه ثم استشمه فادخل حلقه عمداً لم یفطره لانه بمنزلة ریقه ...... الدموع اذا دخلت فم الصائم ان کان قلیلاً کالقطرة والقطرتین او نحوها لایفسد صومه وان کان کثیراً حتی وجد ملوحته فی جمیع فمه واجتمع شئ کثیر فابتلعه یفسد صومه.

وفی الدر المختار(۲/ ۴۰۰): أو دخل أنفه مخاط فاستشمه فدخل حلقه) وان نزل لرأس أنفه کما لو ترطب شفتاه بالبزاق عند الکلام ونحوه فابتلعه أو سال ریقه الی ذقنه کالخیط ولم ینقطع فاستنشقه (ولو عمداً) خلافاً للشافعی فی القادر علی مج النخامة فینبغی الاحتیاط (أو ذاق شیأ بفمه) وان کره لم (یفطر).

وفی الشامیة تحته: سئل ابراهیم عمن ابتلع بلغماً قال ان کان أقل من ملء فیه لا ینقض اجماعاً وان کان مل فیه ینقض صومه عند أبی یوسف وعند أبی حنیفه لا ینقض.

وفیه ایضاً(صـ ۴۰۴): قوله فان وجد الملوحة فی جمیع فمه واجتمع شئ کثیر وابتلعه افطر والا لا.

وفی الشامیة تحته: بهذا دفع فی النهر ما بحثه فی الفتح من ان القطرة یجد ملوحتهافالاولیٰ الاعتبار بوجد ان الملوحة لصحیح الحس اذلا ضرورة فی اکثر من ذلک ولذا اعتبر فی الخانیة الوصول

الی الحلق، ووجه الدفع ماقاله فی النهر من ان کلام .... ظاهر فی تعلیق الفطر علی وجدان الملوحة فی جمیع الفم ولا شک ان القطرة والقطرتین لیستا کذلک وعلیه یحمل مافی الخانیة وفی الامداد عن خط المقدسی ان القطرة لقلتها لا یجد طعمها فی الحلق لتلاشیها قبل الوصول، ویشهد لذالک مافی الواقعات للصدر الشهید اذا دخل الدمع فی فم الصائم ان کان قلیلاً نحو القطرة او القطرتین لا یفسد صومه لان التحرز عنه غیر ممکن وان کان کثیراً حتی وجد ملوحته فی جمیع فمه وابتلعه فسد صومه.

(۶۶) روزہ میں احتلام کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں جوکہ میرے دوست کے ساتھ پیش آیا رمضان میں ہم لوگ کرکٹ کھیل رہے تھے دوپہر کے ٹائم میرا دوست جب کھیل کر گھر گیا تو وہ سو گیا نیند میں اس کو احتلام ہوگیا اور اس کو یہ بات پتہ نہ تھی کہ احتلام سے روزہ ٹوٹتا ہے یا نہیں تو وہ سمجھا کہ میرا روزہ ٹوٹ گیا ہے تو اس نے کھانا کھالیا شام کو اس نے مجھ سے ذکر کیا تو میں نے کہا کہ احتلام سے روزہ نہیں ٹوٹتا ہے تو اس نے کہا کہ اب میں کیا کروں تو میں نے کہا اس کا حکم تو مجھ کو بھی نہیں معلوم مگر میں مفتی صاحب سے پوچھ کر بتاؤں گا برائے مہربانی آپ بتادیں کہ شرعاً اب ان کیلئے کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....اگر احتلام والے کو بوجہ احتلام کے روزہ کے نہ ٹوٹنے کا علم نہ ہو تو روزہ توڑنے کی وجہ سے صرف قضا لازم ہوئی لیکن اگر علم ہونے کے باوجود روزہ توڑ دیا تو پھر قضا وکفارہ دونوں واجب ہونگے۔

لمافی الهندیة (۲۰۶/۱): وإذا احتلم فظن أن ذلک فطره فأکل بعد ذلک معتمدا لا کفارة علیه هکذا فی المحیط.

وفی الشامیة(۴۱۱/۲): لوفعل مایظن الفطربه کمالوأکل أوجامع ناسیاأواحتلم أوانزل بنظر أوذرعه القئی فظن انه أفطر فأکل فلاکفارة للشبهة.

(۶۷) حالتِ روزہ میں کسی کو محض دیکھنے سے انزال ہوجانے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں کراچی یونیورسٹی میں پڑھتا ہوں۔ رمضان میں ایک دن جب صبح صبح میں یونیورسٹی جانے والی گاڑی میں بیٹھا تو ایک نوجوان لڑکی پر میری نظر پڑگئی بس مجھ سے یہ غلطی ہوگئی کہ میں نظر نہ ہٹا سکا۔ اسے دیکھتے رہنے کی وجہ سے میری شہوت بھڑک اٹھی، بالآخر انزال ہوگیا تو کیا اس سے میرا روزہ ٹوٹ گیا ہے؟ اگر ٹوٹ گیا ہے تو اس کا کیا کفارہ ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً ......روزے کی حالت میں کسی عورت کوصرف دیکھنے کی وجہ سے انزال ہوجائے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔البتہ قصداً حالت روزہ میں غیرمحرم پرنگاہ کرنے سے روزے کے انوارات اورحقیقی ثمرات ختم ہوجاتے ہیں۔

وفی الھندیة(۱/۲۰۴): واذا نظر الی امرأة بشھوة فی وجھھا او فرجھا کرّر النظر اولا لا یفطر اذا انزل. کذا فی فتح القدیر وکذا لایفطر بالفکر اذا امنی.

(۶۸) روزے کی حالت میں چھوئے بغیرانزال کا ہونا

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ رمضان المبارک سے تقریباً مہینہ پہلے میں چالیس دن کیلئے جماعت میں چلا گیا تھا،اور ماہِ مبارک کے شروع ایام میں ہی گھر واپسی ہوگئی۔جب گھر پہنچا تو صبح ۹/۱۰ بجے کا وقت تھا،میرے لڑکے نے دروازہ کھولا تھا،میں خاموشی سے اندر کمرے میں گیا تو میری بیوی لیٹی ہوئی تھی،چونکہ اس سے ملاقات کوکافی دن ہوگئے تھے تو مجھ پر شہوت غالب آگئی میں نے اپنے آپ کوقابو رکھا،لیکن صرف اس کو دیکھتے رہنے کی وجہ سے ہی مجھے انزال ہوگیا،اب مجھے اپنے روزے کی فکر ہے آیا یہ ٹوٹا تو نہیں؟اوراس میں کفارہ لازم ہے یا نہیں؟براہ کرم آپ قرآن وسنت کی روشنی میں اس مسئلے کا جواب دیدیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......چھوئے بغیر اپنی عورت کو دیکھتے رہنے کی بناپرروزے کی حالت میں اگرانزال ہوجائے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا، لہٰذاصورت مسئولہ میں آپ کا روزہ برقرار ہے،قضاءاور کفارہ کچھ لازم نہیں۔

لمافی الھندیة(۱/۲۰۴): واذا نظر الی امرأة بشھوة فی وجھھا او فرجھا کرّر النظر اولا لا یفطر اذا أنزل، وکذا لا یفطر بالفکر اذا امنی.

وفی الشامیة(۲/۳۹۶): قال فی الدر: او احتلم او انزل بنظر) ولو الی فرجھا مراراً.

(۶۹) روزے میں بیہوش ہونے سے روزہ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ پچھلے جمعہ کو جو کہ رمضان کا پہلا جمعہ تھا،ہمارے پڑوس میں ایک باباجی رہتے ہیں وہ مسجد میں نماز فجر کے بعد بے ہوش ہوگئے اورعصر کی نماز تک بے ہوش ہی رہے،ہوش میں آنے پربھی انہوں نے روزہ افطار نہیں کیا بلکہ مغرب کے وقت پر ہی تھوڑا بہت پانی پیا،کیاواقعی ان کا روزہ باقی تھا،اوراتنی دیر بے ہوشی سے روزہ نہیں ٹوٹتا؟

الجواب حامداً ومصلیاً صورت مسئولہ میں باباجی کا روزہ واقعی باقی تھا۔چونکہ رات سے نیت بھی پائی جاتی ہے اور پورے دن روزہ کا رکن (امساک)بھی موجود ہے۔

لمافی الھدایة(۱/۲۴۱):ومن اغمی علیه فی رمضان لم یقض الیوم الذی حدث فیه الاغماء لوجود الصوم فیه وھو الامساک المقرون بالنیة اذ الظاھر وجودھا منه وقضی ما بعده لانعدام النیة.

وفي التاتارخانية(۳۹۲/۲):الكافي: الا عذار اربعة انواع: مالا يمتد يوما وليلة غالباً كالنوم فلا يسقط شيئاً من العبادات. وما يمتد خلقة كالصبا فيسقط الكل به دفعاً للحرج وما يمتد وقت الصلاة لاوقت الصوم غالبا كالاغماء فاذا امتد في الصلوات بان زاد عليه يوما وليلة جعل عذراً دفعا للحرج ولم يجعل في الصوم عذراً لان امتداده شهرا نادر، وما يمتد وقت الصلاة والصوم وقدلا يمتد وهو الجنون فاذا امتدفيهما اسقطهما.

(۷۰) بائی پاس آپریشن سے روزہ کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ روزے کی حالت میں بائی پاس آپریشن کروانے سے روزہ تو نہیں ٹوٹتا؟ دراصل میرے چچا نے رمضان میں بائی پاس آپریشن کروایا اوراس دن روزہ بھی رکھ لیا تھا، اب پوچھنا یہ ہے کہ آیا وہ روزہ ہوگیا یا نہیں؟ اگر نہیں ہوا تو اس کا کوئی کفارہ وغیرہ تو نہیں ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... روزہ کسی ایسی چیز سے فاسد ہوتا ہے جو کہ بدن کو درست کرنے کے لئے معتاد یا غیر معتاد راستے سے داخل کی جائے اور دماغ یا پیٹ تک پہنچ جائے، پس بائی پاس آپریشن اور ہر ایسا آپریشن جو کہ پیٹ یا دماغ کے علاوہ ہاتھ پاؤں وغیرہ کا ہو، اس سے روزہ فاسد نہ ہوگا، کیونکہ ان میں پیٹ یا دماغ تک کسی چیز کے پہنچنے کا منفذ نہیں ہے، البتہ اگر غروب کے بعد تک مؤخر کرسکتا ہے، تو روزے کی حالت میں آپریشن نہ کرائے، کیونکہ اس میں خون وغیرہ نکلنے کی وجہ سے ضعف لاحق ہوگا جو کہ روزے کے توڑنے کی طرف مفضی ہوگا۔

لما في الهندية(۲۰۴/۱): وفي داواء الجائفة والآمة اكثر المشايخ على ان العبرة للوصول الى الجوف والدماغ لالكونه رطبا او يابساً حتى اذا علم ان اليابس وصل يفسد صومه ولو علم انّ الرطب لم يصل لم يفسد

وفي الدرالمختار (۴۰۲/۲): او داوى جائفة او امة فوصل الدواء حقيقة الى جوفه ودماغه

وفي الشامية تحته. (قوله فوصل الدواء حقيقة) اشار الى ان ما وقع في ظاهر الرواية من تقييد الافساد بالدواء الرطب مبنى على العادة من انه يصل والا فالمعتبر حقيقة الوصول، حتى لو علم وصول اليابس افسد او عدم وصول الطرى لم يفسد و انما الخلاف اذا لم يعلم يقيناً فافسد بالطرى حكما بالوصول نظراً الى العادة.

وفي الهندية(۱۹۹/۱، ۲۰۰): ولا باس بالحجامة ان امن على نفسه الضعف امّا اذا خاف فانه يكره وينبغي له ان يؤخر الى وقت الغروب، وذكر شيخ الاسلام شرط الكراهة ضعف يحتاج فيه الى الفطر.

﴿جن چیزوں سے روزہ مکروہ ہو جاتا ہے﴾

(۷۱) روزہ میں منجن، ٹوتھ پیسٹ لگانے یا تمباکو سونگھنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ ایک دن میں سحری کر کے سو گیا اور دانت صاف نہ کر سکا پھر جب میں صبح آفس جانے کیلئے اٹھا تو میں نے ٹوتھ پیسٹ کیا اب آپ سے پوچھنا یہ تھا کہ کیا روزے کی حالت میں ٹوتھ پیسٹ کرنا یا منجن وغیرہ استعمال کرنا ٹھیک ہے یا غلط، اسی طرح میرے بعض ساتھی دفتر میں روزے کی حالت میں سگریٹ وغیرہ پیتے ہیں تو کیا سگریٹ یا تمباکو وغیرہ یا ان کا دھواں سونگھنے سے روزے پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟ تسلی بخش جواب دیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... روزہ کی حالت میں منجن یا ٹوتھ پیسٹ کرنا مکروہ ہے اور اگر حلق کے اندر پہنچ جائے تو مفسدِ صوم ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص روزہ کی حالت میں تمباکو سونگھے اور اسکا اثر دماغ تک پہنچ جائے اور اسے سکون محسوس ہو یا لذت حاصل ہو تو روزہ فاسد ہو جائیگا اور اسپر قضا لازم ہوگی۔

لما فی الهندیة (۱/۱۹۹): قال مشایخنا المسئلة علی التفصیل ان لم یکن العلک ملتئما مصلحا فطره وان کان مصلحاملتئمافان کان أسود فطره وان کان أبیض لم یفطره الا ان فی الکتاب لم یفصل کذا فی المحیط وکره ذوق شئ ومضغه بلاعذر ... (وفی صـ۲۰۴) وفی دواء الجائفة والآمة اکثر المشایخ علی ان العبرة للوصول الی الجوف والدماغ لا لکونه رطبا أو یابسا حتی اذا علم أن الیابس وصل یفسد صومه ولو علم ان الرطب لم یصل لم یفسد هکذا فی العنایة واذا لم یعلم أحدهما وکان الدواء رطبا فعند أبی حنیفة یفطر للوصول عادة.

(۷۲) روزے کی حالت میں ٹوتھ پیسٹ استعمال کرنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص روزے سے ہو اور روزے کی حالت میں ٹوتھ پیسٹ استعمال کرے تو اس سے اس کا روزہ ٹوٹ جائے گا یا نہیں؟ نیز روزے کی حالت میں مسواک کرنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... روزے کی حالت میں بلا عذر کسی چیز کا چکھنا مکروہ ہے اور ٹوتھ پیسٹ کے استعمال کرنے سے زبان پر اس کا ذائقہ محسوس ہوتا ہے، اس لئے روزے کی حالت میں اس کا استعمال مکروہ ہے، اور اگر اس کا ذائقہ اور مزہ حلق سے نیچے اتر جائے تو روزہ ٹوٹ جائے گا تاہم روزے کی حالت میں مسواک کرنا بلا کراہت جائز ہے۔

لما في الهندية(۱/۱۹۹): قال مشايخنا المسئلة على التفصيل ان لم يكن العلك ملتئما مصلحا فطره وان كان مصلحا ملتئما فان كان اسود فطره وان كان ابيض لم يفطره..... وكره ذوق شيئ ومضغه بلا عذر كذا في الكنز. ومن العذر في الاول مالو كان زوج المرأة وسيدها سيئ الخلق فذاقت المرقة ومن العذر في الثاني ان لاتجد من يمضغ الطعام لصبيها من حائض او نفساء او غيرهما ممن لايصوم ولم تجد طبيخا ولا لبنا حليبا.

وفي رد المحتار (۲/۴۱۶): وكره ذوق شيئ و مضغه بلا عذر لان العذر فيه لايتضح فذكر مطلقا بلا عذر اهتماما (قوله ابيض الخ) قيده بذلك لان الاسود وغير الممضوغ وغير الملتئم يصل منه شيئ الى الجوف واطلق محمد المسألة وحملها الكمال تبعا للمتأخرين على ذلك قال للقطع بانه معلل بعدم الوصول فإن كان مما يصل عادة حكم بالفساد لانه كالمتيقن. وفي الدر المختار (۲/۴۰۲): (او احتقن او استعط) في انفه شيئا (او اقطر في أذنه دهنا او داوى جائفة او آمة) فوصل الدواء حقيقة. وفي رد المحتار(۲/۴۰۲): (قوله فوصل الدواء حقيقة) أشار الى ان ماوقع في ظاهر الرواية من تقييد الافساد بالدواء الرطب مبني على العادة من انه يصل والا فالمعتبر حقيقة الوصول، حتى لو علم وصول اليابس أفسد او عدم وصول الطرى لم يفسد وانما الخلاف اذا لم يعلم يقينا فافسد بالطرى حكما بالوصول نظر الى العادة. قلت ولم يقيدوا الاحتقان والاستعاط والاقطار بالوصول الى الجوف لظهوره فيها والا فلابد منه حتى لوبقي السعوط في الأنف ولم يصل الى الراس لايفطر.

وفي الفقه الحنفي(۱/۳۹۵): من ذاق شيئا بفمه في نهار رمضان وهو صائم ولم يبتلع ماذاق لم يفطر. لعدم وصول المفطر الى جوفه. ويكره له ذلك لما فيه من تعريض الصوم على الفساد مضغ العلك الذى لايصل منه شيئ الى الجوف مع الريق لايفطر الصائم لعدم وصول شئ منه الى الجوف ويكره ذلک لانه يتهم بالافطار. والعلک المقصود المصطكي (المسكة) اما العلک الملوّن المحلي بالسكر فانه يفطر الصائم.

(۷۳) روزے کی حالت میں کچھ چکھنے اور بھولے سے ناک، کان میں دوائی ڈالنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے اپنے گھر میں دیکھا ہے کہ والدہ یا بڑی بہن وغیرہ افطاری بنانے کے وقت کبھی نمک وغیرہ چکھتی ہیں اور تھوک دیتی ہیں تو کیا روزے کی حالت میں چکھنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟ اگرچہ غلطی سے چکھ لیا ہو اور روزے کی حالت میں بھولے سے کان یا ناک میں دوائی ڈالنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں اگر کوئی شخص بھولے سے کوئی چیز چکھ لیتا ہے تو اسکے روزے پر کوئی اثر نہیں پڑیگا البتہ اگر عمداً بلا عذر کے چکھ لیا تو مکروہ ہوگا، نیز اگر کان یا ناک میں دوائی بھولے سے ڈال لی تھی تو اس صورت میں روزہ صحیح ہوگا۔

لمافی البخاری(۱/۲۵۹)عن ابی هريرة عن النبی ﷺقال اذانسی فاکل اوشرب فليتم صومه فانما اطعمه الله وسقاه.

وفی الهداية(۱/۲۳۸):ومن ذاق شيئابفمه لم يفطر لعدم الفطر صورة ومعنی ويكره له ذالک لمافيه من تعريض الصوم علی الفساد.

وفی الهندية (۱/۱۹۹): كره ذوق شئ ومضغه بلاعذر كذا فی الكنز ومن العذر فی الاول ما لو كان زوج المرأة وسيدها سيئ الخلق فذاقت المرقة الخ.

(۷۴) باورچی کیلئے بوقت ضرورت روزے کی حالت میں سالن چکھنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک ہوٹل میں کام کرتا ہوں میرا کام سالن تیار کرنا ہوتا ہے اب رمضان المبارک کا مہینہ چل رہا ہے میرا روزہ ہوتا ہے بغیر چکھے سالن تیار کرتا ہوں تو بعض اوقات نمک وغیرہ کم ہو جاتا ہے اور بعض اوقات زیادہ گاہک شکایت کرتے رہتے ہیں تو اب آپ حضرات سے معلوم یہ کرنا ہے کہ میرے لئے روزہ کی حالت میں سالن چکھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں روزے کی حالت میں ضرورت کی وجہ سے آپ کے لئے سالن چکھنا جائز ہے بشرطیکہ وہ پیٹ میں نہ جائے۔

لما فی الهندية(۱/۱۹۹): وكره ذوق شی ومضغه بلا عذر كذا فی الكنز ومن العذر فی الاول مالو كان زوج المرأة وسيدها سيئ الخلق فذاقت المرقة......الخ.

الدر المختار(۲/۴۱۶): (وكره) له (ذوق شيی و) كذا(مضغه بلا عذر) وقيد فيهما قاله العينی ككون زوجها او سيدها سيی الخلق فذاقت. وفی الشامية تحته: (قوله وكره الخ) الظاهر ان الكراهة فی هذه الأشياء تنزيهية رملی.

(۷۵) روزہ کی حالت میں ڈرپ یا انجکشن کا حکم

سوال ...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک دن روزہ کی حالت میں ڈاکٹر کے پاس گیا اس نے ڈرپ لگادی تو اب میرے روزے کا کیا حکم ہوگا آیا ٹوٹ گیا ہے یا باقی ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً...... ڈرپ یا انجکشن لگانے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا، کیونکہ روزہ اس وقت فاسد ہوتا ہے جب کوئی چیز معتاد ذرائع سے جوف دماغ یا جوف معدہ میں پہنچ جائے، جبکہ انجکشن یا ڈرپ کے ذریعے جسم میں داخل ہونے والی دوائی وغیرہ رگوں کے ذریعے تمام جسم میں منتشر ہوجاتی ہے وہ دوائی وغیرہ بعینہٖ جوف دماغ یا جوف معدہ میں نہیں پہنچتی بلکہ اس کا اثر پہنچتا ہے جو کہ روزہ کی صحت کیلئے مضر نہیں۔

لمافي الهندية(۱/۲۰۴): وفي دواء الجائفة والآمة اكثر المشايخ على ان العبرة للوصول الى الجوف والدماغ لالكونه رطبا او يابسا حتى اذا علم ان اليابس وصل يفسد صومه ولو علم ان الرطب لم يصل لم يفسد هكذا في العناية.

وفي الدر المختار(۲/۳۹۵): (او ادهن او اكتحل او احتجم) وان وجد طعمه في حلقه.

وفي الشامية تحته:(قوله وان وجد طعمه في حلقه) اى طعم الكحل او الدهن كما في السراج وكذا لو بزق فوجد لونه في الاصح بحر قال في النهر لان الموجود في حلقه اثر داخل من المسام الذى هو خلل البدن والمفطر انما هو الداخل من المنافذ للاتفاق على ان من اغتسل في ماء فوجد برده في باطنه انه لايفطر.

(۷۶) روزہ کی حالت میں ناک میں ''وِکس'' کے استعمال کرنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے روزے میں ایک روز ناک میں وِکس لگانے کی ضرورت پڑگئی، میرے ایک دوست نے دیکھا تو کہنے لگے کہ روزے میں یہ لگانا درست نہیں ہے، مجھے بڑی فکر لگ گئی ہے۔ برائے کرم آپ بتادیں یہ صحیح بات ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً...... مفطرات صوم وہ چیزیں ہیں جو بعینہٖ منافذ فطریہ (قدرتی سراخوں) سے بدن کے اندر پہنچ جائیں اور جن چیزوں کا صرف اثر باطن بدن میں مسامات کے ذریعے پہنچتا ہو، تو وہ مفطر صوم نہیں۔ اور وکس کا بھی صرف اثر (جو بو کی صورت میں ہے) دماغ تک پہنچتا ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں ناک میں وکس لگانا مفطر صوم نہیں ہے۔

لمافي التاتارخانية(۲/۳۶۸): والغبار وفي الخزانة وعريكة الدقيق والدخان وطعم الادوية وريح العطر اذا وجد في حلقه لا يفطر.

وفي الدرالمختار مع الشامية(۲/۴۱۷):(لا) يكره(دهن الشارب و) لا(كحل) اذا لم يقصد الزينة.

وفي الشامية تحته: قوله(قوله لادهن شارب وكحل) بفتح الفاء مصدرين وبضمها اسمين وعلى الثاني فالمعنى لا يكره استعمالهما الا ان الرواية هو الاول وتمامه في النهر وذكر في الامداد اول الباب انه يوخذ من هذا انه لايكره للصائم شم رائحة المسك والورد ونحوه ممالايكون جوهراً

متصلا كالدخان فانهم قالوا لايكره الاكتحال بحال وهو شامل للمطيب وغيره ولم يخصوه بنوع منه وكذا دهن الشارب اهـ.

وفي الشامية(۲/۳۹۵): (قوله انه لو ادخل حلقه الدخان) اى باىّ صورة كان الادخال حتى لو تبخر بخور فآواه الى نفسه واشتمه ذاكر الصومه افطر لا مكان التحرز عنه وهذا مما يغفل عنه كثير من الناس ولا يتوهم انه كشم الورد ومائه والمسك لوضوح الفرق بين هواء تطيب بريح المسك وشبهه وبين جوهر دخان وصل الى جوفه بفعله امداد وبه علم حكم شرب الدخان.

(۷۷) گانے سننے والے کے روزے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری ایک مارکیٹ میں کپڑے کی دوکان ہے میری دکان سے کچھ فاصلے پر ویڈیو کیسٹ کی دکان ہے اور وہ روزے کی حالت میں سارا دن گانے سننے اور ٹی وی دیکھنے میں گزار دیتے ہیں تو ایسے لوگوں کے روزے پر کوئی اثر پڑتا ہے، ان چیزوں کا یا نہیں اور ویڈیو کیسٹ کے کاروبار کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورت مسئولہ میں گانے سننا، ٹی وی دیکھنا یا گانوں اور فلموں کی کیسٹوں کا کاروبار کرنا عام حالات میں بھی برا اور ناجائز ہے روزہ میں اسکی شناعت اور بھی بڑھ جاتی ہے اگر چہ فرض ذمہ سے ساقط ہوجاتا ہے لیکن روزہ کا ثواب جاتا رہتا ہے جیسا کہ صحیح بخاری (۱/۲۵۵) میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی منقول ہے کہ جو شخص روزہ رکھ کر بھی جھوٹی بات اور برے کام نہ چھوڑے اللہ تعالیٰ کو اسکے بھوکا پیاسا رہنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

لمافي صحيح البخارى (۱/۲۵۵):عن ابى هريرة رضى الله عنه قال قال النبى ﷺ من لم يدع قول الزور والعمل به فليس لله حاجة في أن يدع طعامه وشرابه.

وفي احياء علوم الدين(۱/۲۳۰): وقد قال صلى الله عليه وسلم((كم من صائم ليس له من صومه إلّا الجوع والعطش))...... وقيل هو الذى يمسك عن الطعام الحلال ويفطر على لحوم الناس بالغيبة وهو حرام، وقيل هو الذى لا يحفظ جوارحه عن الأثام.

وفي حجة الله البالغة(۲/۵۴): وقوله صلى الله عليه وسلم: من لم يدع قول الزور والعمل به فليس لله حاجة في أن يدع طعامه وشرابه: والمراد بالنفي نفي الكمال.

﴿جن چیزوں سے روزہ مکروہ نہیں ہوتا﴾

(۷۸) روزہ کی حالت میں سرمہ لگانا اور مسواک کرنا

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ میں نے سنا ہے کہ روزے کی حالت میں سرمہ لگانا، آئینہ دیکھنا اور دوپہر کے بعد مسواک کرنا درست نہیں کیا یہ بات صحیح ہے کیا ان افعال سے روزہ مکروہ ہوجاتا ہے نیز روزے کی حالت میں ویسے ہی انزال ہوجائے تو کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً روزے کی حالت میں سرمہ لگانا، آئینہ دیکھنا اور مسواک کرنا اگرچہ دوپہر کے بعد ہی کیوں نہ ہو بلا کراہت درست ہے۔ نیز اگر روزے کی حالت میں کسی کو کسی عورت کی طرف دیکھنے سے یا خیالات فاسدہ کی بناء پر انزال ہوجائے تو اس سے روزہ فاسد نہیں ہوتا۔

لما فی جامع الترمذی(۱/۱۵۲): عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ، ثلاث لایفطرن الصائم الحجامة والقئ والاحتلام.

وفی الفتاویٰ الولوالجیة (۱/۲۲۱): والکحل: لا یفطر لان النبی ﷺ "اکتحل وھو صائم"

وفی الھندیة(۱/۱۹۹): ولا بأس بالسواک الرطب والیابس فی الغداة والعشی عندنا. ولا یکرہ کحل ولا دھن شارب کذا فی الکنز.

وفیہ ایضا(۱/۲۰۴): وإذا نظر الی امرأة بشھوة فی وجھھا أو فرجھا کرّر النظر أولا لا یفطر إذا أنزل کذا فی فتح القدیر.

(۷۹) روزے کی حالت میں مسواک استعمال کرنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اکثر لوگوں سے سنا گیا ہے کہ روزہ کی حالت میں اگر کوئی تر لکڑی کی مسواک کرے تو اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے کیا یہ صحیح ہے یا اس سے روزہ پر کچھ فرق نہیں پڑتا؟

الجواب حامداً ومصلیاً روزے کی حالت میں مسواک استعمال کرنا اسی طرح سنت ہے جیسا کہ روزے کے بغیر سنت ہے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک تر اور خشک مسواک کا کوئی فرق نہیں دونوں کا استعمال جائز ہے اور دونوں کے استعمال سے روزہ پر کچھ فرق نہیں پڑتا۔

لما فی الھندیة(۱/۱۹۹): ولا بأس بالسواک الرطب والیابس فی الغداة والعشی عندنا قال ابو

يوسف رحمه الله تعالى يكره المبلول بالماء وفي ظاهر الرواية لابأس بذلك و اما الرطب الاخضر فلا بأس به عند الكل كذا في فتاوىٰ قاضيخان.

وفي الشامية(٢/٤١٩): (قوله ولا سواك)) بل يسن للصائم كغيره صرح به في النهاية لعموم قوله ﷺ ((لولا ان اشق على امتي لامرتهم بالسواك عند كل وضوء وعند كل صلاة) لتناوله الظهر والعصر والمغرب قوله ولو عشياای بعد الزوال (قوله علی المذهب) وكره الثاني المبلول بالماء لما فيه من ادخاله فمه من غير ضرورة ورد بأنه ليس باقوى من المضمضة اما الرطب الاخضر فلا بأس به اتفاقا. كذا في الخلاصة نهر

(٨٠) روزے کی حالت میں سرمہ لگانے کا حکم

سوال　کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے روزے کی حالت میں سرمہ لگایا تو سرمہ حلق تک پہنچ گیا، آیا اس شخص کا روزہ ٹوٹ گیا یا نہیں؟ اس کے اوپر کفارہ لازم ہوگا یا صرف قضا لازم ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً　روزے کی حالت میں آنکھ میں دوائی کے قطرے ڈالنے سے اور سرمہ لگانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، اگرچہ دوائی اور سرمے کا اثر اور رنگ حلق اور تھوک میں محسوس کیوں نہ ہو۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اس شخص کا روزہ نہیں ٹوٹا، جب روزہ ہی نہیں ٹوٹا تو اس کے اوپر قضا اور کفارہ بھی لازم نہیں ہوگا۔

لمافي الفتاوىٰ الولوالجية(١/٢٢١): والكحل: لايفطر، لان النبي ﷺ "اكتحل وهو صائم."

وفي الدرالمختار(٢/٣٩٦،٣٩٥) (أو ادهن او اكتحل او احتجم) "وان وجد طعمه في حلقه"

وفي الشامية تحته: اى طعم الكحل أو الدهن كمافي السراج وكذا لو بزق فوجد لونه في الاصح بحر. قال في النهر لان الموجود في حلقه اثر داخل من المسام الذى هو خلل البدن والمفطر انما هو الداخل من المنافذ للاتفاق على أن من اغتسل في ماء فوجد برده في باطنه أنه لا يفطر وإنما كره الإمام الدخول في الماء والتلفف بالثوب المبلول لمافيه من إظهار الضجر في إقامة العبادة لا لانه مفطر اهـ، وسيأتي ان كلامن الكحل والدهن غير مكروه وكذا الحجامة الا اذا كانت تضعفه عن الصوم.

وفي الفقه الاسلامي وادلته(٣/١٧٠١): مالايفسد الصوم عند الحنفية (وهو اربعة وعشرون شيئاً تقريباً)　وايضاً القطرة او الاكتحال في العين، ولو وجد الصائم الطعم أو الأثر في حلقه، لأن النبي ﷺ اكتحل في رمضان. وهو صائم.

(۸۱) روزے کی حالت میں دانتوں سے خون آنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے دانتوں میں کچھ تکلیف ہے جسکی وجہ سے کبھی کبھار خون آتا ہے اگر دانتوں سے خون نکل کر حلق میں چلا جائے یا حلق میں جانے یا نہ جانے کا پتہ نہ چلے تو روزہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً روزے کی حالت میں دانتوں سے خون آنے کی صورت میں اگر خون تھوک پر غالب ہو اور روزہ دار اسکو نگل بھی لے تو اس سے روزہ ٹوٹ جائیگا اور قضا لازم ہوگی، کفارہ نہیں آئیگا، اور اگر تھوک خون پر غالب ہے تو روزہ نہیں ٹوٹے گا اور اگر دونوں برابر ہوں تو احتیاطاً روزہ بھی ٹوٹ جائیگا اور اسکی قضا بھی لازم ہوگی۔ البتہ اگر خون نکلنے کا تو علم ہو لیکن حلق میں جانے یا نہ جانے کا پتہ نہ چلے تو اعتبار منہ کے ذائقہ کا ہوگا ایسی صورت میں خون کا ذائقہ پورے منہ میں محسوس ہو تو روزہ ٹوٹ جائیگا اور اگر پورے منہ میں محسوس نہ ہو جیسے ایک دو قطرے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹے گا۔

لمافي الدرالمختار مع رد المحتار (۲/۳۹۶): (أو خرج الدم من بين أسنانه ودخل حلقه)يعني ولم يصل إلى جوفه أماإذاوصل فان غلب الدم أوتساويافسدوالالا،الااذاوجدطعمه......

وفيه ايضاً (۲/۴۰۳)...... بخلاف نحو الغبار والقطرتين من دموعه أوعرقه واماني الاكثر؛قوله فان وجد الملوحة في جميع فمه ...... فالأولى الاعتبار بوجدان الملوحة لصحيح الحس اذلاضرورة في اكثر من ذلک ولذااعتبرفي الخانية الوصول الى الحلق ووجه الدفع ما قاله في النهرمن ان كلام الخلاصة ظاهرفي تعليق الفطرعلى وجدان الملوحة في جميع الفم ولاشک ان القطرة والقطرتين ليستا كذالک.

(۸۲) روزے میں بلا اختیار دھواں حلق میں جانے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دن میں روزہ سے تھا کہیں جا رہا تھا کہ راستے میں ایک جگہ کچرے وغیرہ میں آگ جل رہی تھی جس کے قریب سے گزر کر جانا پڑتا تھا میں جونہی گزرا تو میرے منہ میں دھواں چلا گیا تو اس سے میرا روزہ ٹوٹ گیا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں روزے کی حالت میں حلق تک پہنچنے والے دھوئیں سے روزہ نہیں ٹوٹے گا۔

لمافي الدر المختار(۲/۳۹۵): (أو دخل حلقه غبار أو ذباب أو دخان) ولو ذاكراً. استحساناً لعدم امكان التحرز عنه.

وفي الشامية تحته: (قوله لعدم امكان التحرز عنه) فاشبه الغبار و الدخان لدخولهما من الأنف اذا

أطبق الفم كما في الفتح.

(۸۳) روزہ کی حالت میں مریض کوخون دینے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض دفعہ ماہ مبارک میں کوئی حادثہ پیش آجاتا ہے اور بعض مریضوں کی حالت زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے غیر ہو جاتی ہے۔ایسی صورت میں انہیں خون دینا پڑتا ہے اور اگر افطاری کے وقت کا انتظار کیا جائے تو اس میں یہ خطرہ ہوتا ہے کہ مریض چل بسے گا تو کیا ضرورت کی وجہ سے روزہ دار روزے کی حالت میں خون دے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً...... عام حالت میں روزہ رکھ کر خون دینے سے اگر کمزوری ہوتی ہو تو خون دینا مکروہ ہے۔البتہ ضرورت شدیدہ (جیسا کہ مذکورہ سوال میں ہے) کی صورت میں اگر خون دینے والے کی جان کو کوئی خطرہ یا شدید نقصان نہ ہو تو پھر خون دینے کی گنجائش ہے اور اس صورت میں روزہ بھی مکروہ نہ ہوگا۔

لمافي الشامية(۴۱۹/۲): (وكذالا تكره حجامة) اى الحجامة التي لاتضعفه عن الصوم وينبغي له ان يؤخرهاالى وقت الغروب والفصد كالحجامة.

﴿روزے کی قضاء، کفارہ، فدیہ اور نذر وغیرہ کا بیان﴾

(۸۴) روزہ ونماز بلوغت کے بعد قضا ہونے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل جب بچہ بالغ ہوتا ہے تو بعض دفعہ اسے خود بھی احساس نہیں ہوتا اور دین کی معلومات نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو نابالغ ہی تصور کرتا ہے چنانچہ نماز روزہ کے معاملہ میں اسے نابالغ تصور کرتے ہوئے نماز پڑھ لے یا روزہ رکھ لے تو ٹھیک ورنہ کوئی بازپرس نہیں کی جاتی۔ایسی صورت میں بہت سے نماز روزے اسکے ذمہ قضا ہوتے ہیں، مجھے لگتا ہے کہ میرے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا ہے اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......چونکہ بلوغت کے بعد انسان احکام شرعیہ کا مکلف ہوجاتا ہے یعنی نماز روزہ وغیرہ کی ادائیگی اس پر لازم ہوجاتی ہے۔اب بلوغت کے بعد اگر کوئی شخص ان امور یعنی نماز روزہ وغیرہ کو انکے اوقات میں عذر کی بناپر یا بغیر عذر کے ادا نہ کرے تو اسپر قضا لازم ہے چاہے کم ہو یا زیادہ۔پھر قضا کی صورت یہ ہوگی کہ اگر زمانہ بلوغت معلوم ہے تو بلوغت کے بعد جتنے دنوں کی نمازیں اور روزے قضا ہوئے ہیں انکی قضا کرلے لیکن اگر زمانہ بلوغت معلوم نہیں ہے تو پھر لڑکا اور لڑکی ۱۵ سال کے بعد جو زمانہ گزرا ہے اسکی نمازوں اور روزوں کی قضا کرلے کیونکہ ان پر احکام شرع کا تعلق احتیاطاً اسی مدت سے لازم ہوتا ہے۔پھر چونکہ قضا نمازوں اور روزوں کیلئے تعیین بھی ضروری ہے لہٰذا نیت اسی طرح کرے کہ اول فجر جو نہیں پڑھی اسکی قضا کرتا ہوں یا یہ نیت کرے کہ آخری فجر جو نہیں پڑھی اسکی قضا کرتا ہوں باقی نمازوں کی نیت بھی اسی طرح کرے یعنی اول ظہر یا آخر ظہر۔اسی طرح روزے اگر کئی رمضانوں کے قضا ہوئے ہوں تو اول رمضان یا آخر رمضان کی نیت کرے ورنہ صرف قضا روزے کی نیت کرے۔اس طریقہ سے ادا کرتا رہے یہاں تک کہ غالب گمان ہوجائے قضا شدہ نمازوں اور روزوں کی تعداد پوری ہوگئی۔باقی بچوں کے والدین یا سرپرست حضرات کو چاہیے کہ وہ انہیں کم عمری سے ہی نماز وروزے کا پابند بنائیں تاکہ بلوغت کے فوری بعد انہیں اپنے ذمہ فرائض کی ادائیگی کی عادت پڑ چکی ہو۔

لمافی الدر المختار (۶/۱۵۴): فان لم یوجد فیهما شئ فحتی یتم لکل منهما خمس عشرة سنة به یفتی وهذا عندهما وفی الشامیة لان ابن عمر رضی الله تعالیٰ عنهما عرض علی النبی ﷺ یو احد وسنه اربعة عشر فرده، ثم یوم الخندق وسنه خمسة عشر فقبله ...... ولانها العادة الغالبة علی اهل زماننا و غیرها احتیاط ...... والعادة احدی الحجج الشرعیة فیما لانص فیه نص علیه الشمنی وغیره درمنتقی.

وفی حاشیة الطحطاوی علی المراقی (ص۴۴۷): خاتمة: من لا یدری کمیة الفوائت یعمل بأکبر رأیه فإن لم یکن له رأی یقض حتی یتیقن أنه لم یبق علیه شئ.

وفی الشامیة (۲/۷۶): فإن أراد تسهیل الأمر یقول أول فجر مثلا فإنه إذا صلاه یصیر مایلیه أولاً أو یقول آخر فجر، فإن ما قبله یصیر آخرا ولایضره عکس الترتیب لسقوطه بکثرة الفوائت.

هکذافی الهندیة(۵/۲۱)

(۸۵) رمضان کا چاند دیکھنے والے کی اگر قاضی شہادت قبول نہ کرے تو اس کے روزے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر رمضان المبارک کا چاند صرف ایک شخص دیکھے اور لوگ کسی وجہ سے اس کی گواہی قبول نہ کریں تو اس شخص پر روزہ لازم ہوگا؟ نیز اگر وہ شخص روزہ نہ رکھے تو اس کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداًومصلیاً اگر کوئی شخص رمضان المبارک کا چاند دیکھ لے اور قاضی اس کی شہادت کو قبول نہ کرے تو ایسے شخص پر روزہ رکھنا لازم ہے۔ اگر اس روز اس نے افطار کرلیا یعنی روزہ نہیں رکھا تو اس پر اس روزے کی صرف قضاء لازم ہے نہ کہ کفارہ۔

لمافی القرآن المجید(البقرة): فمن شهد منکم الشهر فلیصمه.

وفی الهندیة(۱/۱۹۷،۱۹۸): رجل رای هلال رمضان وحده فشهد ولم تقبل شهادته کان علیه ان یصوم وان افطر فی ذلک الیوم کان علیه القضاء دون الکفارة.

وفی الدر المختار مع الشامیة (۲/۳۸۴): (رای) مکلف (هلال رمضان او الفطر ورد قوله) بدلیل شرعی (صام) مطلقاً وجوباً وقیل ندباً (فان أفطر قضی فقط) فیهما لشبهة الرد.

وفی الشامیة قال فی التحفة، یجب علیه الصوم، وفی المبسوط علیه صوم ذلک الیوم وهو ظاهر استدلالهم فی هلال رمضان بقوله تعالیٰ فمن شهد منکم الشهر فلیصمه...... (قوله قضی فقط) ای بلا کفارة.

(۸۶) چاند دیکھنے والے کی گواہی قبول نہ ہوئی، اس کے روزہ توڑنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلے میں ایک صاحب رہتے ہیں وہ مالی اعتبار سے بہت کمزور ہیں۔ انہوں نے اس مرتبہ رمضان کے شروع میں سب لوگوں کے سامنے ایک دن پہلے یعنی شعبان کی ۲۹ تاریخ ختم ہونے کے بعد اکیلے چاند دیکھنے کا دعوی کیا، لیکن ان کی گواہی شرعی اعتبار سے بھی صحیح نہیں تھی، انہوں نے اکیلے ہی روزہ رکھ لیا تھا اور پھر صبح دس بجے کے قریب روزہ توڑ دیا۔ پوچھنا یہ تھا کہ آیا ان پر روزے کی قضاء وکفارہ لازم ہے یا نہیں؟ اور کیا انہیں یہ روزہ رکھنا چاہئے تھا؟

الجواب حامداًومصلیاً روزے کے توڑنے پر کفارہ کے وجوب کیلئے ضروری ہے کہ رمضان کا شرعاً ثبوت ہو چکا ہو۔ صورت مسئولہ میں چونکہ مذکورہ شخص کی گواہی شرعاً معتبر نہیں تھی۔ اس کے باوجود مذکورہ شخص پر روزہ رکھنا واجب تھا۔ لیکن جب اس نے روزہ توڑ دیا، تو اس پر

صرف قضاء لازم ہوگی کفارہ نہیں آئے گا۔

لما فی الفتاویٰ الهندیة(۱۹۸،۱۹۷/۱): رجل رأی هلال رمضان وحده فشهد ولم تقبل شهادته کان علیه أن یصوم وإن افطر فی ذلک الیوم کان علیه القضاء دون الکفارة وان افطر قبل أن یرد القاضی شهادته فالصحیح انه لا تجب علیه الکفارة کذا فی فتاویٰ قاضی خان.

وفی الدر المختار(۳۸۴/۲): (رأی) مکلف (هلال رمضان أو الفطر وردقوله) بدلیل شرعی (صام) مطلقا وجوبا وقیل ندبا (فان افطر قضی فقط) فیهما لشبهة الرد (واختلف) المشائخ لعدم الروایة عن المتقدمین (فیما إذا افطر قبل الرد) لشهادته (والراجح عدم وجوب الکفارة).

(۸۷) کن اعذار کی وجہ سے رمضان المبارک کا روزہ چھوڑنا جائز ہے نیز مزدور طبقے کا کام عذر میں داخل ہے یا نہیں؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ مزدور طبقہ رمضان وغیرہ میں روزے نہیں رکھتا کیا شرعاً ان کو گنجائش ہے یا نہیں آیا ان کا کام کرنا عذر کے اندر داخل ہوگا یا نہیں؟ نیز کن اعذار کی بناء پر انسان روزہ چھوڑ سکتا ہے۔ براہ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... رمضان المبارک کے روزے فرض ہیں کسی کیلئے بھی بلا عذر چھوڑنا جائز نہیں۔ البتہ اگر ایسی سخت مجبوری ہو کہ روزہ رکھنے سے جان کی ہلاکت یا ضعف کا خطرہ ہو تو اس وقت روزہ چھوڑنے کی گنجائش ہے لیکن روزہ معاف نہیں ہوتا بعد میں اس کی قضاء لازم ہوتی ہے اور عموماً مزدوروں کے کام ایسے سخت نہیں ہوتے کہ جن کی وجہ سے رمضان جیسی برکتوں اور فضیلت والے روزوں کو چھوڑ دیا جائے اور رمضان کے مہینے میں عموماً مالکان بھی رمضان کا لحاظ کرتے ہوئے مزدوروں پر سختی نہیں کرتے، البتہ اگر پھر بھی دشواری ہو تو اسے چاہئے کہ یا تو دن کے بجائے رات کو کام کرے یا رمضان کا مہینہ چھٹی کرے اور رمضان کے روزے رکھے۔ نیز ان اعذار کی وجہ سے روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے، مسافر، سخت بیمار، ایسی حاملہ عورت کہ جس کو روزہ رکھنے سے اپنی یا بچے کی ہلاکت یا کمزوری کا خطرہ ہو، حیض ونفاس اور ایسا عمر رسیدہ شخص کہ جس کے صحت یاب ہونے کی کوئی امید نہ ہو، ان تمام حضرات کیلئے رمضان کا روزہ چھوڑنا جائز ہے لیکن بعد میں ان روزوں کی قضاء لازم ہے۔ البتہ عمر رسیدہ شخص اپنے روزوں کا صرف فدیہ دے گا۔

لما فی السراجیة (ص۲۹): باب ما یکون عذراً فی الافطار من مسافر بعد ما اصبح فی اهله یکره له الافطار رجل خاف ان لم یفطر تزداد عیناه وجعا او حماه شدة یباح له الافطار وهذا انما یعرف باجتهاده او قال طبیب حاذق امة افطرت فی رمضان متعمدة لضعف اصابها من عمل السید من طبخ

او غیرہ کان واسعا وقضیته للمملوک ان یمتنع عما یعجزہ عن اداء الفرائض....

وفی الهندیة(۱/۲۰۶،۲۰۷): الباب الخامس فی الاعذار التی تبیح الافطار: منها السفر ... (ومنها المرض) اذا خاف علی نفسه التلف او ذهاب عضو یفطر بالاجماع ......(ومنها حبل المرأة وارضاعها) الحامل والمرضع اذا خافتا علی انفسهما او ولدهما افطرتا وقضتا ولا کفارة علیهما (ومنها الحیض والنفاس).........(ومنها العطش والجوع کذالک) اذا خیف منهما الهلاک او نقصان العقل کالامة اذا اضعفت عن العمل وخشیت الهلاک بالصوم وکذا الذی ذهب به موکل السلطان الی العمارة فی الایام الحارة اذا خشی الهلاک او نقصان العقل (ومنها کبر السن) فالشیخ الفانی الذی لا یقدر علی الصیام یفطر.

وفی الدرالمختار(۲/۴۲۱): فصل فی العوارض المبیحه لعدم الصوم: وقد ذکر المصنف منها خمسة وبقی الاکراہ وخوف هلاک او نقصان عقل ولو بعطش اوجوع شدید ولسعة حیة لمسافر سفرا شرعیا

وفی الشامیة تحته: (قوله خوف هلاک) کالامة اذا ضعفت عن العمل وخشیت الهلاک بالصوم وکذا الذی ذهب به متوکل السلطان الی العمارة فی الایام الحارة والعمل حیث اذا خشی الهلاک او نقصان العقل وفی الخلاصة: الغازی اذا کان یعلم یقینا انه یقاتل العدو فی رمضان ویخاف الضعف ان لم یفطر افطر:

وعوارض الصوم التی قد یغتفر — للمرء فیها الفطر تسع تستطر

حبل، وارضاع، واکراہ، سفر — مرض جهاد جوعه عطش کبر

(۸۸) بحالت اکراہ روزہ توڑنے پر قضاوکفارہ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک کالج میں پڑھتا ہوں، دسویں روزہ کو جب صبح کالج پہنچا تو بارش ہورہی تھی، میرے دو دوستوں نے روزہ نہیں رکھا تھا اور کہیں جانے کا پروگرام بنایا، میرے ساتھ جانے سے انکار پر انہوں نے مجھے زبردستی پکڑ کر بسکٹ کھلا کر پانی میرے منہ میں ڈال دیا۔ جس سے پانی اور بسکٹ کے ذرات میرے حلق سے نیچے اتر گئے اب آپ حضرات سے پوچھنا یہ ہے کہ کیا اس سے میرا روزہ ٹوٹ گیا اور اگر ٹوٹ گیا تو میرے لئے شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں اگر آپ کو ان کے روکنے پر بھی نہ قدرت تھی اور نہ ہی آپ کی مرضی شامل تھی بلکہ زبردستی بسکٹ وغیرہ آپ کو کھلا دیا گیا تو اس صورت میں آپ کا روزہ ٹوٹ گیا ہے البتہ آپ پر شرعاً صرف اس کی قضا لازم ہے کفارہ نہیں۔

لما فی البحر الرائق(۲/۲۷۴): قید بالناسی لانه لو کان مخطئا او مکرها فعلیه القضاء.

وفی خلاصة الفتاوی(۱/۲۵۳): ولو صب الماء فی حلقه مکرها فعلیه القضاء دون الکفارة.

وفی قاضی خان(۱/۱۰۱): ولو اکل مکرها أو مخطئا بان یمضمض فوصل الماء جوفه فسد صومه وعلیه القضاء دون الکفارة.

وفی الدر المختار(۲/۴۰۱): (وان افطر خطأ) کأن تمضمض فسبقه الماء أو شرب نائما أو تسحر أو جامع علی ظن عدم الفجر (أو) اوجر (مکرها)

وفی الشامیة تحته: (قوله أو اوجر مکرها) ای صب فی حلقه شیٔ والا یجار غیر قید فلو اسقط قوله اوجر وأبقی قول المتن او مکرها معطوفا علی قوله خطاء لکان اولی لیشمل مالو اکل أو شرب بنفسه مکرها فانه یفسد صومه حلا فالزفر و الشافعی کما فی البدائع ولیشمل الافطار بالاکراه علی الجماع قال فی الفتح: واعلم أن ابا حنیفة کان یقول اولا فی المکره علی الجماع علیه القضاء والکفارة لانه لایکون الا بانتشار الآلة و ذالک امارة الاختیار ثم رجع وقال لاکفارة علیه وهو قولهما لان فساد الصوم یتحقق بالایلاج وهو مکره فیه مع انه لیس کل من انتشرت آلته یجامع اھ أی مثل الصغیر والنائم.

(۸۹) روزہ ٹوٹ جانے کے بعد بیوی سے ہمبستری کرنے سے قضاوکفارہ کاحکم

سوال ...کیافرماتے ہیں علماءکرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک روزہ دار پرشہوت کا غلبہ ہوگیا اس نے ہاتھوں سے منی خارج کرلی اور پھر کچھ دیر بعد دوبارہ شہوت کے ابھرآنے پر بیوی سے جماع کرلیا تو اب اس شخص پر صرف قضاء ہوگی یا قضاء اور کفارہ دونوں لازم ہوں گے؟

الجواب حامداًومصلیاً استمناء بالید یعنی ہاتھوں سے منی خارج کرنا شرعاًوعقلاً انتہائی شنیع اور قبیح فعل ہے حدیث شریف میں ایسے شخص پر لعنت فرمائی گئی ہے اور روزے کی حالت میں اس فعل کی شناعت اور بڑھ جاتی ہے تاہم روزے کی حالت میں اگرکوئی شخص یہ فعل شنیع کرلیتاہے تو اس کا روزہ ٹوٹ جائے گا اس کو توبہ واستغفار کرنا چاہئے اور اس کے ذمہ صرف اس روزے کی قضاء لازم ہوگی۔ اس کے بعد اگروہ بیوی سے ہمبستری کرے تو چونکہ اسکا روزہ باقی نہیں رہا تو اس کی وجہ سے اس پر کفارہ لازم نہیں ہوگا البتہ اگر اس کی بیوی روزے سے تھی تو اس پر قضاء وکفارہ دونوں لازم ہوں گے۔

لما فی الشامیة(۲/۳۹۹): مطلب فی حکم الاستمناء بالکف. (قوله وکذا الاستمناء بالکف) ای فی کونه لایفسد لکن هذا اذا لم ینزل اما اذا انزل فعلیه القضاء کما سیصرح به وهو المختار (الخ).

وفي الهندية(١/ ٢٠٢): لواكل او شرب أو جامع ناسيا وظن ان ذالک فطره فاكل متعمدا لا كفارة عليه وان علم ان صومه لايفسد بالنسيان عند ابى حنيفة رحمه الله تعالىٰ لاتلزمه هو الصحيح هكذا في الخلاصة وإذا احتلم فظن ان ذالک فطره فاكل بعد ذالک متعمدا لا كفارة عليه هكذا في المحيط. (الخ)

وفي الدر المختار(٢/ ٤٠١): (أواكل) أو جامع (ناسيا) أو احتلم او انزل بنظر أو ذرعه القئ (فظن انه افطر فاكل عمداً) للشبهة ولو علم عدم فطره لزمته الكفارة الا في مسألة المتن فلا كفارة مطلقا على المذهب لشبهة.

وفي الشامية تحته: (قوله فاكل عمدا) وكذا لو جامع عمدا كما في نور الايضاح فالمراد باكل الافطار، (قوله للشبهة) علة لنكل قال في البحر وانما لم تجب الكفارة بافطاره عمدا بعد اكله أو شربه أو جماعه ناسيا لانه ظن في موضع الاشتباه بالنظير.

(٩٠) موانع حیض دواء کے استعمال سے روزے کی قضاء کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی عورت رمضان کے مہینے میں حیض بند کرنے کی گولیاں کھاتی ہے اور حیض بند کر دیتی ہے اور رمضان کے روزے رکھ لیتی ہے۔ ایک عالم صاحب نے کہا کہ وہ روزے دوبارہ رکھے گی۔ کیا اس عالم صاحب کا کہنا صحیح ہے یا اس عورت کے روزے مکمل ہو گئے ہیں؟ مفصل جواب دیکر عنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً: شرعی اصطلاح میں حیض نام ہے اس خون کو دیکھنے کا جو بلا کسی سبب کے رحم سے آئے، گویا کہ حیض نام ہے خون آنے کا، اب اگر کسی عارض کی بناء پر خون نہ آئے یا اسے روک دیا جائے تو عورت کے یہ ایام پاکی کے شمار ہوں گے، اور اس پر پاکی کے تمام احکام جاری ہوں گے، لہذا صورت مسئولہ میں جب مذکورہ عورت نے حیض بند کرنے کی گولیوں سے اپنی ماہواری کو روک دیا تو اس پر ان ایام میں رمضان کے روزے رکھنا ضروری تھا، اور جب اس نے ان دنوں میں روزے رکھ لئے تو فریضہ صوم سے سبکدوش ہوگئی۔ اب دوبارہ رکھنے کی ضرورت نہیں۔

لمافي الهندية(١/ ٣٨): لايثبت حكم كل منها الا بخروج الدم وظهوره وهذا هو ظاهر مذهب أصحابنا وعليه عامة مشائخنا وعليه الفتوى.

وفيه ايضا(٥/ ٣٥٦): وان شربت المرأة دواء لتصح نفسها وهي حامل فلا بأس بذلك وهو أولى وان سقط الولد حيا أو ميتا فلا شئ عليها.

وفي الاشباه والنظائر(ص ١٩٩): المدهشة: شربت دواء فحاضت لم تقض الصلوات.

(۹۱) حدیثِ کفارہ اور قضاء پر چند اشکالات اور انکے جوابات

سوال..... حضرت مفتی صاحب میں ایک گورنمنٹ فیکٹری میں ملازمت کرتا ہوں اور کچھ دن پہلے میں تبلیغی جماعت سے منسلک ہوا ہوں مگر میری فیکٹری کے کچھ لوگ دوسرے خیالات کے ہیں جیسے کہ غیر مقلد وغیرہ جب سے میں تبلیغ کے ساتھ منسلک ہوا ہوں یہ لوگ مجھ پر اور میرے کچھ اور ساتھیوں پر اشکالات کرتے رہتے ہیں میرا ذہن سخت الجھن میں مبتلا ہے اور ان کی باتوں کی وجہ سے میرے ذہن میں چند سوالات ہیں، برائے مہربانی آپ ان کا تشفی بخش جواب عنایت فرمائیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ احناف کے نزدیک کفارہ صوم حدیثِ اعرابی سے ثابت ہے جبکہ یہ حدیث خبر واحد ہے اور احناف کے اصول کے مطابق خبر واحد سے فرضیت ثابت نہیں ہوتی اس شبہ کا تسلی بخش جواب عنایت فرمائیں؟

دوسرا اشکال یہ ہے کہ اعرابی نے کفارہ کی کھجور خود استعمال کیں تو کیا اس سے فرض ساقط ہوگیا تھا اگر نہیں تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکو بغیر کفارہ کے کیسے بری کردیا؟

تیسرا اشکال حدیث قضا سے متعلق ہے جس میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ **صام عنه وليه** اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی قضا روزہ رکھ سکتا ہے جبکہ احناف کہتے ہیں قضا ولی نہیں کرسکتا۔ برائے مہربانی حدیث کا جواب اور احناف کے دلائل مرحمت فرما کر مشکور فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورت مسئولہ میں جس حدیثِ اعرابی سے احناف کفارے کا وجوب ثابت کرتے ہیں وہ حدیث مشہور ہے چنانچہ ہر طبقے میں تین سے زائد افراد اس حدیث کو روایت کرنے والے ہیں جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس حدیث کو روایت کرنیوالے صحابہ میں حضرت ابوھریرہ، حضرت عائشہ، حضرت ابن عمر، حضرت عبداللہ ابن عمرو اور حضرت علی رضی اللہ عنہم اجمعین (پانچ صحابہ کرام) اور ان صحابہ کرام سے روایت کرنیوالے تابعین میں حمید بن عبدالرحمٰن، حضرت عباد ابن عبداللہ ابن الزبیر، حضرت ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن اور حضرت حسن ابن علی بن الحسین رحمہم اللہ (چار حضرات) اور پھر ان چار حضرات سے روایت کرنیوالے تابعین و تبع تابعین میں حضرت امام زھری، حضرت محمد بن جعفر، حضرت حبیب اور حضرت حسن بن علی ابن الحسین رحمہم اللہ (چار حضرات) سرفہرست ہیں..... وھلم جرا پھر امام زہری سے چالیس سے زائد افراد اس روایت کو نقل کرنیوالے موجود ہیں جسکی وجہ سے یہ حدیث مشہور ہے اور حدیث مشہور عمل کے لحاظ سے حدیث متواتر کے حکم میں ہوتی ہے حتی کہ حدیث مشہور کے ذریعہ کتاب اللہ پر زیادتی کرنا بھی جائز ہے یہی وجہ ہے کہ علامہ عینی اور حافظ ابن حجر رحمہما اللہ نے اکثر بصیرت کی تصریح فرمائی ہے۔

اسی طرح دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ اس واقعہ میں اعرابی نے اگر چہ کفارے کا استعمال خود فرمایا لیکن اس سے کفارے کا وجوب ساقط نہیں ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسکو بغیر کفارے کے بری کردینا اس وجہ سے نہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کفارہ معاف فرمادیا بلکہ اصل میں وہ شخص حاجتمند تھا اسلئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے تعارض نہ فرمایا اور اسکو اپنے گھر والوں میں کھجور کے استعمال کی اجازت دی البتہ کفارے کی ادائیگی بعد میں (تراخی سے) اس پر لازم رہی۔ جبکہ بعض حضرات (امام زہری اور امام الحرمین

)کے نزدیک یہ اسکی خصوصیت تھی جسکی وجہ سے خود اسے استعمال کا حکم فرمایا۔ چنانچہ فتح القدیر (۲/۳۴۰) میں ہے:.......... **وفی لفظ لأبی داؤد زاد الزهری: وإنما کان هذا رخصة له خاصة ولو أن رجلا فعل ذلک الیوم لم یکن له بدمن التکفیر.**

اسی طرح تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ مرحوم کی طرف سے اسکا ولی روزوں کی قضا نہیں کر سکتا اگرچہ بعض روایات میں قضا کی اجازت وارد ہوئی ہے جیسا کہ سوال میں مذکور ہے لیکن اسکے معارض حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی صریح روایت موجود ہے چنانچہ حضرت امام مالک رحمہ اللہ نے مؤطا (ص۲۴۵) میں اس طرح روایت نقل کی ہے۔ **مالک أنه بلغه ان عبدالله ابن عمر کان یسئل هل یصوم احد عن احد أو یصلی احد عن احد فیقول لا یصوم احد عن احد و لا یصلی احد عن احد.** اس روایت کو امام ترمذی نے مرفوعاً نقل کیا ہے اور علامہ عینی بھی اس حدیث کے رفع کے قائل ہیں (عمدۃ القاری ۱۱/۵۹) لہٰذا اس حدیث کی بنا پر فقہاء کرام نے صراحت کی ہے کہ ولی کو بدنی عبادات میں مرحوم کی طرف سے قضا کا حق حاصل نہیں ہوگا اور جہاں تک: **صام عنه ولیه**: کا تعلق ہے تو فقہاء کرام نے اسکو فدیہ پر محمول کیا ہے۔ چنانچہ **عنایة علی هامش فتح القدیر** (۲/۳۶۰) میں ہے **"وتأویل حدیث عائشة رضی الله عنها فعل عنه ما یقوم مقام الصوم من الإطعام إن أوصی بذلک."**

(۹۲) کفارہ کا وجوب حدیثِ مشہور سے ثابت ہے

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک کالج میں لیکچرر ہوں ہمارے کالج کے جو دوسرے اساتذہ ہیں ان سے مختلف موضوع پر بات چیت ہوتی رہتی ہے، ایک دن اس حدیث پر گفتگو ہونے لگی جو کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ہے جس میں کفارۂ صوم کی فرضیت بیان ہے، تو ایک استاذ نے کہا کہ یہ احناف کے اصول کے خلاف ہے کیونکہ یہ خبر واحد ہے اور خبر واحد سے کتاب اللہ پر زیادتی کرنا ٹھیک نہیں جبکہ قرآن میں اس کا تذکرہ نہیں ہے تو اس سے کفارۂ صوم کی فرضیت ثابت نہیں ہو سکتی تو کیا یہ بات ٹھیک ہے؟ کیا یہ احناف کے اصول کے خلاف ہے اگر خلاف ہے تو پھر فرضیت کیسے ثابت ہوئی؟ برائے مہربانی تشفی بخش جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً صورت مسئولہ میں جس حدیث سے احناف کفارے کی فرضیت بیان کرتے ہیں وہ خبر مشہور ہے اور خبر مشہور سے احناف کے نزدیک فرضیت ثابت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری (۴/۱۳۱) نیز علامہ بدرالدین عینی رحمہ اللہ نے عمدۃ القاری (۱۱/۲۹) میں صراحت کی ہے کہ یہ حدیث چالیس طرق سے مروی ہے لہٰذا حافظ ابن حجر ہی اس حدیث کے مشہور ہونے کے بارے میں الدرایة علی تخریج الهدایة (۱/۲۳۷) میں فرماتے ہیں کہ: **قلت: هذا الحدیث مشهور اخرجه الائمة کلهم من حدیث ابی هریرة رضی الله عنه.**

(۹۳) کفارے میں روزہ رکھنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک دوست ہے اس نے مجھ سے ایک مسئلہ پوچھا جو کہ اس کے گھر

میں کسی فرد کے ساتھ پیش آیا تھا اس نے کہا کہ اگر کسی پر روزے کا کفارہ ہو، اور وہ روزے رکھنے پر بھی قادر ہو پھر بھی وہ مسکینوں کو کھانا کھلادے تو اس کا کفارہ ادا ہو جائے گا میں نے اس سے کہا کہ یہ مسئلہ مجھے معلوم نہیں میں اپنے مفتی صاحب سے پوچھ کر تم کو جواب دوں گا اب آپ سے پوچھنا یہ ہے کہ روزے پر قدرت کے باوجود اگر کوئی کفارہ ادا کرے تو کیا کفارہ ادا ہو جائے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً روزے کے کفارے میں کھانا کھلانا اس وقت جائز ہوتا ہے جبکہ روزہ رکھنے کی طاقت نہ ہو، لہٰذا اس شخص کا یہ عمل درست نہیں ہے اسکو چاہئے کہ دو مہینے لگا تار روزے رکھے۔

لما في الشامية(۲/۴۱۲): (قوله ككفارة المظاهر)مرتبط بقوله و كفرأى مثلهافي الترتيب فيعتق أولافان لم يجدصام شهرين متتابعين فان لم يستطع أطعم ستين مسكينالحديث الأعرابى المعروف فى الكتب الستة.

(۹۴) ماہِ مبارک کا روزہ توڑنے پر کفارے کی حکمت

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ گزشتہ رات میں ایک عالم صاحب کے بیان میں شریک ہوا تھا۔ انہوں نے روزے کے مضمون پر بیان کیا تھا اور آخر میں چند مسائل بھی ذکر کیے تھے ایک مسئلہ جو مجھے پوچھنا تھا وہ رہ گیا تھا اور وقت بھی کافی ہو گیا تھا، وہ یہ تھی کہ اگر کوئی شخص رمضان کا روزہ توڑ دے تو قضاء کفارہ دونوں لازم ہوتے ہیں جبکہ نفل یا دیگر روزے توڑنے میں صرف قضا لازم ہوتی ہے، آخر اس فرق کی کیا وجہ ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً صورت مسئولہ میں رمضان کا روزہ توڑنے پر کفارہ لازم آنے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ روزہ توڑنے پر کفارہ کا لازم آنا خلاف قیاس نص سے ثابت ہے لہٰذا غیر رمضان کا روزہ توڑنے پر یہ حکم نہیں لگایا جائیگا۔ اسی طرح دوسری وجہ فرق کی یہ ہے کہ رمضان کا روزہ توڑنے میں روزے اور ماہ مبارک دونوں کی بے حرمتی ہے اسلئے قضا کیساتھ کفارہ بھی لازم ہوگا جبکہ غیر رمضان میں صرف روزہ کی بے حرمتی ہے اسلئے صرف قضا لازم ہوگی۔

لما في الشامية(۲/۴۰۴): (قوله لاختصاصها)أى الكفارة وهو علة للتقييدبالغيرية وبالاداء وقوله بهتک رمضان اى بخرق حرمة شهر رمضان فلاتجب بافسادقضائه اوافسادصوم غيره لان الافطار فى رمضان ابلغ فى الجناية فلايلحق به غيره لورودهافيه على خلاف القياس.

(۹۵) دو روزے توڑنے پر ایک ہی کفارہ کافی ہو جائے گا

سوال کیا فرماتے ہیں حضرات علماء و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے رمضان المبارک کے دو روزے توڑ دیے اب اس شخص پر دو کفارے لازم ہوں گے یا ایک ہی کافی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اگر کوئی شخص رمضان المبارک کا روزہ جان بوجھ کر توڑ دے تو اس پر قضاء وکفارہ دونوں لازم ہوتے ہیں۔ لہٰذا شخص مذکورہ جس نے دو (۲) روزے توڑے ہیں۔ اس پر دونوں کی قضاء اور کفارہ لازم ہے۔ البتہ اگر دونوں روزے ایک ہی رمضان کے ہیں تو ایک ہی کفارہ دونوں کی طرف سے کافی ہو جائے گا۔ اور اگر دونوں ایک ہی رمضان کے نہیں بلکہ ایک روزہ ایک رمضان کے مہینہ کا ہے اور دوسرا دوسرے مہینہ کا ہے۔ تو صحیح قول کے مطابق دو کفارے لازم ہوں گے۔ واللہ اعلم

لما في الخانية على هامش الهندية(۱/۲۱۵): اذ أفطر في رمضان في يوم ولم يكفر حتى افطر في يوم آخر كان عليه كفارة واحدة.

وفي الهندية (۱/۲۱۵): ولو جامع مراراً في ايام من رمضان واحد ولم يكفر كان عليه كفارة واحدة ولو جامع وكفرثم جامع عليه كفارة اخرى في ظاهر الرواية.

وفي الدر المختار(۲/۴۱۳): ولو تكرر فطره ولم يكفر للأول يكفيه واحدة.

وفي الشامية تحته: (قوله ولم يكفر للأول) أما لو كفر فعليه أخرى في ظاهر الرواية للعلم بأن الزجر لم يحصل بالأولى بحر.

وفيه ايضاً: ولوتكرر فطره ولم يكفر للاوّل يكفيه واحدة ولو في رمضانين عند محمد وعليه الاعتماد بزازية ومجتبى وغيرهما واختار بعضهم للفتوى أن الفطر بغير الجماع تداخل والالا

وفي الشامية تحته: (قوله وعليه الاعتماد)

نقله في البحر عن الأسرار ونقل قبله عن الجوهرة لو جامع في رمضانين فعليه كفارتان وان لم يكفر للاولى في ظاهر الرواية وهو الصحيح. اهـ.

قلت: فقد اختلف الترجيح كما ترى ويتقوى الثاني بأنه ظاهر الراوية (قوله وإلا لا) اى وان كان الفطر المتكرر في يومين بجماع لاتتداخل الكفارة وإن يكفر للاوّل لعظم الجناية ولذا اوجب الشافعيؒ الكفارة به دون الأكل والشرب.

(۹۶) کفارۂ قسم کے روزوں کے دوران اگر مال آ جائے تو کیا حکم ہے؟

سوال ...کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری اپنے قریبی دوست سے کسی بات پر ناراضگی ہوگئی اور میں نے غصہ میں قسم کھالی کہ میں اس سے بات نہیں کروں گا۔ بعد میں مجھے ندامت ہوئی تو میں نے اپنے ایک عزیز سے جو دینی مدرسہ میں علم حاصل کرتے ہیں، اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے مجھے قسم توڑ کر کفارہ ادا کرنے کی تاکید کی اور چونکہ میرے پاس کچھ مال وغیرہ نہ تھا تو انہوں نے مجھے تین روزے رکھنے کا فرمایا، لیکن دوسرے ہی روزہ میں مجھے اچھی خاصی رقم کمپنی سے سالانہ بونس کی صورت میں مل

گئی۔اب آپ حضرات سے پوچھنا یہ ہے کہ کیا پیسہ ملنے کی صورت میں روزوں سے کفارہ ادا ہو جائے گا یا کفارہ میں پیسے دینا ضروری ہوگا؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرما کر مشکور ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں جب آپ کے پاس روزوں کے دوران مال آ گیا تو روزوں کے ذریعے کفارہ ادا کرنا صحیح نہیں ہوگا بلکہ کفارہ بالمال لازم ہو جائے گا یعنی دس مسکینوں کو دو وقت کا کھانا کھلانا، یا ان کو کپڑا پہنا دینا، یا ہر مسکین کو صدقۂ فطر کی مقدار کے برابر رقم کا مالک بنا دینا۔

لما في الهندية(۲/۶۴): اذا صام المكفر يومين ثم وجد في اليوم الثالث مايطعم او يكسولم يجزئ الصوم وعليه الكفارة بالاطعام أو الكسوة وان صام المعسر يومين ثم وجد في اليوم الثالث مايعتق فعليه التكفير بالمال.

وفي الدر المختار(۳/۴۷۷):(والشرط استمرار العجز إلى الفراغ من الصوم فلو صام المعسر يومين ثم) قبل فراغه ولو بساعة (أيسر) ولو بموت مورّثه موسرا (لايجوز له الصوم) ويستأنف بالمال خانية.

(۹۷) جان بوجھ کر روزہ توڑنے کے بعد حیض آیا تو کیا حکم ہے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت نے رمضان المبارک میں دن بارہ بجے جان بوجھ کر روزہ توڑ دیا اور اسی دن دو بجے خون آنا شروع ہو گیا تو کیا اس عورت پر صرف قضاء ہوگی یا کفارہ بھی ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... وہ عورت جو جان بوجھ کر روزہ توڑ دے اور اسی دن حیض یا نفاس کا خون آنا شروع ہو جائے تو ایسی عورت سے کفارہ ساقط ہو جاتا ہے لہٰذا صورت مسئولہ میں مذکورہ عورت سے کفارہ ساقط ہو جائے گا البتہ اس دن اور بقیہ ایام حیض (اگر وہ رمضان المبارک میں ہی ہوں) کی قضاء واجب ہوگی۔

وفي التاتارخانية(۲/۳۹۳): وكذلك اذا اكلت أو شربت ثم حاضت اومرضت في ذلك اليوم لا كفارة عليه وفي الحجة بخلاف ماذا صامت تطوعاً ثم حاضت في ذلك اليوم فانه لا يسقط عنها القضاء لان القضاء لايسقط بالشبهة بخلاف الكفارة.

وفي الهندية(۱/۲۰۶): ولو افطرت المرأة متعمدة ثم حاضت او مرضت يومها ذلك قضت ولا كفارة عليها وكذا لوافطر ثم اغمى عليه.

(۹۸) مسافر کا بستی سے نکلنے سے پہلے واپس آ کر روزہ توڑ دینے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دن میں سفر کے ارادے سے جارہا تھا تھوڑا سفر کیا تھا

کہ مجھے یاد آ گیا میرا کچھ سامان گھر رہ گیا ہے تو میں واپس آ گیا گھر آ کر میں نے کھانا کھالیا جبکہ رمضان کا مہینہ تھا اور میرا روزہ بھی تھا تو اب میرے اوپر صرف قضاء لازم ہے یا کفارہ بھی ساتھ ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً ..... آدمی اگر روزہ رکھ کر سفر کی نیت سے نکلا ہو مگر ابھی اس نے سفر بقدر مسافت شرعی طے نہیں کیا (یعنی فنائے شہر سے ابھی باہر نہیں نکلا) کہ کسی بھولی ہوئی چیز کو لینے گھر آ گیا اور وہاں اس نے روزہ افطار کر لیا تو چونکہ شرعی طور پر وہ ابتک مسافر نہ بنا تھا اور سفر کے احکام اس پر جاری نہ ہوئے تھے اس لئے اس پر کفارہ لازم ہوگا، لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ پر کفارہ بھی لازم ہے۔

لمافي التاتارخانية (۲/۳۷۷): وفي الهداية: وليس في افساد الصوم في غير رمضان كفارة، الذخيرة: ومن أصبح يريد السفر في رمضان وبعث برحله ثم افطر في مصره ذكر في الأصل: عليه الكفارة، وفي نوادر داود بن رشيد عن محمد أنه لاكفارة عليه.

وفي الهندية (۱/۲۰۷): ولو سافر في شهر رمضان ثم رجع الى أهله ليحمل شيأ نسيه فاكل بمنزله ثم خرج القياس ان تجب عليه الكفارة لانه رفض سفره قال الفقيه وبه ناخذ كذا في الغياثية.

وفي الدر المختار (۲/۴۳۱): (ويجب عليه) الصوم (لو) كان (في رمضان) لزوال المرخص (كما يجب علي مقيم إتمام) صوم(يوم منه) اى رمضان (سافر فيه) أى في ذلك اليوم (و) لكن (لاكفارة عليه لوأفطر فيهما) للشبهة في اوله وآخره الا اذا دخل مصره لشئ نسيه فأفطر فإنه يكفر، ولو نوى الصائم الفطر لم يكن مفطرا كمامر.

وفي الشامية تحته: (قوله فإنه يكفر) اى قياسا لأنه مقيم عند الاكل حيث رفض سفره بالعود إلى منزله وبالقياس نأخذ اهـ. خانية فتزاد هذه على المسائل التى قدم فيها القياس على الاستحسان حموى، وقد مرأنه لو اكل المقيم ثم سافر أو سوفربه مكرها لا تسقط الكفارة، والظاهر أنه لو اكل بعد ماجاوز بيوت مصره ثم رجع فاكل لاكفارة عليه وان عزم على عدم السفر أصلابعد اكله لان اكله وقع في موضع الترخص نعم يجب عليه الامساك.

(۹۹) کسی کے وصیت کیے بغیر اس کی طرف سے روزوں کا فدیہ ادا کرنے کا حکم

سوال ..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے دادا کا چند سال پہلے انتقال ہوا ہے اور ان کے بیماری کی وجہ سے دو سال کے روزے رہ گئے تھے اور صحت یابی کے بعد انہوں نے آخری عمر تک روزوں کی قضا نہیں کی تھی اور وفات کے وقت وصیت بھی نہیں کی کہ میری طرف سے فدیہ ادا کر دینا، اب معلوم یہ کرنا ہے کہ اگر میں ان کی طرف سے فدیہ ادا کر دوں تو وہ بری الذمہ ہو جائیں گے؟ آخرت میں مؤاخذہ تو نہیں ہوگا اور کیا مجھ کو بھی اجر ملے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً۔۔۔ اگر کوئی آدمی بیمار ہے روزے نہیں رکھ سکتا تو اس کیلئے افطار کرنا جائز ہے لیکن بعد میں اگر تندرست ہو جائے تو اس پر ان روزوں کی قضا کرنا ضروری ہے اور اگر اس نے موت تک ان روزوں کی قضا نہ کی تو اس پر روزوں کے فدیہ کی وصیت کرنا واجب ہے۔ اور اگر وصیت نہ کی تو ورثہ پر ان روزوں کا فدیہ دینا واجب نہیں البتہ اگر وہ ترکہ کے علاوہ مال سے تبرع کرے تو یہ جائز ہے اور ورثہ کو اس کا ثواب بھی ملے گا۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں جب آپ کے دادا نے دو سال کے روزے نہیں رکھے بیماری کی وجہ سے اور بعد میں تندرست ہو گئے تو ان کے ذمہ ان روزوں کی قضا لازم تھی لیکن جب انہوں نے ان روزوں کی قضا نہ کی اور وصیت کئے بغیر انتقال کر گئے تو اب اگر آپ اپنے دادا کی طرف سے فدیہ ادا کریں تو انشاء اللہ آپ کے دادا بری الذمہ ہو جائیں گے اور ان شاء اللہ آخرت میں مؤاخذہ بھی نہ ہوگا اور آپ کو اس کا اجر بھی ملے گا۔

لمافی الہندیۃ (۱-۲۰۷): ولو فات صوم رمضان بعذر المرض او السفر واستدام المرض او السفر حتی مات لاقضاء علیه لكنه ان اوصی بان يطعم عنه صحت وصيته وان لم تجب عليه ويطعم عنه من ثلث ماله فان برئ المريض او قدم المسافر وادرك من الوقت بقدر مافاته فيلزمه قضاء جميع ماادرك فان لم يصم حتى ادركه الموت فعليه ان يوصى بالفدية كذا في البدائع ويطعم عنه وليه لكل يوم مسكيناً نصف صاع من بر اوصاعاً من تمر اوصاعا من شعير كذا في الهداية فان لم يوص وتبرع عنه الورثة جاز ولا يلزمهم من غير ايصاء كذا في فتاوىٰ قاضي خان.

وفي الدر المختار (۲-۴۲۲): او مريض خاف الزيادة لمرضه وصحيح خاف المرض ... (ص۴۲۳) الفطر يوم العذر الا السفر كما سيجئ وقضوا لزوماً ما قدروا بلا فدية وبلا ولاء ... فإن ماتوا فيه اى في ذالك العذر فلا تجب عليهم الوصية بالفدية لعدم ادراكهم عدة من ايام اخر ولو ماتوا بعد زوال العذر وجبت الوصية بقدر ادراكهم عدة من ايام اخر وأمامن افطر عمداً فوجوبها عليه بالاولى وفدى لزوماً عنه اى عن الميت وليه الذى يتصرف في ماله كالفطرة قدراً بعد قدرته عليه اى على قضاء الصوم وفوته اى فوت القضاء بالموت فلو فاته عشرة ايام فقدر على خمسة فداها فقط بوصيته من الثلث متعلق بفدى وهذا لوله وارث والافمن الكل قهستاني وان لم يوص وتبرع وليه به جاز ان شاء الله تعالى ويكون الثواب للولي.

(۱۰۰) کفارہ صوم والی روایت کا حکم

سوال۔۔۔ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں درجہ رابعہ کا طالب علم ہوں، ایک دن ویسے ہی میں سوچ رہا تھا کہ ماہ رمضان کا روزہ توڑنے کا کفارہ کس نص سے ثابت ہے؟ اعرابی والی روایت بظاہر خبر واحد ہے؟ تو پھر کفارہ صوم کیلئے

کونسی روایت یا نص ہے؟ از راہِ کرم مدلل و مفصل جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً　صورت مسئولہ میں ماہ رمضان کا روزہ توڑنے کا کفارہ اعرابی والی روایت ہی سے ثابت ہے۔ کیونکہ اس خبر واحد کو تلقی الامۃ بالقبول حاصل ہے اور جس خبر واحد کو **تلقی الامۃ با لقبول** حاصل ہو، وہ خبر مشہور کے حکم میں ہوتی ہے۔ نیز علامہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "**الدراية في تخريج احاديث الهداية**" (**۱/۲۳۷، مکتبہ رحمانیہ**) میں اس حدیث کو مشہور قرار دیا ہے۔ لہٰذا اس روایت سے کفارہ کا ثبوت درست ہے۔

لمافي بدائع الصنائع(۲/۲۱۷): لاخلاف في وجوب الكفارة على الرجل بالجماع والاصل فيه حديث الاعرابي.

وفي نور الانوار(صـ۱۷۸): وهذه الاخبار وانكانت احادا لكن لما تلقته الامة بالقبول صارت بمنزلة المشهور.

وفي الدراية في تخريج احاديث الهداية (۱/۲۳۷، مكتبه رحمانيه): قلت هذا الحديث مشهور اخرجه الائمة كلهم من حديث ابى هريرة.

(۱۰۱) روزوں کا فدیہ شروع رمضان میں ہی ادا کرنے کا حکم

سوال...کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے دادا جان بہت ضعیف ہیں روزہ نہیں رکھ سکتے آیا انکے روزوں کا فدیہ ادا کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ نیز اگر ادا کیا جا سکے تو رمضان کی ابتدا میں سارے روزوں کا اکٹھا ادا کیا جا سکتا ہے یا ہر روز شام کو ایک روزہ کا فدیہ ادا کرنا ضروری ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......ایسے شخص پر جو روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتا ہو فدیہ (یعنی ایک مسکین کو کھانا کھلانا یا پونے دو سیر گیہوں یا انکی قیمت) ادا کرنا واجب ہے. چاہے تمام روزں کا فدیہ رمضان کی ابتدا میں دیدے یا رمضان مبارک کے آخر میں حساب کر کے دیدے دونوں صورتیں جائز ہیں۔

لمافي الدر المختار(۲/۴۲۷): (وللشيخ الفاني العاجزعن الصوم الفطرويفدى) وجوباولوفى اول الشهر. وفى رد المحتار (قوله ولو فى اوّل الشهر) اى يخير بين دفعها فى اوله وآخره.

(۱۰۲) فدیہ صوم، ماہِ مبارک کے بعد ادا کرنے کا حکم

سوال...کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ روزوں کے فدیہ کی مقدار آجکل کے اعتبار سے کتنی ہے؟ کیا یہ فدیہ بھی عید سے پہلے دینا ضروری ہے جیسا کہ صدقہ فطر عید سے پہلے دینا ضروری ہے اور کیا جمعۃ الوداع کے روزے کا فدیہ عام روزوں کی طرح

ہے یا اس میں کچھ فرق ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ..... فدیہ کی مقدار پونے دو سیر گندم بنتی ہے اور روپوں میں ادائیگی کے وقت اتنی مقدار گندم کی قیمت بازار سے معلوم کر لی جائے۔ اسی طرح فدیہ صوم، صدقۂ فطر کی طرح رمضان مبارک میں ادا کرنا مستحب ہے اگرچہ ماہِ مبارک کے بعد بھی ادا ہو جاتا ہے۔ نیز جمعۃ الوداع کے روزہ کے فدیہ کا حکم بھی عام روزہ کے فدیہ جیسا ہے۔

لمافی الدر المختار مع رد المحتار (۳۶۵/۲): وھو ای الصاع المعتبر مایسع الفاً واربعین درھما (۱۰۴۰) من ماش اوعدس. قوله وھو ای الصاع الخ. اعلم ان الصاع اربعة امداد والمدرطلان والرطل نصف من والمن بالدراھم مائتان وستون (۲۶۰) درھما وبالاستار اربعون (۴۰) والاستار بکسر الھمزة بالدراھم ستة ونصف وبالمثاقیل قیل اربعة ونصف...فالمد والمن سواء کل منھما ربع صاع مائة وثلاثون درھما (۱۳۰).

وفیه ایضاً (۴۲۷/۲): (ویفدی) وجوبا ولو فی اول الشھر وبلاتعدد فقیر کالفطرة لو مؤسرا.

(۱۰۳) شوگر اور بلڈ پریشر کے مریضوں کیلئے فدیہ کا حکم

سوال ..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص شوگر اور ہائی بلڈ پریشر کے مرض میں مبتلا ہے، جسکے روزانہ دو انجکشن لگتے ہیں (صبح اور رات کو) اور دیگر دوائیاں بھی استعمال کرنا پڑتی ہیں۔ ڈاکٹروں کے مطابق یہ امراض زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں، اس صورت میں کیا وہ شخص روزہ رکھنے کا مکلف ہے؟ فی الوقت وہ شخص صاحب نصاب بھی نہیں ہے کہ فدیہ ادا کر سکے اور ہزاروں روپے کا مقروض بھی ہے، اس صورتحال میں وہ کیا کرے جبکہ وہ ہر حالت میں اپنے پروردگار کا فرمابردار رہنا چاہتا ہے۔

۲۔ ایسا شخص اگر بتوفیق الٰہی ہمت کر کے روزہ رکھے لیکن دن میں کسی بھی وقت دوا استعمال کرنے یا کچھ کھانے کی ضرورت پیش آ جائے تو کیا وہ روزہ توڑ سکتا ہے؟ اس صورت میں روزے کی صرف قضا لازم ہوگی یا کفارہ یا دونوں؟

۳۔ اگر کسی عورت نے روزہ رکھا لیکن وہ دن گیارہ بجے سے حیض سے ہوگئی تو کیا وہ روزہ توڑ کر فوراً کھا پی سکتی ہے یا شام تک اسے روزہ رکھنا ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً .....صورت مسئولہ میں پہلے سوال کے جواب سے پہلے یہ بات سمجھ لیں کہ اگر کوئی شخص اتنا عمر رسیدہ ہو کہ اسمیں روزہ رکھنے کی طاقت بالکل نہ ہو اور اپنی صحت یابی سے مایوس ہو جائے یا اسے ایسا مرض لاحق ہو جائے جس سے صحت یابی کی کوئی امید نہ ہو اور کسی ماہر ڈاکٹر نے بھی اس مرض کی تشخیص کر دی ہو اور وہ شخص روزہ رکھنے سے بالکل لاچار بھی ہو تو اسے ہر روزہ کے بدلہ فدیہ ادا کرنا پڑیگا (فدیہ کی مقدار صدقۂ فطر کی طرح ہے) اور اگر وہ شخص اتنا تنگدست ہو کہ فدیہ بھی ادا نہ کر سکتا ہو تو اس صورت میں فدیہ کا وجوب اس سے ساقط ہو جائیگا وہ شخص اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتا رہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر یہ شخص جسکو شوگر اور بلڈ پریشر کا مرض

لاحق ہے۔مذکورہ بالا صفات کا حامل ہے تو اسکے لئے روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہوگی ورنہ نہیں۔

۲۔اگرایسا شخص بتوفیق الٰہی روزہ رکھ لے پھراسے دن میں دوا کھانے کی حاجت پیش آجائے کہ اگر دوا نہ کھائیگا تو مرض کے بڑھنے کا اندیشہ ہے تو اس پر سے فدیہ والا حکم ساقط ہوجائیگا اوراس روزہ کی صرف قضا اسپر لازم ہوگی نہ کہ کفارہ۔

۳۔روزے کے دوران اگرعورت کوحیض آجائے تو اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اوراس سے عورت کے ذمہ صرف قضا ہوگی، کفارہ نہیں آئیگا۔نیز حیض کی وجہ سے روزہ ٹوٹنے کے بعد اور دورانِ حیض عورت کھاپی سکتی ہے البتہ بہتر یہ ہے کہ تنہائی میں کھائے پئے۔

لمافي الهندية (۱/۲۱۵): وأجمعوا على أنه لايجب التشبه بالصائم على الحائض والنفساء والمريض والمسافر وهل تاكل الحائض سراً أو جهراً قيل سرا وقيل جهرا الخ.

وفيه ايضاً (۱/۲۰۷): وإذا حاضت المرأة أو نفست أفطرت كذا في الهداية.

وفي الدر المختار(۲/۴۲۷): (وللشيخ الفاني العاجزعن الصوم الفطرويفدى) وجوباولوفي اول الشهر وبلا تعددفقير كالفطرة لومؤسرا وإلافيستغفر الله.

وفي الشامية تحته:(قوله للشيخ الفاني)اى الذى فنيت قوته أواشرف على الفناء ولذاعرفوه بانه الذى كل يوم في نقص الى ان يموت نهر.ومثله مافي القهستاني عن الكرماني: المريض اذاتحقق اليأس من الصحة فعليه الفدية لكل يوم من المرض...(قوله العاجزعن الصوم)اى عجزا مستمرا كما يأتي.

(۱۰۴) روزہ رکھنےاورفدیہ دینے،دونوں پرقدرت نہ ہوتو کیا کرے؟

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک کارخانہ میں ملازمت کرتا ہوں، میرے والد صاحب ضعیف العمر شخص ہیں روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے، چونکہ خود میں بھی تنگدستی سے اپنے گھر کا خرچہ پورا کرتا ہوں اور والد صاحب کے پاس بھی کوئی رقم وغیرہ نہیں کہ اس سے فدیہ ادا کریں تو ایسی صورت میں ہمارے لئے شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً.....صورتِ مسئولہ میں اگر واقعتاً آپ کے والد صاحب اتنے بوڑھے ہیں کہ روزہ رکھنے کی بالکل طاقت نہیں ہے اور ان کے پاس اتنا مال بھی نہیں ہے کہ وہ فدیہ ادا کرسکیں تو وہ اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کریں اور استغفار کرتے رہیں۔

لمافي البزازية في هامش الهندية(۴/۱۰۳): نذر بصوم الابد فضعف لإشتغاله بالمعيشة أفطر وأطعم كل يوم نصف صاع بروان لم يقدر استغفر الله تعالىٰ.

وفي الدر المختار(۲/۴۲۷): وللشيخ الفاني العاجز عن الصوم الفطر ويفدى) وجوبا ولوفي اوّل الشهر وبلا تعدد فقير كالفطرة لوموسرا والافيستغفر الله.

(۱۰۵) غریب شخص کیلئے فدیہ کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلے میں ایک صاحب ہیں جو کہ پہلے تو بہت اچھے تھے مالی اعتبار سے بھی اور جسمانی اعتبار سے بھی مگر جب ان کی اولاد بڑی ہوئی تو ان کو اپنے گھر سے نکال دیا اب وہ بہت غریب ہیں کوئی کچھ دیدے تو کھالیتے ہیں ورنہ ان کی اولاد ان کا کچھ خیال نہیں کرتی اور اب بہت لاغر بھی ہوگئے ہیں بیماری کی بنا پر تو اب ایسا شخص رمضان میں کیا کرے کہ وہ روزے رکھنے پر بھی قادر نہیں ہیں اور فدیہ دینے پر بھی قادر نہیں ہیں ایسی صورت میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر کوئی شخص اتنا غریب ہے کہ فدیہ ادا نہیں کرسکتا اور بیماری کی وجہ سے روزہ پر بھی قادر نہیں ہے تو ایسا شخص کثرت سے استغفار کرتا رہے۔

لمافي الهندية (۱/۲۰۷): ويطعم عنه وليه لكل يوم مسكينا نصف صاع من بر أو صاعا من تمر أو صاعا من شعير كذا في الهداية فان لم يوص وتبرع عنه الورثة جاز ولا يلزمهم من غير ايصاء كذا في فتاوىٰ قاضي خان.

وفي الدر المختار (۲/۴۲۷): (ويفدي) وجوبا ولو في اول الشهر وبلا تعدد فقير كالفطرة لو موسرا و الا فيستغفر الله تعالى.

(۱۰۶) روزوں کا فدیہ رمضان سے پہلے دینے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے کافی عرصے سے شوگر ہے، مجھے ڈاکٹر نے ہر تھوڑی دیر بعد پانی پینے کا کہا ہے ہر رمضان میں مجھے کافی پریشانی ہوتی ہے، میں فدیہ نکالتا ہوں، اس سال سوچ رہا ہوں کہ اپنا فدیہ رمضان سے پہلے ہی کسی غریب کو دیدوں، اور یہ بھی خیال آرہا ہے کہ کیوں نہ دو تین سالوں کا یکبارگی دیدوں تاکہ اس غریب کا کچھ بھلا ہوجائے۔ تو کیا اس طرح رمضان سے پہلے میرا روزوں کا فدیہ دینا درست ہے؟ اگر نہیں تو پھر کیا طریقہ اپناؤں، ذرا وضاحت سے بتادیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... رمضان کا مہینہ شروع ہونے سے پہلے اس سال کے روزوں کا فدیہ دینا یا رمضان ہی میں یا رمضان سے پہلے آئندہ دو تین سالوں کے روزوں کا فدیہ جائز نہیں۔ البتہ یہ صورت اختیار کرلی جائے کہ اول رمضان میں اس سال کے تمام روزوں کا فدیہ ایک بار میں دے دیں۔

لمافي الهندية (۱/۲۰۷): فالشيخ الفاني الذى لايقدر على الصيام يفطر ويطعم لكل يوم مسكيناً كما يطعم في الكفارة...... ثم ان شاء اعطىٰ الفدية في اول رمضان بمرة وان شاء اخرها.

وفي الدرالمختار (۲/۴۲۷): (وللشيخ الفاني العاجز عن الصوم الفطر ويفدى وجوباً) ولو في اوّل

الشهر ...... هذا اذا كان الصوم اصلاً بنفسه وخوطب باداء ه.

وفي الشامية تحته: ومثله مافي القهستاني عن الكرماني المريض اذا تحقق اليأس من الصحة فعليه الفدية لكل يوم من المرض

وفي الدرالمختار (۲/۲۹۳): (ولو عجل ذونصاب) زكوته (لسنين او لنصب صح) لوجود السبب...... واختلف فيه قبل النبات وخروج الثمرة والاظهر الجواز

وفي الشامية تحته: افاد ان التعجيل قبل الزرع او قبل الغرس لايجوز اتفاقاً لانه قبل وجود السبب كمالو عجل زكاة المال قبل ملك النصاب.

(۱۰۷) پورے سال روزے کی نذر ماننے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے نذر مانی تھی کہ پورے سال روزے رکھوں گا میں نے جب روزے شروع کئے تو درمیان میں عید الاضحیٰ آ گئی میں نے اس دن بھی روزہ رکھ لیا میری ملاقات ایک دوست سے ہوئی تو اس نے کہا کہ سال میں پانچ دن روزے رکھنا جائز نہیں، اب میں اس روزے کو توڑ چکا ہوں تو میرے لئے اب شرعاً کیا حکم ہوگا کہ اس کا کفارہ یا قضاء ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً سال کے اندر پانچ دن (عیدین اور ایام تشریق) ایسے ہیں کہ احادیث کے اندر ان میں روزہ رکھنے سے منع کیا گیا ہے اور اگر کوئی رکھ لے تو اس کیلئے یہ حکم ہے کہ وہ روزہ کو افطار کرے لہٰذا اگر کوئی شخص پورا سال روزہ رکھنے کی نذر مان لے تو اس کیلئے بھی یہی حکم ہے کہ وہ ان ایام میں روزہ نہ رکھے بلکہ افطار کرے اور دوسرے ایام میں ان کی قضا کرے چونکہ صورت مسئولہ میں آپ نے صرف ایک دن روزہ افطار کیا ہے لہٰذا آپ پر صرف اسی روزے کی قضا لازم ہوگی۔

لمافي الهندية(۱/۲۱۰): ولو قال لله علی صوم هذه السنة افطر يوم الفطر ويوم النحر وأيام التشريق وقضاها كذا في الهداية.

وفي تنوير الابصار مع الدر(۲/۴۳۳ : (ولو نذر صوم الايام المنهية أو) صوم هذه (السنة صح) مطلقا على المختار وفرقوا بين النذر والشروع فيها بان نفس الشروع معصية، ونفس النذر طاعة فصح (و) لكنه (أفطر) الأيام المنهية وجوبا) تحاميا عن المعصية (وقضاها) اسقاطا للواجب (وان صامها خرج عن العهدة) مع الحرمة وهذا اذا نذر قبل الايام المنهية فلو بعدها لم ينقض شيئا.

وفي الشامية(۲/۴۳۴): (قوله وهذا) أی قضاء الايام المنهية في صورة نذر صوم السنة المعينة ط

﴿روزے کے متفرق وجدید مسائل﴾

(۱۰۸) رمضان میں ماہواری کے دنوں میں کھانے پینے کا حکم

سوال... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت رمضان کے روزے سے تھی کہ دن کو اس کو خون آنا شروع ہوگیا تو کیا اس عورت کا یہ روزہ ٹوٹ جائے گا؟ یا اس عورت کیلئے باقی دن کھانا جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً... عورت کو اگر روزے کے دوران ماہواری کا خون آجائے تو اس سے روزہ فاسد ہوجاتا ہے اور باقی دن اس کیلئے کھانا پینا جائز ہوگا۔ لیکن فوراً کھانا پینا شروع نہ کردے جب تک کہ اس کو یقین نہ ہوجائے کہ یہ ماہواری ہی کا خون ہے۔ اور اگر کھانے کی حاجت ہو تو چھپ کر کھائے سب کے سامنے نہ کھائے۔

لما في البحر الرائق(۲/۵۰۵): ومن لم يكن على تلك الصفة لم يجب الإمساك كما في حالة الحيض والنفاس، ثم قيل: الحائض تأكل سرًا لاجهرا، وقيل تأكل سرًا وجهرا.

وفي الهندية(۱/۲۰۷): واذا حاضت المرأة أو نفست أفطرت كذا في الهداية.

(۱۰۹) ماہِ مبارک میں کھلے عام کھانے پینے والوں کا حکم

سوال... کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں کراچی یونیورسٹی میں پڑھتا ہوں میرے کچھ دوست ایسے ہیں کہ وہ روزہ نہیں رکھتے مگر کسی کے سامنے کھاتے پیتے بھی نہیں ہیں اور کچھ کلاس فیلو ایسے ہیں کہ کھلے عام کھاتے پیتے ہیں شریعت کا ایسے لوگوں کے بارے میں کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً... جو لوگ بلاعذر کے رمضان المبارک کے روزہ نہیں رکھتے اور اعلانیہ طور پر کھاتے پیتے ہیں اگر وہ لوگ رمضان کے روزوں کے منکر ہیں یا استخفافاً اور استہزاءً کھاتے پیتے ہیں تو وہ مرتد شمار ہونگے اور مرتد کی سزا شرائط کیساتھ قتل ہے۔ اور اگر ان کا یہ عمل استخفاف اور استہزاء کے طور پر نہیں ہے تو وہ فاسق اور گناہ کبیرہ کے مرتکب ہونگے اس صورت میں وہ تعزیر کے مستحق ہونگے۔ حاکم وقت، اسی طرح اثر ورسوخ رکھنے والے حضرات کیلئے ضروری ہے کہ ایسے لوگوں کو ہاتھ سے اور علماء دین پند ونصیحت سے منع کریں اور اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم یہ تو ہر ایمان والے کا فریضہ ہے کہ دل سے ان کے اس فعل کو برا سمجھے۔

لما في الفقه الاسلامي(۷/۵۵۷۵): انكار حكم مجمع عليه في الاسلام كانكار وجوب الصلاة والصوم.

وفیہ ایضاً(۷/ ۵۵۹۱، ۵۵۹۲): وھو شرعاً العقوبة المشروعة علی معصیة أو جنایة لاحد فیھا... الی قولہ کالأکل فی نھار رمضان بغیر عذر وترک الصلاة فی رأی الجمھور......ویقوم بالتعزیر ولی الأمر أو نائبہ.

(۱۱۰) نابالغ بچوں کے روزہ رکھنے کی عمر

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ الحمدللہ میری شادی کو تقریباً گیارہ سال ہوگئے ہیں اور میری ایک بچی اور ایک بیٹا ہے میری بیوی مجھ سے کہتی ہے کہ اس سال رمضان میں ان دونوں کی روزہ کشائی کریں گے میں نے منع کیا کہ ابھی یہ چھوٹے ہیں اب آپ سے پوچھنا ہے کہ چھوٹے بچوں کو روزہ رکھوانا کیسا ہے کیا یہ درست ہے اور کیا عمر ہونی چاہئے بچوں کی جب ان سے روزے رکھوائے جائیں؟ بعض لوگ بہت چھوٹے چھوٹے بچوں کا روزہ رکھواتے ہیں جبکہ نابالغ پر روزہ فرض بھی نہیں ہے، کیا اس طرح کرنا درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں اس مقصد کیلئے بچوں سے روزہ رکھوانا تاکہ ان کی عادت بن جائے اور بلوغت کے بعد ان پر روزہ رکھنا دشوار نہ ہو جبکہ بچے روزہ رکھنے کی طاقت بھی رکھتے ہوں تو یہ جائز اور محمود ہے بلکہ والدین اس پر مامور ہیں کہ اپنی اولاد کو نیکی کا حکم کریں اور برائیوں سے روکیں۔ البتہ اگر بچوں سے روزہ نام ونمود اور ریاکاری کیلئے رکھوایا جاتا ہے تو یہ جائز نہیں۔

باقی رہی یہ بات کہ کتنی عمر میں بچوں سے روزہ رکھوایا جائے تو در مختار (۳۵۲/۱) کی عبارت: والصوم کالصلاة علی الصحیح کما فی صوم القھستانی معزیاً للزاھدی: سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ و نماز کا اس بارے میں ایک ہی حکم ہے لہٰذا سات سال سے لے کر دس سال تک کے بچوں سے روزہ رکھوانا چاہئے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ اپنی اولاد کو سات سال کی عمر میں نماز کا حکم دو اور اگر وہ دس سال کی عمر کو پہنچ جائیں تو ترک صلاۃ پر انکو مارو۔

لمافی سنن ابی داؤد (۷۱/۱): عن عمرو ابن شعیب عن ابیہ عن جدہ قال قال رسول اللہ ﷺ مروا اولادکم بالصلاة وھم ابناء سبع سنین واضربوھم علیھا وھم ابناء عشر وفرقوا بینھم فی المضاجع.

(۱۱۱) بچے کو نماز کی طرح روزہ میں سستی کی بنا پر تنبیہ کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک ہی بیٹا ہے اس کی عمر دس سال ہو چکی ہے، اسے میں اپنے ساتھ ہی نماز پڑھنے کیلئے لے جاتا ہوں اگر کبھی سستی کرتا ہے تو سمجھاتا ہوں ورنہ حدیث پر عمل کرتے ہوئے مارنے سے بھی کام لے لیتا ہوں۔ مجھے آپ سے پوچھنا یہ تھا کہ کیا روزے پر بھی اسی طرح تنبیہ کرنے کا حکم آیا ہے؟ یا صرف نماز سے متعلق یہ حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً بچوں کی تربیت اور انہیں اچھی عادات ڈالنا والدین کے ذمے ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں اگرچہ والدین بچے کو نماز میں سستی کرنے پر تنبیہ کر سکتے ہیں اسی طرح روزوں کی عادت ڈالنے اور اس میں سستی کرنے پر بھی تنبیہ کی جا سکتی ہے۔ البتہ اگر بچہ کمزور ہے تو بالغ ہونے سے پہلے زیادہ سختی اور زبردستی نہ کی جائے۔

لمافی فتح الباری(۴: ۱۹۳): وفی الحدیث حجة علی مشروعیة تمرین الصبیان علی الصیام کما تقدم لان من کان فی مثل السن الذی ذکر فی هذا الحدیث فهو غیر مکلف وانما صنع لهم ذلک للتمرین.

وفی الدر المختار (۱: ۳۵۲): قلت والصوم کالصلاة علی الصحیح کما فی صوم القهستانی الاختیار انه یومر بالصوم والصلوة وینهی عن شرب الخمر لیألف الخیر ویترک الشر. وفی الشامیة تحته: (قلت): مراده من هذا النقلین بیان أن الصبی ینبغی ان یؤمر بجمیع المأمورات وینهی عن جمیع المنهیات.

(۱۱۲) بچوں کی روزہ کشائی کی تقریب کرنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دیکھا گیا ہے کہ آجکل لوگ اپنے چھوٹے بچوں کو روزہ رکھواتے ہیں جنکی عمریں نو دس سال ہوتی ہیں پھر شادی ہال وغیرہ میں روزہ کشائی کی تقریب منعقد کرتے ہیں کیا یہ سب جائز ہے؟ کیا چھوٹے بچوں کو بھوک و پیاس کی تکلیف میں مبتلا کرنا مناسب ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً اگر بچہ سات سال کا ہو جائے تو اسکو روزے کا کہا جائے اور دس سال کی عمر میں اس پر روزہ رکھوانے میں سختی کی جائے تاکہ بچہ روزہ رکھنے کا عادی ہو جائے لیکن یہ اس وقت ہے کہ جب اس بچہ میں روزہ رکھنے کی طاقت ہو اگر طاقت نہ ہو تو اسے روزہ رکھنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ رہا شادی ہال میں روزہ کشائی کی تقریب منعقد کروانا بغیر اسراف اور قرض ادھار کے اگر اس غرض سے ہو کہ دوسرے دیکھیں گے ان کو ترغیب دلانا مقصود ہو کہ وہ بھی اپنے بچوں کو روزہ رکھوائیں تاکہ بچوں کو روزہ رکھنے کی عادت پڑ جائے تو اس میں ثواب کی امید ہے اور اگر اس سے دکھلاوا مقصود ہے تو اس سے اجتناب کرنا چاہئے۔

لمافی سنن أبی داؤد (۱: ۷۱): عن عمرو ابن شعیب عن ابیه عن جده قال قال رسول الله ﷺ مروا اولادکم بالصلاة وهم ابناء سبع سنین واضربوهم علیها وهم ابناء عشر وفرقوا بینهم فی المضاجع.

وفی الدر المختار (۲: ۴۰۹): ویؤمر الصبی بالصوم إذا أطاقه ویضرب علیه ابن عشر. کالصلاة فی الاصح.

وفی الشامیة تحته: (قوله ویؤمر الصبی) أی یأمره ولیه أو وصیه والظاهر منه الوجوب وکذا ینهی

عن المنكرات ليألف الخير ويترك الشر، ط (قوله إذا أطاقه) ..... قال ط : وقدر بسبع والمشاهد في صبيان زماننا عدم إطاقتهم الصوم في هذا السن اهـ قلت: يختلف ذلك باختلاف الجسم واختلاف الوقت صيفا وشتاء والظاهر أنه يؤمر بقدر الإطاقة اذا لم يطق جميع الشهر.

(۱۱۳) دعوت افطار کیلئے میزبان کا روزہ دار ہونا ضروری ہے؟

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے روزہ کی افطاری کیلئے دعوت کا اہتمام کیا لیکن وہ خود روزے سے نہیں تھا، جب لوگ افطاری کے لئے جمع ہوئے تو وہاں کے امام صاحب نے کہا چونکہ اس آدمی نے روزہ نہیں رکھا (اور یہ جانور ذبح کر کے دعوت کی ہے) لہٰذا ان کا گوشت کھانا صحیح نہیں۔ کیا قول امام درست ہے یا نہیں؟ اس کے بعد لوگ اٹھ کر چلے گئے اور وہ کھانا سارا ضائع کرنا پڑا، اب اس کا تاوان اس امام پر لازم ہوگا یا نہیں؟ از راہِ کرم شریعت محمدیہ کے مطابق ان مسائل کا جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... روزہ داروں کی افطاری کرانے کیلئے یہ بات ضروری نہیں ہے کہ افطاری کرانے والا خود بھی روزے سے ہو، نیز ذبیحہ کے حلال ہونے کیلئے روزہ رکھنا ضروری نہیں ہے بلکہ اگر ذبح کرنے والا مسلمان ہو اور شرعی طریقہ پر یعنی ''بسم اللہ'' پڑھ کر ذبح کرے تو وہ ذبیحہ حلال ہے اور اس کا گوشت کھانا صحیح ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں مذکورہ امام صاحب کا یہ کہنا کہ چونکہ اس شخص کا روزہ نہیں ہے لہٰذا اس کا گوشت بھی حلال نہیں ہے یہ بات صحیح نہیں۔ البتہ امام کی بات کی وجہ سے جو لوگ وہاں سے اٹھ کر چلے گئے تو اس کھانے کے ضائع ہونے کا تاوان امام پر لازم نہیں۔

لمافي شرح المجلة(۱/۲۵۱): الجواز الشرعي ينافي الضمان مثلا لوحفر انسان في ملكه بئراً فوقع حيوان رجل وهلك لايضمن حافر البئر شيئاً، يعني كل ماجاز للانسان ان يفعله شرعاً، فاذا ترتب على فعله ضررٌ او خسار، لا يضمن للمنافاة بين الجواز الشرعي والضمان ..... الخ.

وفي الهندية(۵/۲۸۵): (ومنها) ان يكون مسلما أو كتابيا فلا تؤكل ذبيحة اهل الشرك والمرتد لانه لا يقر على الدين الذى انتقل اليه (ومنها) التسمية حالة الذكاة عندنا اىّ اسم كان الخ.

وفي موسوعة الفقهية(۲۸/۳۰۹): قال المالكية: لاشئ على مجتهد اتلف شيئاً بفتواه، اما غير المجتهد، فيضمن ان نصبه السلطان أو نائبه للفتوى، لانها كوظيفة عمل قصر فيها، وان لم يكن منتصبا للفتوى وهو مقلد، ففي ضمانه قولان، مبنيان على الخلاف في الغرور القولي: هل يوجب الضمان، أولا؟ والمشهور عدم الضمان ..... الخ.

(۱۱۴) مشقت کی وجہ سے روزہ نہ رکھنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص سخت کام کی وجہ سے روزہ نہ رکھے تو اسکی شرعاً اجازت ہے یا نہیں؟ کیونکہ میں تعمیرات کا کام کرتا ہوں جس میں دن میں بغیر کھائے پئے کام کرنا مشکل ہوتا ہے اگر کام نہ کریں تو بچوں کا پیٹ کہاں سے پالیں اب میرے ساتھ جولوگ کام کرتے ہیں وہ بھی اکثر روزہ نہیں رکھتے۔ پوچھنا یہ ہے کہ اس وجہ سے افطار کی اجازت ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ...صورت مسئولہ میں سخت مشقت کی وجہ سے روزہ نہ رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ رمضان المبارک کا روزہ ارکان اسلام میں سے ایک رکن ہے معمولی اعذار کی وجہ سے روزہ چھوڑ دینا جائز نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ ماہ مبارک میں ہلکے پھلکے کام سے گزارہ چلایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس ماہ میں مزدوروں (ملازموں) پر کام کاج میں آسانی کی تلقین فرمائی ہے لیکن اس کے باوجود اگر مشقت کا کام کرنا ناگزیر ہو تو ایسے شخص کیلئے ضروری ہے کہ روزہ کی نیت سے سحری کرے (اور روزہ رکھے) لیکن دن میں اگر ایسی پیاس یا بھوک لگے کہ اس سے جانی نقصان کا اندیشہ ہو تو اب افطار کرنے کی اس قدر اجازت ہے کہ وہ تکلیف دور ہو جائے البتہ اب بھی بقیہ دن بغیر کھائے پئے رہے اور بعد میں اس روزے کی قضا بھی کرے۔

لما في الشامية (۲/۴۲۱): (قوله وخوف هلاک الخ) كالأمة إذا ضعفت عن العمل وخشيت الهلاک بالصوم وكذا الذي ذهب به متوكل السلطان إلى العمارة في الأيام الحارة والعمل حثيث إذا خشي الهلاک أو نقصان العقل.

وفي الفقه الاسلامي(۳/۱۷۰۲): وقرر جمهور الفقهاء أنه يجب على صاحب العمل الشاق كالحصاد والخباز والحداد وعمال المناجم أن يتسحر وينوي الصوم فان حصل له عطش شديد أو جوع شديد يخاف منه الضرر جاز له الفطر وعليه القضاء.

(۱۱۵) کن اعذار کی وجہ سے روزہ توڑنا جائز ہے؟

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں جاننا چاہتا ہوں کہ کن وجوہ کی بنا پر روزہ توڑا جاسکتا ہے؟ کیا معمولی بیماری پر روزہ افطار کرلینا درست ہے یا نہیں اگر نہیں تو کس قدر بیماری پر روزہ توڑنے کی اجازت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ...جن اعذار کی وجہ سے روزہ توڑنے کی اجازت ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ سخت پیاس یا سخت بھوک کی حالت جبکہ روزے دار کو یہ عذر دن میں لاحق ہو جائے اور اس سے ہلاکت یا سخت جانی نقصان کا اندیشہ ہو۔

۲۔ کسی موذی جانور مثلاً سانپ بچھو وغیرہ کے ڈسنے سے اگر دوا کے استعمال نہ کرنے پر ہلاکت کا قوی اندیشہ ہو۔

۳۔ اکراہ یعنی اگر روزہ دار کو کوئی دشمن وغیرہ زبردستی کر کے کھانے پر مجبور کردے اور نہ کھانے کی صورت میں جان یا اعضاء کے ضائع

ہو نیا قوی اندیشہ ہو۔

۴۔ بیماری،البتہ بیماری میں تفصیل یہ ہے کہ اگر روزہ رکھنے کے بعد بیماری سے ہلاکت یا کسی عضو کے ضائع ہونے یا بیماری کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہوتو روزہ توڑنا جائز ہے ورنہ معمولی بیماری میں روزہ توڑنا جائز نہیں ہے۔

لمافي الشامية(۲/۴۲۱): (قوله وبقي الاكراه): ذكر في كتاب الاكراه انه لو اكره على اكل ميتة بغير ملجئ كحبس اوضرب اوقيد لم يحل وان بملجئ كقتل اوقطع عضو أو ضرب مبرح حل فان صبر فقتل اثم. ...(قوله وخوف هلاک الخ) كالامة اذا ضعفت عن العمل وخشيت الهلاک بالصوم وكذا الذي ذهب به متوكل السلطان الى العمارة في الايام الحارة والعمل حثيث اذا خشي الهلاک اونقصان العقل..... (قوله ولسعة حية)عطف على العطش المتعلق بقوله وخوف هلاک ح اى فله شرب دواء ينفعه.

وفي (صـ۴۲۲) (قوله خاف الزيادة) اوابطاء البرء اوفساد عضو بحر او وجع العين اوجراحة اوصداعااوغيره.

(۱۱۶) کیاہر ملک میں اس کی تاریخ کے اعتبار سے شب قدر ہوتی ہے؟

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ شب قدر طاق راتوں میں تلاش کرنے کا حکم ہے لیکن چونکہ دنیا میں چاند کی تاریخوں میں اختلاف پایا جاتا ہے جیسا کہ اس سال سعودی عرب میں پاکستان کی تاریخ چاند کے اعتبار سے ایک دن زیادہ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر سعودی عرب میں طاق رات ہوگی تو پاکستان میں جفت رات ہوگی اس صورت حال میں شب قدر سعودی عرب کی تاریخ کے مطابق ہوگی یا پاکستان کی تاریخ کے مطابق کیونکہ شب قدر تو ایک ہی ہوگی؟

الجواب حامداًومصلیاً ہر ملک کا روزہ،عید،شب قدر وغیرہ اس ملک کی تاریخ کے اعتبار سے ہوتے ہیں کیونکہ حدیث مبارکہ میں چاند دیکھ کر روزہ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے اور اختلاف مطالع کا اعتبار کیا جاتا ہے یعنی جس ملک میں چاند نظر آئے گا تو اس میں رمضان شروع ہو جائے گا اور اس کی عید،شب قدر وغیرہ اسی حساب سے ہوگی،لہٰذا شب قدر تو ایک ہی ہوتی ہے لیکن ایک ملک میں چاند نظر آنے اور دوسرے ملک میں نظر نہ آنے سے تاریخ بدل جاتی ہے جیسا کہ کبھی عید سعودیہ والوں کی ایک دن ہم سے پہلے ہوتی ہے لیکن ایک دن پہلے ہونے سے دوعیدیں نہیں ہو جاتیں اسی طرح شب قدر بھی ہے۔

لمافي الترمذي (۱/۱۴۸): حدثنا علي بن حجر ......نامحمد بن ابي حرملة اخبرني كريب ان ام الفضل بنت الحارث بعثته الى معاوية بالشام قال فقدمت الشام فقضيت حاجتها واستهلّ عليّ هلال رمضان وانا بالشام فراينا الهلال ليلة الجمعة ثم قدمت المدينة في اخر الشهر فسألني ابن عباس ثم

ذکر الهلال فقال متی رايتم الهلال فقلت راينا ليلة الجمعة فقال انت رايته ليلة الجمعة فقلت راه الناس وصاموا وصام معاوية فقال لكن رايناه السبت فلا نزال نصوم حتى نكمل ثلثين يوما او نراه فقلت الا تكتفي برؤية معاوية وصيامه قال لا هكذا امرنا رسول الله ﷺ.

وفي بدائع الصنائع (مکتبہ رشیدیہ)(۲/۸۳): فامّا اذا كانت بعيدة فلا يلزم احد البلدين حكم الاخر لان مطالع البلاد عند المسافة الفاحشة تختلف فيعتبر في اهل كل بلد مطالع بلدهم دون البلد الاخر وحكي عن ابي عبدالله بن ابي موسىٰ الضرير انه استفتي في اهل اسكندريه ان الشمس تغرب بها ومن على منارتها يرى الشمس بعد ذلك بزمان كثير فقال يحل لاهل البلد الفطر ولا يحل لمن على راس المنارة اذا كان يرى غروب الشمس لان مغرب الشمس يختلف كما يختلف مطلعها فيعتبر في اهل كل موضع مغربه.

(۱۱۷) جہاں رات مختصر سی ہوتی ہو یا رات آتی ہی نہ ہو وہاں روزہ رکھنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جن ممالک میں رات بالکل نہیں آتی یا مختصر سی رات ہوتی ہے تو یہ روزے کس طرح رکھیں گے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ان ممالک میں جہاں مختصر سی رات ہوتی ہے اور یا وہ ممالک جن میں رات آتی ہی نہیں، روزے رکھنے کیلئے یا تو کسی قریبی ملک کے وقت کا اندازہ لگایا جائے ''جس میں شب وروز معمول کے مطابق ہوں'' اور یا مکہ مکرمہ کے وقت کا اندازہ لگایا جائے اور پھر اس کے مطابق روزے رکھے جائیں۔

لما في الطحطاوي على الدر (۱/۱۷۲): (قوله حديث الدجال) هو مارواه مسلم عن النواس بن سمعان قال ذكر رسول الله ﷺ الدجال ولبثه في الارض أربعين يوماً يوم كسنة ويوم كشهر ويوم كجمعة وسائر ايامه كا يامكم قلنا فذالك اليوم الذى كسنة يكفينا فيه صلاة يوم قال لاقدروا له قدره. قال الاسنوى ويقاس عليه اليومان التاليان قال الرملي ويجرى ذالك فيما لومكثت الشمس عند قوم مدة "حلبي مختصرا" قلت وكذالك يقدر لجميع الاجال كالصوم والزكاة والحج والعدة وآجال البيع والسلم والاجارة وينظر ابتداء اليوم فيقدر كل فصل من الفصول الاربعة بحسب مايكون من الزيادة والنقص كذا في كتب الائمة الشافعية ونحن نقول بمثله اذ اصل التقدير مقول به اجماعا في الصلوات. حلبي شارح المنية.

وفي الفقه الاسلامي (۳/۱۶۲۷): وزمن الصوم من طلوع الفجر الى غروب الشمس ويوخذ في البلاد التي يتساوى الليل والنهار فيها. وفي حالة طول النهار احيانا كبلغاريا بتقدير وقت الصوم

بحسب اقرب البلاد منها او بتوقیت مکة.

(۱۱۸) ابر والے دن میں رمضان کے چاند کیلئے ایک گواہ کافی ہے جبکہ عید کیلئے ابر والے دن میں شہادت کاملہ شرط ہے وجہ فرق

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک طالب علم ہوں چھوٹے درجہ میں پڑھتا ہوں اگر کوئی اشکال ذہن میں آتا ہے تو اساتذۂ کرام سے حل کر لیتا ہوں اور کبھی کبھار آنجناب کے دارالافتاء میں بھی بطور سوال بھیج دیتا ہوں۔ براہ کرم مجھے اس مسئلے کا جواب بتادیں کہ رمضان اور عید کے چاندوں میں گواہوں کی تعداد میں کیا وجہ کہ اتنا فرق ہے؟ رمضان کا چاند یوم الغیم میں ایک آدمی کی بھی شہادت سے ثابت ہو جاتا ہے جبکہ عید کے چاند کیلئے جم غفیر کی شرط لگائی جاتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً رمضان المبارک کا چاند بادل والے دن ایک آدمی کی گواہی سے ثابت ہو جاتا ہے جبکہ عید کے چاند کے لئے بادل والے دن میں شہادت کاملہ (دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں) شرط ہے۔ اصل اصول تو اس میں حدیث ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے چاند کیلئے ایک آدمی کی گواہی اور عید کے چاند کیلئے دو آدمیوں کی گواہی قبول فرمائی ہے۔ البتہ فقہاء نے ایک وجہ فرق یہ بیان کیا ہے کہ رمضان المبارک کے چاند کی گواہی ایک دینی معاملہ یعنی اس میں اپنے اوپر ایک عبادت کو لازم کرنا ہے جس میں مشقت ہے۔ اور اس میں کوئی تہمت نہیں ہے اور دیانات میں ایک آدمی کی گواہی قبول کی جاتی ہے، جبکہ عیدالفطر کے چاند سے بندوں کا نفع متعلق ہے اور اس میں ایک مشقت والی عبادت سے نکلنا ہے اور اس میں صرف ایک گواہ ہو تو اس پر تہمت ہے اس وجہ سے عیدالفطر کے چاند کے لئے بادلوں والے دن شہادت کاملہ شرط ہے، باقی یوم الغیم (بادلوں والے دن) جم غفیر یعنی کثیر تعداد میں لوگوں کی گواہی شرط نہیں ہے یہ اس وقت ضروری ہے جبکہ آسمان بالکل صاف ہو۔

لما فی الهداية (۱/۲۳۳، ۲۳۴): واذا كان بالسماء علة قبل الامام شهادة الواحد العدل فی روية الهلال رجلاً كان او امرأة حراً كان او عبداً لانه امر دینی فاشبه رواية الاخبار ولهذا لا يختص بلفظ الشهادة وتشترط العدالة لان قول الفاسق فی الديانات غير مقبول...... واذا كان بالسماء علّة لم تقبل فی هلال الفطر الاشهادة رجلين أو رجل وامرأتين لانه تعلق به نفع العبد وهو الفطر فاشبه سائر حقوقه.

وفی سنن ابی داؤد (۱/۳۲۰): عن ربعی بن خراش عن رجل من اصحاب النبی ﷺ قال اختلف الناس فی أخر يوم من رمضان فقدم اعرابيان فشهدا عند النبی ﷺ بالله الهلال الهلال امس عشية فامر رسول الله ﷺ الناس ان يفطروا وزاد خلف فی حديثه وان يغدوا الى مصلاهم، عن ابن عباس

رضی اللہ عنہ قال جاء اعرابی الی النبی ﷺ فقال انی رایت الھلال قال الحسن فی حدیثه یعنی رمضان فقال اتشهد لا اله الا الله قال نعم قال اتشهد ان محمداً رسول الله قال نعم، قال یابلال اذن فی الناس فلیصوموا غداً.

وفی در المختار مع الشامیة(۳۸۶/۲): وشرط للفطر مع العلة والعدالة نصاب الشهادة ولفظ اشهد قوله نصاب الشهادة ای علی الاموال وهو رجلان أو رجل وامرأتان قوله (تعلق نفع العبد، علة لاشتراط ما ذکر فی الشهادة علی هلال الفطر، بخلاف هلال الصوم لان الصوم امر دینی فلم یشترط فیه ذلک اما الفطر فهو نفع دنیوی للعباد فاشبه سائر حقوقهم فیشترط فیه ما یشترط فیها.

(۱۱۹) روزے دار شوہر بھول کر ہمبستری کا کہے تو بیوی پر اُسے یاد دلانا ضروری ہے؟

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کو روزے کی حالت میں جماع کا تقاضا ہوا اس کو روزہ یاد نہیں رہا اس نے بیوی سے خواہش پوری کرنے کو کہا تو اس صورت میں بیوی کو روزہ یاد دلانا ضروری ہے یا اس کی خواہش پوری کرے؟

الجواب حامداً ومصلیاً صورت مسئولہ میں مذکورہ شخص کی بیوی پر اپنے شوہر کو یاد دلانا واجب ہے یاد نہ دلانے کی صورت میں بیوی گنہگار ہوگی اور اگر روزہ رمضان کا ہے اور بیوی بھی روزے سے ہے تو بیوی پر اپنے شوہر کی خواہش پوری کرنے کی صورت میں قضاء اور کفارہ دونوں لازم ہوں گے۔

وفی الهندیة(۲۰۲/۱): ولو قیل لرجل یأکل أنک صائم وهو لا یتذکر فالصحیح أنه یفسد صومه هکذا فی الظهیریة (رجل نظر إلی صائم یاکل ناسیاً ان رأی فیه قوة یمکنه أن یتم الصوم الی اللیل فالمختار أنه یکره أن لایذکره وان کان یضعف فی الصوم بأن کان شیخاً کبیراً یسعه أن لایخبره کذا فی الظهیریة فی فصل الأعذار المبیحة.

وفی فتاویٰ اللجنة الدائمة للبحوث العلمیة والافتاء(۳۰۶/۱۰،۳۰۷): نمت فی رمضان عام ۱۳۹۲ هـ وزوجتی بجانبی واستیقظت مع اذان الفجر، ولکن غلبنی النوم ثم استیقظت ونسیت الصیام کلیاً فجامعت زوجتی کعادتی فی جماعها عند النوم، ثم عند الفجر ثم اغتسل و اصلی الفجر، وقد ندمت ندما شدیدا علی ماحصل منی، فما یلزمنی ومایلزم زوجتی علما بانها تجهل حکم الجماع فی نهار رمضان للصائم. وأنها ذکرتنی بعد فقلت لم لم تذکرینی عند الجماع أو قبله فقالت أنا ما أدری.

(ج): إذا كان الواقع كما ذكرت من جماعك لزوجتك ناسياً الصيام فليس عليك قضآء ولا كفارة، لأنك معذور بالنسيان، وقد قال ﷺ من نسي وهو صائم فاكل أو شرب فليتم صومه فإنما أطعمه الله وسقاه والجماع في معنى ذالك وأما المرأة فالأحوط في حقها القضآء والكفارة لأن الظاهر مما ذكرت عنها ان لديها علماً ولكنها تساهلت......الخ.

(۱۲۰) کیا رمضان میں اعمال کا ثواب بڑھ جاتا ہے؟

سوال ...کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہمیں نے خود ایک عالم صاحب سے یہ سنا ہے کہ رمضان المبارک میں ایک فرض کا ثواب ستر گنا اور نفل کا ثواب فرض کے برابر ہوجاتا ہے۔کیا ان کی یہ بات درست ہے؟ اور اس حدیث کا کیا ثبوت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......جی ہاں! رمضان میں ایک فرض کا ثواب ستر گنا ہوجاتا ہے۔صحیح ابن خزیمہ (۱۹۱/۳) اور مشکوۃ (ص۱۷۳) وغیرہما میں یہ روایت موجود ہے،اگر چہ بعض ائمہ نے حدیث کے راوی علی بن زید بن جدعان پر کلام کیا ہے لیکن دوسرے بعض ائمہ نے اس کی توثیق فرمائی ہے۔حدیث چونکہ فضائل سے متعلق ہے اس لئے اس قسم کا ضعف فضائل میں برداشت کرلیا جاتا ہے۔لہٰذا عالم صاحب کی بات بے اصل نہیں ہے۔

لمافي الترغيب والترهيب(۵۷/۲): وعن سلمان رضي الله عنه قال: خطبنا رسول الله ﷺ في آخر يوم من شعبان قال: يا ايها الناس قد اظلكم شهر عظيم مبارك، شهر فيه ليلة خير من الف شهر، شهر جعل الله صيامه فريضة فيه وقيام ليله تطوعاً من تقرب فيه بخصلة من الخير كان كمن أدى فريضة فيما سواه ومن أدى فريضة فيه كان كمن ادى سبعين فريضة فيما سواه الخ. رواه ابن خزيمة في صحيحه، ثم قال صح الخبر ورواه من طريق البيهقي ورواه ابو الشيخ ابن حبان في الثواب باختصار عنهما.

(۱۲۱) روزے کی حالت میں بھوک اور پیاس سے ہلاکت کا اندیشہ ہو تو کیا کریں؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اس رمضان المبارک میں گرمی کا احساس تو آپ کو بھی ہوگا،اور پرسوں جمعہ کے دن گرمی کا تو عالم یہ تھا کہ''چیل انڈا چھوڑ دے''اس گرمی کے دن میرے پڑوسی کے ایک ۱۹سال کے لڑکے نے بغیر سحری کا روزہ رکھ لیا، جمعہ کا دن تھا صبح اٹھ کر دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے میں لگ گیا جمعہ کی نماز تک فارغ ہوکر جمعہ کی تیاری کی نماز پڑھی اور گھر لوٹا تو گرمی اور پیاس کی شدت سے نڈھال ہورہا تھا۔کچھ دیر میں اس کی حالت اور بگڑنے لگی تو گھر والوں نے اسے پانی پلانا

چاہا تو اس نے پینے سے انکار کردیا کہ میں روزہ نہیں توڑوں گا اگر چہ مرجاؤں، لوگوں نے بہت سمجھایا لیکن وہ نہ مانا، عصر کی نماز تک وہ پیاس اور گرمی کو نہ برداشت کرسکا اور وفات پاگیا۔ شام افطار کے وقت جب میں اپنے کام سے گھر پہنچا تو بچوں نے اطلاع دی کہ خادم بھائی کا آج اس طرح انتقال ہوگیا۔ مجھے بڑا دکھ اور صدمہ ہوا۔ میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ آیا اس طرح کرنے پر اسے ثواب ملا ہوگا یا خدانخواستہ وہ گناہ گار تو نہیں ہوا؟ براہِ کرم آپ مجھے اس بارے میں صحیح بات سے مطلع فرمادیں تاکہ میں آئندہ کسی کے کام آسکوں اور لوگوں کو اس مسئلے سے آگاہ کرسکوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر روزے کی حالت میں بھوک اور پیاس اتنی شدت اختیار کرجائے کہ جس سے ہلاکت کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں روزے کو توڑنا واجب ہے اگر نہیں توڑا تو یہ شخص گنہگار ہوگا اور اس کو ثواب نہ ملے گا کیونکہ اس صورت میں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے جس کی ممانعت وارد ہوئی ہے قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ" (ترجمہ) "اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو۔" لہٰذا صورت مسئولہ میں اس لڑکے کیلئے روزے کا توڑنا واجب تھا لہٰذا ترک واجب کی وجہ سے اس لڑکے کو ثواب نہیں ملے گا بلکہ وہ گنہگار رہا۔ (اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کی صحیح سمجھ عطا فرمائے۔ آمین)

لمافي الهندية(۵/۳۳۸): ومن امتنع عن أكل الميتة حالة المخمصة او صام ولم يأكل حتى مات يأثم......

وفي الفقه الاسلامي وادلته(۳/۱۷۰۱): يجوز الفطر لمن حصل له او ارهقه جوع او عطش شديد يخاف منه الهلاك او نقصان العقل او ذهاب بعض الحواس بحيث لم يقدر معه على الصوم وعليه القضاء فان خاف على نفسه الهلاك حرم عليه الصيام لقوله تعالى"(ولا تلقوا بايديكم الى التهلكة)".

(۱۲۲) فجر کی نماز میں اگر بغیر تلفظ کے روزے کی نیت کرلی جائے تو روزہ درست ہوگا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں پابندی سے پورے روزے رکھ رہا ہوں۔ آج صبح سحری میں نیت کرنا بھول گیا تھا اور فجر کی دوسری رکعت میں یاد آیا تو میں نے نماز میں ہی دل دل میں نیت کرلی۔ لیکن مجھے پھر بھی کھٹکا لگا ہوا ہے کہ کہیں میرا یہ روزہ خراب نہ ہوگیا ہو، براہ کرم آپ اس بارے میں مجھے لکھ کردیدیں تاکہ میں مطمئن ہوجاؤں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... نیت دل کے ارادے کا نام ہے۔ مخصوص الفاظ کا زبانی طور پر کہنا ضروری نہیں۔ افضل یہ ہے کہ یہ ارادہ اور نیت صبح صادق سے پہلے کریں لیکن اگر کوئی بھول جائے اور نصف نہار سے پہلے نیت کرلے تو بھی روزہ ہوجائے گا لہٰذا جب آپ نے روزے کے ارادے سے سحری کھائی تھی تو یہ سحری کھانا ہی خود روزے کی گویا نیت کرنا ہوگیا تھا لہٰذا آپ مطمئن ہوجائیں آپ کا روزہ درست ہوگیا۔ اسی طرح اگر سحری نہیں کھائی تھی اور فجر کی نماز میں بغیر تلفظ کے نیت کرلی تو یہ نیت روزے کیلئے کافی ہوگی اور نماز بھی فاسد نہ ہوگی۔

لمافي الهندية(۱/۱۹۵): والنية معرفته بقلبه ان يصوم كذا في الخلاصة ومحيط السرخسي و السنة ان يتلفظ بها...... والتسحر في رمضان نية ذكره نجم الدين النسفيؒ الخ.

وفی الدر المختار(۲/۳۸۰): ونية الصوم فی الصلوة صحيحة ولاتفسدها بلا تلفظ

(۱۲۳) مرنے والے کے قضاء روزے ورثاء کیلئے رکھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے والد صاحب کا ابھی کچھ عرصے پہلے انتقال ہوگیا ہے۔ان کے ذمہ بہت سے روزے بھی تھے، میں ارادہ کررہا ہوں کہ ان کی قضاء خود ادا کرلوں، میں نے کسی کتاب میں حدیث کے حوالے سے پڑھا تھا کہ ایسا کر سکتے ہیں، لیکن میرے ایک دوست کا کہنا ہے کہ میں نے ایک معتبر عالم دین سے سنا ہے کہ ایسا کرنا شرعاً درست نہیں ہے۔براہ کرم آپ میری اس معاملے میں صحیح رہنمائی فرمادیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... جوعبادات خالص بدنیہ ہیں جیسے کہ نماز اور روزہ ہے، ان میں نیابت جائز نہیں ہے، لہٰذا آپ اپنے والد صاحب کی طرف سے ان روزوں کی قضاء نہیں کرسکتے، البتہ اگر انہوں نے وصیت کی ہو کہ میرے روزوں کا فدیہ دے دینا تو انکے ترکے کے ثلث مال سے آپ پر ان کے روزوں کا فدیہ دینا لازم ہے جو کہ ایک روزہ کے بدلے صدقۃ فطر کی مقدار میں ہے، صدقۃ فطر کی مقدار نصف صاع گندم ہے جو کہ انگریزی حساب سے تقریباً دو کلوگرام بنتا ہے، ثلث مال سے زیادہ دینا جائز نہیں ہے البتہ باقی سب ورثاء راضی ہوں تو دے سکتے ہیں اور اگر وصیت نہیں کی تو پھر یہ فدیہ دینا لازم نہیں ہے اگر تبرعاً دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں۔

لمافی التاتارخانية(۱/۷۷۰، ۷۷۱): رجل مات وعليه صلوات، فاوصى ان يطعموا عنه بصلاته، اتفق المشائخ على انه يجب تنفيذ هذه الوصيةمن ثلث ماله واختلفوا انه هل يقوم الاطعام مقام الصلوة ؟ قال محمد بن سلمة ومحمد بن مقاتل يقوم وقال البلخي لايقوم وكذلك قول علمائنا الطعام يقوم مقام صوم رمضان وصوم النذر والوتر كذلك والصحيح ان هذا قول ابى حنيفة فى الوتر (الى ان قال) وان لم يوص الورثة وتبرع بعض الورثة يجوز.

وفی الدرالمختار(۲/۷۲، ۷۳، ۷۴): (ولومات وعليه صلوات فائتة واوصى بالكفارة يعطى لكل صلاة نصف صاع من برّ كالفطرة (وكذا حكم الوتر) والصوم، وانما يعطى (من ثلث ماله)...... (ولوقضاها ورثته بامره لم يجز) لانها عبادة بدنية (بخلاف الحج) لانه يقبل النيابة،

وفی الشامية تحته:(قوله يعطى) اى يعطى عنه وليه اى من له ولاية التصرف فى ماله بوصاية او وراثة فيلزمه ذلك من الثلث ان اوصى، والافلا يلزم الولى ذلك لانها عبادة فلا بدّ فيها من الاختيار، فاذا لم يوص فات الشرط فيسقط فى حق احكام الدنيا للتعذر (قوله وانما يعطى من ثلث ماله) اى فلو زادت الوصية على الثلث لا يلزم الولى اخراج الزائد الا باجازة الورثة، (قوله لم يجز الظاهر انه بضم الياء من الاجزاء) بمعنى ان الصلوة لا تسقط عن الميت بذلك وكذا الصوم، نعم لوصام

او صلی وجعل ثواب ذلک للمیت صح، لانه یصح ان یجعل ثواب عمله لغیره عندنا، (قوله لانه یقبل النیابة) لانه عبادة مرکبة من البدن والمال، فان العبادة ثلاثة انواع: مالیة، بدنیة، ومرکبة منهما، فالعبادة المالیة کالزکاة تصح فیها النیابة حالة العجز والقدرة والبدنیة کالصلوة والصوم لا تصح فیها النیابة مطلقاً، والمرکبة منهما کالحج ان کان نفلاً تصح فیه النیابة مطلقا، وان کان فرضاً لاتصح الا عند العجز الدائم الی الموت.

(۱۲۴) روزہ میں نصف النہار تک نیت کرنے کی وجہ

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک مدرسہ میں قدوری پڑھاتا ہوں، یہ میرا پہلا سال ہے، اپنی حد تک کافی مطالعہ وتحقیق کر کے جاتا ہوں تاکہ ہر طالب اچھی طرح مطمئن ہو سکے، ابھی جب میں کتاب الصوم کا مطالعہ کر رہا تھا تو ایک اشکال میرے ذہن میں پیدا ہو گیا، بہت سوچا لیکن اس کا جواب مجھے نہیں آیا، آپ کو زحمت دے رہا ہوں۔ برائے مہربانی اس پر اپنی تحقیق سے مجھے سرفراز فرمادیں۔ سوال یہ تھا کہ نماز، حج وغیرہ عبادات میں نیت شروع میں کرنے کی شرط ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ روزے میں نصف النہار تک اس کی اجازت دی گئی ہے؟ روزہ اور ان عبادات میں ایسا کیا فرق ہے جو روزے میں تو ابتداء میں کرنا شرط نہیں اور ان دیگر عبادات میں شرط ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورتِ مسئولہ میں روزہ میں نصف النہار تک نیت کی اجازت اس لئے دی گئی ہے کہ صوم ایک رکن ہے۔ لیکن ایسا رکن ہے جو دراز ہے، اس میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ یہ رکن عادت کے طور پر ہے یا عبادت کے طور پر ہے، پس اس کا تعین نیت ہی سے ہو سکتا ہے۔ اب یہ نیت اگر دن کے اکثر حصہ میں پائی گئی، تو چونکہ اکثر کل کے قائم مقام ہوتا ہے۔ اس لئے کثرت کی وجہ سے جانب وجود کو جانب عدم پر ترجیح دے کر کہا جائے گا کہ نیت پورے دن میں پائی گئی ہے اور جب پورے دن میں نیت پائی گئی تو روزہ درست ہے۔ اس کے برخلاف نماز اور حج کے ان دونوں میں ابتدا سے نیت کرنا ضروری ہے۔ ان دونوں کے اندر للاکثر حکم الکل کا قاعدہ جاری نہیں ہوگا۔ کیونکہ ان دونوں کے کئی ارکان ہیں، جیسے کہ قیام، رکوع، طواف، وقوف وغیرہ اور بغیر ان ارکان کے نماز اور حج ادا نہ ہونگے۔ اس لئے ان دونوں کے شروع میں نیت کرنا ضروری ہے، ورنہ بعد میں نیت کرنے سے بعض ارکان نیت کے بغیر رہ جائیں گے۔ نیز جواب مذکور پر یہ اشکال وارد ہو سکتا ہے کہ یہاں پر نیت متأخرہ ثابت ہوتی ہے اور عبادات میں تجزی نہیں ہوتی کہ بعض عمل میں تو نیت کر لیں اور بعض بغیر نیت کے کر لیں۔ کیونکہ بعض کا فساد کل کے فساد کو مستلزم ہے۔ لہٰذا جواب یہ دیا جائے گا کہ یہاں صوم میں خلاف قیاس نص موجود ہے اور نص کی موجودگی میں قیاس کا اعتبار نہیں ہوتا۔

لمافی الشامیة(۲/۳۷۷): وفی الجامع الصغیر قبل نصف النهار وهو الاصح لأنه لابد من وجود النیة فی اکثر النهار ونصفه من وقت طلوع الفجر الی وقت الضحوة الکبری لاوقت الزوال

فتشترط النية قبلها لتتحقق في الأكثر.

وفي الدر المختار (۳۷۹/۸): (ويحتاج صوم كل يوم من رمضان الى نية) ولو صحيحا مقيماً تمييزاً للعبادة عن العادة، وقال زفرؒ ومالكؒ تكفي نية واحدة كالصلاة، قلنا فساد البعض لايوجب فساد الكل بخلاف الصلوة (والشرط للباقي) من الصيام قران النية للفجر ولو حكما وهو (تبييت النية) للضرورة وتعيينها لعدم تعين الوقت.

وفي المسلم(۳۶۴/۱): حدثنا ابوبكر بن ابي شيبة حدثنا وكيع عن طلحة بن يحيى عن عمّته عائشة بنت طلحة عن عائشةؓ ام المومنين قالت دخل عليّ النبي ﷺ ذات يوم فقال هل عندكم شئ قلنا لاقال فاني اذا صائم ......الخ.

وفي الحسامي بالنامي (۱۲/۲): واما شرطه ..... وان لا يكون الاصل معدولاً به عن القياس كايجاب الطهارة بالقهقهة في الصلوة.

(۱۲۵) پانی کان کے اندر چلا جانے سے روزہ نہ ٹوٹنے اور تیل یا دواء ڈالنے سے ٹوٹ جانے کی وجہ

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جناب عالی اس دفعہ رمضان میں آپ نے عصر کے بعد مسائل بتانے کا اچھا سلسلہ شروع کیا ہے۔ دوروز قبل روزے کا ایک مسئلہ آپ نے بتایا مجھے اس بارے میں ہی پوچھنا ہے۔ میں نے درجہ سادسہ تک ایک مدرسہ میں بھی پڑھا ہوا ہے۔ مسئلہ یہ تھا کہ اگر کان میں دوا ڈالی جائے تو روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور پانی چلا جائے تو نہیں ٹوٹتا۔ آخران میں فرق کی وجہ کیا ہے؟ کیا انتفاع علت ہے؟ یا صرف کسی چیز کا پیٹ میں چلا جانا؟ براہِ کرم ذرا واضح اور مدلل انداز میں سمجھا دیں۔

الجواب حامداًومصلیاً......اصول تو یہی ہے کہ روزے کی حالت میں منافذ میں سے کسی منفذ کے ذریعے کوئی چیز پیٹ میں یا دماغ تک پہنچ جائے تو اس سے روزہ فاسد ہوجاتا ہے لیکن اگر پانی کان کے اندر چلا جائے تو اس صورت میں روزہ فاسد نہیں ہوگا اور کان کے اندر دوائی یا تیل ڈالنے کی صورت میں بالاتفاق روزہ فاسد ہوجائے گا چونکہ پانی چلے جانے کی صورت میں بچنا ممکن نہیں ہے بلکہ حرج لازم آتا ہے اور دفع حرج کی بنا پر روزہ فاسد نہیں ہوگا اور تیل یا دوائی ڈالنے کی صورت میں بچنا ممکن ہے اس لئے اس صورت میں روزہ فاسد ہوجائے گا۔

لمافي الدر المختار(۳۹۶/۲): (أو دخل الماء في أذنه وان كان بفعله) على المختار كما لو حک اذنه بعود ثم أخرجه وعليه درن ثم ادخله ولو مرارا .....وفي الشامية تحته: وفصل في الخانية بأنه ان دخل لا يفسد وان ادخله يفسد في الصحيح لانه وصل الى الجوف بفعله فلا يعتبر فيه صلاح البدن.....

والحاصل الاتفاق على الفطر بصب الدهن وعلى عدمه بدخول الماء واختلف التصحيح في ادخاله.

وفي مراقي الفلاح (۱/۲٦۱): (أو خاض نهراً فدخل الماء أذنه) لايفسد للضرورة.

وفي امداد الفتاح شرح نور الايضاح (۱/٦٧٨): (أو كان خاض نهرا فدخل الماء) في (اذنه) لايفسد صومه قاله قاضيخان انتهى، و ذلك للضرورة والحرج.

(۱۲٦) رمضان میں کافر کا دن کے وقت مسلمان ہوجانے سے اس کے روزے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی کافر رمضان المبارک میں مسلمان ہوجائے تو جس دن وہ مسلمان ہوا ہے، اس دن کا روزہ رکھنا فرض ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً اگر کوئی کافر رمضان المبارک میں دن کے وقت مسلمان ہوجائے تو جس دن وہ مسلمان ہوا ہے اس دن کا روزہ فرض نہیں ہے۔ البتہ شام تک روزے داروں کی مشابہت کیلئے کھانے پیئے بغیر دن گزارنا ضروری ہے۔

لمافي الدر المختار (۲/۴۰۸): (وصبي بلغ وكافرا سلم وكلهم يقضون) مافاتهم (الا الاخيرين) وان افطرا لعدم اهليتهما في الجزء الاول من اليوم وهو السبب في الصوم لكن لونويا قبل الزوال كان نفلا فيقضي بالافساد" كمافي الشرنبلالية عن الخانية.

وفي الشامية تحته: (قوله وان افطرا) اخذه من قول البحر سواء افطرا في ذلك اليوم اوصاماه لكن لايخفى ان صوم الكافر لايصح لفقد شرطه وهو النية المشروطة بالاسلام فالمراد صومه بعد اسلامه اذا اسلم في وقت النية.

(قوله لعدم اهليتهما) اى لأصل الوجوب بخلاف الحائض فانها اهل له وانما سقط عنها وجوب الاداء فلذا وجب عليها القضاء ومثلها المسافر والمريض والمجنون.

وفي الفقه الاسلامي وادلته (۳/۱٦۲۴): فان اسلم الكافر في شهر رمضان، صام ما يستقبل من بقية شهره، وليس عليه قضاء ما سبق بالاتفاق، لقوله تعالى (قل للذين كفروا: اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَاقَدْ سلف) (انفال: ۳۸/۸) ولان في ايجاب قضاء مافات في حال الكفر تنفيراً عن الاسلام أما ان اسلم الكافر في اثناء النهار. (الى قول) ويستحب الكف عن الاكل عند الحنفية والمالكية والشافعية مراعاة لحرمة او لحق الوقت بالتشبه بالصائمين.

(۱۲۷) جمعۃ الوداع میں قضاء عمری کی بدعت

سوال کیا فرماتے ہیں علماء عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے کچھ دن پہلے اخبار میں یہ پڑھا کہ کوئی شخص اگر جمعۃ الوداع کا روزہ

رکھ لے تو اس کے پچھلے سارے روزے معاف ہو جاتے ہیں اسی طرح جمعۃ الوداع میں قضاء عمری جو پڑھی جاتی ہے کیا یہ صحیح ہے ان دونوں باتوں کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ...... رمضان المبارک کے آخری جمعہ کی کوئی خاص فضیلت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی صحیح روایت سے منقول نہیں ہے اور یہ نظریہ رکھنا کہ جمعۃ الوداع کا روزہ رکھنے سے پچھلے سارے روزے معاف ہو جاتے ہیں ایک جاہلانہ تصور ہے۔

اسی طرح جمعۃ الوداع میں قضاء عمری کا بھی شریعت میں کوئی ثبوت نہیں۔

لمافي الموضوعات الكبرى لملا علي قاريؒ (ص ۲۴۲ قدیمی کتب خانہ): حديث "من قضى صلاة من الفرائض في آخر جمعة من شهر رمضان كان ذلك جابرا لكل صلاة فائتة في عمره الى سبعين سنة" باطل قطعا لانه منا قض للإجماع على أن شيئا من العبادات لا يقوم مقام فائتة سنوات.

وفي الشامية(۲/۲۶):قال في البحر :ومن هنايعلم كراهة الاجتماع على صلاة الرغائب التي تفعل في رجب في اولى جمعة منه وانهابدعة ومايحتاله أهل الروم من نذرهالتخرج عن النفل والكراهة فباطل.

(۱۲۸) روزہ خور کو کھانے پینے کی اشیاء لا کر دینے کا حکم

سوال ...... کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ میرے ایک رشتہ دار ریلوے اسٹیشن پر ملازمت کرتے ہیں وہاں پر کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو کہ ماہ رمضان کے تقدس کا خیال نہیں کرتے۔ خود بھی روزہ نہیں رکھتے اور دوسرے روزہ داروں کی بھی پرواہ نہیں کرتے چنانچہ وہاں کے افسران اپنے ملازمین سے کھانے پینے کی اشیاء منگواتے ہیں اور مجبوراً انہیں لا کر بھی دینا پڑتی ہیں کیونکہ ان کی ملازمت کا مسئلہ ہوتا ہے تو کیا یہ ملازمین اپنے افسروں کے ساتھ اس صورت میں گنہگار ہوں گے یا نہیں اور ملازمین کو ایسی صورت میں کیا کرنا چاہئے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ...... صورت مسئولہ میں گناہگار وہ شخص ہوتا ہے جس سے معصیت کا فعل صادر ہو۔ مذکورہ بالا صورت میں اشیاء خورد ونوش کو صرف لا کر دینے سے معصیت متحقق نہیں ہوتی، لہٰذا ماہ مبارک میں ملازمین کیلئے افسران کو خورد ونوش کی چیزیں لا کر دینے میں کچھ گناہ تو نہیں ہے البتہ ملازمین کو چاہئے کہ حتی الامکان اس کام سے بچنے کی کوشش کریں اور دل سے بھی اس فعل قبیح کو برا سمجھیں۔

لمافي الشامية(۶/۳۹۱،۳۹۲): (قوله جازتعمير كنيسة)قال في الخانية ولواجرنفسه ليعمل في الكنيسة ويعمرهالابأس به لأنه لامعصية في عين العمل......وله ان الاجارة على الحمل وهوليس بمعصية ولاسبب لهاوانماتحصل المعصية بفعل فاعل مختار.

(۱۲۹) روزہ خور مہمان کا اکرام نہ کرنے کا حکم

سوال ...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ رمضان المبارک میں بعض مرتبہ یہ صورت پیش آجاتی

ہے کہ دن میں مہمان وغیرہ گھر یا دفتر آجاتے ہیں اگر یہ پتہ چلے کہ ان مہمانوں میں سے کسی نے روزہ نہیں رکھا ہے چاہے اسے کوئی شرعی عذر ہو یا نہ ہو، یا تمام مہمانوں نے ہی روزہ نہیں رکھا ہے اور سب مسلمان بھی ہیں تو آیا میزبان ان کا اکرام کرسکتا ہے یا نہیں؟ جبکہ وہ لوگ افطار تک بھی ٹھہرنے کے ارادہ سے نہ آئے ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً ...... صورت مسئولہ میں اگر رمضان کے مہینے میں گھر میں مہمان آجائے تو اگر کسی شرعی عذر کی بناء پر مہمان کا روزہ نہ ہو تو میزبان اس کا اکرام کرسکتا ہے۔ مگر یہ ضروری ہے کہ روزے دار کے سامنے نہ کھائے۔ اور اگر مہمان نے بغیر کسی شرعی عذر کے روزہ نہیں رکھا تو میزبان اس کا اکرام نہ کرے۔

لما في التفسير المنير (٦/ ٦٩): ((وتعاونوا على البر)) ...... ولا تعاونوا على الاثم وهو الذنب والمعصية: وهي كل ما منعه الشرع، أو حاک في الصدر وكرهت ان يطلع عليه الناس. ولا تعاونوا على التعدى على حقوق الغير والاثم والعدوان يشمل كل الجرائم التي يأثم فاعلها، ومجاوزة حدود الله بالاعتداء على القوم. واتقوا الله بفعل ما امركم به واجتناب مانهاكم عنه الخ.

وفي الدرالمختار (٢/ ٤٠٧): (والاخيران يمسكان بقية يومهما وجوبا على الأصح) لأن الفطر قبيح وترک القبيح شرعاً واجب (كمسافر أقام وحائض ونفساء طهرتا ومجنون افاق ومريض صح) ومفطر ولو مكرها أو خطأ.

وفي الشامية تحته: (قوله والاخيران) أى من تسحر أو أفطر يظن الوقت ليلا الخ...... (قوله على الأصح)...... وأجمعوا على أنه لايجب على الحائض والنفساء والمريض والمسافر وعلىٰ لزومه لمن أفطر خطأ أو عمداً او يوم الشک ثم تبين أنه رمضان ذكره قاضيخان شرنبلالية (قوله لأن الفطر) وطويت فيه النتيجة وتقريره هكذا الفطر قبيح شرعاً وكل قبيح شرعا تركه واجب فالفطر تركه واجب فافهم. (قوله كمسافر أقام) ..... وكذا كل من وجب عليه الصوم ...... او تسحر على ظن أن الفجر لم يطلع ثم تبين طلوعه فانه يجب عليه الإمساک تشبهًا اهـ.

(۱۳۰) روزہ کی نیت کب تک کی جاسکتی ہے؟

سوال ...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دن رمضان میں، میں اپنے دوستوں کے ساتھ عید کی شاپنگ کیلئے گیا ہوا تھا رات کو دیر سے واپسی ہوئی اور رات دیر سے سونے کی بنا پر سحری کے وقت میری آنکھ نہ کھل سکی اور صبح تقریباً گیارہ بارہ بجے آنکھ کھلی اور میں نے بغیر سحری کے روزے کی نیت کرلی تو آیا میرا روزہ درست ہوگیا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ...... صورت مسئولہ میں اگر نصف النہار سے پہلے پہلے نیت کرلی جائے تو روزہ درست ہوگا ورنہ نہیں، اور نصف النہار

سے مراد صبح صادق سے غروب آفتاب تک کے وقت کا نصف ہے۔لیکن یہ واضح ہونا چاہئے کہ نیت کا مطلب دل کا ارادہ ہے،زبان سے کچھ کہنا ضروری نہیں ہے لہٰذا اگر رات سے ارادہ روزے کا تھا لیکن زبان سے کچھ الفاظ نہیں کہے تھے تو روزہ ہوگیا۔

لما في الشامية(۲/۳۷۷):(قوله الى الضحوة الكبرى)المرادبها نصف النهار الشرعي والنهار الشرعي من استطارة الضوء في أفق المشرق الى غروب الشمس والغاية غير داخلة في المغيا كما اشار اليه المصنف بقوله لاعندها ح؛وعدل عن تعبير القدوری والمجمع وغيرهمابالزوال لضعفه لان الزوال نصف النهارمن طلوع الشمس ووقت الصوم من طلوع الفجر كمافي البحر عن المبسوط قال في الهداية وفي الجامع الصغيرقبل نصف النهاروهو الأصح لانه لابدمن وجودالنية في أكثر النهارونصفه من وقت طلوع الفجرالى وقت ضحوة الكبرى لاوقت الزوال فتشترط النية قبلها لتحقق في الأكثر.

(۱۳۱) ناپاکی کی حالت میں روزہ رکھنے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ ماہ مبارک میں ایک رات میں نے اپنی بیوی سے صحبت کی پھر سحری کے وقت غسل کیا نماز پڑھی پھر دفتر جانے میں ٹائم تھا میں دوبارہ سوگیا جب اٹھا تو یاد آیا کہ میں نے صبح غسل میں کلی نہیں کی تو کیا اس سے میرے روزے پر کچھ اثر پڑے گا یا نہیں اور مجھ کو نماز لوٹانی ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....صورت مسئولہ میں اگر آپ نے سحری کے وقت منہ بھر کر پانی پی لیا ہو تو وہ کلی کے قائم مقام ہو جائیگا اور اگر منہ بھر کر پانی نہ پیا ہو تو اس صورت میں یاد آنے کے بعد کلی کرنا ہوگی اور نماز لوٹانی ہوگی البتہ روزہ ہر حال میں صحیح ہوگا۔

لمافي السراجية(صـ۳):الجنب اذاغسل بعض أعضاءه ثم نام اوحدث ثم غسل مابقي جاز النية في الاغتسال ليس بشرط(المضمضة والاستنشاق فرضان في الغسل)

وفي الشامية (۱/۱۵۱):(قوله ويكفي الشرب عبا) أى لامصاً فتح وهو بالعين المهملة والمرادبه هناالشرب بجميع الفم.

(۱۳۲) روزہ میں دل کی نیت کافی ہے

سوال ...کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے بڑے بھائی مجھ سے کہتے ہیں کہ روزے کی نیت زبان سے کرنا ضروری ہے جبکہ میں نے اپنے دوست جو کہ دینی مدرسے میں پڑھتے ہیں ان سے ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ دل میں کر لینا کافی ہے اب آپ سے پوچھنا ہے کہ روزے کی نیت زبان سے کرنا ضروری ہے یا دل میں کر لینا کافی ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً ......صورت مسئولہ میں دیگر عبادات کی طرح روزہ میں بھی دل سے نیت کرلینا کافی ہے،البتہ فقہاء نے زبان سے نیت کرنا مستحب لکھا ہے۔

لـمـافـي الشـامية (۲/۳۸۰): (قـوله والسـنة)أي سنة المشايخ لاالنبي ﷺ لعدم ورودالنطق بها عنه (وقوله أن يتـلـفظ بها)فيقول نويت أصوم غداأوهذااليوم ان نوى نهارالله عزوجل من فرض رمضان سراج.

(۱۳۳) غصے میں اپنی بیوی کوکہا کہ اگرتمہاری بیٹی نے روزہ نہ توڑاتوتم کوتین طلاق

سوال کیافرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں ایک عجیب مسئلہ پیش آیا ہے ایک آدمی نے اپنی بیٹی کومنع کیا کہ کل تم روزہ نہ رکھنا۔بیٹی نے باپ کی بات نہ مانی اورفرض روزہ تھا رکھ لیا،صبح اس شخص کو بڑا غصہ آیا کہ اس نے میری بات نہ مانی۔اس آدمی نے اپنی بیوی کومخاطب کر کے کہا کہ اگرتمہاری اس بیٹی نے روزہ نہیں توڑاتوتم کوتین طلاق۔اب یہ شخص اس کی بیوی اور بیٹی سب پریشان ہیں کہ کیا کریں۔بیٹی کا فرض روزہ ہے۔آیا اس صورت میں اس کیلئے روزہ توڑنا جائز ہے؟اورکیا اس پر کفارہ آئے گا؟

الجواب حامداًومصلیاً ......اگرکسی نے کہا کہ اگرفلاں نے روزہ رکھاتو میری بیوی کوطلاق ہو،توراجح قول کے مطابق خواہ نفلی روزہ ہو یا قضاء کا،قبل الزوال ہو یا بعدالزوال بہرصورت میں روزہ توڑنا جائز ہے،جبکہ دوسراقول یہ ہے کہ قضاء روزہ توڑنا جائزنہیں ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اداء روزہ کا توڑنا بطریق اولیٰ جائزنہیں ہوگا۔اس لئے کہ قضاء ادا کے حکم میں ہوتا ہے۔طلاق سے بچانے کیلئے اداء روزہ کا توڑنا جائز ہے یانہیں اورپھرتوڑنے کی صورت میں اس کی وجہ سے کفارہ لازم آتا ہے یانہیں،کوئی صریح جزئیہ نہیں مل سکا۔البتہ یہ(طلاق سے بچانے کیلئے اداء روزہ توڑنا)ان اعذاراورضرورتوں میں سے نہیں ہے جن کی وجہ سے روزہ توڑنا مباح ہوجاتا ہے اوراسی طرح یہ ان چیزوں میں سے بھی نہیں ہے جن کی وجہ سے اداءروزہ کا کفارہ لازم نہیں آتا ہے۔لہٰذا صورت مسئولہ میں مذکورہ شخص کی بیٹی کواس نیت سے کہ اس کی ماں طلاق سے بچ جائے روزہ توڑنا جائز ہے اورامید ہے کہ اس وجہ سے اس پرمواخذہ نہیں ہوگا۔البتہ اس پراس روزے کی قضاءاورکفارہ دونوں لازم ہوں گے۔نیزدیگرعلمائے کرام سے بھی اس مسئلے کے بارے میں پوچھ لیا جائے۔

لـمافي الفتاوى الولوالجية(۱/۲۲۶): لان القـضـاء خـلف، فكان حكمه حكم الاصل فعلى هذا لو قالوا: لوان صائماًحلفه رجل بطلاق امرأته انه يفطر فان كان متطوعا يفطر لحق أخيه وان كان صائما عن قضاء رمضان لا يفطر.

وفـي الـدر الـمختار(۲/۴۳۰): (ولو حلف) رجل على الصائم(بطلاق امرأته ان لم يفطر أفطر ولو) كان صائما (قضاء) ولا يحنثه (على المعتمد) بزازية وفي النهر عن الذخيرة وغيرها هذا اذا كان قبل

الزوال اما بعده فلا الا لاحد ابويه الى العصر لابعده وفي الاشباه دعا أحد اخوانه لا يكره فطره لو صائما غير قضاء رمضان.

وفي الشامية تحته:(قوله وفي النهر عن الذخيره الخ) اقول: ذكر في الذخيرة مسالة الضيافة ومسالة الحلف وما فيهما من الاقوال، ثم قال وهذا كله اذا كان الافطارقبل الزوال الخ وبه علم انه جار على الاقوال كلها لاقول مخالف لها فتأيد ما قلناه من حصول الجمع فافهم ...... (قوله لو صائما غير قضاء رمضان) أما هو فيكره فطره لان له حكم رمضان كمافي الظهيرية، وظاهر اقتصاره عليه انه لا يكره له الفطر في صوم الكفارة والنذر بعذر الضيافة، وهو رواية عن أبي يوسف لكنه لم يستثن قضاء رمضان. قال القهستاني عند قول المتن: ويفطر في النفل بعذر الضيافة في الكلام اشارة الى انه في غير النفل لا يفطر كمافي المحيط وعن أبي يوسف أنه في صوم القضاء والكفارة والنذر يفطر اهـ. فأنت تراه لم يستثن قضاء رمضان والظاهر من المصنف انه جرى على رواية ابي يوسف فكان ينبغي له ان لا يستثني قضاء رمضان حموى على الاشباه بتصرف ط.

وفي الدر المختار(۲/ ۴۲۱): فصل في العوارض المبيحة لعدم الصوم،

وقد ذكر المصنف منها خمسة وبقي الاكراه وخوف هلاك او نقصان عقل ولو بعطش او جوع شديد ولسعة حية. (لمسافر)...... (او حامل او مرضع)...... (خافت بغلبة الظن على نفسها او ولدها) ...... (او مريض خاف الزيادة)...... (ص۴۲۷) (وللشيخ الفاني العاجز عن الصوم الفطر ويفدى) ......

(۱۳۴) رمضان کے مہینے، روزوں اور تعیین تعداد کی حکمت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں کالج میں پڑھتا ہوں اور کالج میں ہر طرح کے لڑکے ہوتے ہیں اور بعض فلسفیانہ ذہن رکھنے والے ساتھی بھی ہیں میری ان کے ساتھ ذرا اچھی سلام دعا ہے تو وہ مجھ سے بحث مباحثہ کرتے رہتے ہیں میں چونکہ حافظ قرآن ہوں اور جماعت کے ساتھ بھی الحمدللہ چار ماہ لگے ہوئے ہیں اور بزرگوں کی کیسٹیں وغیرہ سنتا رہتا ہوں تو میں انہیں مطمئن کرنے کیلئے کچھ جوابات دے دیتا ہوں اور الحمدللہ وہ کافی مطمئن بھی ہوجاتے ہیں لیکن گزشتہ ہفتے ایک ساتھی نے یہ بحث چھیڑ دی کہ رمضان المبارک کے روزوں میں کیا حکمت ہے اور کیا وجہ ہے کہ صرف ایک ہی مہینہ روزہ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے اور پھر باقی مہینوں کو چھوڑ کر صرف رمضان کے مہینہ کو اختیار کیا گیا ہے اس کی کیا وجہ ہے میں نے کچھ جوابات دیئے لیکن وہ مطمئن نہ ہوا تو میں نے سوچا کہ دارالافتاء سے اس کی تفصیل معلوم کرلیتے ہیں لہٰذا براہ مہربانی آپ تفصیل کے ساتھ رمضان المبارک کے روزوں کی حکمت اور پھر اسی مہینہ کے خاص ہونے کی وجہ اور صرف ایک ہی مہینہ روزہ رکھے جانے کی وجہ تحریر فرمادیں تاکہ میں اور میرے دوسرے ساتھی بھی اس

سے مستفید ہو کر تشفی قلب حاصل کریں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......روزوں کا رمضان کے مہینے میں فرض ہونا قرآن، حدیث اور اجماع امت سے ثابت ہے، جس طرح جسم کے لئے غذا اور دوا کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح روح کے لئے غذا قرآن مجید اور دوا روزے ہیں، تو جس مہینے میں اللہ تعالیٰ نے روح کی غذا (قرآن مجید) کو نازل فرمایا اسی مہینے میں روح کی دوا (روزے) کو لازم فرمایا، تاکہ بندوں کا مکمل طور پر روحانی علاج ہو سکے، اسی طرح روزوں کیلئے ایام کو بھی متعین فرمایا کیونکہ من جاء بالحسنة......الخ کے قاعدے کے مطابق ایک مہینے کے روزے تقریباً پورے سال کے روزوں کے برابر ہیں، اسی طرح اس میں دفع حرج اور امت کو افراط وتفریط سے بچا کر متحد کرنا بھی مقصود ہے۔

لمافي التفسير المنير(١٤١/٢): امتاز رمضان باختصاصه بالصوم فيه من بين الشهور، لانه انزل فيه القرآن، اى ابتدأ إنزاله في رمضان.

وفي الفقه الاسلامي وادلته (١٦٢٨/٣): صوم شهر رمضان ركن من اركان الاسلام وفرض من فروضه، بدليل القرآن والسنة والاجماع. أما القرآن فقوله تعالىٰ "يا ايها الذين امنوا كتب عليكم الصيام، كما كتب على الذين من قبلكم لعلكم تتقون"......... وأما السنة: فقول النبي ﷺ "بني الاسلام على خمس: شهادة ان لا اله الاالله وان محمد رسول الله، وإقام الصلوة وإيتاء الزكوة وصوم رمضان وحج البيت من استطاع اليه سبيلا"...... واجمع المسلمون على وجوب صيام شهر رمضان.

وفي حجة الله البالغة(٣٩/٢): ثم وجب تعيين مقداره لئلا يفرط احد فيستعمل منه مالا ينفعه و ينجع فيه، او يفرط مفرط فيستعمل منه ما يوهن اركانه ويذهب نشاطه وينفه نفسه ويزيره القبور، وانما الصوم ترياق يستعمل لدفع السموم النفسانية مع مافيه نكاية بمطية اللطيفة الانسانية ومنصتها فلا بدمن ان يتقدر بقدر الضرورة.

وفي التفسير المنير(١٣١/٢): ومن اعظم فوائد الصوم الروحيه: ان الصائم يحتسب الاجر والثواب عند الله ويصوم لوجه الله وحده، يكسر حدة الشهوة ويخفف من تأثيرها وسلطانها فيعود الى الاعتدال وهدوء المزاج. يستدعى الاحساس المرهف والشفقة والرحمة التى تدعوه الى البذل والعطاء... فيه تحقيق معنى المساواة بين الاغنياء والفقراء......الخ.

﴿اعتکاف کے مسائل﴾

(۱۳۵) مرد وعورت کیلئے اعتکاف کی شرائط

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ میں کہ میں نے اس سال قرآن مجید حفظ کیا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس سال اعتکاف میں بیٹھوں تو آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ اعتکاف میں کیا کیا باتیں ضروری ہیں اور کیا عورتوں کیلئے بھی وہی شرائط ہوتی ہیں جو کہ مردوں کیلئے یا کچھ الگ ہوتی ہیں؟ کیونکہ میری بڑی بہن بھی اعتکاف میں بیٹھنا چاہتی ہیں۔ براہ کرم جلد جواب عنایت فرمادیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......معتکف کیلئے مندرجہ ذیل شرائط ہیں (۱) اعتکاف کی نیت کرنا (۲) ایسی مسجد میں اعتکاف کرنا جس میں پانچ وقت کی نماز ادا کی جاتی ہو (۳) واجب اعتکاف میں روزہ رکھنا (۴) مسلمان عاقل ہونا (۵) جنابت سے پاک ہونا۔ عورت کے اعتکاف کیلئے بہتر جگہ وہ ہے جو حصہ اس نے گھر میں نماز کیلئے متعین کیا ہو۔ نیز عورت کیلئے بھی اعتکاف کی وہی شرائط ہیں جو مرد کی ہیں البتہ عورت کیلئے حیض ونفاس سے پاک ہونا بھی ضروری ہے۔ اسی طرح عورت کیلئے مسجد میں اعتکاف کرنا خوفِ فتنہ کی وجہ سے مکروہ تحریمی ہے۔

لما فی البدائع(۳/۵): امامایرجع الی المعتکف فمنهاالاسلام والعقل والطهارة عن الجنابة والحیض والنفاس وانها شرط الجواز فی نوعی الاعتکاف الواجب والتطوع جمیعا. وفی(صـ۳/۶) ومنهاالنیة لأن العبادة لاتصح بدون النیة ومنهاالصوم فانه شرط لصحة الاعتکاف الواجب بلاخلاف بین اصحابنا.

وفی الهندیة(۱/۲۱۱): والمرأة تعتکف فی مسجد بیتها اذا اعتکفت فی مسجد بیتها فتلک البقعة فی حقها کمسجد الجماعة فی حق الرجل لا تخرج منه الا لحاجة الانسان کذا فی شرح المبسوط للسرخسی ولو اعتکفت فی مسجد الجماعة جاز ویکره هکذا فی محیط السرخسی.

(۱۳۶) اعتکاف کا مسنون طریقہ اور اعتکاف کے معمولات

سوال: ....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اس سال میرا اعتکاف میں بیٹھنے کا ارادہ ہے، میری خواہش ہے کہ میں اعتکاف بالکل مسنون طریقے سے کروں اور جو اعمال ہمارے بزرگوں سے منقول ہیں وہ بھی بتادیں اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

الجواب حامداً ومصلیاً......رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں اعتکاف سنت مؤکدہ ہے اور اس میں بالاتفاق اعتکاف کرنا اولیٰ اور افضل ہے۔ اس میں سنت طریقہ یہ ہے کہ رمضان المبارک کی بیس (20) تاریخ کو عصر کے بعد سورج کے غروب ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی

رضا حاصل کرنے کیلئے اس آخری عشرہ کے اعتکاف کی نیت کر کے مسجد میں داخل ہو جائے جب عید الفطر کے چاند کے دیکھنے کا شرعاً ثبوت ہو جائے تو اس کا اعتکاف پورا ہو جائے گا لیکن افضل یہ ہے کہ معتکف چاند رات کو مسجد ہی میں رہے عید کی نماز پڑھنے کیلئے وہاں سے نکل جائے اور یہ کہ اعتکاف جامع مسجد میں ہو، معتکف آداب اعتکاف کا لحاظ رکھے اور مندرجہ ذیل اعمال کو اپنا دستور العمل بنائے۔

(۱)۔ بقدر استطاعت نفل نمازیں پڑھے مثلاً مغرب کی نماز کے بعد کم از کم چھ رکعت اور زیادہ سے زیادہ بیس رکعات اوابین نفل پڑھے۔

(۲)۔ عشاء کی نماز اور تراویح سے فارغ ہونے کے بعد علم دین حاصل کرنے کی نیت سے اور عمل کی غرض سے معتمد و معتبر دینی کتابوں کا مطالعہ کرے، حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور انبیاء علیہم السلام کے واقعات، صحابہ کرام، ائمہ عظام اور اولیاء کرام کے حالات اور ملفوظات کا مطالعہ کرے۔

(۳)۔ طاق راتوں میں جب طبیعت میں بشاشت ہو، ذکر اللہ، تلاوت قرآن اور نوافل میں مشغول رہے۔ جب سونے کا تقاضا ہو جائے تو سنت طریقے سے باوضو ہو کر سو جائے، رات کو تہجد کیلئے اُٹھے پھر اپنے رب کریم سے رُو رُو کر اپنے لئے اور جملہ مسلمین کیلئے دعا مانگے۔

(۴)۔ اس کے بعد سحری کھائے۔ پھر نماز فجر کی تیاری کرے خاص طور پر صف اول اور تکبیر اولیٰ کا اہتمام کرے۔ دوران انتظار استغفار کرتا رہے۔

(۵)۔ جب نماز فجر پڑھے تو اس کے بعد آیت الکرسی، چار قل پڑھے اور پورے جسم پر دم کرے۔ سبحان اللہ، الحمد للہ، لا الہ الا اللہ، اللہ اکبر، استغفر اللہ اور درود شریف کی ایک تسبیح پڑھے۔

(۶)۔ اشراق کے نفل کم از کم دو رکعت اور زیادہ سے زیادہ آٹھ رکعات ادا کرے اور اس طرح چاشت کے نفل کم از کم دو رکعت زیادہ سے زیادہ بارہ (12) رکعات ادا کرے۔

(۷)۔ زوال کے بعد چار رکعت سنن زوال ادا کرے اس کے بعد سنن ظہر پڑھے، نماز ظہر سے فراغت کے بعد صلوۃ التسبیح پڑھے۔

(۸)۔ عصر کے وقت نماز کی تیاری کرے، نماز عصر کے بعد تلاوت کرے پھر مذکورہ تسبیحات پڑھے۔ اس کے بعد دعا میں مشغول ہو جائے اور یہ قبولیت دعا کیلئے انتہائی قیمتی وقت ہے اپنی، احباب اور دیگر متعلقین کی مغفرت کیلئے کوشش کرے رحمت الٰہی سے مایوس نہ ہو۔

(۹)۔ درود شریف کثرت سے پڑھے۔

(۱۰)۔ معتکف ہر لایعنی بات اور لایعنی عمل سے اجتناب برتے۔ کثرت کلام سے پرہیز کرے اور اس طرح لڑائی جھگڑے، غیبت، چغلی، جھوٹ بولنے، جھوٹی قسمیں کھانے اور فحش باتیں اور کسی مسلمان کو ناحق ایذاء پہنچانے سے اپنے آپ کو بچائے رکھے۔

لما في الهندية (۱/ ۲۱۱، ۲۱۲): وأما آدابه فان لايتكلم الابخير وأن يلازم بالاعتكاف عشرا من رمضان وأن يختار أفضل المساجد كالمسجد الحرام والمسجد الجامع كذا في السراج الوهاج ويلازم التلاوة والحديث والعلم وتدريسه وسير النبي ﷺ والانبياء عليهم السلام وأخبار الصالحين وكتابة امور الدين كذا في فتح القدير ولا بأس أن يتحدث بمالا إثم فيه.

وفی الفقه الاسلامی(۳/۱۷۷۲): (۱) يستحب للمعتكف التشاغل على قدر الاستطاعة ليلا ونهارا بالصلاة وتلاوة القرآن وذكر الله تعالى نحو لا اله الا الله ومنه الاستغفار والفكر القلبي في ملكوت السموات والارض ودقائق الحكم والصلاة على النبي ﷺ وتفسير القرآن ودراسة الحديث والسيرة وقصص الانبياء وحكايات الصالحين ومدارسة العلم ونحو ذلك من الطاعات المحضة (إلى أن قال)

(۲) يسن الصيام للمعتكف عند الجمهور (غير المالكية) الذين لا يشترطونه والمالكية يشترطون الصوم والحنفية يشترطونه في الاعتكاف المنذور.

(۳) يندب أن يكون الاعتكاف في المسجد الجامع...... وافضل المساجد لذلك المسجد الحرام ثم المسجد النبوي ثم المسجد الأقصى.

(۴) يندب الاعتكاف في رمضان لانه من افضل الشهور لا سيما في العشر الأخير من رمضان بالاتفاق..........

(۵) يندب مكث المعتكف ليلة العيد إذا اتصل اعتكافه بها ليخرج منه إلى المصلى فيوصل عبادة بعبادة..........

(۶) يجتنب المعتكف كل مالا يعنيه من الاقوال والافعال ولايكثر الكلام..........

ويجتنب الجدال والمراء والسباب والفحش فان ذلك مكروه في غير الاعتكاف ففيه أولیٰ......

ولا يتكلم المعتكف الابخير ولا بأس بالكلام لحاجته ومحادثة غيره.

(۱۳۷) اعتکاف مسنون میں سنۃ علی الکفایۃ ہونے کا مطلب

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

اعتکاف مسنون، سنت علی الکفایۃ ہے یا سنت مطلقہ؟ اگر یہ سنت علی الکفایۃ ہے تو پھر یہ پورے شہر کی کسی ایک مسجد میں کافی ہو جائے گا؟ یا پھر شہر کے ہر محلے کی کسی ایک مسجد میں کرنا کفایت کرے گا؟ یا پھر ہر محلے کی ہر مسجد کیلئے سنت علیٰ الکفایۃ ہوگا؟ اس مسئلے میں ''فتاویٰ جات'' میں مختلف اقوال ملتے ہیں مثلاً علامہ شامی رحمہ اللہ نے اعتکاف مسنون کو تراویح پر قیاس کیا ہے اور اقوال ثلاثہ میں سے ہر محلے والے قول کو اختیار کیا ہے اور اسی طرح ''احسن الفتاویٰ'' میں بھی حضرت رحمہ اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے مگر ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا ہے۔'' کہ اس میں صریح جزئیہ نہیں ملا'' جبکہ اس کے برخلاف ''جامع الرموز'' ودیگر کتب کہ جن میں ''لوترک فی بلدۃ لا ساؤا'' کہا گیا ہے۔ اس سے صراحۃً یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ پورے شہر میں ایک بھی اعتکاف کافی ہوگا۔ اب حل طلب بات یہ ہے کہ اعتکاف مسنون میں سنت علیٰ

الکفایہ ہونے کا کیا مطلب ہے؟ بحوالہ جواب تحریر فرما کر مشکور وممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً....اعتکاف مسنون سنت علی الکفایہ ہے۔اور سنت علی الکفایہ ہونے میں فقہاء کرام کے دوقسم کے اقوال ملتے ہیں. بعض کے نزدیک پورے شہروالوں پر سنت علی الکفایہ ہے لہٰذا اگر شہر میں کوئی بھی شخص بیٹھ گیا تو یہ سنت ادا ہو جائے گی، ورنہ سب کے سب گناہ گار ہوں گے، اور اس قول کو علامہ قہستانی نے ''جامع الرموز'' میں اور اسی طرح دیگر فقہاء کرامؒ نے اختیار کیا ہے۔ جبکہ اس کے بر خلاف علامہ شامیؒ اور متاخرین میں سے اکثر علماء کا قول یہ ہے کہ شہر کے ہر محلہ کی مسجد پر سنت علی الکفایہ ہے۔ لہٰذا اگر کسی بھی محلہ کی مسجد میں یہ سنت ادا کی گئی تو یہ سنت ادا ہو جائے گی، ورنہ محلہ والے سب کے سب گناہ گار ہوں گے، اور عبادات میں چونکہ احتیاط والی جہت کو ترجیح ہوتی ہے اس لئے بہتر یہ ہے کہ علامہ شامی والی رائے کو اختیار کیا جائے اور شہر کے ہر محلے کی کسی ایک ہی مسجد پر سنت علی الکفایہ کا اطلاق کیا جائے۔

لمافي اعلاء السنن(۹/۱۷۹): قوله: عن عائشة الخ قال المؤلف: دلالته على مواظبة الاعتكاف كما هو الاصل في لفظ كان ظاهرة فهو سنة مؤكدة، واما كونها كفاية فحيث اكتفى باعتكافه ﷺ ولم يعتكفوا في زمانه والانقل وكذالك لم يعتكف جميعهم بعده فدل عليه تأمل.

وفي جامع الرموز(۱/۳۷۶): فصل الاعتكاف: لغة اللبث من العكف او من المعكوف اى الاقامة كما في الكرماني وشريعة على ضربين سنة وواجب وباللام اشار الى الاول وهو مكث في مسجد بنية عبادة غير واجبة بقرينة قوله سنة مؤكدة مطلقا وقيل في العشر الاخير من رمضان فاما في غيره فمستحب كمافي بيان الاحكام وقيل سنة على الكفاية حتى لو ترك في بلدة لأساؤا وقيل سنة لا يأثم تاركه وقيل مستحب كما في الزاهدى والصحيح الثاني لمواظبه عليه الصلاة والسلام على ذالك وقضائه في شوال حين ترك كمافي المضمرات.

وفي الدرالمختار(۲/۴۴۲): (وسنة مؤكدة في العشر الاخير من رمضان) أى سنة كفاية كمافي البرهان وغيره لاقترانها بعدم الانكار على من لم يفعله من الصحابة.

وقال الشامي(قوله أى سنة كفاية) نظيرها اقامة التراويح بالجماعة فاذا قام بها البعض سقط الطلب عن الباقين فلم يأثموا بالمواظبة على الترك بلا عذر، ولو كان سنة عين لأثموا بترك السنة المؤكدة اثما دون اثم ترك الواجب.

وفي ايضاً قال في فصل التراويح(۲/۴۵): (قوله والجماعة فيها سنة على الكفاية الخ) أفاد ان اصل التراويح سنة عين بخلاف صلاتها بالجماعة فانها سنة كفاية، فلو تركها الكل أساء وا.

وهل المراد انها سنة كفاية لأهل كل مسجد من البلدة أو مسجد واحد منها أو من المحلة؟ ظاهر

كلام الشارح الاول، واستظهر ط الثاني، ويظهر لي الثالث، لقول المنية: حتى لو ترك أهل محلة كلهم الجماعة فقد تركوا السنة وأساءوا اهـ، وظاهر كلامهم هنا ان المسنون كفاية اقامتها بالجماعة في المسجد، حتى لو أقاموها جماعة في بيوتهم ولم تقم في المسجد أثم الكل...... الخ.

وفي القواعد الفقهية (صـ ۱۵): الاصل ان الاحتياط في حقوق الله تعالىٰ جائز وفي حقوق العباد لايجوز.

(۱۳۸) ایسے محلے کی مسجد میں اعتکاف کا حکم جہاں چند گھر ہوں

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مسجد ایسی جگہ ہے جہاں صرف چھ سات گھر ہیں اور یہ لوگ کاشتکار ہیں نماز کیلئے صرف دو چار آدمی آتے ہیں تو آپ سے معلوم یہ کرنا ہے کہ اس مسجد میں بھی اعتکاف کرنا ضروری ہوگا؟ جبکہ یہ لوگ بہت مصروف ہیں اعتکاف کرنے میں ان کے کام میں حرج لازم آتا ہے تو اب ان کیلئے کیا حکم ہوگا؟ اعتکاف نہ کرنے کی صورت میں کیا سارے لوگ گناہگار ہوں گے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں اگر اس مسجد کا امام اور مؤذن مقرر ہوں اور پنج وقتہ نماز باجماعت اس میں ادا کی جاتی ہو، تو اس مسجد میں اعتکاف کرنا ضروری ہے اگر ان لوگوں میں سے کسی ایک نے بھی اعتکاف نہ کیا تو سب گنہگار ہوں گے۔

لما في الدر المختار (۲/ ۴۴۰): (هو) لغة اللبث وشرعا (لبث) بفتح اللام وتضم المكث (ذكر) ولو مميزا في (مسجد جماعة) هو ماله امام ومؤذن اديت فيه الخمس اولاو عن الامام اشتراط اداء الخمس فيه وصححه بعضهم وقال لايصح في كل مسجد وصححه السروجي واما الجامع فيصح فيه مطلقا اتفاقا.

وفي رد المحتار (۲/ ۴۴۲): (قوله اى سنة كفاية) نظيرها اقامة التراويح بالجماعة فاذا قام بها البعض سقط الطلب عن الباقين فلم يأثموا بالمواظبة على الترك بلا عذر ولو كان سنة عين لأثموا بترك السنة المؤكدة اثما دون اثم ترك الواجب كما مربيانه في كتاب الطهارة.

(۱۳۹) تین نمازیں باجماعت ادا کی جانے والی مسجد میں اعتکاف کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلے میں ایک مسجد ہے جس میں تین نمازیں باجماعت ہوتی ہیں اور کچھ فاصلے پر ایک بڑی مسجد ہے جس میں پانچوں نمازیں باجماعت ادا کی جاتی ہیں تو اعتکاف کس مسجد میں افضل ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ...... صورت مسئولہ میں جہاں پر پانچوں نمازیں باجماعت ادا ہوتی ہوں وہاں اعتکاف کرنا ضروری ہے، جہاں تین نمازیں ادا ہوتی ہیں وہاں اعتکاف نہیں ہوگا۔

لـمـافي الدر المختار (۲/۴۴۰): (مسجد جماعة) هو ماله إمام ومؤذن أديت فيه الخمس أولا، وعن الامام اشتراط أداء الخمس فيه وصححه بعضهم وقال لايصح في كل مسجد وصححه السروجي.

وفـي ردالمحتار (۲/۴۴۰): (قوله أديت فيه الخمس أولا) صرح بهذا الا طلاق في العناية وكذا في النهر وعزاه الشيخ اسمعيل الى الفيض والبزازية وخزانة الفتاوىٰ والخلاصة وغيرها. ويفهم ايضا وان لم يصرح به من تعقيبه بالقول الثاني هنا تبعا للهداية فافهم (قوله وصححه بعضهم) نقل تصحيحه في البحر عن ابن الهمام (قوله وصححه السروجي) وهو اختيار الطحاوي قال الخير الرملي وهو أيسر خصوصا في زماننا فينبغي أن يعول عليه والله تعالىٰ اعلم.

(۱۴۰) اعتکاف واجب اور مسنون کیلئے مسجد جماعت شرط ہے یا نہیں؟

سوال ...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا اعتکاف واجب اور مسنون کیلئے مسجد جماعت شرط ہے یا نہیں؟ جبکہ کتب فتاویٰ کی عبارات اس مسئلے میں مختلف ہیں۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اعتکاف واجب اور مسنون کیلئے مسجد جماعت ضروری اور شرط ہے۔

۱)۔ اعتکاف ایسی مسجد میں کیا جائے جہاں اذان اور پنجگانہ جماعت کا اہتمام ہو، ویران یا جنگل کی مسجد یا عیدگاہ میں نہیں۔ (فتاویٰ محمودیہ، ۱/۲۷۸)

۲)۔ نیز ایسی مسجد میں اعتکاف کرنا جہاں پنج وقتہ نماز ادا کی جاتی ہو شرط ہے۔ (القاموس الفقہ ۲، ۱۷۲/۲)

۳)۔ **(وأما شروطه) ...... ومنها مسجد الجماعة فيصح في كل مسجد له أذان وإقامة هو الصحيح كذا في الخلاصة. (الفتاوىٰ العالمكيريه، ۱/۲۱۱)**

۴)۔ دیگر ایام میں جماعت نہ ہوتی ہو لیکن اعتکاف کے دنوں میں جماعت ہوتی ہو تو کافی ہے۔ اعتکاف صحیح ہو جائے گا۔ آپ بخوشی اعتکاف کر سکتے ہیں۔ (فتاویٰ رحیمیہ، ۲۷۵/۷)

۵)۔ سوال: اعتکاف درست ہونے کی شرائط کیا ہیں؟

جواب: مسجد جماعت میں اعتکاف کرنا۔ (تعلیم الاسلام صفحہ ۱۶۹، اعتکاف کی اقسام)

اور مندرجہ ذیل عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد جماعت کا ہونا ضروری نہیں ہے۔

۱)۔ احسن الفتاویٰ میں ہے ''مسجد میں پنج وقتہ نمازیں جماعت کے ساتھ ہوتی ہوں یا نہیں''۔ (احسن الفتاویٰ ۴، ۵۱۷/۴)

۲)۔''مسجد میں ٹھہرنا خواہ اس مسجد میں پنج وقتہ نمازیں جماعت کے ساتھ ہوتی ہوں یا نہیں''۔(مسائل بہشتی زیور،صفحہ ۳۸۵)

۳)۔اعتکاف کیلئے تین چیزیں ضروری ہیں۔(۱)۔مسجد میں ٹھہرنا خواہ مسجد میں پنج وقتہ نماز ہوتی ہے یا نہیں۔

اوراس کے تحت حاشیہ میں یہ عبارت بھی منقول ہے:''بعض فقہاء نے مسجد جماعت کی شرط رکھی ہے،بعض نے یہ شرط رکھی ہے کہ اس میں پنج وقتہ نمازیں ہوتی ہوں،مگر صاحبین یعنی امام محمد اور امام ابو یوسف کے نزدیک ہر مسجد میں اعتکاف درست ہے اسی کی اکثر علماء نے تائید کی ہے اور اس زمانے میں اسی پر فتویٰ ہے۔(علم الفقہ،حصہ سوم،صفحہ ۴۴۸)

۴)۔ **(مسجد جماعة) هو ماله امام و موذن اذّيت فيه الخمس اولا (درمختار) اديت فيه الخمس اولا صرح بهذا الاطلاق في العناية و كذا في النهر عزاه الشيخ اسماعيل الى الفيض والبزازية وخزانة الفتاوى والخلاصة وغيرها.(الفتاوىٰ الشامية، ۱/۴۴۲)**

مندرجہ ذیل امور مطلوب ہیں:

(۱)۔اعتکاف واجب ومسنون کیلئے مسجد جماعت شرط ہے؟

(۲)۔اس مسئلے میں امام صاحب کے قول پر فتویٰ ہے یا صاحبین کے قول پر؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اعتکاف واجب ومسنون کیلئے اکثر کتب فقہ وفتاویٰ میں مسجد جماعت کو شرط قرار دیا گیا ہے اور مسجد جماعت سے مراد وہ مسجد ہے جس میں امام اور مؤذن مقرر ہو،اور جہاں امام ومؤذن مقرر ہوگا وہاں عموماً پنج وقتہ نماز ادا کی جائے گی جیسا کہ علامہ طحطاویؒ نے ''طحطاوی علی الدر'' (۱/۴۷۲) میں فرمایا اور امام ابو یوسفؒ سے منقول ہے کہ واجب اعتکاف کیلئے مسجد جماعت ضروری ہے نفل اعتکاف کیلئے ضروری نہیں ہے اور سنت مؤکدہ حکماً واجب ہوتا ہے معلوم ہوا کہ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک بھی واجب ومسنون اعتکاف کیلئے مسجد جماعت ضروری ہے اسی طرح اکثر کتب فقہ وفتاویٰ مثلاً ''ہدایہ'' (۱/۲۲۷)،''فتح القدیر''(۲/۳۹۴)،''البحر الرائق'' (۲/۵۲۶)،''قاضی خان'' (۱/۱۰۷)،''ہندیہ'' (۱/۳۵) وغیرہ اور ہمارے اکثر علماء کے فتاویٰ مثلاً ''محمودیہ'' (۱۰/۲۷۸)،''رحیمیہ (۷/۲۷۵)،''جواہر الفتاویٰ'' (۱/۳۵)،''آپ کے مسائل اور ان کا حل'' (۳/۳۱۲) وغیرہ میں پنج وقتہ نماز والی مسجد کو ضروری قرار دیا ہے۔لہٰذا مذکورہ حوالہ جات کی روشنی میں امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول راجح معلوم ہوتا ہے کہ واجب ومسنون اعتکاف کیلئے پنج وقتہ نماز والی مسجد کا ہونا ضروری ہے۔

لما في المبسوط للسرخسيؒ(۳/۱۱۵): ثم جوازه يختص بمساجد الجماعات وروى الحسن عن أبي حنيفة رحمهما الله تعالىٰ قال كل مسجد له امام ومؤذن معلوم وتصلى فيه الصلوات الخمس بالجماعة فانه يعتكف فيه.

وفي بدائع الصنائع(۳/۱۸): ثم ذكر الكرخي أنه لا يصح الاعتكاف الافي مساجد الجماعات يريد به الرجل وقال الطحاوي انه يصح في كل مسجد، وروى الحسن بن زياد عن أبي حنيفة أنه لا يجوز

الافي مسجد تصلّي فيه الصلوات كلها الخ.

وفي البداية (۱/۲۲۷): ثم الاعتكاف لايصح الافي مسجد جماعة لقول حذيفة لا اعتكاف الافي مسجد جماعة وعن ابي حنيفة انه لا يصح الافي مسجد يصلي فيه الصلوات الخمس لانه عبادة انتظار الصلوة فيختص بمكان يؤدى فيه.

وفي المحيط البرهاني(۳/۹۰۳): وجوازه يختص بالمساجد وقال القدورى لا يصح الاعتكاف الافي مسجد الجماعات وروى عن أبي حنيفة رحمه الله تعالىٰ انه لا يصح الافي مسجد يصلي فيه الصلوات الخمس قيل: أراد أبو حنيفة رحمه الله تعالىٰ غير المسجد الجامع فان هناک يجوز الاعتكاف وان لم يصلوا فيه الصلوات كلها بجماعة وفي المنتقى عن أبي يوسف أن الاعتكاف الواجب لايجوز اداؤه في غير مسجد الجماعة (وغير الواحب يجوز اداؤه في غير مسجد الجماعة) والافضل اعتكاف الرجل في الجامع اذا كان ثمة قوم يصلون بجماعة وأن لم يكن قوم فاعتكافه في مسجده افضل.

وفي فتاوى والولوالجية(۱/۲۱۲): ولا يصح الافي مسجد الجماعات لقوله تعالىٰ وَاَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ في المسجد.

وفي فتاوى قاضيخان(۱/۱۰۷): عن ابي حنيفة في رواية لايصح الاعتكاف الافي مسجد تصلي فيه الصلوة كلها وفي رواية لايصح الا في المسجد الجامع وفي رواية يصح في كل مسجد له اذان واقامة وهو الصحيح لقوله عمر لا اعتكاف الافي مسجد له اذان واقامة.

وفي الهندية (۱/۲۱۱): (اما شروطه) ومنها مسجد الجماعة فيصح في كل مسجد له اذان وأقامة هو الصحيح كذا في الخلاصة.

وفي طحطاوى على الدر(۱/۴۷۲): (قوله في مسجد جماعة) انما شرط لقول حذيفة لا اعتكاف الافي مسجد جماعة منح.

وفيه ايضاً(۱/۴۷۳): (قوله اذيت فيه الخمس اولا) هذا الاطلاق لم يكن في عبارة النهر والبحر ولاغيرهما مما اطلعت عليه والظاهر انه اخذه من اطلاق عبارة الخانية ونصها في كل مسجد له اذان واقامة هو الصحيح اهـ قلت ما المانع ان يكون المراد بالمسجد الذى له اذان واقامة ماتقام فيه الخمس كما رواه الحسن عن الامام وصححه بعض المشائخ كما قاله الكمال فيرجع هذا القول الى ما بعده على انه اذا كان له امام ومؤذن لزم اداء الخمس فيه عادة وان كان بهما فقط.

وفی مرقاة المفاتیح(۴/۰ ۵۳، ۵۳۱): قال الشمنی شرط الاعتکاف مسجد الجماعة وهو الذی له مؤذن وامام و یصلی فیه الصلوات الخمس او بعضها بجماعة وعن أبی حنیفة لا یصح الاعتکاف الافی مسجد جامع یصلی فیه الصلوات الخمس بجماعة وهو قول احمد قال ابن الهمام وصححه بعض المشائخ اهـ وقال قاضیخان وفی روایة لایصح الاعتکاف عنده الافی الجامع اهـ وهو ظاهر الحدیث وعن أبی یوسف ومحمد یصح الاعتکاف فی کل مسجد وهو قول مالک والشافعی لاطلاق قوله تعالیٰ "وانتم عاکفون فی المساجد" لأبی حنیفة ماروی الطبرانی (الی قوله) لا اعتکاف (فی المساجد التی فی الدور (الی قوله) وروی ابن شیبة وعبدالرزاق فی مصنفیهما عن علی قال لا اعتکاف الافی مسجد جماعة وتقدم مرفوعا عن عائشة رضی الله عنها الخ.

(۱۴۱) معتکف کیلئے مسجد سے باہر بات چیت کا حکم

سوال　کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ رمضان کے آخری عشرہ میں دوران اعتکاف کسی شرعی حاجت کیلئے اگر معتکف نکل جائے اور اس دوران کسی سے بات کی یا کسی کو سلام کیا یا کچھ پوچھ لیا یا کسی کو کچھ بتادیا تو کیا ان تمام صورتوں میں اس شخص کا اعتکاف فاسد ہوجائیگا؟ ہمارے ہاں لوگ معتکف کو سلام کرنے اور سلام کا جواب دینے سے بھی سختی سے روکتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہر قسم کی بات اعتکاف کو فاسد کردیتی ہے کیا انکی یہ بات درست ہے آسان انداز میں سمجھا کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......اگر کوئی شخص اعتکاف کے دوران کسی شرعی یا طبعی حاجت کیلئے نکلے تو اس دوران راستہ میں بغیر رکے ہوئے سلام دعا کرنا، کسی مریض کی عیادت کرنا، کچھ پوچھنا یا بتلانا جائز ہے لیکن اگر دوران گفتگو رک گیا تو اعتکاف فاسد ہوجائیگا۔ البتہ فضول اور غیر ضروری کلام سے معتکف کو بہر حال پرہیز کرنا چاہئے۔

لمافی الهندیة(۱/۲۱۲): فاذاخرج لبول أوغائط لابأس بان یدخل بیته ویرجع الی المسجد کمافرغ من الوضوء ولومکث فی بیته فسد اعتکافه وان کان ساعة.

(۱۴۲) معتکف کا مریض کی عیادت کیلئے جانے کا حکم

سوال　کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ محمد انور اعتکاف کیلئے مسجد میں بیٹھ گیا ہے اب اس کے دادا جی سخت بیمار ہیں اور انور کو بہت یاد کرتے ہیں تو اب اس صورت میں انور کیلئے دادا کی عیادت کیلئے گھر جانے کی گنجائش ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً　معتکف کا بیمار کی عیادت کیلئے مسجد سے باہر نکلنا درست نہیں ہے اگر کوئی معتکف مریض کی عیادت کیلئے مسجد سے باہر نکل گیا تو اس کا اعتکاف ٹوٹ جائے گا اور ایک دن کے اعتکاف کی روزہ کے ساتھ اس پر قضالازم ہوگی۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر محمد

انور اپنے دادا جی کی شدید بیماری کی وجہ سے گھر چلا جاتا ہے (اور اسے چلے جانا ہی چاہئے) تو اس کا اعتکاف ٹوٹ جائے گا اور ایک دن کے اعتکاف کی روزے کے ساتھ اس پر قضا لازم ہوگی اور اس چلے جانے کی وجہ سے وہ گناہ گار بھی نہ ہوگا۔

لمافي النهر الفائق(۲/۴۷): وعن هذا فسد إذا عاد مريضا أو شهد جنازة تعينت إلا أنه لا يأثم بل يجب عليه الخروج.

لمافي فتاویٰ الهندية (۱/۲۱۲): ولا يخرج لعيادة المريض كذا في البحر الرائق.

وفي رد المحتار(۲/۴۴۷): وعلل في الخانية المرض بأنه لايغلب وقوعه فلم يصر مستثنى عن الايجاب فأفاد الفساد في الكل وعلى هذا يفسد لو لاعيادة مريض او شهود جنازة وإن تعينت عليه إلا انه لا يأثم كمافي المرض بل يجب.

(۱۴۳) مدہوشی اور جنون سے اعتکاف ٹوٹنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا مدہوشی اور جنون مفسد اعتکاف ہے؟ اگر ہے تو اس کی کوئی تحدید بھی ہے؟ مثلاً ایک دن اور ایک رات ہو یا پھر اس سے کم بھی مفسد ہوسکتی ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً..... نفس مدہوشی اور جنون مفسد اعتکاف نہیں ہاں اگر مدہوشی اور جنون اس قدر دراز ہو جائے کہ وہ نیت صوم کیلئے مانع بن جائے تو پھر اس مدہوشی اور جنون سے اعتکاف فاسد ہو جائے گا۔ مثلاً کسی معتکف کو آج مدہوشی یا جنون لاحق ہو گیا اور دوسرے دن زوال سے پہلے پہلے اسے افاقہ ہوگیا اور اس نے روزے کی نیت کرلی تو اس کا اعتکاف فاسد نہیں ہوگا کیونکہ اعتکاف کیلئے روزہ شرط ہے اور زوال شرعی سے پہلے روزہ کی نیت کرنا صحیح ہے اور اگر زوال شرعی کے بعد اسے افاقہ ہوا تو اعتکاف فاسد ہو جائے گا کیونکہ زوال شرعی کے بعد روزہ کی نیت صحیح نہیں ہوتی، لہٰذا جب روزہ نہیں ہے تو اعتکاف بھی صحیح نہیں ہوگا۔

لمافي المبسوط للسرخسي (۳/۱۲۶): واذا اغمي على المعتكف أياماً أو اصابه لمم فعليه اذا برء أن يستقبل الاعتكاف لان ماهو شرط الاداء وهو الصوم قد انعدم بتطاول الاغماء فعليه الاستقبال الخ.

وفي الدر المختار(۲/۴۵۰): وكذا أغماؤه وجنونه إن داما أياماً فإن دام جنونه سنة قضاه استحساناً.

وفي الشامية (۲/۴۵۰): (قوله إن داما أياماً) المراد بالأيام أن يفوته صوم بسبب عدم إمكان النية ح ويقضيه في الاغماء كالجنون ط (قوله سنة) عبارة البدائع وغيرها سنين والمراد المبالغة فيقضي في الأقل بالأولى.

وفي الفقه الاسلامي وادلته (۳/۱۷۷۸): الإغماء والجنون الطويلان فاذا جن المعتكف او اغمي عليه أياماً بطل اعتكافه عند الجمهور الخ.

(۱۴۴) معتکف کا نمازِ جنازہ پڑھنے کیلئے مسجد سے باہر جانے کا حکم

سوال ... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص اعتکاف کیلئے بیٹھا لیکن چار دن بعد اس کا ماموں فوت ہو گیا اب وہ اس کے جنازہ میں شریک ہونا چاہتا ہے تو شرعاً اس کیلئے جنازہ کیلئے باہر جانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... معتکف کیلئے نماز جنازہ میں شرکت کیلئے مسجد سے باہر نکلنا جائز نہیں ہے۔ اگر کوئی معتکف نماز جنازہ میں شرکت کیلئے مسجد سے باہر نکل گیا تو اس کا اعتکاف ٹوٹ جائے گا، اور ایک دن کے اعتکاف کی روزہ کے ساتھ قضاء اس پر لازم ہوگی خواہ رمضان میں قضاء کرلے یا رمضان کے بعد۔ تاہم مذکورہ عذر کی صورت میں اعتکاف توڑنے کا گناہ نہ ہوگا۔

لما فی الهندية (۱/۲۱۲): ولو خرج لجنازة يفسد اعتكافه وكذا لصلاتها ولو تعينت عليه الخ.

وفی الخانية (۱/۱۰۷): ولا يعود المعتكف مريضا ولا يشهد جنازة.

وفی الشامية (۲/۴۴۷): وعلى هذا يفسد لو لا عيادة مريض او شهود جنازة وإن تعينت عليه الا انه لا يأثم كمافي المرض بل يجب كمافي الجمعة.

(۱۴۵) حالت اعتکاف میں کنگھا کرنے کا حکم

سوال ... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلے ہی کے ایک صاحب جو کہ بڑے اچھے خوش اخلاق اور معلوماتی انسان ہیں ان سے میری بات ہوئی تو وہ فرما رہے تھے کہ حالت اعتکاف میں کنگھا کرنا درست نہیں ہے جو شخص کنگھا کرتا ہے اس کا اعتکاف ختم ہو جاتا ہے۔ کیا ان کی بات صحیح ہے؟ جبکہ اکثر معتکفین کنگھا کرتے ہیں تو ان کے اعتکاف کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً... حالت اعتکاف میں جو چیزیں ممنوع قرار دی گئی ہیں وہ جماع، دواعیہ جماع اور اسی طرح بلا عذر طبعی وشرعی مسجد سے باہر نکلنا ہے، کہ ان چیزوں کی وجہ سے معتکف کا اعتکاف فاسد ہو جاتا ہے جہاں تک کنگھے کا تعلق ہے تو اس بارے میں صریح نص موجود ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف میں ہوتے تھے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کے سر مبارک میں کنگھا کرتی تھیں، پس صورت مسئولہ میں کنگھا کرنے سے اعتکاف فاسد نہیں ہوتا ہے اور تمام معتکفین حضرات کا اعتکاف درست ہے اور آپ کو جن صاحب نے بتایا ہے ان کی بات درست نہیں، ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ اگر کچھ بال وغیرہ گر جائیں تو اس کو اٹھا لینا چاہیے کیونکہ مسجد کی تنظیف (صفائی ستھرائی) واجب ہے۔

لمافی جامع الترمذی (۱/۱۶۵): عن عائشة رضی الله عنها انها قالت كان رسول الله ﷺ اذا اعتكف ادنى الي راسه فارجله وكان لايدخل البيت الا لحاجة الانسان.

وفی الهندية (۱/۲۱۲): (واما مفسداته) فمنها الخروج من المسجد فلا يخرج المعتكف من

معتكفه ليلا او نهارا الا بعذر وأيضاً (صـ۲۱۳) فيحرم على المعتكف الجماع ودواعيه نحو المباشرة والتقبيل واللمس والمعانقة ..... (واما محظوراته) ويلبس المعتكف ويتطيب ويدهن راسه كذا في الخلاصة.

وفي الهندية(۵/۳۲۱): والرابع عشر ان ينزهه عن النجاسات والصبيان والمجانين.

وفي الشامية(۲/۴۴۹): (تحت قوله لكن الخ) والظاهر ان مثل النوم لاكل والشرب اذا لم يشغل المسجد ولم يلوثه لان تنظيفه واجب كمامر......

وفيه ايضاً (۲/۴۵۰): (قوله ولو كان وطؤه الخ)ان المعتكف انما يكون في المسجد فلا يتهيأله الوطء. ......الى قوله تعالىٰ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ فِي الْمَسَاجِدِ اهـ ...... (قوله وان حرم الكل) اى كل ماذكر من دواعي الوطء اذلا يلزم من عدم البطلان بها حلها لعدم الحرج.

(۱۴۶) اعتکاف میں ناخن وغیرہ کاٹنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص کے ناخن یا بال بڑھ جائیں اور وہ اعتکاف میں بیٹھ جائے تو حالت اعتکاف میں ناخن کٹوانا یا بال کٹوانا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ ایک صاحب نے بولا ہے کہ اعتکاف کے دوران ناخن اور بال کاٹنا جائز ہے اس کی کیا حقیقت ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......بہتر طریقہ یہ ہے کہ اعتکاف میں بیٹھنے سے پہلے ناخن یا غیرضروری بال جو بڑھ گئے ہوں کاٹ لینا چاہیے اگر کسی وجہ سے نہ کاٹ سکا تو اعتکاف میں ان چیزوں کے کاٹنے کی اجازت ہے اوراس میں بھی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ جس سے مسجد کی تلویث نہ ہو، جیسے مسجد میں چادر وغیرہ بچھالیں۔

لما في فتح الباري(۴/۲۲۰):(قوله وهو مجاور) في رواية احمد والنسائي كان يأتيني وهو معتكف في المسجد فيتكئ على باب حجرتي فاغسل رأسه وسائره في المسجد وقد تقدمت فوائده في كتاب الحيض ويؤخذ منه ان المجاورة والاعتكاف واحد وفرق بينهما مالك وفي الحديث جواز التنظيف والتطيب والغسل والحلق والتزين الحاقاً بالترجل والجمهور على انه لا يكره في المسجد وعن مالك تكره في الصنائع والحرف حتى طلب العلم وفي الحديث استخدام الرجل إمرأته برضاها وفي إخراجه رأسه دلالة على اشتراط المسجد للاعتكاف.

وفي المفصل في احكام المرأة والبيت المسلم(۲/۱۲۰): ان المعتكف يجوز له ان تمشط زوجته رأسه، والترجيل يعني: التشيط والتهين، وقد ألحق العلماء به التنظيف، والتطيب، والغسل والحلق،

والتزيين، وحلق الرأس، وتقليم الأظفار، وتنظيف البدن من الشعث والدرن.

وفي الشامية (۲/۴۴۵): (قوله ولا يمكنه الخ) فلو أمكنه من غير أن يتلوث المسجد فلا بأس به بدائع أي بأن كان فيه بركة ماء أو موضع معد للطهارة أو اغتسل في اناء بحيث لا يصيب المسجد لماء المستعمل قال في البدائع: فإن كان بحيث يتلوث بالماء المستعمل يمنع منه لان تنظيف المسجد واجب اهـ.

وفي المدونة الكبرىٰ (۱/۲۹۴): فقيل لإبن القاسم، أكان مالك يكره للمعتكف حلق الشعر وتقليم الاظفار، فقال: لا إلا أنه انما كره ذلك لحرمة المسجد.

(۱۴۷) اعتکاف میں سگریٹ کے استعمال کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص اعتکاف میں بیٹھا ہوا ہے لیکن وہ سگریٹ کا عادی ہے اس کے بغیر کافی تکلیف میں پڑ جاتا ہے اب آپ حضرات سے معلوم یہ کرنا ہے کہ اس شخص کا سحری کھانے کے بعد اسی طرح افطاری کے بعد سگریٹ پینے کیلئے مسجد سے باہر نکلنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... شریعت معتکف کو عذر شرعی یا طبعی لاحق ہونے کی وجہ سے مسجد سے باہر جانے کی اجازت دیتی ہے۔ لیکن سگریٹ کے عذر شرعی اور طبعی نہ ہونے کی وجہ سے معتکف اپنی عادت پوری کرنے کیلئے مسجد سے باہر نہیں جا سکتا۔ البتہ بیت الخلاء جاتے آتے تبعاً استعمال کرنے کی گنجائش ہے۔

لما في الهندية (۱/۲۱۲): (واما مفسداته) فمنها الخروج من المسجد فلا يخرج المعتكف من معتكفه ليلا ونهارا الابعذر وان خرج من غير عذر ساعة فسد اعتكافه في قول ابي حنيفه رحمه الله تعالىٰ..... (ومن الاعذار الخروج للغائط والبول واداء الجمعة).

(۱۴۸) معتکف اگر قضاء حاجت کیلئے جائے اور دیر ہو جائے تو اعتکاف کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اس سال جب رمضان کا آخری عشرہ آیا تو میرے دوست واحباب نے اعتکاف میں بیٹھنے کا ارادہ کیا اور مجھے بھی بیٹھنے کا کہا تو میں بھی اعتکاف میں بیٹھ گیا تو ایک دن میں قضاء حاجت کیلئے باہر گیا لیکن بیت الخلاء فارغ نہ ہونے کی وجہ سے مجھے انتظار میں کھڑا ہونا پڑا تو اس سے اعتکاف پر تو کچھ اثر نہیں پڑتا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... معتکف کیلئے بہتر یہی ہے کہ وہ ایسے وقت میں بیت الخلاء جائے کہ اس کو انتظار نہ کرنا پڑے۔ لیکن اگر بیت الخلاء فارغ نہ ہوں اور اس کو انتظار کرنا پڑ جائے تو اس سے اعتکاف پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

لمافي الهندية(۱/۲۱۲): (واما مفسداته) فمنها الخروج من المسجد فلا يخرج المعتكف من معتكفه ليلا و نهارا الا بعذر ... (ومن الاعذار الخروج للغائط والبول واداء الجمعة) فاذا خرج لبول او غائط لابأس بان يدخل بيته ويرجع الى المسجد كما فرغ من الوضوء ولو مكث في بيته فسد اعتكافه وان كان ساعة عند ابي حنيفة رحمه الله كذا في المحيط. ولو كان بقرب المسجد بيت صديق له لم يلزم قضاء الحاجة فيه وان كان له بيتان قريب وبعيد قال بعضهم لايجوز ان يمضى الى البعيد فان مضى بطل اعتكافه كذا في السراج الوهاج وان كان خرج لحاجة الانسان له ان يمشي على التؤدة كذا في النهاية.

(۱۴۹) معتکف کا مقدمے کی ساعت کیلئے مسجد سے نکلنا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص کا عدالت میں مقدمہ چل رہا ہو، اور وہ اعتکاف میں بیٹھ جائے اور اسی دوران اس کے مقدمہ کی ساعت ہونے لگے تو اس شخص کو مقدمہ کیلئے عدالت جانا جائز ہوگا یا نہیں؟ جبکہ نہ جانے کی صورت میں نقصان کا اندیشہ ہو؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... معتکف حالتِ اعتکاف میں مسجد سے صرف حاجت طبعیہ یا شرعیہ کیلئے ہی نکل سکتا ہے۔ لہٰذا مذکورہ صورت میں معتکف کو چاہیے کہ اس مقدمے کی ساعت کو مؤخر کروائے البتہ اگر مقدمے کی ساعت مؤخر نہیں ہوسکتی اور اس کو اپنی جان یا مال کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے تو صرف مقدمے کی ساعت کیلئے مسجد سے باہر جا سکتا ہے اور مقدمے کی ساعت کے بعد فوراً مسجد میں لوٹ آئے۔

لمافي الهندية(۱/۲۱۲): (واما مفسداته) وكذا لو خاف على نفسه أوماله فخرج هكذا في التبيين.

وفي الشامية(۲/۴۴۵): (قوله طبيعية) اى سواءً كانت طبعية أو شرعية وفسر ابن الشلبي: الطبيعية بما لا بدمنها وما لا يقضى في المسجد.

وفي الفقه الاسلامي(۳/۱۷۶۳): ولا يخرج الا لعذر شرعي أو ضرورة أو حاجة.

وايضاً (صـ۱۷۶۴) أو لحاجة ضرورية: كانهدام المسجد أو أداء الشهادة تعينت عليه أو خوف على نفسه.

(۱۵۰) بے ریش لڑکوں کا اعتکاف میں بیٹھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری مسجد کی کمیٹی والوں نے ایک مفتی صاحب سے مشورہ کر کے اس سال سے اعتکاف میں بیٹھنے والوں کیلئے باریش ہونے کی شرط لگائی ہے۔ اور بے ریش لڑکوں کا بیٹھنا ممنوع قرار دیا ہے۔ اب کچھ لڑکوں کے بزرگ اس پر بہت ناراض ہو رہے ہیں کہ یہ اپنی طرف سے شریعت میں اضافہ ہے اور جب اللہ اور اس کے

رسول نے پابندی نہیں لگائی تو یہ کون ہوتے ہیں؟ آیا ان بزرگوں کا یہ کہنا درست ہے؟ اور کیا مسجد والوں کا اس طرح کی پابندی لگانا درست نہیں ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً شریعت کی رُو سے اعتکاف میں بیٹھنے والے کیلئے عاقل ہونا کافی ہے۔ اور بالغ ہونا شرط نہیں۔ پس صورت مسئولہ میں اعتکاف میں باریش اور بے ریش دونوں قسم کے حضرات بیٹھ سکتے ہیں۔ البتہ اگر اندیشہ فتنہ کی وجہ سے کمیٹی والوں نے اعتکاف میں اس قسم کی پابندی لگائی ہو تو صحیح ہے۔

لمافي معارف السنن(۲/۳۰۴): قوله وإياكم وهيشات الاسواق الهيشات بفتح الهاء واسكان الياء وبالشين المعجمة: مايكون فيها من الجلبة وارتفاع الاصوات وما يحدث فيها من الفتن (الى ان قال) وقيل له علاقة بالحديث والغرض النهي عن رفع الاصوات والضوضاء في المسجد.

وفي الهندية(۱/۲۱۱): واما البلوغ فليس بشرط لصحة الاعتكاف فيصح من الصبي العاقل وايضاً فيه (۵/۳۲۱) السابع ان لايتكلم فيه من احاديث الدنيا (الى ان قال) الجلوس في المسجد للحديث لايباح بالاتفاق لان المسجد مابني لامور الدنيا وفي خزانة الفقه مايدل على ان الكلام المباح من حديث الدنيا في المسجد حرام قال ولا يتكلم بكلام الدنيا وفي صلاة الجلابي الكلام المباح من حديث الدنيا يجوز في المساجد وان كان الاولىٰ ان يشتغل بذكر الله تعالى.

وفي الشامية(۲/۴۴۰): (قوله ولو مميزا) فالبلوغ ليس بشرط كمافي البحر عن البدائع. وفيه ايضا(۱/۴۰۷): الغلام اذا بلغ مبلغ الرجال ولم يكن صبيحا فحكمه حكم الرجال، وان كان صبيحا فحكمه حكم النساء، وهو عورة من فرقه الى قدمه.

وفيه ايضاً(۱/۵۶۲): (قوله وكذا تكره خلف أمرد) الظاهر انها تنزيهية ايضا: والظاهر ايضا كما قال الرحمتي ان المراد به الصبيح الوجه لانه محل الفتنة.

(۱۵۱) اعتکاف میں بیٹھنے کیلئے عمر کی قید لگانے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک مسجد کی کمیٹی کا صدر ہوں۔ الحمدللہ سارے کام ساتھیوں کے مشورے سے کرتا ہوں، رمضان المبارک کے آخری عشرے کی آمد آمد ہے لوگ مسجد میں اعتکاف میں بیٹھنے کا ارادہ لکھوانا شروع کرنے والے ہیں، ہماری کمیٹی کے مشورے میں یہ بات رکھی گئی تو یہ مسئلہ اٹھا کہ اس سال پچیس سال سے کم عمر افراد کو اعتکاف میں بیٹھنے کی اجازت نہ دی جائے، کیونکہ ہماری مسجد مرکزی مسجد ہے اور ایک مفتی صاحب کا بیان بھی آخری عشرہ میں روزانہ ہوتا ہے۔ اس لئے لوگوں کا رجوع بھی بہت ہے۔ اب نوجوان لڑکے بھی اعتکاف میں بیٹھنے کا ارادہ ظاہر کرتے ہیں، لیکن نوجوان جب اعتکاف میں

بیٹھتے ہیں اور کئی ایک جب ملتے ہیں تو کبھی کبھی مسجد کے آداب کی رعایت نہیں رکھتے، اور بسا اوقات نوجوان بے ریش ہوتے ہیں جن کے قیام میں اور دوسرے مفاسد ہوتے ہیں۔ تو ایسی صورتحال میں ہماری کمیٹی کا یہ فیصلہ کہ پچیس سال سے کم عمر افراد کو اعتکاف میں بیٹھنے کی اجازت نہ دی جائے، درست ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو پھر ہمیں ان مسائل سے نمٹنے کیلئے کیا کرنا چاہیے؟ براہ کرم جلد از جلد جواب مرحمت فرمادیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً اعتکاف کیلئے بلوغ شرط نہیں بلکہ عاقل نابالغ بھی اعتکاف میں بیٹھ سکتا ہے۔ البتہ اگر کوئی شور وغل کرتا ہو، جس کی وجہ سے نمازیوں اور دوسرے معتکفین کی عبادت میں خلل واقع ہوتا ہو یا مسجد کی بے حرمتی لازم آتی ہو نیز ایسے بے ریش لڑکے جن کے اعتکاف میں بیٹھنے کی وجہ سے مفاسد اور فتنہ کا اندیشہ ہو تو ان کو اعتکاف میں بیٹھنے سے روکا جا سکتا ہے لیکن اس میں عمر کی کوئی تحدید نہیں، لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ کی کمیٹی کا یہ فیصلہ کہ پچیس سال سے کم عمر افراد کو اجازت نہ دی جائے مناسب نہیں۔ بلکہ افراد کو دیکھا جائے گا اگر کسی میں مذکورہ بالا وجوہ میں سے کوئی وجہ ہے تو اس کو پیار ومحبت سے سمجھا کر منع کیا جا سکتا ہے۔

لما في الحلبي الكبير(ص۶۱۰): يجب أن تصان عن ادخال الرايحة الكريهة.... ورفع الصوت وادخال المجانين والصبيان لغير الصلوة ونحوها الخ

وايضا فيه (ص۶۱۲) والكلام المباح فيه مكروه ويأكل الحسنات كما تأكل البهيمة الحشيش كذا ذكره حديثا صاحب الكشاف.

وفي الشامية(۶۵۸/۱): وإن كان أمرد فلا بيه ان يمنعه.

وفيه ايضا(۶۶۰/۱): أجمع العلماء سلفا وخلفا على استحباب ذكر الجماعة في المساجد وغيرها إلا أن يشوش جهرهم على نائم أو مصل أو قارئ الخ.

(۱۵۲) حالت اعتکاف میں کھانے کیلئے مسجد سے نکلنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ رمضان کے مہینے میں عام طور پر لوگ عمرے کیلئے جاتے ہیں اور بعض لوگ تو صرف آخری عشرے کے اعتکاف کیلئے جاتے ہیں، لیکن چونکہ وہاں کھانے کا اپنا بندوبست تو ہوتا نہیں ہے، مجبوراً ہوٹل میں جاتے ہیں۔ تو کیا اس طرح وہاں جا کر بیت اللہ اعتکاف میں بیٹھنا اور حالت اعتکاف سے اُٹھ اُٹھ کر بازار جانا درست ہے؟ آسان سلیس انداز میں یہ مسئلہ بتادیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً معتکف کیلئے بغیر ضرورت طبعیہ اور ضرورت شرعیہ کے مسجد سے نکلنا جائز نہیں ہے۔ مسئلہ بالا میں اگر واقعی وہاں اپنا کھانے کا انتظام نہیں ہو سکتا تو مجبوراً کھانا کھانے کے بقدر ہوٹل میں جا سکتا ہے لیکن ہوٹل میں ضرورت سے زیادہ ٹھہرنا یا بار بار بازار جانا جائز نہیں ہے۔ البتہ بہتر یہ ہے کہ مغرب کے بعد کھانے کیلئے جائے۔

لما فی حاشیة الطحطاوی علی مراقی الفلاح(صـ۷۰۲،۷۰۳): (ولا یخرج منه)...... الا لحاجة شرعیة (او) حاجة (طبیعیة) (او) حاجة و(ضروریة)...... وفی الظهیریة(صـ۷۰۴) وقیل: یخرج بعد الغروب للاکل والشرب وفی حاشیة الطحطاوی تحت قوله: (وقیل: یخرج بعد الغروب للاکل والشرب) قال فی البحر ینبغی حمله علی ما اذا لم یجد من یاتی له به فحینئذٍ یکون من الحوائج الضروریة.

وفی التاتارخانیة(۲/۴۱۱،۴۱۲،۴۱۳): م: ولا یخرج المعتکف من معتکفه لیلا ولانهارا الا بعذر ... وقیل یخرج بعد الغروب للاکل والشرب...... واما فی الاعتکاف النفل فلا بأس بان یخرج بعذر وبغیر عذر.

(۱۵۳) معتکف کا چہرے کو چھپانا اور کس حد تک باتیں کرنا جائز ہے؟

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ جب وہ اعتکاف کرتے ہیں تو ہر وقت منہ چھپا کر رکھتے ہیں اور کسی سے بات بھی نہیں کرتے کیا ان لوگوں کا یہ طریقہ صحیح ہے؟ اعتکاف کے دوران کس حد تک باتیں کرنا جائز ہے اور کس قسم کی بات کر سکتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... مسجد میں اعتکاف کرنا رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں مسنون ہے البتہ معتکف کے لئے یہ بات درست نہیں کہ اپنے چہرے کو چھپا کر رکھے۔ اعتکاف سے مقصود اللہ کا قرب حاصل کرنا ہے اب اگر کوئی شخص اس قرب کو حاصل کرنے کیلئے مسنون اعمال میں اپنے وقت کو صرف کر رہا ہے اور لوگوں سے بات نہیں کر رہا تو ایسا کرنا اچھا ہے کیونکہ اگر وہ لوگوں سے اختلاط کرے گا تو یہ اللہ کے قرب کو حاصل کرنے میں رکاوٹ بنے گا، البتہ اگر کوئی شخص بالکل خاموش رہتا ہے نہ ذکر کرتا ہے نہ کوئی اور مسنون عمل کرتا ہے اور اس خاموشی کے ثواب ہونے کا اعتقاد رکھتا ہے تو ایسا کرنا مکروہ ہے۔ نیز معتکف بوقت ضرورت بقدر ضرورت مباح کلام کر سکتا ہے۔

لمافی تفسیر مظهری (القرآن الکریم، البقرة)(۱/۲۰۷): وانتم عاکفون فی المساجد: العکوف هو الاقامة علی الشیٔ والاعتکاف فی الشرع هو الاقامة فی المسجد علی عبادة الله تعالیٰ مع النیة.

وفی ترمذی شریف(۱/۱۶۵): عن عائشة رضی الله عنها انها قالت کان رسول الله ﷺ اذا اعتکف ادنی الی راسه فارجله وکان لایدخل البیت الالحاجة الانسان.

وفی الدرالمختار (۲/۴۴۹): ویکره تحریما صمت ان اعتقده قربة والا لا لحدیث "من صمت نجا" و یجب ای الصمت کمافی غرر الأذکار عن شر لحدیث "رحم الله امرأ تکلم فغنم أو سکت فسلم "وتکلم إلا بخیر وهو مالا إثم فیه

وفي الشامية تحته: ويجب لم يقل يفترض ليشمل الواجب، فان الكلام قدكون حراماً كالغيبة مثلاً وقد يكره كانشاد شعر قبيح وكذكر لترويج سلعة فالصمت من الاول فرض وعن الثاني واجب فافهم.

وفيه ايضاً: ومنه المباح عند الحاجة اليه لا عندعدمها وهو محمل مافي الفتح انه مكروه في المسجد: ياكل الحسنات كماتاكل النار الحطب كقراءة قرآن وحديث وعلم.

وفي الفقه الاسلامي(۳ /۱۰ - ۱) يجتنب المعتكف كل مالا يعنيه من الأقوال والأفعال، ولا يكثر الكلام. لان من كثر كلامه كثر سقطه وفي الحديث ((من حسن اسلام امرء تركه مالا يعنيه)).

ويجتنب الجدال والمراء والسباب والفحش، فان ذلك مكروه في غير الاعتكاف، ففيه أولى ولا يبطل الاعتكاف بشيء من ذلك لانه لما لم يبطل بمباح الكلام لم يبطل بمحظور

ولا يتكلم المعتكف الا بخير ولا بأس بالكلام لحاجته ومحادثة غيره ويكره الصمت إن اعتقده قربة لانه منهي عنه لانه صوم اهل الكتاب وقد نسخ.

(۱۵۴) اعتکاف مسنون ٹوٹ جانے کی صورت میں ایک دن کی قضاء سے کیا مراد ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اعتکاف مسنون ٹوٹ جانے کی صورت میں ایک دن کی قضاء سے کیا مراد ہے؟ ایک دن کی قضاء کے متعلق فتاویٰ میں تعارض پایا جاتا ہے، جیسا کہ "خیر الفتاویٰ" میں ایک دن کی قضاء سے دن اور رات دونوں مراد ہیں۔ خیر الفتاویٰ کی عبارت ملاحظہ ہو: "صورت مسئولہ میں ایک دن رات کے اعتکاف کی قضاء کر لی جائے"۔ (خیر الفتاویٰ ۴/ ۱۱۷)

دوسری جگہ درج ہے: "عبارت مذکورہ سے معلوم ہوا کہ صاحبین کے نزدیک ایک دن رات کی قضاء کرے گا اور اس دن روزہ بھی رکھے گا"۔ (خیر الفتاویٰ ۴/ ۱۳۰)۔ جبکہ "احسن الفتاویٰ" میں ایک دن کی قضاء میں تفصیل کی گئی ہے کہ اگر رات میں اعتکاف فاسد ہوا تو دن اور رات دونوں کی قضاء کرے گا اور اگر دن کو اعتکاف فاسد ہوا تو صرف دن کی قضا کرے گا، رات کی نہیں۔

ملاحظہ ہو: "ایک دن کی قضاء میں رات دن دونوں کی واجب ہے یا صرف دن کی؟ اس سے متعلق صریح جزئیہ نظر سے نہیں گزرا، قواعد سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اعتکاف دن میں فاسد ہوا تو صرف دن کی قضاء واجب ہوگی، صبح صادق سے قبل شروع کرکے غروب آفتاب تک اعتکاف کرے اور اگر رات میں اعتکاف فاسد ہوا تو رات دن دونوں کی قضاء واجب ہوگی"۔ (احسن الفتاویٰ ۴/ ۵۱۱)

مہربانی فرما کر اس تعارض کو دور فرما کر مشکور وممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً اولاً بطور تمہید کے چند امور جاننا ضروری ہیں:

(۱) نفل اعتکاف کے لئے روزہ شرط ہے یا نہیں؟ فقہاء کرام کا آپس میں اختلاف ہے، اس اختلاف کا دارومدار نفل اعتکاف کے مقدار یا وقت

ہونے اور نہ ہونے پر ہے۔ جو حضرات مقدر بالوقت مانتے ہیں وہ روزے کو شرط قرار دیتے ہیں اور جو حضرات مقدر بالوقت کے قائل نہیں ان کے ہاں روزہ شرط نہیں اس اختلاف کے تناظر میں مسنون اعتکاف کیلئے روزہ شرط ہوگا کیونکہ وہ مقدر بالوقت ہے کیونکہ مسنون اعتکاف ''عشرۂ آخیرہ کا اعتکاف'' ہے۔

(۲)۔صرف رات کے اعتکاف کی نذر ماننا درست نہیں کیونکہ اعتکاف منذور کیلئے روزہ شرط ہے اور رات روزے کا محل نہیں البتہ دن کی بھی نیت کرلے تو رات کی نذر درست ہو جائے گی چونکہ اعتکاف مسنون کیلئے بھی روزہ شرط ہے لہٰذا اعتکاف مسنون میں رات کا اعتکاف دن کے اعتکاف کے تابع ہوگا۔ نیز اعتکاف مسنون اعتکاف منذور کی طرح شروع کرنے سے لازم ہوتا ہے۔

(۳)۔طرفین کے نزدیک اعتکاف مسنون میں ہر دن مستقل بنفسہٖ ہے نیز ہر رات آنے والے دن کے تابع ہے البتہ چند ایام اس سے مستثنیٰ ہیں۔

(۴)۔لزم النفل بالشروع کے تحت علامہ شامی رحمہ اللہ رقم طراز ہیں(۲/۳۱): وضابطها كل عبادة تلزم بالنذر ويتوقف ابتداؤها على ما بعده في الصحة. وقال ناقلاً عن شرح المنية (۲/۲۹): ودخل فيه الصلوة...... والاعتكاف على قولهما.

مسنون اعتکاف چونکہ رات سے شروع ہوتا ہے لہٰذا رات کا اعتکاف باعتبار صحت دن کے اعتکاف کے تابع ہوگا۔

(۵)۔قضاء بمثل اداء ہوتی ہے۔ مذکورہ بالا تمہیدات کی روشنی میں مسنون اعتکاف ٹوٹ جانے کی صورت میں ایک دن کی قضاء سے مراد دن رات کی قضاء ہے خواہ اعتکاف دن کو ٹوٹ جائے یا رات کو۔ رات کو ٹوٹ جانے کی صورت میں تو دونوں (دن رات) کی قضاء میں کوئی اشکال نہیں۔ البتہ دن کو ٹوٹ جانے کی صورت میں رات کی قضاء اس لئے لازم ہوگی کہ مسنون اعتکاف کیلئے چونکہ روزہ شرط ہے نیز مسنون اعتکاف رات سے شروع ہوتا ہے جبکہ رات روزے کا محل نہیں لہٰذا رات کا اعتکاف باعتبار صحت آنے والے دن کے اعتکاف کے تابع ہوگا۔ جب اصل (دن) کا اعتکاف ٹوٹ گیا تو تابع (رات) کا اعتکاف بھی کالعدم شمار ہوگا نیز مسنون اعتکاف چونکہ رات سے شروع ہوتا ہے لہٰذا طرفین کے نزدیک رات کا اعتکاف باعتبار صحت آنے والے دن کے اعتکاف پر موقوف ہوگا۔ جیسا کہ تمہید نمبر (۴) میں مذکور ہے۔ مزید براں یہ کہ مسنون اعتکاف رات سے شروع ہوتا ہے تو تمہید نمبر (۵) کے مطابق قضاء بمثل اداء ہوتی ہے لہٰذا قضاء بھی رات سے کی جائے گی۔

لمافي البدائع(۳/۳۰): واما اعتكاف التطوع: فهل يفسد بالخروج... وفي رواية الحسن بن زياد عن ابي حنيفة يفسد بناء على ان اعتكاف التطوع غير مقدر على رواية الاصل فله ان يعتكف ساعة من نهار. او نصف يوم، او ماشاء من قليل. او كثير ..... وعلى رواية الحسن: هو مقدر بيوم كالصوم ولهذا قال انه لا يصح بدون الصوم .... وجه رواية الحسن: ان الشروع في التطوع موجب للاتمام على اصل اصحابنا صيانةً للمؤدى عن البطلان كمافي صوم التطوع ومست الحاجة الى صيانة

المودی ههنا، لان القدر المؤدی انعقد قربة فیحتاج الی صیانته.

وفی البحر الرائق(۵۲۴/۲): لتصریحهم بان الصوم انما هو شرط فی المنذور (فی منحة الخالق تحته) قلت تصریحهم بذالک انما هو بالنسبة الی النفل یعنی انه لیس بشرط فی النفل لانه المحتاج الی البیان، أما المسنون فلا یکون الا بالصوم عادة فلا حاجة الی التنبیه علیه وامکان تصور عدم الصوم فیه لمرض نادر جدًا.

ومقتضاه ان التقدیر مستلزم لایجاب الصوم فیه ولا یخفی ان اعتکاف العشر الأخیر مقدر فیکون الصوم شرطا فیه.

وفی الدر المختار(۴۴۳/۲): (فلو شرع فی نفله ثم قطعه لا یلزمه قضاءه) لانه لا یشترط له الصوم ..... وفی الشامیة تحته (۴۴۵/۲): الحاصل ان الوجه یقتضی لزوم کل یوم شرع فیه عندهما بناءً علی لزوم صومه.

وفیه (۴۴۲/۲) ومقتضی ذلک ان الصوم شرط ایضاً فی الاعتکاف المسنون لانه مقدر بالعشر الأخیر حتی لو اعتکفه بلا صوم لمرض او سفر، ینبغی ان لا یصح عنه بل یکون نفلاً فلا تحصل به اقامة سنة الکفایة. فی الشامیة (۴۴۵/۲،۴۴۴) وعلی کل فیظهر من بحث ابن الهمام لزوم الاعتکاف المسنون بالشروع .. اما علی قول غیره فیقضی الیوم الذی افسده لاستقلال کل یوم بنفسه .... علی ان الشروع ملزم کالنذر وهو لو نذر العشر یلزمه کله متتابعاً.

وفیه ایضاً (۴۵۱/۲): والحاصل بقی المفرد فلو نذر اعتکاف یوم لزمه فقط نواه او لم ینو وان نوی اللیلة معه لزماه ولو نوی اعتکاف لیلة لم یصح مالم ینوبها الیوم..... قوله اعلم ان اللیالی تابعة للأیام ای کل لیلة تتبع الیوم الذی بعدها.

(۱۵۵) معتکف کیلئے مسجد میں خیمہ لگانے کا ثبوت

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ رمضان میں آخری عشرے کے اعتکاف میں ایک بات تمام مسجدوں میں دیکھنے میں آتی ہے کہ ہر معتکف چادروں کا ایک خیمہ یا ایک علیحدہ ممتاز جگہ اپنے لئے بنالیتا ہے، اور نمازوں اور اپنے تقاضے کے علاوہ اوقات اکثر وہیں گزارتا ہے، پوچھنا یہ تھا کہ آیا اس کا کوئی ثبوت بھی ہے؟ اور اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اور اس کے لگانے میں کیا حکمت ہے؟ براہ کرم آسان الفاظ میں جواب مرحمت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......رمضان المبارک کے آخری عشرے کے اعتکاف میں ہر معتکف جو چادروں کا ایک خیمہ یا ایک علیحدہ ممتاز جگہ

اپنے لئے بنالیتا ہے اس کا ثبوت ہے۔صحیح مسلم (۱/۳۷۱) میں روایت ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہ وہ فرماتی ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف کا ارادہ فرماتے تو فجر کی نماز پڑھ کر اپنے اعتکاف کی جگہ میں داخل ہوجاتے۔ جب انہوں نے رمضان المبارک کے آخری عشرے میں اعتکاف کا ارادہ فرمایا تو اپنے لئے ایک خیمہ بنانے کا حکم دیا جو بنایا گیا۔لہٰذا مسجد میں اعتکاف کیلئے خیمہ وغیرہ بنانا جائز ہے بدعت نہیں ہے البتہ اس میں اس بات کا خیال ضرور رکھا جائے کہ اتنی جگہ نہ گھیری جائے یا یہ پردے اس طور پر نہ لگائے جائیں کہ جس سے نمازیوں کو تکلیف ہو۔اور جہاں تک اس کی شرعی حیثیت کا تعلق ہے تو علماء نے اس کو مستحب لکھا ہے یعنی اگر کسی نے خیمہ نہیں لگایا تو اس کا اعتکاف بھی درست ہے۔اور اس کے لگانے میں حکمت یہ ہے کہ اعتکاف میں اصل مقصد یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو دنیا کے مشاغل سے فارغ کر کے اپنے نفس کو مکمل یکسوئی کے ساتھ اپنے مولیٰ کے حوالے کردے اور خیمہ وغیرہ لگانے میں یہ صورت بطریق احسن حاصل ہوسکتی ہے۔

لمافی شرح الکرمانی علی الصحیح البخاری (۱۶۷/جز ۹): وجواز اتخاذ المعتکف لنفسہ موضعا من المسجد ینفرد بہ مدة اعتکافہ مالم یضیق علی الناس وان العمل اذا لم یکن خالصا للّٰہ تعالیٰ لم یکن لہ قدر عند اللّٰہ.

وفی مرقاة المفاتیح(۵۲۹/۴): (صلی الفجر ثم دخل فی معتکفہ) بصیغة المفعول ای مکان اعتکافہ ...... وتاولوا الحدیث بانہ ﷺ دخل المعتکف وانقطع وتخلی بنفسہ فانہ کان فی المسجد یتخلی عن الناس فی موضع یستتر بہ عن اعین الناس کما ورد انہ اتخذ فی المسجد حجرة من حصیر.......

وفی البحر الرائق(۵۲۳/۲): ومحاسنہ کثیرة لان فیہ تفریغ القلب عن امور الدنیا وتسلیم النفس الی المولی والتحصن بحصن حصین وملازمة بیت رب کریم فھو کمن احتاج الی عظیم فلازمہ حتی قضی مآربہ فھو یلازم بیت ربہ لیغفرلہ کذا فی الکافی. وفی الاختیار: وھو من اشرف الاعمال اذا کان عن اخلاص.

(۱۵۶) خواتین کیلئے مسجد میں اعتکاف میں بیٹھنا کیا مکروہ تنزیہی ہے؟ اس بارے میں فقہاء کرام کا راجح قول کیا ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا عورت محلہ کی جامع مسجد میں اعتکاف کرسکتی ہے۔اس کے بارے میں کراہت تنزیہی کا قول جو نقل کیا جاتا ہے۔(۲) اس کی کیا حیثیت ہے؟ (۳) اور یہ کہ موجودہ دور میں اس قول پر عمل کرنا کیسا

ہے؟ (۴) غیر مقلدین حضرات اپنی مساجد میں باقاعدہ عورتوں کے اعتکاف کا الگ سے بندوبست کرتے ہیں۔ اگر یہ صرف خلاف افضل ہے تو پھر اس کی تردید کس حد تک کی جاسکتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ... عورتوں کے مسجد میں آنے کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں ... **لو ادرک رسول الله ﷺ ما احدث النساء لمنعهن المسجد كما منعت نساء بني اسرائيل اهـ (صحيح بخاري. ۱۲۰/۱)** (عورتوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو بدعت کرنا شروع کر دیا اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اگر اپنی زندگی میں دیکھ لیتے تو خود ہی ان کو مسجد میں آنے سے روک دیتے جیسا کہ بنی اسرائیل کی عورتوں کو روکا گیا)۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اس دور کی بات کر رہی ہیں، جو خیر القرون کا زمانہ تھا صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی کافی تعداد موجود تھی معاشرہ برائیوں سے پاک تھا اس وقت کے حالات حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی نظر میں اس قابل تھے کہ عورتوں کو مسجد میں آنے سے روک دیا جائے۔ موجودہ دور تو اس دور سے بہت مختلف ہے۔ اب تو ہر طرف بدامنی، فحاشی، عریانی پھیلی ہوئی ہے آج کل تو بدرجہ اولیٰ ان کو مسجد میں آنے کی اجازت نہیں دینی چاہئے نیز اگرچہ کتابوں میں عورتوں کے مسجد میں اعتکاف کے بارے میں کراہت تنزیہی کا قول منقول ہے لیکن علامہ طحطاوی علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ اعتکاف کے مسئلے کو بھی نماز کے مسئلے پر قیاس کیا جائے (جس طرح عورتوں کا نماز کیلئے مسجد میں آنا مکروہ تحریمی ہے اسی طرح اعتکاف کیلئے بھی مسجد میں آنا مکروہ تحریمی ہے) تاکہ عورتوں کا مسجد میں اعتکاف کے مسئلے میں کوئی تردد باقی نہ رہے۔ نیز صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے آثار سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے بھی عورتوں کو مسجد میں آنے سے منع فرمایا ہے، اس لئے علماء کرام نے عورتوں کے مسجد میں آنے کے بارے میں (خواہ نماز پڑھنے کیلئے ہو یا اعتکاف وغیرہ کیلئے ہو) ناجائز ہونے کا فتویٰ دیا ہے۔

لما في المسلم(۱۸۳/۱): عن عمرة بنت عبدالرحمن انها سمعت عائشة زوج النبي ﷺ تقول: لو ان رسول الله ﷺ راى ما احدث النساء لمنعهن المسجد كما منعت نساء بني اسرائيل قال: فقلت لعمرة النساء بني اسرائيل منعن المسجد قالت نعم اهـ.

وفي العمدة القاري(۱۴۸/۱۱): وقال: ابراهيم بن عبلة في قوله (آلبر ترون) دلالة على انه ليس لهن الاعتكاف في المسجد اذ مفهومه ليس ببرلهن وقال بعضهم وليس ما قاله بواضح قلت بلى هو واضح لانه اذا لم يكن برالهن يكون فعله غير براى غير الطاعة وارتكاب غير طاعة حرام ويلزم من ذالك عدم الجواز.

وفي الطحطاوي (۴۷۳/۱): قوله يكره في المسجد الا انه جائز بلا خلاف بين اصحابنا وظاهر مافي النهاية انها كراهة تنزيه وينبغي على قياس مامر من ان المختار منعهن من الخروج في الصلوات كلها ان لا يتردد في منعهن في الاعتكاف في المسجد.

وفيه ايضاً(۲۴۵/۱): وما في الدر المنتقى يوافق ماهنا حيث قال وفي الكافي وغيره اما في زماننا

فالمفتی به منع الکل فی الکل حتی فی الوعظ ونحوه (قوله لفساد الزمان ولذا قالت عائشةؓ للنساء حین شکون الیها من عمر لنهیه لهن عن الخروج الی المساجد لو علم النبی ﷺ ماعلم عمرؓ ما اذن.

(۱۵۷) عورت کا اعتکاف کیلئے پورا کمرہ مختص کرنا اور دورانِ اعتکاف کھانا پکانا

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری بڑی ہمشیرہ اس سال اعتکاف میں بیٹھنا چاہ رہی ہیں۔ انہوں نے معلوم کروایا ہے کہ میں جس کمرے میں نماز پڑھتی ہوں اس پورے کمرے کو اعتکاف کی جگہ کیلئے مختص کرسکتی ہوں؟ اور دوران اعتکاف اگر کھانا پکانا چاہوں تو آیا پکا سکتی ہوں؟ میرے گھر میں سوائے میرے دو بچوں کے اور کوئی نہیں ہوتا، شوہر ڈیوٹی پر ہوتے ہیں۔ برائے مہربانی جلد جواب دیجئے گا۔

الجواب حامداً ومصلیاً گھر میں جو جگہ نماز کیلئے مختص ہو، عورت اسی جگہ میں اعتکاف کیلئے بیٹھ سکتی ہے۔ اگر کوئی جگہ نماز کیلئے مختص نہ ہو تو پہلے ایک جگہ کو مختص کرنا ضروری ہے ورنہ اس کے بغیر اعتکاف میں، عورت کیلئے بیٹھنا جائز نہیں ہے۔ صورت مسئولہ میں اگر پورا کمرہ نماز کیلئے مختص ہے تو اس میں اعتکاف درست ہے اور اگر کمرہ نماز کیلئے مختص نہیں ہے تو پہلے پورے کمرے کو نماز کیلئے مختص کریں تب اس میں اعتکاف درست ہوگا۔ رہا دورانِ اعتکاف کھانا پکانے کا حکم تو گھر میں اگر اور کوئی نہ ہو جو کھانا پکا سکے تو ضرورت کی وجہ سے اپنے اعتکاف کی جگہ میں ہی کھانا پکا سکتی ہیں۔

لمافی الهندیة(۱/۲۱۱): والمرأة تعتکف فی مسجد بیتها اذا اعتکفت فی مسجد بیتها فتلک البقعة فی حقها کمسجد الجماعة فی حق الرجل لاتخرج منه الالحاجة الانسان کذا فی شرح المبسوط للامام السرخسی...... ولو لم یکن فی بیتها مسجد تجعل موضعا منه مسجدا فتعتکف فیه کذا فی الزاهدی. (وفی الصفحة ۲۱۲) ولو شرط وقت النذر والالتزام ان یخرج الی عیادة المریض وصلوة الجنازة وحضور مجلس العلم یجوز له ذلک کذا فی التارخانیة ناقلا عن الحجة. هذا کله فی الاعتکاف الواجب اما فی النفل فلا بأس بان یخرج بعذر وغیره فی ظاهر الروایة وفی التحفة لابأس فیه بان یعود المریض ویشهد الجنازة کذا فی شرح النقایة للشیخ ابی المکارم.

وفی الدرالمختار(۲/۴۴۱): (او) لبث (امرأة فی مسجد بیتها) ویکره فی المسجد، ولا یصح فی غیر موضع صلاتها من بیتها کما اذا لم یکن فیه مسجد ولا تخرج من بیتها اذا اعتکفت فیه،

وفی الشامیة تحته: (قوله فی مسجد بیتها) وهو المعد لصلاتها الذی یندب لها ولکل احد اتخاذه کمافی البزازیة نهر ...... (قوله کما اذا لم یکن فیه مسجد) ای مسجد بیت وینبغی انه لواعدته للصلاة عند ارادة الاعتکاف ان یصح.

وفیہ ایضاً(۲/۴۴۴): (وحرم علیہ) ای علی المعتکف اعتکافا واجبا اما النفل فلہ الخروج لانہ منہ لہ لا مبطل کما مر (الخروج الالحاجۃ الانسان) طبیعیۃ کبول وغائط وغسل لواحتلم ولا یمکنہ الاغتسال فی المسجد کذا فی النہر.

وفی الشامیۃ تحتہ: (قولہ وحرم الخ) لانہ ابطال للعبادۃ وھو حرام لقولہ تعالیٰ، ولا تبطلوا اعمالکم. بدائع (قولہ اما النفل) ای الشامل للسنۃ المؤکدۃ ح.

وفیہ ایضاً(۲/۴۴۸): وفی التاتر خانیۃ عن الحجۃ لوشرط وقت النذر ان یخرج لعیادۃ مریض وصلوۃ جنازۃ وحضور مجلس علم جاز ذلک فلیحفظ.

وفی الشامیۃ تحتہ: (قولہ جاز ذلک) قلت: یشیر الیہ قولہ فی الھدایۃ وغیرھا عند قولہ ولا یخرج الالحاجۃ الانسان لانہ معلوم وقوعھا فلا بدمن الخروج فیصیر مستثنی اھ والحاصل ان ما یغلب وقوعہ یصیر مستثنی حکما وان لم یشترطہ وما لا فلا الا اذا شرطہ.

(۱۵۸) حالت اعتکاف میں عورت کیلئے سحری پکانے کا حکم

سوال محترم ومکرم جناب حضرت مفتی صاحب از راہ شفقت بزرگانہ میرے درج ذیل سوالوں کا جواب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں۔

۱۔کیا معتکف عورت گھر والوں کیلئے سحری پکا سکتی ہے جبکہ کوئی دوسرا موجود نہ ہو، اگر نہیں تو پھر عورت اعتکاف کیسے کرے؟

۲۔کیا معتکف عورت اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ سحر وافطار کر سکتی ہے یا نہیں؟

۳۔اہل خانہ کیساتھ بات چیت کتنی اور کس وقت کی جائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ کے سمجھنے سے پہلے یہ سمجھ لیں کہ عورت کے اعتکاف کا طریقہ یہ ہے کہ گھر میں جس جگہ نماز پڑھتی ہو اس جگہ یا کسی اور جگہ کو اعتکاف کیلئے مخصوص کر لے۔سوائے ضروری حاجات (پیشاب، پاخانہ، غسل جنابت) کے علاوہ اپنی جگہ سے باہر نہ نکلے جب حاجت کیلئے نکلے تو حاجت پوری کرنیکے بعد فوراً اپنی جگہ واپس آجائے۔

دوران اعتکاف قرآن مجید کی تلاوت، ذکر وتسبیحات ونوافل وغیرہ جیسے مشاغل میں مصروف رہے بلاضرورت بات چیت سے احتراز کرے۔کھانا، پینا، سونا اعتکاف کی جگہ ہی میں کرے۔ضروری حاجات کے علاوہ نکلنے سے اعتکاف فاسد ہو جاتا ہے، اسی طرح عورت کے ایام ماہواری شروع ہونے سے اعتکاف ختم ہو جاتا ہے۔

پس صورت مسئولہ میں آپ اپنے گھر والوں کیلئے اپنے اعتکاف کی جگہ سے نکل کر سحری وغیرہ نہیں پکا سکتیں، اور نہ ہی باہر نکل کر گھر والوں کے ساتھ سحری وافطاری کر سکتیں ہیں۔بات چیت ہر وقت کی جا سکتی ہے مگر بلاضرورت تفصیلی بات چیت سے احتراز کرتے ہوئے اہم گفتگو کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

لمافی الهندية(۲۱۱/۱):والمرأة تعتكف في مسجد بيتها اذا اعتكفت في مسجد بيتها. فتلك البقعة فی حقها كمسجد الجماعة في حق الرجال. لاتخرج منه الالحاجة الانسان كذافی شرح المبسوط... لهاان تعتكف في غير موضع صلاتهامن بيتهااذااعتكفت فيه كذافی التبيين ... منها الصوم وهوشرط الواجب منه..... (ص۲۱۲) ويلازم التلاوة والحديث والعلم وتدريسه وسير النبی ﷺ والانبياء عليهم السلام و اخبار الصالحين.....ولابأس ان يتحدث بمالااثم فيه كذافی شرح الطحاوی.

(۱۵۹) نظرِشہوت سے انزال کی صورت میں اعتکاف کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اس رمضان میں، میں اپنے تین دوستوں کے ساتھ مل کر اعتکاف میں بیٹھا تھا، وقت اچھا گزر رہا تھا، اعمال میں بھی جڑتا تھا میرے ایک دوست کے پاس کیمرے والا موبائل تھا، اس میں بعض شہوت انگیز تصاویر بھی تھیں۔ ایک دن مجھ پر شیطانی حالت طاری ہوگئی اور میں اس سے موبائل لے کر تنہائی میں ان تصاویر کو دیکھنے لگا۔ اوران تصاویر کو دیکھنے سے مجھے انزال ہوگیا، بعد میں اور ابھی بھی مجھے بہت افسوس ہے خوب توبہ واستغفار بھی کرلیا۔ اب مجھے آپ اتنا بتا دیں کہ اس طرح کرنے سے میرے اعتکاف پر تو کوئی اثر نہیں پڑا؟ مجھے اس اعتکاف کی قضاء تو نہیں کرنا پڑے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً......حالت اعتکاف میں اس طرح کے فعل کا ارتکاب حرام اور سخت گناہ ہے البتہ یہ فعل مفسد اعتکاف نہیں ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں اعتکاف کی قضاء نہیں کرنا پڑے گی۔

لمافی سنن أبي داؤد(۳۳۵/۱): عن عائشة رضي الله عنها انها قالت: السنة على المعتكف ان لا يعود مريضا ولا يشهد جنازة ولا يمس امرأة ولا يباشرها ولا يخرج لحاجة الالمالابدمنه ولااعتكاف الابصوم ولا اعتكاف الافي مسجد جامع.

وفي الدر المختار(۴۵۰/۲): ولا يبطل بانزال بفكر اونظر.

وفي الفقه الاسلامي(۱۷۷۷/۳): امالو أمنى بالتفكير او بالنظر او باشر ولم ينزل، فلا يفسد اعتكافه عند الجمهور لانها مباشرة لاتفسد صوما ولا حجا فلم تفسد الاعتكاف كالمباشرة لغير شهوة.

(۱۶۰) دولڑنے والوں کو چھڑوانے کیلئے بھول کر معتکف کا مسجد سے باہر نکلنا

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص اعتکاف میں تھا ایک دن باہر لڑائی شروع ہوگئی اس نے جب دیکھا تو اس کو اعتکاف یاد نہیں رہا جلدی سے مسجد سے باہر ان کو چھڑوانے کیلئے پہنچ گیا تو اس شخص کے اعتکاف کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً　صورتِ مسئولہ میں اس شخص کا اعتکاف فاسد ہوگیا اور اس کا یہ اعتکاف اعتکافِ نفلی ہوجائے گا اور اس پر لازم ہے کہ اس ایک دن کی روزے کے ساتھ قضا کرلے۔

لمافی خلاصة الفتاوى(۱/۲۶۷): ولا يخرج المعتكف الالحاجة لازمة شرعية كالجمعة او لحاجه طبيعية كالبول والغائط　ولو خرج المعتكف من المسجد بغير عذر ساعة بطل اعتكافه وعندهما لا يبطل حتى يكون اكثر من نصف يوم وأيضاً (ص۲۶۸)ولو خرج بعذر فعلى هذا الخلاف ومن الاعذار المرض الا انه لاياثم اذا كان الخروج بعذر ومن الاعذار انهدام المسجد او اخرجه سلطان كرهاً او اخرجه الغريم　فسداعتكافه في قول ابي حنيفة قال الامام السرخسي وقولهما ايسر على المسلمين　ولو خرج المعتكف بغير عذر ناسياً فسد اعتكافه اذا كان ساعة او نصف يوم عندهما.

وفي الدر المختار(۲/۴۴۷): (فلو خرج) ولو ناسياً (ساعة) زمانية لارملية كمامر(بلا عذر فسد) (و)ان خرج (بعذر يغلب وقوعه) وهو ما مرّ لاغير (لا)يفسد واما ما لا يغلب كانجاء غريق وانهدام مسجد فمسقط للاثم لا للبطلان والالكان النسيان اولیٰ بعدم الفساد كما حققه الكمال.

وفي الشامية تحته:(قوله وهو مامر) اى من الحاجه الطبيعية والشرعية

وفي الدرالمختار(۲/۴۴۳):(وحرم عليه) اى على المعتكف اعتكافاً واجباً اما النفل فله الخروج

وفي الشامية تحته: (قوله وحرم الخ) لأنه ابطال للعبادة وهو حرام لقوله تعالى: ولا تبطلوا أعمالكم.

بدائع (قوله واما النفل) اى الشامل للسنة المؤكدة ح قلت قدمنا ما يفيد اشتراط الصوم فيها بناء على انها مقدّرة بالعشرا لاخير ومفاد التقدير ايضا اللزوم بالشروع تامل ثم رأيت المحقق ابن الهمام قال: ومقتضى النظر لو شرع في المسنون اعنى العشر الاوا خر بنيته ثم افسده ان يجب قضاؤه تخريجاً على قول ابى يوسف في الشروع في نفل الصلاة تناويا اربعا لاعلى قولهما اهـ اى يلزمه قضاء العشر كله لو افسد بعضه كما يلزمه قضاء اربع لوشرع في نفل ثم افسد الشفع الاوّل عند ابى يوسف، لكن صحح في الخلاصة انه لا يقضى لاركعتين كقولهما...... فيظهر من بحث ابن الهمام لزوم الاعتكاف المسنون بالشروع وان لزوم قضاء جميعه او باقيه مخرج على قول ابى يوسف اما على قول غيره فيقضى اليوم الذى افسده لاستقلال كل يوم بنفسه.

(۱۶۱) اعتکاف والی عورت اگر حائضہ ہوجائے تو کیا کرے؟

سوال　کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت کو ماہِ رمضان اخیر عشرہ میں دورانِ اعتکاف

حیض آنے لگے تو اسکا کیا حکم ہے؟ آیا اس کا اعتکاف باقی ہے؟ اگر اعتکاف باقی نہیں رہا تو اس کی قضا کی کیا صورت ہوگی؟ بعد رمضان میں یا آئندہ آنے والے ماہ رمضان میں؟ قرآن وسنت کی روشنی میں واضح حل بتائیں۔

الجواب حامداًومصلیاً..... حیض کے آنے کی وجہ سے اعتکاف فاسد ہوجاتا ہے اور اس کی قضاء لازم ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں کہ ''عورت کو ماہِ رمضان کے اخیر عشرہ میں دوران اعتکاف حیض آنے لگے'' اس وجہ سے اس عورت کا اعتکاف فاسد ہوجائے گا اور اعتکاف سے باہر آجائے بعد میں صرف ایک دن کے اعتکاف کی قضاء کرنا لازم ہوگی اور قضاء اس وقت کرے گی جب وہ ماہواری سے پاک ہوجائے (بشرطیکہ اس دن روزہ رکھنا مکروہ نہ ہو) اور قضاء کرتے وقت روزہ رکھنا بھی لازم ہے۔

لمافی بدائع الصنائع (۳/۳۲): ولو حاضت المرأة فی حال الاعتکاف فسد اعتکافها، لان الحیض ینافی اهلیة الاعتکاف لمنافاتها الصوم ولهذامنعت من انعقاد الاعتکاف فتمنع من البقاء.

وفی الشامیة (۲/۴۴۴): وعلی کل فیظهر من بحث ابن الهمام لزوم الاعتکاف المسنون بالشروع ..... اما قول غیره فیقضی الیوم الذی افسده لاستقلال کل یوم بنفسه الخ.

کتاب الحج

(حج وعمرہ کے مسائل کا بیان)

﴿فصل فی فرضية الحج وشرائطه وأركانه﴾

(حج کی فرضیت، شرائط اور ارکان سے متعلق مسائل کا بیان)

(۱) حج کب فرض ہوگا؟

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک غریب انسان ہوں، تین بچیاں ہیں۔ ایک شادی کے لائق ہے۔ میرے پاس ایک عدد ٹریکٹر اور اس کے جملہ اوزار ہیں تو کیا مجھ پر حج فرض ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ..... صورت مسئولہ میں آپ پر حج فرض نہیں۔ البتہ مذکورہ مال کے علاوہ سفر حج کا متوسط خرچہ اور مدت سفر میں اہل و عیال کے اخراجات کے مثل مال ہو تو پھر حج لازم ہو جائے گا۔

لمافي الهندية(۱/۲۱۷): وتفسير ملك الزاد والراحلة ان يكون له مال فاضل عن حاجته وهو ما سوى مسكنه و لبسه وخدمه وأثاث بيته قدرما يبلغه الى مكة ذاهبا وجائياً.

وفي الشامية(۱/۴۵۹):(قوله ذى زاد وراحلة) إفاد أنه لايجب إلا بملك الزاد وملك أجرة الراحلة،فلا يجب بالاباحة أو العارية.

(۲) استطاعت حج کی تعریف

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حج کی فرضیت کیلئے آدمی کے پاس کتنی رقم ہونی چاہئے؟ نیز اگر رقم نقد موجود نہ ہو بلکہ جائیداد یا سامان تجارت یا کسی پر قرض کی صورت میں ہو تو کیا اسپر بھی حج فرض ہو جاتا ہے؟ جبکہ حج کے داخلہ کے بالکل آخری مراحل میں ہو یعنی اتنا وقت نہ ہو کہ اسمیں جائیداد یا سامان بیچ کر داخلہ کر سکے اس صورت میں کیا کرنا چاہئے؟

الجواب حامداً ومصلیاً اگر کسی شخص کے پاس اسکی حاجات اصلیہ، اسکے اہل وعیال کے نفقہ اور اگر وہ مقروض ہو تو ادائیگی قرض کے علاوہ اتنی رقم ہو جو حج کے تمام اخراجات کیلئے کافی ہو یا نقد رقم تو نہ ہو لیکن اسکی ضروریات سے زائد اتنی جائیداد یا مال تجارت ہو جسکو فروخت کر کے حج کے اخراجات کے بقدر رقم حاصل ہو جائے تو دونوں صورتوں میں وہ شخص صاحب استطاعت ہے اور اسپر حج فرض ہے۔ اور مذکورہ استطاعت کا حاصل ہونا اس وقت ضروری ہے جب اسکے شہر کے لوگ حج پر جانے کی تیاری کر رہے ہوں جسکی صورت آجکل یہ ہے کہ حج کیلئے جس وقت درخواستیں وصول کی جاتی ہیں اگر اس وقت کوئی شخص صاحب استطاعت ہوگا تو اس پر حج فرض ہو جائیگا اور

اگر اس وقت وہ شخص صاحب استطاعت نہیں لیکن بعد میں اشہرِ حج کے دوران ہی وہ شخص صاحب استطاعت ہوگیا تو اس پر بھی حج فرض ہوجائیگا اگر اس سال وہ حج نہ کرسکا تو آئندہ سال اس پر حج کرنا فرض ہوگا۔

لمافي الخانية علی هامش الهندية(۱/۲۸۲):ومن شرائط الاستطاعة وهي ان يملک مالافاضلا عن مسکنه وفرشه وثياب بدنه وفرسه وسلاحه ونفقة عياله واولاده الصغارمدة ذهابه وايابه وان يکفي ذلک الفاضل للزادوالراحلة وقال بعض العلماء:ان کان الرجل تاجرايعيش بالتجارة فملک مالامقدار مالودفع منه الزاد والراحلة لذهابه وايابه ونفقة عياله واولاده من وقت رجوعه يبقی له بعدرجوعه رأس مال التجارة التي کان يتجر بهاکان عليه الحج والافلا.

(۳) حج کیلئے استطاعت کی تفصیل

سوال ...کیافرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں حج کے سلسلے میں ایک کتاب کا مطالعہ کررہا تھا، اس میں وجوب حج کیلئے استطاعت کا ہونا لازم قرار دیا گیا ہے۔اوراستطاعت سے مراد یہ لکھا ہے کہ ''جب قافلے نکلنے لگیں'' لیکن آجکل تو قافلے نہیں ہوتے تو پھراستطاعت سے مرادموجودہ زمانے میں کیا ہوگا؟

الجواب حامداًومصلیاً ...جب کسی آدمی کے پاس حج کا خرچ ،اورمدت حج میں اہل عیال کا خرچ ہو،اوردیگر شرائط بھی پائی جائیں تونفس وجوب ہوجاتا ہے،البتہ وجوب اداءاَشہرِحج میں ہوگا،چونکہ اشہرِحج سے پہلے عرف عام کے مطابق حج کی تیاری لازم ہے،قدیم زمانہ میں چونکہ قافلوں کے نکلنے کے وقت سے تیاری لازم تھی،توفقہاء نے اس کا حکم فرمایا،اب چونکہ قافلوں کے نکلنے سے پہلے قانونی دشواریاں بھی ہوتی ہیں لہٰذا جس وقت سے اس زمانہ میں لوگ عرف عام کے مطابق حج کی تیاری کریں گے اسی وقت سے ہرمستطیع پرتیاری واجب ہوگی اوروہ درخواستوں کے جمع کرانے کا وقت ہے،پس اب عرف میں یہی حج کی تیاری کا وقت ہے تو اسی کا اعتبار ہوگا،یہی وجہ ہے جو بروقت درخواست جمع نہ کرائے تووہ اس سال حج پرنہیں جاسکتا۔

لمافي الشامية(۲/۴۵۸): الاول. شروط الوجوب وهي التي اذا وجدت بتمامها وجب الحج و الا فلا وهي سبعة: الاسلام، والعلم بالوجوب لمن في دارالحرب والبلوغ والعقل والحرية والاستطاعة والوقت اي القدرة في أشهر الحج أو وقت خروج اهل بلده علی مايأتي.

وفي الدرالمختار(۲/۴۶۵): والعبرة لوجوبها اي العدة المانعة من سفرها وقت خروج أهل بلدها وکذا سائر الشروط، بحر، وفي الشامية اي يعتبر وجودها في ذلک الوقت. ذکر صاحب اللباب في منسکه الکبير ان من الشرائط إمکان السير وهو ان يبقی وقت يمکنه الذهاب فيه الی الحج علی السير المعتاد فان احتاج الی ان يقطع کل يوم أو في بعض الايام أکثر من مرحلة لايجب الحج،

وذكر شارح اللباب أن منها ما يتمكن من اداء المكتوبات في اوقاتها.

(۴) ایام حج میں استطاعت رکھنے والے پر حج کا حکم

سوال .. کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے پاس شوال المکرّم کے آخر میں ۲لاکھ روپے آئے اورمحرم کے شروع میں ختم ہوگئے تو کیا میرے اوپر حج فرض ہے اور نہ کرنے کی صورت میں گنا ہگار ہوں گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اگر کسی کے پاس حج کے مہینوں ''شوال، ذوالقعدہ، ذوالحجہ'' میں اتنی رقم آ جائے جس سے حج کرسکتا ہو، اور کوئی مانع سفر عذر بھی نہ ہوتو اس پر حج فرض ہوجاتا ہے۔اور اس کو وہ رقم دوسری جگہ خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔اور حج میں جانا ضروری ہے، اگر کوئی باجود حج فرض ہونے کے نہ جائے تو گنا ہگار ہوگا۔لہٰذا صورت مسئولہ میں جس وقت حکومت کی طرف سے حج کے فارم جمع ہوتے ہیں اور قرعہ اندازی ہوتی ہے اگر اس وقت یہ رقم ملی ہوتب تو حج فرض ہوگا اور اگر اس کے بعد ملی ہوتو حج فرض نہیں ہوگا۔

لمافي الهندية(۲۱۶/۱): وهو فرض على الفور وهو الاصح فلا يباح له التاخير بعد الامكان الى العام الثاني: فاذا اخره وادّى بعد ذلك وقع اداء

وفي الشامية(۴۵۵/۲): ان وجوبه على الفور للاحتياط فان في تاخيره تعريضا للفوات.

وفي الشامية(۴۵۸/۲): شروط الوجوب وهي التي اذا وجدت بتمامها وجب الحج والا فلا وهي سبعة: الإسلام والعلم بالوجوب لمن في دار الحرب والبلوغ والعقل والحرية والاستطاعة والوقت اى القدرة في اشهر الحج اوفي وقت خروج اهل بلده.

(۵) فرضیت حج درخواست داخلہ کے وقت ہوجاتا ہے یا اشہر حج سے؟

سوال ...کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل حج کی درخواست داخلہ کے وقت فرضیتِ حج کا فتویٰ دیا جارہا ہے یعنی داخلے کا وقت ہوتے ہی فرضیتِ حج ہوجاتا ہے دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیں کہ آج کل فرضیتِ حج درخواست داخلہ کے وقت ہوجاتا ہے نہ کہ اشہر حج سے۔اور ہمارے خیال میں داخلے کے وقت کی حیثیت فقط اتنی ہے کہ اس میں حصول راحلہ ہوسکتا ہے اور صاحب استطاعت کیلئے اس وقت میں حصول راحلہ کیلئے کوشش کرنا شرط ہے اور داخلے کے وقت میں فرضیت حج ماننے سے کیا یہ اشکالات جوذیل میں درج کیے جارہے ہیں درست ہیں یا نہیں۔براے مہربانی تمام اشکالات کا مکمل ومدلل جواب عنایت فرمائیں۔اور اگر یہ اشکالات صحیح نہیں ہیں تو ان کی عدم صحت کو مدلل بیان فرمائیں۔اور حج کی فرضیت کی شرائط اور اداء کی شرائط کے اعتبار سے بات مدلل اور واضح فرمائیں۔ہم اہل مدرسہ کافی عرصہ سے اس مسئلہ کے بارے میں پریشان ہیں۔خلاصہ کلام آپ جو بھی فتویٰ دیں اس کو مدلل اور واضح ضرور فرمائیں تاکہ خلجان وپریشانی دور ہو،اور آپ عنداللہ ماجور ہوں۔

(نوٹ): ...... داخلے کا وقت اشہر حج سے ڈیڑھ دو ماہ قبل ہوتا ہے۔

(۱)۔ اشہر حج سے پہلے فرضیت حج کا قائل ہونا۔ کیا یہ اصول فقہ کے قاعدے کے خلاف تو نہیں جس میں حج کو عبادت مؤقتہ مان کر روزے اور نماز کے مشابہ مانا ہے۔ کیا عبادت مؤقتہ وقت سے پہلے فرض ہو سکتی ہے یا نہیں؟

(۲)۔ نور الایضاح میں حج کی فرضیت کی آٹھ شرائط میں ایک وقت بھی ذکر کیا ہے اور نص قرآنی نے اشہر حج کو حج کا وقت بتایا ہے۔

(۳)۔ کیا پرانے زمانے پر جس میں آلات واسباب سفر آج کی طرح نہیں تھے۔ آج کے زمانے کو قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے یا نہیں؟

(۴)۔ پہلے زمانے میں جو بُعد مسافت کی علت تھی کیا آج بھی وہی علت معتبر ہے؟

(۵)۔ پرانے زمانے میں بُعد مسافت کی جو یہ علت تھی کہ اگر اشہر حج سے پہلے ادائیگی حج کیلئے روانہ نہ ہوتے تو حج فوت ہو جاتا کیا اشہر حج سے پہلے چلنے کو مقیس علیہ بنانا اور آج کے درخواست داخلہ کے وقت کو اس پر قیاس کرنا صحیح ہے؟ کیا دونوں کی علتوں میں فرق نہیں ہے؟ اس کو واضح فرمائیں۔

(۶)۔ داخلے کے وقت فرضیت حج کے قائل ہونے سے یہ بات لازم آجائے گی مثلاً کوئی آدمی ہے جو صاحب استطاعت ہے حج پر جا سکتا ہے مگر لاپرواہی یا کوتاہی سے درخواست حج نہ دے سکا یا داخلے کے وقت مالدار تھا اشہر حج سے پہلے فقیر ہو گیا یعنی دونوں صورتوں میں فقیر ہو گیا یا اس نے درخواست حج بھی دی مگر نامنظور ہوئی اور اس نے بینک سے پیسے نکلوا لئے پھر اشہر حج سے پہلے پہلے فقیر ہو گیا اور ساری زندگی فقیر رہا۔ لہٰذا مذکورہ تینوں صورتوں میں وجوب حج لازم آ رہا ہے اور عبادتِ مؤقت کی فرضیت غیر مؤقت میں لازم آ رہی ہے جو باطل ہے۔

(۷)۔ داخلے کے وقت وجوب حج ماننا کیا آیت ذیل کے مقتضیٰ کے خلاف تو نہیں؟ **يَسْـئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ** (البقرہ، پارہ: ۲) اور روح المعانی میں اس آیت کی تفسیر یوں ذکر کی ہے:

قل هي مواقيت للناس والحج، مطابقا لما فيه للحكمة الظاهرة اللائقة بشان التبليغ العام المذكرة لنعمة الله تعالى ومزيد رافته سبحانه وهي ان يكون معالم للناس يؤقتون بها امورهم الدنيوية ويعلمون اوقات زروعهم ومتاجرهم. ومعالم للعبادات الموقتة يعرف بها اوقاتها كالصيام والافطار وخصوصا الحج فان الوقت مراعى فيه اداء وقضاء (الجز الثاني، صـ۷۰۱).

(۸)۔ بُعد مسافت کی وجہ سے اشہر حج سے پہلے روانگی پر آج کل کے داخلے کے وقت کو قیاس کرنے میں چند وجوہ سے فرق ہے۔ عذر اور سبب دونوں اعتبار سے فرق ہے اشہر حج سے پہلے روانگی پرانے زمانے میں عملی شکل میں تھی اور آج کل عملی روانگی پوری دنیا کے حجاج کی اشہر حج ہی میں ہوتی ہے اور پرانے زمانے میں اشہر حج سے پہلے عملی روانگی ہوتی تھی اور آج کل اشہر حج سے پہلے فقط ایک درخواست عملی شکل میں حصول راحلہ کیلئے دی جاتی ہے۔ اور پرانے زمانے کا عذر اُس زمانے کے اعتبار سے دائمی اور قدرتی تھا اور اس زمانے کا عذر وقتی اور من جانب مخلوق ہے۔ پرانی علت بعد سفر ہے جبکہ آج کی علت بعد سفر نہیں ہے بلکہ حکومت کی غلط پالیسیاں ہیں۔

پرانے زمانے کی روانگی قبل از اشہرِ حج فریضۂ حج کی ادائیگی کیلئے سبب تام تھا اور آج کی درخواست اشہرِ حج سے پہلے سبب ناقص ہے کیونکہ بعض حضرات کی درخواستیں دو تین سال تک نامنظور ہوتی رہتی ہیں پھر بعضے فقیر ہو جاتے ہیں اور بعضے فوت ہو جاتے ہیں اور بعضے بیمار۔ یہ تین چیزیں اس وقت بھی تھیں مگر اس زمانے میں تاخیر ادائیگی فریضہ کیلئے رکاوٹ بن جاتی ہے۔لہٰذا اس وجہ سے پرانے زمانے میں قبل از اشہرِ حج کی روانگی میں فرضیت معتبر تھی اور آج کی فرضیت محلِ نظر ہے۔

بہرحال آپ اگر اس زمانے میں بھی فرضیت کے قائل ہیں تو شرعی دلیل سے اپنے موقف کو ضرور مبین اور مبرہن فرمائیں خاص کر مقیس علیہ اور قیاس کو۔ تاکہ ہمارا اضطراب اور پریشانی دور ہو، اور آپ عنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً ...... حج کے مذکورہ مسائل کو سمجھنے سے پہلے چند اہم باتوں کو ذہن نشین کرنا ضروری ہے۔

(۱)۔سب سے اہم اس بات کو سمجھنا کہ حج کا سبب کیا چیز ہے؟ حج کا سبب بیت اللہ ہے۔

لمافی الشامية(۴۵۵/۲): لان سببه البيت بدليل الاضافة فى قوله تعالى ولله على الناس حج البيت من استطاع ...... فان الاصل اضافة الاحكام الى اسبابها كما تقرر فى الاصول ولا يتكرر الواجب اذا لم يتكرر سببه

(۲)۔حج کے وجوب کیلئے دو قسم کی شرائط ہیں۔

شرائط اداء ...... یہ شرائط جب شرائط وجوب کے ساتھ متحقق ہو جائیں تو بنفسہٖ حج ادا کرنا لازم ہے اور اگر ان شرائط اداء میں سے کوئی شرط نہ پائی جائے تو حج بدل کرانا یا حج کی وصیت کرنا لازم ہے۔ شرائط ادا تین ہیں: احرام، مکان، زمان۔

شرائط وجوب ...... یہ شرائط جب پورے طور پر ثابت ہو جائیں تو حج فرض ہو جائے گا ان شرائط وجوب میں سے ایک شرط وجوب وقت بھی ہے۔وقت تو اشہرِ حج ہی ہے البتہ جو لوگ دور دراز ممالک میں رہتے ہیں ان کے لئے قافلوں کے نکلنے کا وقت ہے اور آج کل درخواستوں کے جمع ہونے کا وقت ہے کیونکہ وجوب اور ادائیگی دونوں ایک وقت میں ہوں یہ ذرا مشکل بات ہے خاص کر ان لوگوں کیلئے جو دور دراز ممالک میں رہنے والے ہیں کیونکہ ان کو تو قافلوں کے نکلنے کے وقت نکلنا ہوگا ہاں جو قریب ہے وہ تو ایک ہفتہ پہلے بھی حج کیلئے جا سکتا ہے اور حج ادا کر سکتا ہے۔

لمافی فتاوىٰ التاتارخانية (۴۲۹/۲): اما شرطه فنوعان. شرائط الاداء وشرائط الوجوب شرائط الاداء ثلاثة الاحرام. والمكان هو البقعة المعظمة والزمان وهوا شهر الحج فلا يجوز شئ من افعالها...... قبل اشهر الحج.

وشرائط وجوبه خمس. الاستطاعة...... قال ابو حنيفةؒ فى ظاهر الرواية تفسيرها سلامة البدن.

وفى الشامية(۴۵۸/۲): شروط الاداء: وهى التى ان وجدت بتمامها مع شروط الوجوب وجب اداءه بنفسه وان فقد بعضها مع تحقق شروط الوجوب فلا يجب الاداء بل عليه الاحجاج او

الایصاء عند الموت......

شروط الوجوب: وهي التي اذا وجدت بتمامها وجب الحج والا فلا...... الوقت ای القدرة فی اشهر الحج اوفي وقت خروج اهل بلده.

وفي القرآن الكريم(ال عمران:۹۷):ولله على الناس حج البيت من استطاع اليه سبيلا.

وفي اعلاء السنن(۱۰/۷): قيل : يا رسول الله ما السبيل: قال: الزاد والراحلة.

وفي روح المعاني(۱/۸۴): الحج اشهر معلومات: ای وقته ذلک وبه يصح الحمل المراد بوقته وقت مناسكه واعماله من غير كراهة.

(۱)۔ اشہر حج سے پہلے حج کی فرضیت کا قائل ہونا اصول فقہ کے قاعدے کے خلاف نہیں ہے کیونکہ اصول فقہ میں اشہر حج کو شرط ادا قرار دیا ہے کہ ارکان حج کی ادائیگی اس سے پہلے نہیں ہو سکتی شرط وجوب قرار نہیں دیا اور اسی حیثیت سے حج کو نماز اور روزے کے مشابہ قرار دیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ وقت نماز اور روزے کی ادائیگی کیلئے سبب بھی ہے اور شرط بھی اس لئے نماز اور روزے کی فرضیت وقت سے پہلے نہیں ہو سکتی کیونکہ مسبب کی تقدیم سبب پر جائز نہیں۔ بخلاف حج کے کہ وقت حج کی ادائیگی کیلئے شرط اداء ہے سبب نہیں ہے جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا ہے کیونکہ حج کا سبب تو بیت اللہ ہے لہٰذا حج کی فرضیت وقت سے پہلے ہو سکتی ہے۔

وفي نور الانوار(ص۵۳): اما ان يكون الوقت ظرفاً للمؤدى وشرطا للاداء وسبباً للوجوب كوقت الصلوة وتقديم المسبب على السبب لا يجوزاصلاً...... او يكون معياراً له وسببا لوجوبه كشهر رمضان ولا فرق بينه وبين القسم الاول الا بكون الاوّل ظرفاً وهذا معيارٌ.

وفي اعلاء السنن(۱۰/۳۲۲): وقول الله تعالىٰ، الحج اشهر معلومات لا يقتضي الاكون الحج وأركانه موقتة بهن دون شرائطه.

وفي الحسامي(ص۳۴،۱۱۶،۱۱۷): الموقت بوقت مشكل تو سعه وهو الحج ...... ووقته اشهر الحج قال في مابين السطور ای وقت ادائه.

ان اصول الدين وفروعه مشروعة باسباب جعلها الشرع اسبابا لها كالحج بالبيت والصوم بالشهر والصلوة باوقاتها.

كالحج بالبيت متعلق وجوبه بالبيت لان سبب وجوب الحج البيت لانه يضاف الى البيت في الشرع قال الله تعالىٰ، ولله على الناس حج البيت: والاضافة دليل السببية كما ستعرف: واما الوقت فشرط لجواز الاداء وليس بسبب لانه لا يضاف اليه.

والصوم متعلق وجوبه الشهر فهو سببه لانه يضاف اليه ويتكرر بتكرره ويصح الاداء بعد دخول

الشهر لاقبله.

والصلوة متعلق وجوبها باوقاتها فيكون اوقات الصلوة سبباً لوجوبها لان الصلوة تضاف اليها ويتكرر بتكررها ولا تصح قبلها وتصح بدخولها.

(۲)۔ نورالایضاح میں حج کی فرضیت کی شرائط میں جو وقت کو ذکر کیا گیا ہے۔اس سے مراد یا تو وقت اداء ہے جو کہ اشہر حج ہے یا اس سے مراد وقت وجوب ہے جو کہ باختلاف بلدان مختلف ہوتا رہتا ہے جیسا کہ حاشیہ طحطاوی علی مراقی الفلاح شرح نورالایضاح میں اس کی تصریح موجود ہے۔اور نص قرآنی کا مقتضی وجوب اداء کو بیان کرتا ہے جیسا کہ احکام القرآن میں علامہ جصاصؒ نے اس کی تصریح فرمائی ہے نہ کہ شرط وجوب کو۔

لمافي حاشية الطحطاوی علی مراقي الفلاح(صـ ۷۲): قوله والوقت: ای وقت الطواف والوقوف ويحتمل ان المراد الوقت الذی يحصل فيه الحج وهو يختلف باختلاف البلدان.

وفي احكام القرآن للجصاص: فعلی هذا يكون معنیٰ قوله: الحج اشهر معلومات ان افعاله في اشهر الحج المعلومات.

(۳،۴،۵)۔ حج کیلئے قافلے کی صورت میں نکلنے میں جو علت تھی کہ اگر کوئی تاخیر کرتا تو حج فوت ہو جاتا اس لئے کہ بغیر قافلے کے حج کرنا بوجہ تکالیف طرق مشکل تھا اور آجکل وہی علت درخواستوں کے جمع کروانے کے وقت پائی جاتی ہے کہ اگر کوئی شخص درخواست جمع کروانے کی تاریخ سے تاخیر کرتا تو حج کے فوت ہونے کا خطرہ ہے لہٰذا قافلے کے نکلنے کے وقت کو مقیس علیہ بنانا اور آجکل درخواستوں کے جمع کرنے کے وقت کو مقیس بنانا درست ہے اور آجکل بھی وہی علت معتبر ہے اور سائل کا یہ کہنا کہ آلات واسباب بدل گئے تو قیاس درست نہیں ہے تو سائل کا یہ کہنا درست نہیں ہے کیونکہ شریعت میں احکام کا دارومدار وسائل پر نہیں ہوتا بلکہ قیاس کرتے وقت علت کو دیکھا جاتا ہے کہ اگر علت مقیس ومقیس علیہ دونوں میں ایک ہو تو قیاس درست ہے۔

وفي الشامية(۲/۴۶۵): وقت خروج اهل بلدها أی ثابتة وقت خروج اهل بلدها ولوقبل اشهر الحج لبعد المسافة وكذا سائر الشروط ای يعتبر وجودها في ذلک الوقت.

(۶)۔ جیسا کہ شروع میں بیان ہوا کہ حج کا سبب بیت اللہ ہے اور حج کے وجوب کیلئے دو قسم کی شرائط ہیں: وجوب اداء کی شرائط،نفس وجوب کی شرائط۔وجوب اداء کی شرائط میں زمان یعنی اشہر حج اور افعال حج کا ادا کرنا اشہر حج سے پہلے جائز نہیں۔نفس وجوب کی شرائط میں سے استطاعت ہے اس کا تحقق اشہر حج سے پہلے بھی ہو سکتا ہے۔درخواست جمع ہونے کے وقت صاحب استطاعت ہونا ضروری ہے اب اگر کوئی شخص اس وقت صاحب استطاعت تھا اور درخواست جمع نہیں کروائی یا درخواست جمع کروائی لیکن منظور نہیں ہوئی تو اس وجہ سے اس شخص سے حج کی فرضیت ساقط نہیں ہوگی بلکہ حج کرنا اس کے ذمہ لازم ہے۔

وفي الفقه الاسلامي وادلته(۳/۲۰۸۴):ثم ان شرط وجوب الحج من الزاد والراحلة وغير ذلک

یعتبر وجودها وقت خروج اهل بلده فان جاء وقت الخروج والمال فی یده فلیس له ان یصرفه فی غیره.

وفی الشامیة(۴۶۵/۲): وقت خروج اهل بلدها وکذا سائر الشروط قوله وقت ای ثابتة وقت خروج اهل بلدها ولو قبل اشهر الحج لبعد المسافة قوله وکذا سائر الشروط ای یعتبر وجودها فی ذلک الوقت.

وقال فیه ایضاً: وقالوا لولم یحج حتی اتلف ماله وسعه ان یستقرض ویحج ولو غیر قادر علی وفائه ویرجی ان لا یواخذه الله بذلک. ای لو ناویاً وفاءً اذا قدر کما قیده قوله وسعه ان یستقرض الخ ای جازله ذلک وقیل یلزمه الاستقراض کمافی باب المناسک.

(۷)۔ ابتداء میں بیان ہوا کہ حج کے وجوب کیلئے دوقسم کی شرائط ہیں۔ شرائط وجوب شرائط اداء، روح المعانی میں آیت کریمہ کا مقتضی وجوب اداء اور قضا کو بیان کرتا ہے کہ حج کے ارکان وافعال کی ادائیگی مواقیت حج سے پہلے نہیں ہوگی لیکن نفس وجوب اس سے پہلے بھی ہوسکتا ہے کیونکہ نفس وجوب باختلاف بلدان مختلف ہوتا رہتا ہے پہلے زمانے میں قافلوں کے نکلنے کا وقت تھا اور آجکل درخواستوں کے جمع ہونے کا وقت ہے اس عبارت سے بھی یہی پتا چلتا ہے کہ نفس وجوب اور وجوب اداد والگ چیزیں ہیں اولاً اس فرق کو سمجھنا چاہئے اور روح المعانی والے نے بھی اس کی تصریح بیان فرمائی ہے۔

وفی روح المعانی(۸۴/۱): الحج اشهر معلومات: ای وقته ذلک وبه یصح الحمل ..... المراد بوقته وقت مناسکه واعماله من غیر کراهة.

سائل نے روح المعانی کی عبارت ذکر کی ہے اس عبارت سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کیونکہ اس عبارت میں وقت حج کی ادائیگی کو بیان کررہا ہے، اداء اور قضا کے اعتبار سے کہ حج کے ارکان وافعال کی ادائیگی وہ اشہر حج ہی میں ہوگی ان سے پہلے نہیں ہوسکتی البتہ نفس وجوب وہ اشہر حج سے پہلے بھی ہوسکتا ہے اور نفس وجوب اور وجوب اداء یہ دونوں چیزیں ایک وقت میں محقق ہوں یہ ذرا مشکل بات ہے خاص کر جبکہ حج کرنے والے کا تعلق دور دراز ممالک سے ہو۔

(۸)۔ پرانے زمانے میں اشہر حج سے پہلے روانگی کی علت بعد مسافت تھی اس لئے کہ اگر کوئی شخص قافلے سے تاخیر کرتا تو حج فوت ہوجانے کا خطرہ تھا اور راستے کی تکالیف ومشقت کی وجہ سے اکیلے حج کرنا ناممکن اور مشکل تھا اور آجکل بھی وہی علت درخواست جمع کرواتے وقت پائی جاتی ہے کہ اگر کوئی شخص ان ایام میں جوکہ متعین ہیں درخواست جمع ہونے کیلئے ان ایام میں درخواست جمع نہیں کرواتا سستی کرتا ہے تو اس سے بھی حج فوت ہوجائیگا اور یہ قانون حکومت کی طرف سے مقرر ہے کہ ایام حج میں حج کیلئے درخواست کا جمع ہونا ویزہ وغیرہ کا ہونا ضروری ہے۔

پہلے زمانے میں تو آسانی تھی کہ جو شخص حج پر جانا چاہتا قافلے کے ساتھ شریک ہوجاتا لوگ بھی تھوڑے ہوتے تھے لیکن آجکل تو مشکلات

زیادہ ہیں اگر آج بھی ایسا ہوجائے کہ جو چاہے حج پر چلا جائے تو وہاں مناسک حج کو اداء کرنا نہایت مشکل ہے اس وجہ سے یہ ساری ترتیب حکومت کی جانب سے مقرر ہے اس وجہ سے داخلہ درخواست کے وقت استطاعت کوفرضیت حج کیلئے شرط قرار دیا گیا ہے۔

اگرچہ پہلے زمانے میں عملاً اشہرحج سے پہلے روانہ ہونا پڑتا تھا چونکہ آجکل وسائل کی وجہ سے فوراً روانہ نہیں ہوتے لیکن ان قافلے والوں کی طرح اشہرحج سے پہلے وہاں انتظامات کرنے پڑتے ہیں تو وہی علت بعد مسافت والی اب بھی ہے۔ البتہ قدرتی اعذار جیسے پہلے زمانے میں پائے جاتے تھے آجکل بھی پائے جاتے ہیں، بیمار ہوجانا انتقال ہوجانا۔

اس زمانے میں عذر وقتی اور من جانب المخلوق ہے سائل کا یہ کہنا درست نہیں اس لئے کہ حکومت والے ایسا کرنے پر مجبور ہیں کہ ان کو اتنے ہی لوگ وہاں بھیجنے ہیں جن کیلئے آسانی سے وہاں انتظام ہوجائے تاکہ حجاج کرام کو مناسک حج ادا کرنے میں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ رہی ان لوگوں کی بات جن کی سالوں تک درخواست منظور نہیں ہوئی جس کی وجہ سے تاخیر ہوتی ہے اس صورت میں اللہ کی ذات عالی سے امید ہے کہ وہ لوگ عنداللہ ماخوذ نہیں ہوں گے ہاں فرضیت ان حضرات سے ساقط نہیں ہوگی جب تک ان کو حج پر قدرت ہے۔

اور سائل کا پہلے زمانے میں اشہرحج سے پہلے قافلوں کی روانگی کو سبب تام سمجھنا اور آجکل درخواست کے جمع ہونے کے وقت کو سبب ناقص سمجھنا یہ غلط ہے۔ پہلے بھی بیان ہوچکا ہے کہ حج کا سبب بیت اللہ ہے پہلے زمانے میں بھی سبب وہی تھا اور آج بھی سبب وہی ہے اور ہمیشہ وہی سبب رہے گا۔

لـمـافي البحر الرائق (۲/۵۴۵):والخائف من السلطان الذی یمنع الناس من الخروج الی الحج ولا یـجـب عـلیـهـم الحج بأنفسهم ولا الاحجاج عنهم ان قدروا علی ذلک هذا ظاهر المذهب عن ابی حنـیـفة وهـو روایة عـنـهما وظاهر الروایة عنهما انه یجب علیهم الاحجاج فان أحجوا اجزأهم مادام العجز مستمراً بهم فان زال فعلیهم الاعادة.

وفي التاتارخانیه(۲/۴۲۹): وسببه البیت لانه یضاف الیه.

(۶) کیا فرضیت حج کیلئے مالدار ہونا ضروری ہے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری الحمدللہ ایک دکان ہے۔ دکان چونکہ صحیح طریقے سے نہیں چل رہی اس لئے میں نے ایک کمیٹی ڈالی اور اس میں تقریباً -/45,000 روپے جمع کئے ہیں اب کمیٹی میری نکلی ہے جبکہ مزید مجھے -/1,80,000 روپے کمیٹی میں جمع کرنے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ میں رقم کو کاروبار میں لگاؤں تاکہ دکان میں جملہ کوالٹی اور ورائٹی پوری ہوتا کہ کاروبار صحیح طریقے سے چل پڑے۔ جبکہ میری اہلیہ کے ساتھ دیگر رشتہ داروں کی یہ خواہش ہے کہ کمیٹی کی رقم سے اہلیہ کیلئے حج کا داخلہ کرایا جائے۔ تاکہ حج ادا کرسکے۔ واضح رہے کہ میری اہلیہ کے پاس اپنی ذاتی اتنی رقم نہیں کہ اس سے حج ادا کرسکے۔ نیز میری اہلیہ کے ساتھ میرا بھائی اور اس کی اہلیہ زینب ساتھ جائے گی۔ جبکہ زینب اور میری اہلیہ سگی بہنیں ہیں۔ میرے بھائی اور اس کی اہلیہ کی

بھی بھرپور خواہش ہے کہ میری اہلیہ ان کے ساتھ حج کو جائے۔ اس صورت میں اس کمیٹی کی رقم سے اپنی اہلیہ کیلئے حج کا داخلہ کرواؤں یا اس رقم کو کاروبار میں لگاؤں تاکہ کاروبار میں وسعت ہو۔ نیز میری اپنی خواہش یہ ہے کہ کاروبار میں وسعت ہو جائے تو دونوں مل کر حج ادا کریں گے۔ واضح رہے کہ میں نے الحمدللہ حج ادا کیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ

(۱)۔ میں یہ کمیٹی کی رقم کاروبار میں لگاؤں یا اہلیہ کیلئے اس رقم سے حج کا داخلہ کراؤں؟

(۲)۔ کاروبار میں رقم لگانے سے میں گناہگار تو نہیں ہوں گا؟

(۳)۔ اگر میری بیوی میرے بھائی اور اس کی اہلیہ کے ساتھ حج کو جائے تو شرعاً گناہ تو نہیں، کون گناہگار ہوگا؟

(۴)۔ کیا اس کمیٹی میں جو قرضہ ہے میرے اوپر اس سے حج ادا ہو جائے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... (الف) حج اس شخص پر فرض ہوتا ہے جس کی اپنی ملکیت میں اتنا مال ہو جس کے ذریعے وہ حج کر سکے۔ جس کی ملکیت میں اتنا مال نہ ہو اس پر حج فرض نہیں ہوتا۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں چونکہ مال شوہر کی ملکیت میں ہے بیوی کی ملکیت میں نہیں ہے اسلئے بیوی پر حج فرض نہیں۔ اور مذکورہ صورت میں شوہر مال کو کاروبار میں لگانے سے گناہگار نہیں ہوگا۔

(ب)۔ عورت کے حج پر جانے کیلئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ عورت کے ساتھ اس کا محرم "جس کے ساتھ نکاح ہمیشہ کیلئے حرام ہوتا ہے" ہو اگر محرم نہ ہو تو عورت کا حج پر جانا جائز نہیں ہے لہٰذا صورت مسئولہ میں چونکہ عورت دیور کے ساتھ جانے کا ارادہ رکھتی ہے جو کہ محرم نہیں ہے اس لئے اس عورت کا حج پر جانا جائز نہیں ہے۔

(ج)۔ قرضدار ہونے سے حج کی ادائیگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

لمافي القرآن الكريم(آل عمران: ۳/۹۷): ولله على الناس حج البيت من استطاع اليه سبيلاً ط.

وفي الهندية(۱/۲۱۷): (ومنها القدرة على الزاد والراحلة) بطريق الملك او الاجارة دون الاعارة والاباحة سواء كانت الاباحة من جهة من لامنّة له عليه كالوالدين والمولودين اومن غيرهم كالا جانب كذا في السراج الوهاج ولو وهب له مال ليحج به لايجب عليه قبوله سواء كان الواهب ممن تعتبر منته كالا جانب او لاتعتبر كالا بوين والمولدين كذا في فتح القدير.

وفي الشامية (۲/۴۶۴): (قوله ومع زوج او محرم) هذا وقوله ومع عدم عدة عليها شرطان مختصان بالمرأة فلذا قال لامرئة وما قبلهما من الشروط مشترك والمحرم من لايجوز له مناكحتها على التابيد بقرابة او رضاع او صهرية كما في التحفة.

(۷) فرضیت کے بعد دیگر ضروریات کے مقابلے میں حج کی ادائیگی ضروری ہے

سوال... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص پر حج فرض ہو گیا تھا لیکن اس نے اس وقت

ادانہیں کیا یہاں تک کہ اسکے پاس جتنا پیسہ تھا سب ختم ہوگیا بلکہ اپنا ذاتی مکان بھی فروخت کرڈالا، کچھ عرصہ بعد اسکے پاس رقم آئی اب وہ چاہتا ہے کہ میں کافی عرصہ سے دربدر پھررہا ہوں اسلئے پہلے میں مکان خریدلوں اسکے بعد اگر رقم آگئی تو حج کرلونگا، پوچھنا یہ ہے کہ اب یہ شخص پہلے حج ادا کرے یا مکان خریدلے؟

الجواب حامداًومصلیاً......صورت مسئولہ میں اس شخص پر پہلے حج کرنا ضروری ہے کیونکہ اسپر پہلے ہی سے حج فرض ہو چکا تھا اور فرضیت کی ادائیگی بہرصورت ضروری اور لازمی ہے چاہے اس شخص کو ادائیگی حج کیلئے قرض لینا پڑے یا کوئی اور صورت ممکن ہو۔

لمافي الهندية(۱/۲۱۷):وان لم يكن له مسكن ولاشئ من ذلک وعنده دراهم يبلغ بهاالحج أويبلغ ثمن مسكن وخادم وطعام وقوت فعليه الحج فان جعلهافي غيرالحج أثم.

وفي الطحطاوي على الدر(۱/۴۸۱):(قوله وسعه ان يستقرض) وفي التمرتاشي عن ابي يوسف يلزمه الاستقراض.

(۸) ضرورت سے زائد جائیداد والے پر حج فرض ہے

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا حج کرنے کا ارادہ ہے لیکن میرے پاس جائیداد کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے، کیا میں جائیداد کو فروخت کرکے حج پر جاسکتا ہوں؟ اور کیا جس کے پاس جائیداد کے علاوہ اور کچھ نہ ہو تو کیا اسپر حج فرض ہو جاتا ہے یا نہیں؟ اور اسکے لئے جائیداد فروخت کرنا لازمی ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......جس شخص کے پاس اتنی جائیداد ہو کہ اہل وعیال کے نان، نفقہ اور سکنی کا معقول و مستقل انتظام کرنیکے بعد اتنی فاضل جائیداد بچتی ہو کہ وہ رقم حج پر جانے کیلئے کافی ہو تو اس شخص پر حج فرض ہے اور جائیداد کو فروخت کرنا ضروری ہے اور اگر فاضل رقم اتنی ہو کہ وہ حج کیلئے ناکافی ہو تو اس شخص پر حج فرض نہیں۔

لمافي البحرالرائق(۲/۳۱۳):وتثبت الاستطاعة بدارلايسكنهاوعبدلايستخدمه فعليه ان يبيع ويحج.

وفي الهندية(۱/۲۱۷): وفي التجريد ان كان له دار لا يسكنها وعبد لا يستخدمه فعليه أن يبيعه ويحج به.

(۹) کئی ایکڑ زمین ہونے کی صورت میں حج فرض ہے یا نہیں؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے پاس ۱۴/۱ ایکڑ زمین ہے جس پر میں گندم کاشت کرتا ہوں اور کوئی نقد رقم نہیں ہے تو کیا میرے اوپر حج فرض ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......حج کے وجوب کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ آدمی کے پاس اتنا مال ہو جو اس کی ضروریاتِ اصلیہ (اپنا

اور اہل وعیال کے نان ونفقہ) سے زائد ہو۔صورت مسئولہ کے مطابق اگر زمین کا ایک حصہ بیچ کر مصارف حج ادا کرنے کے بعد باقی زمین اتنی ہو کہ اُس سے آپ کا اور آپ کے اہل وعیال کا نفقہ پورا ہوجاتا ہو،تو آپ پر زمین بیچ کر حج کرنا فرض ہے،اور اگر باقی ماندہ جائیداد سے آپ کا اور آپ کے اہل وعیال کا گزر بسر نہ ہو سکے تو آپ پر زمین بیچنا فرض ہے نہ حج کرنا۔

لـمافي الهندية(۱/۲۱۷): وكذا من كان ثياب لايمتهنها كان عليه ان يبيع ويحج بثمنها ان كان ثمنا وفـأ بـالـحـج ولـو كـان لـه منزل يكفيه بعضه لا يلزمه بيع الفاضل لاجل الحج كذا في فتاوىٰ قاضي خـان، اذا كان له منزل يسـكنه ويمكنه ان يبيع ويشترى بثمنه منزلا ادون منه ويحج بالفضل لم يلزمه ذلك كذا في المحيط، وان اخذ فهو الفضل كذا في الايضاح.

وفيـه ايضاً(۱/۲۱۸): ان كان محترفا يشترط لوجوب الحج ان يملك الزاد والراحلة ذهابا وايابا ونـفـقة عياله واولاده من وقت خروجه الى رجوعه ويبقى له آلات حرفته وان كان صاحب ضيعة ان كـان له من الضياع مالو باع مقدار مايكفي الزاد والراحلة ذاهبا وجائيا ونفقة عياله واولاده ويبقى له من الـضـيـعة قدر ما يعيش بغلة الباقي يفترض عليه الحج والا فلا، وان كان حراثا اكارا فملك مالا يـكـفـي الـزاد والـراحـلة ذاهـبـا وجـائيـا ونفقة عياله واولاده من خروجه الى رجوعه ويبقى له آلات الحراثين من البقر ونحو ذلك كان عليه الحج والا فلا كذا في فتاوىٰ قاضي خان.

وفـي الـدر الـمـختار(۲/۴۶۱): (فضلاعما لا بدمنه) كمامر في الزكوٰة. ومنه المسكن ومرمته ولو كبيرا يمكنه الاستغناء ببعضه، والحج بالفاضل فانه لا يلزمه بيع الزائد، نعم هو الافضل وعلم به عدم لـزوم بيع الكل والاكتفاء بسكنى الاجارة باالاولى وكذا لو كان عنده مالو اشترى به مسكنا وخادماً لايـبقى بعده ما يكفي للحج لا يلزمه، خلاصة وحرر في النهر انه يشترط بقاء راس المال. لحرفته ان احتـاجـت لـذلـك والا لا وفـي الاشـبـاه معـه الف وخـاف العزوبة ان كان قبل خروج اهل بلده فلا التـزوج ولـو وقتـه لزمه الحج(و) فضلا عن (نفقة عياله) فمن تلزمه نفقته لتقدم حق العبد(الى) حين) عوده وقيل بعده بيوم وقيل شهر.

وفـي الشـامـيـة (۲/۴۶۲): (قـولـه يشـتـرط بـقـاء راس مال لحرفته) كتاجرودهقان ومزارع كما في الخلاصة، ورأس المال يختلف باختلاف الناس بحر.

(۱۰) جس شخص پر حج فرض ہو وہ پہلے شادی کرے یا حج کرے؟

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے پاس اتنی رقم ہے جو میری ضروریات سے زیادہ

ہے جس سے میں بآسانی حج کرسکتا ہوں لیکن دوسری طرف میری جوان بیٹی جس کی شادی نے مجھے پریشان کر رکھا ہے آیا اس صورت میں مجھے حج کرنا چاہئے یا اپنی جوان بیٹی کی شادی کرنی چاہئے؟ جلدی جواب دے کر مشکور فرمائیں تاکہ میری پریشانی دور ہو جائے۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... ہر وہ شخص جو صاحب استطاعت ہو اور اس پر حج فرض ہو تو اس کو بغیر عذر کے حج مؤخر نہیں کرنا چاہئے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں چونکہ آپ پر حج فرض ہو چکا ہے۔ اور کوئی عذر شرعی بھی نہیں ہے، لہٰذا آپ پہلے فریضۂ حج ادا کریں، اس کے بعد بیٹی کی شادی کریں۔

لمافی التاتارخانية (۲/۴۳۳): "الينا بيع: ان كان له مقدار مايحج به وعزم على التزوج ذكر ابن شجاع عن ابى حنيفة أنه يحج ولا يتزوج."

وفى الهندية (۱/۲۱۷): اذا وجدما يحج به وقد قصد التزوج يحج به ولا يتزوج لان الحج فريضة او جبها الله تعالىٰ على عبده.

(۱۱) اولاد کی شادی کرانا حج سے رکنے میں عذر ہے یا نہیں؟

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اکثر لوگوں میں مشہور ہے کہ جس شخص کی اولاد شادی کے قابل ہو، اور وہ بغیر شادی کئے حج پر جانا چاہے تو اس کو جانا جائز نہیں بلکہ پہلے شادی کرے اور بعد میں حج پر جائے کیا یہ بات صحیح ہے یا اولاد کی شادی کئے بغیر حج پر جانا جائز ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورت مسئولہ کے مطابق جس شخص کی اولاد شادی کے قابل ہو، اور وہ شخص اولاد کی شادی کروانے پر قدرت بھی رکھتا ہو، تو اگرچہ اولاد کی شادی اس کے ذمہ ہے لیکن جب اسی شخص کے حق میں فرضیت حج کی شرائط پائی جائیں۔ تو اب اس شخص پر حج کو جانا اور حج کرنا لازم ہے اور اس عذر کی بنا پر (کہ وہ اولاد کی شادی کرائے) حج سے رکنا جائز نہیں ہے بلکہ اس پر حج کرنا فرض ہے۔

لمافى الهندية (۱/۲۱۷): اذا وجد ما يحج به وقد قصد التزوج يحج به ولا يتزوج لان الحج فريضة اوجبها الله تعالىٰ على عبده كذا فى التبيين.

وفى الشامية (۲/۴۶۲): (قوله وفى الاشباه) المسئلة منقولة عن ابى حنيفة فى تقديم الحج على التزوج والتفصيل المذكور ذكره صاحب الهداية فى التجنيس وذكرها فى الهداية مطلقاً واستشهد بها على ان الحج على الفورعنده ومقتضاه تقديم الحج على التزوج وان كان واجباً عند التوقان وهو صريح مافى العناية مع انه حينئذ من الحوائج الاصلية ولذا اعترضه ابن كمال باشاه فى شرحه على الهداية بانه حال التوقان مقدم على الحج اتفاقاً.

(۱۲) مشترکہ مال سے حج کرنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے والد صاحب کا انتقال ہوگیا ہے ان کی ایک دوکان تھی ہم چار بھائی ہیں ہم نے اس کام کو آگے بڑھایا آج الحمدللہ بہت بڑا کاروبار ہے کافی پیسے بھی جمع ہیں ہم سب بھائی کاروبار بھی اکٹھے کرتے ہیں اور کھانا پینا بھی ساتھ ہے اب ہمارے پاس اتنی رقم موجود ہے کہ ایک شخص آسانی سے حج کرسکتا ہے تو اس صورت میں کس بھائی پر حج فرض ہوگا؟ اور مشترک مال سے حج ادا کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... فرضیت حج کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ آدمی اتنی رقم کا مالک ہو، جو ان کے ضروریات زندگی اور اہل وعیال کے نان ونفقہ سے زائد ہو۔ اور وہ ان کے حج پر آنے جانے کیلئے کافی ہو۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر مشترک مال میں سے ہر ایک بھائی کا اتنا حصہ بنتا ہو، جو اُن کی ضروریات اور اہل وعیال کے نان ونفقہ سے زائد ہو، اور حج پر آنے جانے کے لئے کافی ہو، تو ہر ایک بھائی پر حج فرض ہے ورنہ کسی پر حج فرض نہیں ہے۔ واللہ اعلم

لمافي البحر الرائق(۲/۳۷۸): ولو كان بين رجلين أربعون شاة حتى لم يجب على كل واحد منهما الزكاة (الى ان قال) لأن ملك كل واحد منهما قاصر على النصاب اهـ.

وفيه ايضاً(۲/۵۳۶): وأما القدرة على الزاد والراحلة فالفقهاء على أنه من شرط الوجوب فلا وجوب أصلا يتعلق بالفقير لا شتراط الاستطاعة في آية الحج وفسرت بهما.

وفيه ايضاً(۲/۵۳۸): ثم القدرة على الزاد لاتثبت الا بالملك لا بالاباحة والقدرة على الراحلة لاتثبت الا بالملك أو الإجارة لابالعارية والاباحة فلو بذل الابن لأبيه الطاعة وأباح له الزاد والراحلة لا يجب عليه الحج وكذا لو وهب له مال ليحج به لا يجب عليه القبول لأن شرائط اصل الوجوب لا يجب عليه تحصيلها عند عدمها.

وفي القاضي خان(۱/۱۳۵): ومن الشرائط الاستطاعة وهي ان يملك مالا فاضلا عن مسكنه وفرشه وثياب بدنه وفرسه وسلاحه ونفقة عياله وأولاده الصغار مدة ذهابه وايابه وان يكفي ذلك الفاضل للزاد والراحلة محملا او زاملة او شق محمل كان عليه الحج.

وفي الهندية(۱/۲۱۷): وتفسير ملك الزاد والراحلة ان يكون له مال فاضل عن حاجته وهو ماسوى مسكنه ولبسه وخدمه وأثاث بيته قدر ما يبلغه الى مكة ذاهبا وجائيا...... اهـ.

وفي الشامية(۲/۴۵۹): (قوله ذى زاد وراحلة) أفاد انه لا يجب إلا بملك الزاد وملك أجرة الراحلة فلا يجب بالإباحة أو العارية كما في البحر.

وفي الدر المختار(۴/۳۰۰): (وكل) من شركاء الملك (أجنبي) في الامتناع عن تصرف مضر (في مال صاحبه) لعدم تضمنها الوكالة...... اهـ.

(۱۳) حکومت کے خرچہ سے حج کرنے کا حکم

سوال ...کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل مختلف طریقوں سے حکومت لوگوں کو حج پر بھیجتی ہے خرچہ وغیرہ سب حکومت کا ہوتا ہے اور یہ لوگ صرف ارکان ادا کرتے ہیں آیا ان لوگوں کا حج فرض ادا ہو جاتا ہے یا مال آنے پر دوبارہ حج کرنا لازم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں جن حجاج کرام نے حکومت کے خرچہ سے حج ادا کیا ہو اگر انہوں نے حج نفل کی نیت نہ کی ہو تو ان کا حج فرض ادا ہو جائے گا مال آنے پر دوبارہ حج کرنا لازم نہ ہوگا البتہ اگر حجاج نے یہ سمجھا کہ ہم تو فقیر ہیں حکومت کے خرچہ سے حج ادا کر رہے ہیں اور نفلی حج کی نیت کر لی تو اس صورت میں دوبارہ مال آنے پر حج کرنا لازم ہوگا۔

لمافي الهندية(۱/۲۱۷): الفقير اذا حج ما شيا ثم أيسر لاحج عليه كذا في قاضي خان.

وفي الشامية (۲/۴۶۰): (تنبيه) في اللباب: الفقير الآفاقي اذا وصل الى ميقات فهو كالمكي ......

ولـيـفيد انه يتعين عليه أن لاينوى نفلا على زعم أنه لايجب عليه لفقره لانه ماكان واجبا وهو آفاقي فلما صار كالمكي وجب عليه فلونواه نفلا لزمه الحج ثانياً اهـ ملخصا ونظيره ماسنذكره في باب الحج عن الغير من ان المأمور بالحج اذا واصل الى مكة لزمه أن يمكث ليحج حج الفرض عن نفسه لكونه صار قادراً على مافيه.

وفي اللجنة الدائمة(۱۱/۳۶): (س) ماحكم فيمن يحج من نفقات الحاكم؟ بمعنى اذا ارادحاكم من الحاكم بان يعطي رعاياه مبلغا من المال وقال لهم حجوا بهذا المال فهل يجوز لهم بأن يحجوا به ام لا؟ واذا حجوا به فهل تسقط عنهم حجة الاسلام؟

(ج) يجوز لهم ذلك وحجهم صحيح لعموم الادلة.

(۱۴) حکومت کی طرف سے اگر زادِراہ اور ٹکٹ وغیرہ حج کیلئے ملے تو اسے فروخت کرنے کا حکم

سوال ...کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جب افغانستان میں امریکہ نے بمباری کر کے عوام کو شہید کر دیا تو افغان حکومت نے شہداء کے وارثین کی دادرسی کے لئے حج کے پیکیج کا اعلان کر دیا ہے کہ جس گھر میں کوئی شہید ہو چکا ہے اس گھر کا ایک فرد ہم حج پر بھیجتے ہیں اور ان کے لئے ہم ٹکٹ کا انتظام کرتے ہیں، اب وہ لوگ جن کے لئے حکومت نے یہ انتظام کیا ہے وہ

واپسی آنے تک خرچہ کی قدرت رکھتے ہیں (یعنی جن کے حق میں حج کی شرائط پوری ہیں) کہتے ہیں کہ ہم اپنا حج کا ٹکٹ دوسروں کو دے کر فروخت کر کے ان سے پیسے لے سکتے ہیں یا نہیں؟ جبکہ حکومت بھی اس معاملے سے خبردار ہے اور پھر بھی کچھ تنبیہ یا منع نہیں کرتی۔ تو کیا حج کا ٹکٹ اس طرح فروخت کرنا جائز ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً صورت مسئولہ میں یہ ٹکٹ افغان حکومت کی طرف سے شہداء کے وارثین کیلئے ہبہ ہے اگر یہ ٹکٹ شہداء کے وارثین میں سے کسی ایسے شخص کی ملک میں آجائے جس کے حق میں حج کے واجب ہونے کی تمام شرائط پوری ہوں تو اس کے اوپر حج فرض ہو جائے گا۔ اب اگر ایسا شخص (جس نے پہلے حج نہ کیا ہو) اس ٹکٹ کو اپنی ملک میں آنے کے بعد فروخت کرے گا تو اس کے اوپر سے فرض ساقط نہیں ہوگا۔ جن حضرات نے پہلے حج نہیں کیا اور ان کیلئے ٹکٹ ملنے کے بعد حج کے واجب ہونے کی تمام شرائط پائی جاتی ہوں تو ان کیلئے ٹکٹ فروخت کرنا ناجائز ہوگا بشرطیکہ اس ٹکٹ کے فروخت کرنے سے ان کے حج میں تاخیر ہوتی ہو، اس لئے کہ حج کے فرض ہونے کے بعد اس میں تاخیر کرنا مکروہ تحریمی ہے۔ البتہ وہ حضرات جن کے حق میں حج کے واجب ہونے کی تمام شرائط پوری نہ ہوں یا انہوں نے پہلے حج کرلیا ہو تو ان کیلئے ٹکٹ کا فروخت کرنا جائز ہوگا۔

لمافی القرآن الکریم (ال عمران:۹۷): وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا، ومن کفر فان اللہ غنی عن العالمین.

وفی ترمذی (۱/۱۶۸): عن ابن عمر قال جاء رجل الی النبی ﷺ فقال یا رسول اللہ ما یوجب الحج قال الزاد والراحلة.

وفی الشامیة(۲/۴۵۷): (قوله ووجهه الخ) ای وجه کون التاخیر صغیرة أن الفوریة واجبة لأنها ظنیة لظنیة دلیلها وهو الاحتیاط لأن فی تاخیره تعریضا له للفوات، وهو غیر قطعی فیکون التأخیر مکروها تحریما لاحراما لأن الحرمة لاتثبت الا بقطعی کمقابلها وهو الفرضیة.

وفی الهندیة (۱/۲۱۷): منها القدرة علی الزاد والراحلة بطریق الملک او الاجارة دون الاعارة والاباحة سواء کانت الاباحة من جهة من لا منة له علیه کالوالدین و لمولودین أو من غیرهم کالأجانب کذا فی السراج الوهاج.

ولو وهب له مال لیحج به لایجب علیه قبوله...... وفی (۴/۳۷۴) کتاب الهبة... اما شرائطها ... منها ان یکون الموهوب مقبوضا حتی لا یثبت الملک للموهوب له قبل القبض.

وفی الشامیة(۵/۶۸۸): کتاب الهبة ... وحکمها..... وتصح بقبول ای فی حق الموهوب له اما فی حق الواهب فتصح بالإیجاب وحده لانه متبرع.

وفی بدائع الصنائع(۸/۵۰۹): للمالک ان یتصرف فی ملکه أی تصرف شاء.

(۱۵) کیا مکہ مکرمہ جانے کی رقم ہو مدینہ جانے کی نہ ہو تو حج کرنا فرض ہے؟

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے پاس اتنی رقم ہے جس سے میں مکہ مکرمہ آ جاسکتا ہوں لیکن مدینہ منورہ جانے کی رقم نہیں ہے۔تو کیا ایسی صورت حال میں میرے لئے حج پر جانا لازم ہے یا نہیں، آیا حاجی کیلئے روضۂ اقدس کی زیارت کیلئے مدینہ منورہ جانا لازم ہے۔

الجواب حامداًومصلیاً صورت مسئولہ میں آپ پر حج کرنا لازم ہے لیکن آج کل چونکہ ہمارے ملک میں موجودہ صورت حال یہ ہے کہ حج کیلئے ویزا اس وقت ملتا ہے جبکہ مکہ اور مدینہ جانے کا پورا خرچہ ہو،اب چونکہ آپ کے پاس مدینہ جانے کا خرچہ نہیں ہے اس لئے آپ کو ویزا ابھی نہیں مل سکتا اس مجبوری کی وجہ سے آپ حج پر نہیں جاسکتے۔اس لئے آپ مدینہ منورہ جانے کے خرچے کے حصول کیلئے کوشش کریں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ آپ کیلئے اس مبارک سفر کو آسان فرمائیں۔البتہ اگر کہیں اس کی اجازت مل جاتی ہو،اور آدمی کے پاس مکہ مکرمہ تک کا بندوبست ہو تو اس پر حج فرض ہوگا۔باقی روضۂ اقدس کی زیارت کے بارے میں فقہاء کرام کے تین اقوال ہیں۔بعض مندوب کہتے ہیں،بعض واجب اور بعض واجب کے قریب کے قائل ہیں۔علامہ شامی رحمہ اللہ نے تیسرے قول کو ترجیح دی ہے۔

لمافي الهندية(۱/۲۱۷): وتفسير ملك الزادو الراحلة ان يكون له مال فاضل عن حاجته وهو ما سوى مسكنه ولبسه وخدمه وأثاث بيته قدر ما يبلغه الى مكة ذاهبا وجائيا راكبا لا ماشيا وسوى مايقضي به ديونه ويمسك لنفقة عياله ومرمة مسكنه ونحوه الى وقت انصرافه.

وفي الهندية(۱/۲۶۵): قال مشايخنا رحمهم الله تعالىٰ انها افضل المندوبات وفي مناسك الفارسي وشرح المختار انها قريبة من الوجوب لمن له سعة.

وفي الدر المختار(۲/۶۲۶): وزيارة قبره مندوبة بل قيل واجبة لمن له سعة.

وفي الشامية تحته: نعم عبارة اللباب والفتح وشرح المختار أنها قريبة من الوجوب لمن له سعة.

وفي الشامية(۲/۴۶۲): وان لم يكن له مسكن ولا شئ من ذلك وعنده دراهم تبلغ به الحج وتبلغ ثمن مسكن وخادم وطعام وقوت وجب عليه الحج.

(۱۶) اُدھار لے کر حج ادا کرنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی اپنی بیوی کے ساتھ حج کرنا چاہتا ہے اور ایک آدمی کے پیسے کم پڑ رہے ہیں کیا کسی اور سے اُدھار لے کر حج کرے تو حج ہو جائے گا یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً حج کی ادائیگی کیلئے ادھار لینا درست ہے لہٰذا صورت مسئولہ میں حج ہو جائے گا۔

لمافي الخانية على هامش الهندية (۱/ ۲۸۴): وعن محمد من عليه الحج اذا فرط ولم يحج حتى اتلف ماله وسعه ان يستقرض الساعة فيحج وان كان لا يقدر على قضاء الدين وان مات قبل ان يقضي دينه قال ارجوا أن لا يواخذ بذلك ولا يكون آثما اذا كان من نيته قضاء الدين اذا قدر.

وفي الهندية(۱/ ۲۲۰): اذا اراد الرجل ان يحج بمال حلال فيه شبهة فانه يستدين للحج ويقضي دينه من ماله كذا في فتاوى قاضيخان.

(۱۷) حرام مال کی موجودگی میں قرض لے کر حج کرنا بہتر ہے

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کے پاس سود کا مال ہے اور وہ حج پر جانے کا ارادہ رکھتا ہے تو کیا یہ کسی سے قرض لے کر اور اس کو اپنا حرام مال دے کر حج کر سکتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورتِ مسئولہ میں حج کا ارادہ رکھنے والے شخص کیلئے (جس کے پاس سودی حرام مال کے علاوہ اور مال نہیں ہے) بہتر یہ ہے کہ وہ کسی غیر مسلم سے قرض لے کر حج کرے اور پھر اپنے مال میں سے اس کو قرضہ ادا کرے۔ کیونکہ حرام مال کے ساتھ حج کرنے سے اگرچہ حج فرض ذمہ سے ساقط ہو جاتا ہے لیکن اس کا ثواب نہیں ملتا۔

وفي الهندية(۱/ ۲۲۰): اذا اراد الرجل ان يحج بمال حلال فيه شبهة فانه يستدين للحج ويقضي دينه من ماله.

وفيه ايضاً(۶/ ۳۹۰): وكل حيلة يحتال بها الرجل ليتخلص بها عن حرام أو ليتوصل بها الى حلال فهي حسنة.

وفي الشامية(۲/ ۴۵۶): ويجتهد في تحصيل نفقة حلال فانه لايقبل بالنفقة الحرام كما ورد في الحديث مع انه يسقط الفرض عنه معها ولا تنافي بين سقوطه وعدم قبوله فلا يثاب لعدم القبول ولا يعاقب عقاب تارك الحج اهـ اى لان عدم الترك يبتني على الصحة وهي الاتيان بالشرائط والاركان والقبول المرتب عليه الثواب يبتني على اشياء كحل المال والاخلاص كما لو صلى مرائيا او صام واغتاب فان الفعل صحيح لكنه بلا ثواب.

وفي الفقه الاسلامي(۱/ ۲۳۶): ليحرص على أن تكون نفقته حلالا خالصة من الشبهة فان حج بما فيه شبهة أو بمال مغصوب صح حجه عند الجمهور لكنه ليس حجا مبرورا.

(۱۸) سود کے مال سے حج بیت اللہ کرنے کی ممانعت اور مالِ حلال سے حج کرنے کی ایک صورت کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک سرکاری ملازم تھا آج سے پانچ سال قبل میں

ریٹائر ہوا تو مجھے آٹھ لاکھ (-/800,000) روپے پنشن ملی اس وقت دنیاوی لائن میں تھا اس وجہ سے ساری رقم بینک میں جمع کرادی جو میں دس سال تک نہیں نکلوا سکتا، البتہ اس کا سود مجھے ہر سال ملتا رہتا ہے بعد میں میں نے تبلیغی جماعت میں وقت لگایا اب خواہش ہے کہ حج کراؤں اس رقم کو ملنے میں پانچ سال دیر ہے اب مجھے اس سال کا سود مل گیا ہے اور کچھ پچھلے سال والا بھی باقی ہے اب ارادہ ہے کہ اس رقم سے حج کراؤں آیا میرے لئے سودی رقم سے حج کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس کے جواز کی کوئی صورت ہو سکتی ہو تو ضرور بیان فرمادیجئے۔

الجواب حامداً ومصلیاً ...... اللہ رب العزت نے قرآن مجید میں سود کو حرام قرار دیا ہے چنانچہ ارشاد فرمایا: وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰو. اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا: یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰو اِنْ کُنْتُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ (ترجمہ): "اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور جو کچھ سود کا بقایا ہے اس کو چھوڑ دو اگر تم ایمان والے ہو" (کیونکہ ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی جائے) اور سود کے متعلق قرآن مجید اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اتنی سخت وعیدیں ارشاد فرمائی گئی ہیں جو کسی دوسرے گناہ پر نہیں فرمائی گئیں، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ۔ "پس اگر تم (سود) نہیں چھوڑتے تو اعلان سن لو جنگ کا اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے"۔ فَاِنْ تُبْتُمْ فَلَکُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِکُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ "اور اگر تم توبہ کرلو گے تو تم کو تمہارے اصل اموال مل جائیں گے کہ تم کسی پر ظلم کرنے پاؤ گے اور نہ تم پر کوئی ظلم کرنے پائے گا"۔ پس صورت مسئولہ میں آپ پر لازم ہے کہ اپنی حج بیت اللہ کی خواہش پوری کرنے سے پہلے اپنے آپ کو سود جیسی لعنت سے پاک کریں۔ اور اب تک غفلت اور دین سے دوری کی وجہ سے اس لعنت میں مبتلا رہے ہیں اس پر خوب توبہ اور استغفار کریں اور بینک سے سودی معاملہ کو ختم کر کے اپنی اصلی رقم لینے کی کوشش کریں۔ اور جب تک اصل رقم نہ ملے اپنی خواہش (حج بیت اللہ) کو مؤخر کردیں۔ اور جب اپنی اصل رقم مل جائے تو اس مال حلال سے اللہ کے گھر حج کرنے کیلئے جائیں۔ کیونکہ عند اللہ مال حرام سے کیا ہوا حج قبول ہی نہیں ہوتا۔ تاہم اگر آپ اپنی خواہش (حج بیت اللہ) ابھی پوری کرنا چاہتے ہیں تو اس کی صورت یہ ہے کہ آپ کسی ایسے شخص سے جس کی کمائی حلال کی ہو قرض لے کر حج کرنے کیلئے تشریف لے جائیں اور جب بینک سے آپ کی اصل رقم مل جائے تو اس سے قرض کی ادائیگی کردیں۔ کیونکہ اس صورت میں حج کی ادائیگی مال حرام سے نہ ہوگی اور عند اللہ قبول ہونے کی امید ہے۔

لما فی سنن ابن ماجہ (ص۱۶۴): عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ: قال قال رسول اللہ ﷺ الربا سبعون حوبا ایسرھا ان ینکح الرجل امہ.

وفی الھندیۃ (۱/۲۲۰): ویجتھد فی تحصیل نفقۃ حلال فانہ لا یقبل الحج بالنفقۃ الحرام مع انہ یسقط الفرض معھا وان کانت مغصوبۃ کذا فی فتح القدیر، اذا اراد الرجل ان یحج بمال حلال فیہ شبھۃ فانہ یستدین للحج ویقضی دینہ من مالہ کذا فی فتاوی قاضی خان فی المقطعات.

وفی الشامیۃ (۲/۴۵۶): قال فی البحر ویجتھد فی تحصیل نفقۃ حلال، فانہ لا یقبل بالنفقۃ الحرام کما ورد فی الحدیث، مع انہ یسقط الفرض عنہ معھا ولا تنافی بین سقوطہ، وعدم قبولہ فلا یثاب

لعدم القبول ولا يعاقب عقاب تارک الحج.

وفی مناسک ملا علی قاری صـ۸): وتكون النفقة من وجه حلال، فان الحج لا يقبل بالنفقة الحرام، وان سقط عنه الفرض فی الظاهر لو حج بها...... واذا اراد ان يحج، ولم يكن معه الامال حرام او فيه شبهة، فيستدين للحج من مال حلال ليس فيه شبهة، ويحج به. ثم يقض دينه فی ماله.

(۱۹) حکومت کی اجازت کے بغیر حج کرنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جولوگ عمرہ کیلئے چلے جاتے ہیں اور غیر قانونی طور پر وہاں رہ کر حج ادا کرتے ہیں تو کیا انکا اس طرح حج کرنا درست ہوگا جبکہ حکومت نے صرف عمرہ کی اجازت دی تھی۔

الجواب حامداًومصلياً ....جولوگ عمرہ کیلئے چلے جاتے ہیں اور حج کرکے واپس آتے ہیں تو انکا حج ادا ہوجاتا ہے کیونکہ فریضہ حج کا ادا ہونا حکومت کی اجازت پر موقوف نہیں ہے البتہ حاکم کا حکم مباح اور جائز امور میں ماننا واجب ہے اسکے نہ ماننے کی وجہ سے ترک واجب کا گناہ ہوگا۔

لمافی الشامية(۱/۱۸۵):تنبيه اذاامر الامام بالصيام فی غير الايام المنهية وجب كماقدمناه فی باب العيدمن ان طاعة الامام فيماليس بمعصية واجبة.

(۲۰) نابینا کے لئے حج پر جانا فرض نہیں

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نابینا آدمی کیلئے حج پر جانے کا کیا حکم ہے؟ اس طرح ایک شخص کی آنکھوں میں سخت تکلیف رہتی ہے کبھی نظر آتا ہے اور کبھی نظر نہیں آتا جبکہ وہ صاحب نصاب بھی ہے تو اب اسکے لئے کیا حکم ہے؟

الجواب حامداًومصلياً: نابینا پر خود حج کرنا فرض نہیں ہے البتہ کسی شخص کو اپنی طرف سے بھیج کر حج بدل کروالے اور وہ شخص جسکی آنکھ میں سخت تکلیف ہو اگر کوئی شخص اسکو ساتھ لیجانیوالا موجود ہو تو اس کے ساتھ حج پر جائے ورنہ کسی کے ذریعہ حج بدل کروالے۔ حج بدل کی دونوں صورتوں میں اگر انکا عذر زائل ہوگیا تو ان دونوں پر حج کا اعادہ کرنا لازم ہوگا۔

لمافی الشامية(۲/۴۵۹): (قوله صحيح البدن) أی سالم عن الآفات المانعة عن القيام بمالابد منه فی السفر فلايجب علی مقعدومفلوج وشيخ كبير لايثبت علی الراحلة بنفسه واعمی وان وجد قائدا وظاهر الرواية عنهماوجوب الاحجاج عليهم ويجزيهم ان دام العجزوان زال أعادوا بأنفسهم.

(۲۱) مالدار نابینا کے حج کا حکم

سوال　کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک دوست ہے جو کافی مالدار ہے گزشتہ ماہ ایک حادثہ میں اس کی دونوں آنکھیں خراب ہوگئی ہیں۔ اب وہ بالکل نابینا ہے۔ چونکہ اس پر حج بھی فرض ہے۔ لیکن وہ بڑا پریشان ہے کہ کیا کرے، جب آنکھیں تھیں تو غفلت تھی اور اب جب ہوش آیا تو آنکھیں نہیں ہیں۔ آپ بتائیں کہ اب وہ کیا کرے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ... مذکورہ نابینا شخص کسی صحت مند بینا شخص کو اپنا نائب بنا کر اس سے حج ادا کروائے۔

لمافی الهندية (۱/۲۵۷): ومركبة منهما كالحج والا نابة تجرى فى النوع الاول فى حالتى الاختيار والاضطرار ولا تجرى فى النوع الثانى وتجرى فى النوع الثالث عند العجز كذا فى الكافى ولجواز النيابة فى الحج شرائط (منها) ان يكون المحجوج عنه عاجزا عن الاداء بنفسه وله مال.

وفى الدر المختار (۲/۵۹۸): (... والمركبة منهما) كحج الفرض (تقبل النيابة عند العجز فقط) لكن (بشرط دوام العجز الى الموت) لانه فرض العمر حتى تلزم الاعادة بزوال العذر (و) بشرط (نية الحج عنه) اى عن الآمر　(صـ ۵۹۹): (وان لم يكن كذلك كالعمى والزمانة سقط الفرض) بحج الغير (عنه) فلا اعادة مطلقاسواء (استمر به ذلك العذر ام لا).

وفى الشامية (۲/۵۹۸): والحاصل ان من قدر على الحج وهو صحيح ثم عجز لزمه الاحجاج اتفاقا اما من لم يملك مالا حتى عجز عن الاداء بنفسه فهو على الخلاف واصله ان صحة البدن شرط للوجوب عنده ولوجوب الاداء عندهما وقدمنا اول الحج اختلاف التصحيح وان قول الامام هو المذهب (قوله حتى تلزم الاعادة بزوال العذر) اى العذر الذى يرجى زواله كالحبس والمرض بخلاف نحو العمى فلا اعادة لوزال على مايأتى.

وفى الفقه الاسلامى (۳/۲۰۹۷): يجوز الحج عن الغير الذى مات ولم يحج او عن المريض الحى الذى عجز عن الحج لعذر وله مال...... قال الحنفية من لم يجب عليه الحج بنفسه لعذر كالمريض ونحوه وله مال يلزمه ان يحج رجلا عنه ويجزئه عن حجة الاسلام اى انه تجوز النيابة فى الحج عند العجز فقط لاعند القدرة بشرط دوام العجز الى الموت.

(۲۲) والدین کی تیمارداری کیلئے حج کو مؤخر کرنا

سوال　کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک ساتھی ہے اس نے حج کیلئے فارم جمع

کروایا اور مرمجبی نکل آیا اور اس پر یہ حج فرض بھی تھا، اب ہوا یہ کہ جب روانگی میں ایک ہفتہ باقی تھا تو اس کے والد صاحب سخت بیمار ہوگئے والدصاحب کہتے ہیں کہ پتا نہیں کہ پھر میں تجھے دیکھوں گا یا نہیں اور تیرے علاوہ کوئی دوسرا میرا خیال نہیں رکھتا اسلئے تو اس سال حج پر نہ جا، تو پوچھنا یہ ہے کہ ایک طرف اللہ کا حکم ہے کہ حج کرو اور دوسری طرف والدصاحب کی تیمارداری کیلئے کوئی نہیں ہے اور آئندہ کچھ پتا نہیں کہ میرے دوست کے پاس اتنی رقم ہوگی بھی یا نہیں، اب میرے دوست کیلئے کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً بصورت مسئولہ میں آپ کے ساتھی کیلئے حج پر نکلنا مکروہ تحریمی ہے کیونکہ جب حقوق اللہ اور حقوق العباد میں تعارض آجائے تو ترجیح حقوق العباد کو دی جاتی ہے لہٰذا آپ کے ساتھی کو چاہئے کہ اس سال حج پر نہ جائیں والدصاحب کی خدمت کریں پھر جب یہ عذر ختم ہوجائے تو حج کرلے۔

لمافی لطحطاوی علی الدر (۱۰۹/۳): اذا اراد الابن ان یخرج الی الحج وابوه کاره لذلک. اذا کان الاب مستغنیا عن خدمته فلاباس به وان کان محتاجا یکره کذا الام وفی السیر الکبیر اذا لم یخف علیه الضعف فلاباس به.

وفی الشامیة (۴۵٦/۲): (قوله ممن یجب استئذانه) کأحد أبویه المحتاج إلى خدمته وظاهره أن الکراهة تحریمیة ولذا عبر الشارح بالوجوب .... قال فی البحر: وهذا کله فی حج الفرض أما حج النفل فطاعة الوالدین أولى مطلقا کما صرح به فی الملتقط.

(۲۳) کیا نفلی حج کیلئے والدین کی اجازت ضروری ہے؟

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا اس سال نفلی حج کرنے کا ارادہ ہے لیکن والدین منع کررہے ہیں آپ نے حج فرض ادا کرلیا ہے نفلی کی کیا ضرورت ہے لہٰذا آپ حضرات سے معلوم یہ کرنا ہے کہ میں نفلی حج کیلئے والدین کی اجازت کے بغیر جا سکتا ہوں؟

الجواب حامداً ومصلیاً اگر آپ کے والدین کو آپ کے نفلی حج کیلئے جانے کی وجہ سے کسی بھی سخت تکلیف و پریشانی کے پیش آنے کا قوی اندیشہ ہے مثلاً ان کو آپ کی خدمت کی ضرورت ہے اور کوئی دوسرا خدمت کرنے والا نہیں ہے وغیرہ، تو آپ کیلئے نفلی حج کیلئے جانا جائز نہیں۔ اور اگر ان کو کسی قسم کی تکلیف و پریشانی کے پیش آنے کا اندیشہ نہیں ہے تو پھر ان کی اجازت کے بغیر آپ کے لئے نفلی حج کیلئے جانا جائز ہے۔ لیکن پھر بھی مستحب ومناسب یہی ہے کہ والدین کی اطاعت وفرمانبرداری کو ملحوظ رکھتے ہوئے، آپ والدین کی اجازت کے بغیر نفلی حج کیلئے نہ جائیں۔

لمافی الهندیة (۳٦۵/۵): الابن البالغ یعمل عملا لا ضرر فیه دینا ولا دنیا بوالدیه وهما یکرهانه فلا بد من الاستئذان فیه اذا کان له منه بد.

وقال محمد رحمه الله في السير الكبير اذا اراد الرجل ان يسافر الى غير الجهاد لتجارة او حج او عمرة وكره ذالك ابواه فان كان يخاف الضيعة عليهما بان كان معسرين و نفقتهما عليه وماله لا يفي بالزاد والراحلة و نفقتهما فانه لا يخرج بغير اذنهما سواء كان سفرا يخاف على الولد الهلاك فيه كركوب السفينة في البحر او دخول البادية ماشيا في البرد او الحر الشديدين او لا يخاف على الولد الهلاك فيه. وان كان لا يخاف الضيعة عليهما بان كانا موسرين ولم تكن نفقتهما عليه ان كان سفرا لا يخاف على الولد الهلاك فيه كان له ان يخرج بغير اذنها وإن كان سفرا يخاف على الولد الهلاك فيه لا يخرج الا باذنهما كذا في الذخيرة.

وف الدر المختار(۴/۱۲۵): وفيه لايحل سفر فيه خطر الاباذنهما، ومالا خطر فيه يحل بلا اذن ومنه السفر في طلب العلم.

قال العلامة الشامي في حاشية: (قوله فيه خطر) كالجهاد وسفر البحر والخطر بالخاء المعجمة والطاء المهملة المفتوحتين الاشراف على الهلاك كما في ط عن القاموس. قوله (وما لا خطر) كالسفر للتجارة والحج والعمرة يحل بلا اذن الا ان خيف عليهما الضيعة سرخسي.

(۲۴) چھوٹا (نابالغ) بچہ اگر حج کرے تو کیا اس کا حج نفلی ہوگا یا فرض؟

سوال　کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم دو میاں بیوی اس سال اللہ کے فضل وکرم سے فریضۂ حج کی ادائیگی کیلئے جارہے ہیں۔ ہمارے ساتھ ہمارا نو سالہ بچہ بھی ہے۔ ہم اسے بھی تمام ارکان وافعال کروائیں گے۔ آپ سے پوچھنا یہ تھا کہ چھوٹا بچہ جب ماں باپ کے ساتھ پورا حج کرلے تو آیا بڑے ہونے کے بعد اس پر دوبارہ حج فرض ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً　چھوٹا (نابالغ) بچہ اگر حج کرے تو وہ نفلی حج شمار ہوگا اور بالغ ہونے کے بعد اگر اس کو استطاعت ہوئی تو اس کو حج فرض ادا کرنا ہوگا۔

لما في الهندية(۱/۲۱۷): ولو ان الصبي حج اذا قبل البلوغ فلا يكون ذلك عن حجة الاسلام ويكون تطوعا.

وفي الدر المختار(۲/۴۶۶): (فلو احرم صبي عاقل او احرم عنه ابوه صار محرما)...... (فبلغ او عبد فعتق) قبل الوقوف (فمضى) كل على احرامه (لم يسقط فرضهما) لانعقاده نفلاً.

(۲۵) مالدار شخص کا قرعہ اندازی میں نام نہیں آیا، بعد میں مال ختم ہوگیا؟

سوال　کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص پر حج فرض ہے وہ جانے کا ارادہ بھی رکھتا ہے

لیکن قرعہ اندازی میں اس کا نام نہیں نکلا اب اگر اس کے پاس مال ختم ہو جائے اور حج نہ کر سکے تو یہ گنہگار ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ...صورت مسئولہ میں مذکورہ شخص حج پر نہ جاسکنے کی وجہ سے گنابگار نہیں ہوگا۔لیکن فرضیت بھی ذمہ سے ساقط نہ ہوگی۔

لمافي الهندية(۱/۲۱۶): وهو فرض على الفور وهو الاصح فلا يباح له التاخير بعد الامكان الى العام الثاني فاذا أخره وادى بعد ذلك وقع اداء.

وفي فتاوىٰ الشامية(۲/۴۵۵): ان وجوبه على الفور للاحتياط فان في تاخيره تعريضا للفوات.

وفي الشامية(۲/۴۵۸): شروط الوجوب وهي التي اذوجدت بتمامها وجب الحج والا فلا وهي سبعة: الاسلام والعلم بالوجوب لمن في دار الحرب والبلوغ والعقل والحريه والاستطاعة والوقت اى القدرة في اشهر الحج اوفي وقت خروج اهل بلده.

وفي الفقه الاسلامي(۳/۲۰۷۳): قال ابو حنيفة رحمه الله تعالىٰ وابو يوسفؒ والمالكيه في ارجح القولين والحنابلة يجب الحج بعد توافر الاستطاعة وبقية الشروط الاتية على الفور في العام الاول أى في اول اوقات الامكان فيفسق وترد شهادته بتاخيره سنيناً لان تاخيره معصية صغيرة بارتكابه مرة لايفسق الا بالاصرار لان الفورية ظنية بسبب كون دليلها ظنيا، كما قال الحنفية ويدل عليه انه لو تراخى كان اداء وان اثم بموته قبله.

(۲۶) حاجی کے صاحبِ نصاب ہونے کی وجہ سے قربانی کا حکم

سوال ...کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے خالو جان حج کیلئے سعودی عرب جانے والے ہیں ان کا ارادہ حج تمتع کرنے کا ہے، اب وہ وہاں تمتع کی قربانی تو کریں گے، لیکن معلوم یہ کرنا ہے کہ آیا وہ اپنے مالدار یعنی صاحب نصاب ہونے کی وجہ سے بھی وہاں قربانی کریں گے؟ یا ہم ان کی طرف سے یہاں پاکستان میں قربانی کردیں۔ براہ کرم جلد تسلی بخش جواب مرحمت فرمادیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً ... قربانی واجب ہوتی ہے۔ ہر مسلمان، آزاد، مقیم پر جبکہ وہ صاحب نصاب ہو۔لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ کے خالو جان مقیم نہیں جس کی وجہ سے ان پر قربانی واجب نہیں۔البتہ اگر وہ خود یا آپ ان کے حکم سے قربانی کریں تو یہ جائز ہے۔ یہ ان کی طرف سے نفلی قربانی ہوگی۔

لمافي الهندية(۵/۲۹۳): ولا تجب على المسافرين ولا على الحاج اذا كان محرما وان كان من اهل مكة كذا في شرح الطحطاوى.

وفي الشامية(۲/۱۲۶): هو ضد مسألة دخول الحاج الشام فانه يصير مقيما حكما وان لم ينوى

الاقامة وهذا مسافر حكما وان نوى الاقامة لعدم انقضاء سفر مادام عازما على الخروج قبل خمسة عشر يوما.

وفي الدر المختار(۲/۵۱۳): فلا تجب على حاج مسافر فأما اهل مكة فتلزمهم وان حجوا وقيل لا تلزم المحرم.

(۲۷) جس شخص نے مسجد نمرہ میں قیام کیا اور عرفہ میں نہیں گیا اس کے حج کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اس سال الحمدللہ مجھے آپ کی دعاؤں سے اللہ رب العزت نے حج کی سعادت بخشی بہت اچھا اور بہترین سفر تھا، روحانیت اور نورانیت کی عجیب چاشنی تھی، بہرکیف! میں نے وہاں بعض لوگوں کو دیکھا کہ جو مسجد نمرہ میں قیام کیے ہوئے تھے، اور عرفات کے میدان میں بھی نہیں گئے، بس مستقلاً وہیں رہے تھے، تو کیا ایسا کرنا صحیح ہے؟ اور کیا عرفات میں کچھ وقت گزارنا جو شرط بتایا جاتا ہے کسی صورت میں اسے چھوڑا جا سکتا ہے؟ براہ کرم اس مسئلے کا ضرور جلد جواب دیجئے گا۔

الجواب حامداً ومصلیاً یوم عرفہ کو زوال کے بعد طلوع فجر تک میدان عرفات میں کچھ نہ کچھ وقت گزارنا حج کا سب سے اہم رکن ہے جس نے اس رکن کو ادا نہیں کیا اس کا حج نہیں ہوتا۔ اب ایسے شخص پر لازم ہے کہ وہ حج کے دوسرے افعال کو ادا کرے اور حلال ہو جائے اور اگلے سال پھر حج کی قضا کرے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں جن لوگوں نے مسجد نمرہ میں قیام کیا اور میدانِ عرفات میں نہیں گئے تو ان کا حج ہوا یا نہیں تو یہ اس بات پر موقوف ہے کہ مسجد نمرہ میدان عرفات میں داخل ہے یا نہیں۔ تو اس کے بارے میں علماء کے اقوال مختلف ہیں بعض کہتے ہیں داخل ہے اور بعض کہتے ہیں کہ داخل نہیں، اور بعض کہتے ہیں کہ پچھلا حصہ داخل ہے اور اگلا حصہ داخل نہیں بہرحال جس جگہ کا یقینی طور پر میدان عرفات میں سے ہونا ثابت ہو جائے اس میں تھوڑا سا وقت گزارنے سے یہ رکن ادا ہو جائے گا اور جس جگہ کے بارے میں یقین سے معلوم نہ ہو کہ یہ میدان عرفات میں داخل ہے یا نہیں، وہاں پر قیام کرنے والوں پر احتیاطاً حج کی قضا اگلے سال کرنا فرض ہے۔

لما في اعلاء السنن(۱۰/۱۱۰): واما مسجد نمرة فلا يتأدى بالوقوف فيه ماثبت فرضيته بنص قطعي وهو الوقوف بعرفة احتياطا كما قالو في استقبال الحطيم بل اولى.

وفي الشامية(۲/۵۰۳): قال في المعراج وينزل بعرفات في اى موضع شاء الا الطريق وقرب جبل الرحمة افضل وقال الائمة الثلاثة في نمرة افضل لنزوله عليه الصلوة والسلام فيه قلنا نمرة من عرفة ونزوله عليه الصلوة والسلام فيه لم يكن عن قصد.

وفي مناسك ملا علي قاري(ص۴۲۹): (فائت الحج هو الذي احرم به ثم فاته الوقوف بعرفة ولم

یدرک شیئا منه) ای من زمن الوقوف ومکانه(ولو ساعة لطیفة) ای لغویة لا عرفیة (ولو ادرک ساعة من وقته) مع مکانه (نهارا ای بعد زوال عرفة (اولیلا) لیلة المزدلفة الی طلوع فجرها (فقد تم حجه) لقوله علیه الصلوة والسلام من ادرک عرفة قبل طلوع الفجر فقد ادرک الحج.

وفی تعلیقات مولانا فیض احمد ملتانی علی البنایة(۱۰۴/۵): وقال بعض اصحابنا لعرفات اربع حدود واعلم انه لیس من عرفات وادی عرنة ولا نمرة ولا المسجد المسمی مسجد ابراهیم ویقال له ایضا مسجد عرنة.

(۲۸) یوم النحر (قربانی کے دن) میں حاجی کیلئے چار کام اوران کی ترتیبی رعایت

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ان شاء اللہ تعالیٰ اس سال حج کی سعادت حاصل کررہا ہوں۔اس سلسلے میں،میں ایک مولانا صاحب کے درس حج میں بھی شرکت کرتا ہوں،اور کچھ کتابیں بھی زیر مطالعہ ہیں۔لیکن ابھی آپ سے یہ زحمت دینی تھی کہ مجھے آپ یہ بتادیں کہ قربانی والے دن مجھے کیا کیا کام کرنے ہوں گے؟اگر میں کسی کام کو آگے پیچھے کردوں تو اس صورت میں کوئی مجھ پر دم تو نہیں آئے گا؟براہ کرم جلدی ذرا وضاحت سے جواب عنایت فرمادیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً: واضح رہے کہ یوم النحر (قربانی والے دن) میں حاجی نے چار (۴) کام کرنے ہوں گے۔

(۱) جمرۂ عقبہ (بڑے شیطان) کو سات کنکر مارنا۔ (۲) قربانی کرنا۔البتہ حج افراد ادا کرنے والے کیلئے مستحب ہے جبکہ قارن ومتمتع پر واجب ہے۔ (۳) حلق یا قصر کروانا (یعنی بال چھوٹے کرنا یا استرے سے صاف کروانا)۔ (۴) طواف زیارت کرنا۔

ان پہلے افعال کو اسی ترتیب سے ادا کرنا واجب ہے،لہٰذا حلق یا قربانی میں تقدیم یا تاخیر کرنے سے دم جنایت لازم ہوگا،لیکن یہ دم جنایت قارن ومتمتع کرنے والے کے ساتھ خاص ہے۔حج افراد کرنے والے نے اگر قربانی یا حلق میں تقدیم یا تاخیر کی تو اس پر دم لازم نہیں ہوگا!

جس صورت میں قربانی یا حلق میں تقدیم یا تاخیر کرنے والا شخص قارن یا متمتع ہے تو اس پر دم جنایت بھی لازم ہے۔اور اگر حج افراد کیا ہے تو اس پر دم واجب نہیں ہے۔

وفی الہندیة(۲۳۱/۱): ثم یاتی جمرة العقبة قبل الزوال فیرمیها بسبع حصیات فی بطن الوادی من اسفل الی اعلی مثل حصاة الحذف ولا یقف عندها هکذا فی شرح الطحاوی ثم یرجع الی منی فان کان معه نسک ذبحه وان لم یکن فلا یضره لانه مفرد بالحج ولو کان قارنا او متمتعا فلا بد له من الذبح ثم یحلق او یقصر وفیه ایضا(صـ۲۳۲): ثم یطوف بالبیت فی یومه ذلک طواف الزیارة ان استطاع أومن الغد أو بعد الغد والایؤخر عن ذلک.

وفی الدرالمختار(۵۱۵/۲): (ثم) بعد الرمی (ذبح ان شاء) لانه مفرد (ثم قصر) (صـ۵۱۷) (ثم

طاف للزيارة يوما من ايام النحر) الثلاثة.

وفيه ايضا(صـ٥٥٥): فيجب في يوم النحر اربعة اشياء: الرمي،ثم الذبح لغير المفرد ثم الحلق ثم الطواف لـكـن لاشـي عـلى من طاف قبل الرمي والحلق، نعم يكره لباب وقد تقدم، كما لا شئ على المفرد الا اذا حلق قبل الرمي، لان ذبح لايجب. (ويجب دمان على قارن حلق قبل ذبحه) دم للتاخير، ودم للقران على المذهب كما حرره المصنف: قال: وبه اندفع ماتوهمه بعضهم من جعل الدمين للجناية.

(۲۹) طواف کے درمیان جماعت کھڑی ہونے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص طواف یا سعی شروع کرے لیکن مکمل کرنے سے پہلے جماعت کھڑی ہو جائے تو اس شخص کو کیا کرنا چاہئے؟

الجواب حامداًومصلیاً...... طواف اور سعی کے درمیان جماعت کھڑی ہو جائے، تو دیکھا جائے اگر طواف اور سعی مکمل کرنے سے جماعت کی کوئی رکعت چھوٹنے کا اندیشہ نہ ہو، تو طواف وسعی مکمل کرلے ورنہ طواف اور سعی کو ترک کر کے نماز باجماعت میں شامل ہو جائے، بعد میں جہاں سے چھوڑا تھا وہیں سے اسے مکمل کرلے، از سرِ نو دوبارہ شروع کرنا ضروری نہیں۔

لـمـا فـي الهـنـدية(۱/۲۲۷): ولو أقيمت الصلاة والرجل يطوف أو يسعى يترك الطواف والسعي ويصلي ثم يبني بعد الفراغ من الصلاة.

وفـي الـدر المختار(۲/۴۹۷): ولو خرج منه أو من السعي إلى جنازة أو مكتوبة أو تجديد وضوء ثم عاد بنى وجاز فيهما أكل وبيع.

وفـي الشـامية(۲/۴۹۷): (قـولـه بـنـى) أي عـلـى مـا كـان طافه ولا يلزمه الاستقبال...... بقي ما أذا حـضـرت الـجـنـازة أو المكتوبة في أثناء الشوط هل يتمه أو لا؟ لم أرمن صرح به عندنا وينبغي عدم الاتـمـام إذا خاف فوت الركعة مع الامام وإذا عاد للبناء هل يبني من محل انصرافه أو يبتدئ الشوط من الحجر؟ و الظاهر الأول قياسا على من سبقه الحدث في الصلاة.

(۳۰) میقاتی پر طواف وداع واجب نہیں

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جو لوگ میقات کے اندر قیام پذیر ہوں تو ان پر طواف وداع واجب ہے یا نہیں؟ اگر کوئی طواف وداع نہ کرے تو اس کیلئے کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداًومصلیاً...... جو لوگ میقات کے اندر قیام پذیر ہوں ان پر طواف وداع واجب نہیں بلکہ مندوب ہے اس لئے اگر یہ حج میں

طواف وداع نہ کریں تو ان پر دم وغیرہ کچھ بھی لازم نہ ہوگا البتہ آفاقی (جو نہ مکہ میں قیام پذیر ہے اور نہ میقات میں) پر حج میں طواف وداع واجب ہے اس لئے اگر یہ طواف وداع کیے بغیر واپس آجائے تو اس پر دم لازم ہوگا۔

لما فی الهندية(۱/۲۳۴): وطواف الصدر واجب علی الحاج اذا اراد الخروج من مكة فليس علی المعتمر طواف الصدر ولا يجب علی اهل مكة واهل المواقيت ومن دونهم.

وفيه ايضاً(۱/۲۳۵): ومن نفر ولم يطف للصدر فانه يرجع مالم يجاوز الميقات فان ذكر بعد مجاوزة الميقات لم يرجع فان رجع رجع بعمرة وان عاد بعمرة ابتدأ بطوافها فاذا فرغ من عمرته طاف للصدر.

وفی الدر المختار(۲/۵۲۳): (ثم) اذا اراد السفر(طاف للصدر) ای الوداع (سبعة اشواط بلا رمل وسعی و هو واجب الاعلی اهل مكة) ومن فی حكمهم فلا يجب بل يندب كمن مكث بعده.

وفی الشامية تحته: (قوله وهو واجب) فلو نفر ولم يطف وجب عليه الرجوع ليطوف مالم يجاوز الميقات فيخير بين إراقة الدم والرجوع باحرام جديد بعمرة مبتدئا بطوافها ثم بالصدر ولاشئ عليه لتاخيره والاولیٰ اولیٰ تيسيرا عليه ونفعا للفقراء... (قوله ومن فی حكمهم) ای ممن كان داخل المواقيت.

(۳۱) اپنی بیوی یا والدہ میں سے کس کو حج کروانا بہتر ہے؟

سوال... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے اپنی ماں اور بیوی کو پچھلے سال عمرہ کروایا تھا (یعنی ان تینوں نے عمرہ کیا تھا) اور اب اس آدمی کے پاس اتنے پیسے ہیں کہ وہ خود اور اس کی بیوی حج کر سکتے ہیں لیکن لوگ کہتے ہیں کہ ماں سے اجازت لینا ضروری ہے تو اس صورت میں وہ آدمی کیا کرے اور یہ بھی بتا دیجئے کہ وہ آدمی ان دونوں میں سے کس کو حج کرائے یعنی زیادہ حق ماں کا ہے یا اس کی بیوی کا حق زیادہ ہے۔ جبکہ اس آدمی کا ارادہ اپنی بیوی کو حج کرانے کا ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورت مسئولہ میں شرعاً اس شخص پر ماں یا بیوی کو حج کرانا ضروری نہیں ہے البتہ اس شخص کو اختیار ہوگا کہ اپنی ماں یا بیوی میں سے کسی کو بھی اپنے ساتھ حج پر لے جائے۔ البتہ ماں کو لے جانا زیادہ بہتر ہے۔

لما فی البخاری(۲/۸۸۳): عن أبی هريرة قال جاء رجل إلی رسول الله ﷺ فقال يا رسول الله من احق بحسن صحابتی قال أمک قال ثم من قال أمک قال ثم من قال ثم امک قال ثم من قال ثم أبوک.

وفی فتح الباری(۱۰/۳۳۰): وصححه الحاكم من حديث عائشة سألت النبی ﷺ ای الناس اعظم حقاً علی المرأة قال زوجها قلت فعلی الرجل قال أمه.

(۳۲) حج کے مہینوں میں ملنے والی رقم سے حج نہ کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص گورنمنٹ کا ملازم ہے جب وہ ریٹائرڈ ہوتا ہے تو اسے دو تین لاکھ رقم ملتی ہے اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اتنی رقم سے وہ آسانی حج کر سکتا ہے لیکن درج ذیل ضروریات درپیش ہیں تو آیا اس صورت میں اس پر حج فرض رہے گا یا حج کی فرضیت ساقط ہو جائے گی ضروریات میں ایک تو یہ ہے کہ اس کا اپنا مکان نہیں ہے، کرایہ کے مکان میں رہ رہا ہے اب مکان تعمیر کرے تو ساری رقم اس پر لگ جائے گی۔ اسی طرح دوسری ضرورت یہ ہے کہ اب وہ چونکہ ملازمت سے فارغ ہو گیا ہے تو گزر بسر کیلئے دکان بنانا چاہتا ہے کیونکہ اور کوئی ذریعہ آمدن نہیں ہے اس صورت میں بھی ساری رقم اس پر لگ جائے گی یا یہ ہے کہ گھر میں بچیاں جوان ہیں ان کی شادی کیلئے بھی یہی پونجی ہے تو آیا شرعاً اس شخص کا مذکورہ بالا صورتوں میں حج ادا کرنا ہی ضروری ہے یا ان مصارف میں رقم لگانے کی گنجائش ہے شریعت مطہرہ کی روشنی میں جواب مرحمت فرما کر ممنون فرماویں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورتِ مسئولہ میں اگر شخص مذکور کو یہ رقم اُن ایام میں ملتی ہے جس وقت حج کیلئے داخلہ کارروائی کی جاتی ہے تو اس صورت میں حج فرض ہو جائے گا اور اس رقم کو ضروریات مذکورہ میں سے کسی بھی ضرورت میں صرف کرنا جائز نہیں ہوگا اور اگر اُن ایام سے پہلے یا اُن ایام کے بعد ملتی ہے تو اس صورت میں اس رقم کو ان ضروریات وغیرہ میں صرف کرنا جائز ہوگا۔

لمافي القرآن الكريم(آل عمران:۹۷): ولله على الناس حج البيت من استطاع اليه سبيلاً ط.

وفي الشامية (۲/ ۴۶۲):(قوله لايلزمه) تبع في عزو ذالك الى الخلاصة مافي البحر والنهر والذى رأيته في الخلاصة هكذا وان لم يكن له مسكن ولا شئ من ذالك وعنده دراهم تبلغ به الحج وتبلغ ثمن مسكن وخادم وطعام و قوت وجب عليه الحج وان جعلها في غيره اثم اهـ لكن هذا اذا كان وقت خروج اهل بلده كما صرح به في اللباب امّاقبله فيشترى به ماشاء لانه قبل الوجوب كما في مسألة التزوج الآتية وعليه يحمل كلام الشارح فتدبّر.

(۳۳) حج کرنے کا مکمل طریقہ

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک صاحب جو کہ میرے دوست بھی ہیں ان پر حج فرض ہے لیکن وہ حج پر نہیں جاتے اور عذر یہ پیش کرتے ہیں کہ مجھے احکامات معلوم نہیں ہیں۔ اسلئے آپ اس معاملہ میں میری مدد فرمائیں کہ جب یہ صاحب میقات پر جائیں تو واپسی تک ان کو کیا کیا کرنا چاہئے؟ انشاء اللہ مجھے امید ہے کہ آپ جو احکامات بتائیں گے اور تحریر فرمائیں گے میں انکو دیدوں گا اور وہ جانے کیلئے تیار ہو جائینگے۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورتِ مسئولہ میں آپ کے دوست کا یہ عذر کہ حج کے احکامات معلوم نہیں ہیں درست نہیں ہے۔ اسلئے کہ بندہ

جس طرح نماز وروزہ اسلام کے بنیادی ارکان میں سے ہیں اسی طرح حج بھی ایک بنیادی رکن ہے اور جس طرح نماز وروزہ کے مسائل جاننا ضروری ہے اسی طرح حج کے مسائل بھی جن پر حج فرض ہو جاننا ضروری ہے۔ لہٰذا ان صاحب پر ضروری ہے کہ وہ حج کے مسائل دیکھ کر فریضہ حج ادا کریں۔ اور حج کے احکام تو لوگوں کو دیکھ کر بھی ادا کئے جاسکتے ہیں۔ باقی تفصیلی احکامات کیلئے آپ ہمارے بزرگوں کی کتابوں میں سے کوئی کتاب انھیں دیدیں مثلاً

(۱) طریقہ حج وعمرہ: حضرت مفتی محمد عاشق الٰہی صاحب رحمہ اللہ

(۲) رہنمائے حج: حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ

(۳) فضائل حج: حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا نور اللہ مرقدہ

﴿فصل فی واجبات الحج وسننه﴾

(حج کے واجبات اور سنن کا بیان)

(۳۴) کیا تلبیہ کیلئے خاص الفاظ منقول ہیں؟

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کہتا ہے کہ تلبیہ کیلئے کوئی خاص الفاظ منقول نہیں بس جن الفاظ سے اللہ پاک کی کبریائی بیان ہو، ان سب الفاظ سے جائز ہے، اب آپ حضرات سے معلوم یہ کرنا ہے کہ تلبیہ کیلئے خاص الفاظ پڑھنا ضروری ہے یا دوسرے الفاظ سے بھی ادا ہو جاتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً... تلبیہ کیلئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مخصوص الفاظ منقول ہیں اور انہی الفاظ کے ساتھ تلبیہ مسنون ہے البتہ دیگر الفاظ سے بھی جن سے اللہ تبارک وتعالی کی کبریائی بیان ہوتی ہو، تلبیہ ادا ہو جائے گا لیکن یہ طریقہ سنت کے خلاف اور مکروہ تنزیہی ہوگا۔

لمافي الهندية(۱/۲۲۲): ولو كان مكان التلبية تسبيح أو تحميد أو تهليل أو تمجيد أو ما أشبه ذلك من ذكر الله تعالى ونوى به الا حرام صار محرما سواء كان يحسن التلبية أو لا يحسنها بالإجماع وكذا إذا أتى بلسان آخر أجزأه سواء كان يحسن العربية اولا يحسنها.

وفي الشامية(۲/۴۸۳): (قوله تحريما لقولهم إنها مرة شرط)..... ولا يخفى مافيه فإنه إن أراد أن الشرط خصوص الصيغة المارة ففيه أن ظاهر المذهب كمافي الفتح أنه يصير محرما بكل ثناء وتسبيح وقدمر وإن أراد بها مطلق الذكر فلا يفيد مدعاه وهو كراهة نقص هذه الصيغة تحريما فالحق مافي البحر من أن خصوص التلبية سنة فإذا تركها أصلا ارتكب كراهة التنزيه.

(۳۵) طواف سے قبل سعی کرنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص عمرہ کیلئے جائے اور وہ طواف کرنے سے قبل سعی کر لے تو اس کیلئے کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً سعی کرنا واجب ہے اور اس کی صحت کی شرائط میں سے یہ ہے کہ سعی طواف کے بعد کی جائے۔ لہذا اگر کسی نے

طواف کے بعد یا طواف کے چار چکروں کے بعد سعی کی تو درست ہے اور اگر طواف سے قبل یا طواف کے چار چکروں سے پہلے سعی کی تو اس پر دوبارہ سعی کرنا ضروری ہے۔

لمافي المبسوط للسرخسي (۴/۱د): لايجوز السعي قبل الطواف(الى ان قال) ويجوز السعي بعد ان يطوف الأكثر من الطواف لأن الاكثر يقوم مقام الكل.

وفي الشامية (۲/۵۰۰):واشار ايضا الى ان السعي بعد الطواف فلو عكس اعاد السعي لأنه تبع له.

(۳۶) حالت طواف میں رمل کی ابتداء اور طواف کی مسنون دعائیں

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آئندہ سال میرا حج پر جانے کا ارادہ ہے اور اس کے بارے میں میں نے اپنے امام صاحب سے تھوڑے مسائل سیکھنا بھی شروع کردیے ہیں لیکن جب طواف کے متعلق مسائل شروع ہوئے تو اس میں رمل اور مسنون دعاؤں سے متعلق ایک طویل گفتگو کی لیکن میرے ذہن میں ایک مسئلہ بھی نہیں آیا تو میں نے اس سے کہا کہ آیا طواف میں رمل کسی خاص جگہ سے شروع ہوگا یا طواف کے شروع سے آخر تک رمل ہوگا۔ دوسری بات یہ ہے کہ میرا حافظہ خصوصاً عربی کے بارے میں بہت کمزور ہے میں اتنی زیادہ دعائیں یاد نہیں کرسکتا ہوں مجھے کوئی ایک آدھ دعا بتائیں تو ان دونوں مسائل کے بارے میں انہوں نے لاعلمی ظاہر کی لہٰذا آپ حضرات برائے مہربانی ان دونوں مسائل کے بارے میں پوری وضاحت سے جواب دے دیں اور حج سے متعلق مسائل کے بارے میں کوئی اچھی سی کتاب ہو تو ان کا نام بھی تحریر کریں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......(۱)۔رمل ہر اس طواف میں ہوتا ہے جس کے بعد سعی ہو اور حالت طواف میں رمل کی ابتداء حجر اسود سے شروع ہوگی اور پہلے تین چکروں میں صرف رمل کرنا ہوتا ہے، اور جب تیسرے چکر میں حجر اسود کے پاس پہنچ جائیں تو اس وقت رمل ختم ہوجائے گا اور بقیہ چار چکر اپنی درمیانی چال کے اعتبار سے ادا کئے جائیں گے۔

(۲)۔ابتدائے طواف کے وقت مذکورہ دعا پڑھنی چاہئے" بسم الله والله اكبر اللّٰهم ايمانا بك وتصديقا بكتابك ووفاء بعهدك واتباعا لسنة نبيك صلى الله عليه وسلم "اور رمل کے وقت یہ دعا پڑھیں" اللّٰهم اجعلهُ حجا مبرورا وذنبا مغفورا وسعيا مشكورا "اور بقیہ چار چکروں میں یہ دعا پڑھیں" اللّٰهم اغفر وارحم، واعف عما تعلم وانت الاعز الاكرم، ربنا اتنا في الدنيا حسنة وفي الآخرة حسنة وقنا عذاب النار "۔البتہ اگر آپ ان دعاؤں میں سے کوئی بھی نہ پڑھ سکے تو بھی آپ کا حج درست ہوجائے گا۔

(۳)۔مندرجہ ذیل کتب میں سے کسی ایک سے آپ استفادہ کرسکتے ہیں۔(۱) فضائل حج: مؤلفہ شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔(۲) حج اور عمرہ قدم بقدم: حضرت مولانا مفتی عبدالرؤف سکھروی صاحب دامت برکاتہم۔(۳) حج سنت کے مطابق کیجئے: حضرت مولانا مفتی محمد صاحب دامت فیوضہم جامعۃ الرشید کراچی۔

لما فی الاذکار للنووی(صـ۱۷٦): فصل فی اذکار الطواف، یستحب ان یقول عند استلام الحجر الاسود اولا، وعند ابتداء الطواف ایضاً: "بسم الله والله اکبر، اللھمّ ایمانا بک وتصدیقاً بکتابک ووفاء بعھدک واتباعاً لسنة نبیک صلی الله علیه وسلم" .... ویقول فی رمله فی الاشواط الثلاثة ((اللھم اجعله حجا مبروراً، وذنباً مغفوراً، وسعیا مشکوراً)) ویقول فی الاربعة الباقیة: ((اللھم اغفر وارحم،واعف عما تعلم وانت الاعز الاکرم، اللھم ربنا اتنا فی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة وقنا عذاب النار.......... الخ.

وفی الھندیة (۱/۲۲٦): ویرمل فی الثلاثة الاول من الاشواط ویمشی فی الباقی علی ھیئته کذا فی الکافی. وکذا فی کل طواف بعده سعی فانه یرمل فیه کذا فی فتاوی قاضیخان............... ولو ترک الرمل فی الشوط الاول لا یرمل الافی الشوطین بعده وبنسیانه فی الثلاثة الاول لا یرمل فی الباقی، ولو رمل فی الکل لم یلزمه شئ کذا فی البحر الرائق...... الخ.

وفی الشامیة (۲/۴۹۸): (قوله استاناً) ففی مسلم وابی داؤد والنسائی عن ابن عمر رضی الله عنھما قال ((رمل رسول الله صلی الله علیه وسلم من الحجر الی الحجر ثلاثا ومشی اربعاً فتح............

(قوله ولو فی الثلاثة الخ) قال فی الفتح ولو مشی شوطا ثم تذکر لایرمل الافی شوطین وان لم یذکر فی الثلاثة لایرمل بعد ذالک اھـ ای لان ترک الرمل فی الاربعة سنة، فلو رمل فیھا کان تارکا للسنتین وترک احداھما اسھل بحر، ولو رمل فی الکل لا یلزمه شئ ولوالجیة، وینبغی ان یکرہ تنزیھا لمخالفة السنة بحر .... الخ.

(۳۷) یوم النحر کے بعد منیٰ میں قیام کی شرعی حیثیت

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ منیٰ کا رش مطلق عذر ہے یا مخصوص لوگوں کیلئے ہے؟ نیز عرفات سے مزدلفہ کے راستے میں رش کو منیٰ کے رش پر قیاس کرتے ہوئے منیٰ والا حکم لگانا درست ہے یا نہیں؟ اگر کوئی شخص بوجہ رش کے مزدلفہ تاخیر سے پہنچے اور وقوف نہ کر سکے تو دم لازم ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... یوم النحر کے بعد منیٰ میں تین راتیں گزارنا مسنون ہے، جس کی عدم ادائیگی پر گناہ تو ہوتا ہے، مگر دم لازم نہیں آتا البتہ وقوف مزدلفہ واجب ہے، جس کی ادائیگی نہ ہونے پر دم لازم آتا ہے۔ لیکن اگر بھیڑ یا کسی عذر کی وجہ سے تاخیر ہوگئی یا ادائیگی نہ ہو سکی تو دم لازم نہیں آئے گا۔

لما فی الطحطاوی علی الدر (۱/۵۰۵): (قوله لکن لو ترکه بعذر الخ) لایخص ھذا الواجب بل کل

واجب اذا ترکه للعذر لاشیٔ علیه قاله فی البحر(قوله کزحمة) ولو للرجال مع بعضهم او کان به ضعف او علة.

وفی الدر المختار(۲/۵۱۱): (ثم وقف) بمزدلفة ووقته من طلوع الفجر الی طلوع الشمس ولو مارا کما فی عرفة، لکن لو ترکه بعذر کزحمة بمزدلفة لاشیٔ علیه.

وفی الشامية تحته: (قوله کزحمة) عبارة اللباب الااذا کان لعلة او ضعف، او یکون امراة تخاف الزحام فلا شیٔ علیه اھ لکن قال فی البحر ولم یقید فی المحیط خوف الزحام بالمراة بل اطلقه فشمل الرجل.

وفی الشامية(۲/۵۲۰): قوله فيبيت بها للرمی) ای لیالی أیام الرمی هو السنة فلو بات بغیر ها کره ولا یلزمه شیٔ لباب.

(۳۸) منیٰ میں رات گزارنے کا حکم اور منیٰ سے واپسی کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایام تشریق میں منیٰ میں رات گزارنے کا کیا حکم ہے؟ اگر کوئی شخص قصداً یا جگہ نہ ملنے کی وجہ سے منیٰ کے باہر رات گزارے تو اس کیلئے کیا حکم ہوگا نیز منیٰ سے واپسی کب ہوگی؟

الجواب حامداًومصلیاً......ایام تشریق میں گیارہویں اور بارہویں کو منیٰ میں رات گزارنا سنت ہے اگر کوئی شخص منیٰ کے باہر رات گزارے تو مکروہ ہوگا اور اس پر کچھ بھی لازم نہیں ہوگا اور منیٰ سے واپسی بارہ (۱۲) ذوالحجہ کو زوال شمس کے بعد رمی کرنے کیلئے ہوگی البتہ اگر تیرہویں تاریخ کی رات کو وہاں (منیٰ) ہی ٹھہرا رہا تو تیرہویں تاریخ کو رمی کرنا لازمی ہوجائے گا۔

لمافی الهندية(۱/۲۳۳): ویکره ان یبیت فی غیر منیٰ فی ایام منیٰ فی کذفی شرح الطحطاوی فان بات فی غیرها متعمداً فلا شیٔ علیه عندنا.

وفی الشامية(۲/۵۱۹): (ثم أتی منیٰ) بعدما صلی رکعتی الطواف (یبیت بها لرّمی ای لیالی ایام الرّمی وهو السنة فلو بات بغیرها کره ولایلزمه شیٔ.

(۳۹) دورانِ طواف چکر میں استلام کا رہ جانا

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں جب حج پر گیا تھا تو وہاں بڑا رش تھا۔ بڑی مشکل سے طواف کا موقع ملتا تھا۔ مجھ سے ویسے ہی تیز تیز چلا نہیں جاتا اس لئے کافی دشواری بھی ہورہی تھی۔ اسی کیفیت میں، میں نے طواف کے ایک چکر میں حجر اسود کا استلام نہیں کیا۔ آیا میرا یہ طواف معتبر ہوا یا نہیں؟ براہ کرم مجھے اس بارے میں بتادیجئے اور اب میں کیا کروں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ...... طواف میں استلام مسنون ہے اگر عذر کی بنا پر رہ جائے تو کوئی حرج نہیں۔

لمافی نیل الاوطار (۳/۱۰۳، جزء۵): ان النبی ﷺ کان اذا طاف بالبیت الطواف الاول خبب ثلاثا ومشی اربعا متفق علیهما.

وفی الفتاوی الولوالجیة (۱/۲۵۷): فکذا کل شوط بالاستلام وان استلمت فی اوله واخره تصیر مقیما للسنة ولا یضرک ترکه فیما بین ذالک وهذا دلیل علی ان الاستلام فی الابتداء والانتهاء سنة وفیما بین ذالک ادب.

وفی الهندیة (۱/۲۲۵، ۲۲۶): وان افتتح الطواف باستلام الحجر وختم به وترک الاستلام فیما بین ذالک اجزأه واذا ترک رأسا فقد اساء.

وفی الدر المختار (۲/۴۹۳): (واستلمه) بکفیه وقبله بلا صوت ... (بلا ایذاء) لانه سنة.

وفی الشامیة تحته: (قوله واستلمه) ای بعد ان یرسل یدیه وصفة الاستلام ان یضع کفیه علی الحجر ویضع فمه بین کفیه ویقبله.

(۴۰) دائیں جانب سے طواف شروع کرنا واجب ہے اور ترک کی صورت میں دم لازم ہوگا

سوال ...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے بڑے بھائی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے اس سال حج کی سعادت عطا فرمائی۔ انہیں حج کرنے کی بڑی تمنا تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ آرزو پوری کردی۔ انہیں خانہ کعبہ سے بھی بڑا عشق ہے اس کی بڑی سی تصویر انہوں نے اپنے گھر میں لگا رکھی ہے جب وہ حج پر گئے تو انہوں نے دورانِ طواف اسی عشق اور ادب کی بناء پر اپنا چہرہ خانہ کعبہ کی طرف کئے رکھا اور پورا طواف اسی طرح کیا اب یہاں آکر انہوں نے ہمیں بتایا تو میرے دل میں آیا کہ میں آپ سے اس بارے میں عرض کروں کہ آیا شرعاً ان کا اس طرح کرنا درست تھا؟ اب ان کا یہ طواف صحیح ہوا یا نہیں، اور کیا ان پر دم آئے گا اس کی ادائیگی کی اب کیا صورت ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً ...... طواف کو دائیں جانب سے شروع کرنا یہ واجب ہے۔ اور اس کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ طواف حجر اسود سے دائیں جانب سے اس طرح شروع کرے کہ بیت اللہ شریف کو بائیں جانب میں رکھیں۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر چہرہ کے ساتھ جسم کا رخ بھی خانہ کعبہ کی طرف ہو، تو یہ ناجائز ہے اور آپ کے بھائی پر دم لازم ہوگیا ہے اور اس کی ادائیگی کا طریقہ یہ ہوگا کہ کوئی شخص جو حج یا عمرہ کیلئے جا رہا ہو اس سے حدود حرم میں جانور ذبح کروایا جائے اور اگر صرف چہرہ بیت اللہ کی طرف کیا ہو تو اس صورت میں دم لازم نہ ہوگا البتہ خلاف ادب ہے لیکن طواف دونوں صورتوں میں ہوگیا ہے۔

لمافی الدر المختار (۲/۴۶۸): (والتیامن فیه) ای فی الطواف فی الاصح

وفی الشامية تحته: (قوله التيامن فيه) وهو اخذ الطائف عن يمينه وجعله البيت عن يساره.

وفی غنية الناسک(صـ۱۱۳): التيامن. وهو اخذ الطائف عن يمين نفسه وجعل البيت عن يساره فلو عكس...... واعتد به في ثبوت التحلل عندنا ولكنه ترک الواجب فعليه موجبه.

وفی الشامية(۲/۵۵۸):(قوله ان شاء ذبح الخ) هذا فيما يجب فيه الدم...... (قوله في الحرم) فلو ذبح في غيره لم يجز الا ان يتصدق باللحم على ستة مساكين.

(۴۱) صفاومروہ کی سعی الٹی کر لینے والے شخص کیلئے حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ماموں اپنی کمپنی کی طرف سے اس سال حج کی سعادت حاصل کر کے آئے وہ بیچارے بہت زیادہ لکھے پڑھے نہیں ہیں۔ انہوں نے حج کا طریقہ تو یہیں سیکھ لیا تھا بس ان سے یہ غلطی ہوگئی تھی کہ انہوں نے صفاومروہ پر سعی الٹی کر لی تھی آپ سے پوچھنا یہ ہے آیا اس طرح کرنے سے ان پر کوئی دم وغیرہ تو لازم نہیں ہوگیا؟ براہِ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب مرحمت فرما کر نوازش فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... سعی کی ابتداء صفا سے واجب ہے اور اختتام مروہ پر واجب ہے اگر کسی نے سعی کی ابتداء مروہ سے کی اور اختتام صفا پر کیا تو اس میں پہلا چکر جو کہ مروہ سے شروع کیا تھا اس کا اعتبار نہیں ہوگا اس کے بعد والے چکر شمار ہوں گے۔ صورت مسئولہ میں آپ کے ماموں نے چونکہ الٹی سعی کی جس وجہ سے ان کا پہلا چکر شرعاً غیر معتبر ٹھہرا، انہیں چاہئے تھا کہ اس کے بعد ایک اور چکر لگا لیتے تاکہ سات چکر پورے ہوجاتے۔ لیکن جب انہوں نے ایسا نہیں کیا تو اب ان پر صدقہ دینا واجب ہوگیا جو کہ نصف صاع گندم (پونے دو سیر) یا اس کی قیمت ہے۔

لمافی القرآن الكريم(البقرة): ان الصفا والمروة من شعائر الله...... الخ.

وفی مناسک ملا علی القاریؒ(۱/۵۷۱): لو بدأ بالمروة وختم بالصفا يلزمه اعادة شوط واحد يعني بأن يعود من الصفا إلى المروة. ..... ويكون شوطه الاوّل ساقطة الاعتبار......

وفيه ايضاً(۱/۳۵۵): (ولوترک منه) ای من السعی (ثلاثة اشواط أو اقل فعليه لكل شوط صدقة الا أن يبلغ ذلک دما فله الخيار بين الدم وتنقيص الصدقة)ای بقدر ماشاء أو مقدر بنصف صاع...... الخ.

وفی الشامية(۲/۵۵۶): (ويجب لكل شوط منه ومن السعی نصف صاع) ای لو ترک ثلاثة منه أو اقل فعليه لكل شوط منه صدقة الا أن يبلغ دما فيخير بين الدم وتنقيص الصدقة لباب.

(۴۲) حاجی حضرات کنکریاں کب اور کیسے ماریں گے اور ان کی تعداد کیا ہوگی؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اس سال ہم چند دوست مل کر حج پر جارہے ہیں اللہ تعالیٰ

کے فضل سے ہم سب دوستوں کے نام آ گئے ہیں۔ مجھے ایک صاحب نے بھی بتایا اور ایک کتاب میں بھی پڑھا ہے کہ وہاں شیطان کو کنکریاں بھی مارنا ہوتی ہیں، ہمیں تو کچھ بھی پتا نہیں ہے آپ براہ کرم بتادیں کہ یہ کنکریاں مارنا کب شروع کریں گے؟ اور کیسے ماریں گے؟ اور کنکریوں کی تعداد کیا ہوگی کہاں سے کنکریوں کی ابتداء کریں گے اور کہاں انتہا ہوگی؟

الجواب حامداًومصلیاً...... حاجی حضرات کنکریاں تین دن ماریں گے۔ پہلے دن یعنی دسویں ذوالحجہ کو زوال سے پہلے صرف جمرة العقبہ (بڑے شیطان) کو ماریں گے۔ دوسرے اور تیسرے دن تینوں کو، مسنون طریقہ اس کا یہ ہے کہ دوسرے اور تیسرے دن زوال کے بعد کنکریاں مارنے کی ابتداء مسجد خیف کے قریب جو جمرہ ہے اس سے کی جائے گی پھر جمرة الوسطیٰ (درمیان والا جمرة) پھر آخر میں جمرة العقبہ کو مارا جائے گا۔ اور ہر جمرہ کو سات کنکریوں سے مارا جائے گا اور مارنے کی کیفیت کے بارے میں مختلف اقوال ہیں ان میں آسان اور معتاد یہ ہے کہ انگوٹھے اور انگشت شہادت کے سروں سے مارا جائے۔

لما في الهندية(۱/۲۳۱): ثم ياتي جمرة العقبة قبل الزوال فيرميها بسبع حصيات في بطن الوادى من أسفل الى أعلى مثل حصاة الخذف ويكبر مع كل حصاة ولا يرمي يومئذ من الجمار غيرها ولا يقف عندها...... (وفي صـ۲۳۳): (الخامس) في كيفية الرمي وقد اختلف المشايخ فيها قال بعضهم يأخذ الحصى بطرفي ابهامه وسبابته كانه عاقد ثلاثين ويرميها كذا في المحيط وفي الولوالجية وهو الاصح كذا في التاتارخانية. (وفي صـ۲۳۴) (الثاني عشر) انه في اليوم الاول يرمي جمرة العقبة لاغير وفي بقية الايام يرميها يبدأ بالاولى ثم بالوسطى ثم بجمرة العقبة كذا في المحيط.

وفي الشامية(۲/۵۱۲): (قوله ورمي جمرة العقبة) هي ثالث الجمرات على حد منى من جهة مكة و ليست من منى ويقال لها الجمرة الكبرى والجمرة الاخيرة قهستاني ولا يرمي يومئذ غيرها ولا يقوم عندها حتى ياتي منزله ولوالجية. (وفي صـ۵۱۳): (قوله سبعاً) اى سبع رميات بسبع حصيات فلو رماها دفعة واحدة كان عن واحد ....(قوله اى برؤس الاصابع) قيل كيفية الرمي ان يضع طرف ابهامه اليمنى على وسط السبابة ويضع الحصاة على ظاهر الابهام كانه عاقد سبعين فيرميها: وقيل ان يحلق سبابته و يضعها على مفصل ابهامه كانه عاقد عشرة وقيل ياخذهابطرفي ابهامه وسبابته وهذا هو الاصح لانه الايسر المعتاد: فتح، وكذا صححه في النهاية والولوالجية وهو مراد الشارح فافهم والخلاف في الاولوية والمختار انها مقدار الباقلاء لباب اى قدر الفولة وقيل قدر الحمصة او النواة اوالانملة قال في الانهر وهذا بيان المندوب واما الجواز فيكون ولو بالاكبر مع الكراهة.

وفي الدر المختار(۲/۵۲۰): (وبعد الزوال ثاني النحر رمي الجمار الثلاث يبدأ) استناناً (بما يلي

مسجد الخيف ثم بمايليه) الوسطى (ثم بالعقبة سبعاً سبعاً ووقف)

وفي الشامية تحته : (قوله يبدأ استناناً) حاصله ان هذا الترتيب مسنون لامتعين وبه صرح في المجمع وغيره واختاره في الفتح وقال في اللباب: والاكثر على انه سنة وعزاه شارحه الى البدائع ولكرماني والمحيط والسراجية.

(۴۳) بعض کنکریوں کا حوض میں نہ گرنے کا حکم

سوال ... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ایک دوست ہیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سال حج کی سعادت عطا فرمائی جمرات کی رمی کرتے ہوئے انہیں شک ہوگیا ہے کہ شاید ان کی بعض کنکریاں حوض میں نہیں گریں۔ اب اگر ان کی کچھ کنکریاں واقعی نہیں گری تھیں تو کیا ان پر اس کا اعادہ واجب ہے؟ اور انہیں اس صورت میں کیا کرنا چاہئے تھا؟

الجواب حامداً ومصلیاً ... اگر کسی کو یہ شک ہو جائے کہ بعض کنکریاں حوض (موضع کنکری) میں نہیں گریں تو ایسی صورت میں اگر ممکن ہو تو اتنی تعداد میں کنکریوں کا اعادہ کرنا یہی احتیاط کا تقاضا ہے۔ لیکن شدید ہجوم کی وجہ سے ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں اعادہ کی ضرورت نہیں۔

لمافيالشامية (۲/۵۱۳): وكذا لو رمى وشك في وقوعها موقعها فالإحتياط أن يعيد.

وفي اللجنة الدائمة (۱۱/۲۷۸،۲۷۷): (س): في اليوم الثاني من رمي الجمرات رميت الجمرة الصغرى بعد صلوة العصر بسبع حصيات وأنا متأكد من عدد الحصى وعندما أردت التوجه إلى الجمرة الوسطى حدثتني نفسي: يمكن تكون واحدة خرجت من الحوض فرميت بواحدة عن الشك علماً بأن الرمي كان في الحوض الأعلى في الدور الثاني وبعد خطوات من الجمرة نفسها وقفت محتاراً فرجعت اليها ورميت بحصاة ثانية ولم أتابع رمي الوسطىٰ والكبرىٰ في نفس الوقت لشدة الزحام فخرجت وعدت بعد صلوة العشآء وأكملت رمي الجمرة الوسطىٰ والجمرة الكبرىٰ فهل فيما تقدم شئ أو علي شئ.

ج: رميك للجمرة الصغرى بعد العصر ثم تأخير رمي الجمرة الوسطىٰ والكبرى الى بعد صلاة العشآء لاحرج عليك في ذلك بسبب الزحام والرمي صحيح.

وفي الطحطاوي على الدر(۱/۵۰۵): قوله ورمى جمرة العقبة قيد بالرمي لأنه لووضعها وضعا لم يجزئ لترك الواجب.

وفي الشامية (۲/۵۱۳): (قوله وإلا) اى وإن لم تقع من على ظهره بنفسها، بل بتحرك الرجل أو الجمل أو وقعت بنفسها لكن بعيدا من الجمرة. (قوله لا) قال في الهدايه لأنه لم يعرف قربة الا في

مکان مخصوص وفی اللباب ولو وقعت علی الشاخص ای أطراف المیل الذی هو علامة للجمرة أجزأه ولو علی قبة الشاخص ولم تنزل عنه أنه لایجزیه للبعد وإن لم یدر أنها وقعت فی المرمی بنفسها أو بنقض من وقعت وتحریکه ففیه اختلاف والإحتیاط أن یعیده.

(۴۴) بغیر عذر کے رات کے وقت کنکریاں مارنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل حج اور اس کے سفر میں پیش آنے والے مسائل سے تو آنجناب بخوبی واقف ہوں گے، بالخصوص جب یہ سفر خواتین کے ساتھ ہو، مجھے بھی عنقریب یہ مبارک سفر کرنا ہے اور سفر میں میری والدہ اور والد صاحب بھی ساتھ ہیں۔اب اگر ہم رش کی وجہ سے یا ویسے ہی بغیر عذر کے رات کے وقت کنکریاں مارنا چاہیں تو آیا یہ جائز ہے؟ اور اگر کوئی مرد عورتوں اور کمزوروں کے ساتھ دسویں تاریخ کی رات کو مزدلفہ سے آدھی رات کے بعد روانہ ہو جائے تو کیا وہ جمرۃ العقبہ کو ان عورتوں اور کمزور لوگوں کے ساتھ کنکریاں مار سکتا ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......بغیر عذر کے رات کے وقت کنکریاں مارنا مکروہ ہے جمرۃ العقبہ کو کنکریاں مارنے کا وقت دسویں تاریخ کی صبح صادق سے شروع ہو کر گیارہویں تاریخ کے صبح صادق تک ہوتا ہے۔دسویں تاریخ کی صبح صادق سے پہلے کسی کیلئے بھی کنکریاں مارنا جائز نہیں لہٰذا اگر کوئی مرد عورتوں اور کمزوروں کے ساتھ دسویں تاریخ کی رات کو مزدلفہ سے آدھی رات کے بعد روانہ ہو جائے تو وہ جمرۃ العقبہ کو ان عورتوں اور کمزوروں کے ساتھ دسویں تاریخ کی صبح صادق سے پہلے کنکریاں نہیں مار سکتا البتہ معذورین کیلئے یہ گنجائش ہے کہ وہ گیارہویں تاریخ کے صبح صادق تک بلا کراہت کنکریاں مارنے کو مؤخر کریں۔

لما فی البحر الرائق(۳۴۵/۲): وله اوقات اربعة وقت الجواز ووقت الاستحباب ووقت الاباحة ووقت الکراهة فالأول ابتداء ه من طلوع الفجر یوم النحر وانتهاؤه اذا طلع الفجر من الیوم الثانی حتی لو اخره حتی طلع الفجر فی الیوم الثانی لزمه دم عند ابی حنیفة خلافا لهما ولو رمی قبل طلوع فجر یوم النحر لم یصح اتفاقا والثانی من طلوع الشمس الی الزوال والثالث من الزوال الی الغروب والرابع قبل طلوع الشمس وبعد الغروب.

وفی الهندیة (۲۳۳/۱):(الاول) فی اوقات الرمی وله اوقات ثلاثة یوم النحر وثلاثة من ایام التشریق أولها یوم النحر ووقت الرمی فیه ثلاثة، أنواع مکروه ومسنون ومباح فما بعد طلوع الفجر الی وقت الطلوع مکروه وما بعد طلوع الشمس الی زوالها وقت مسنون وما بعد الزوال الشمس الی غروب الشمس وقت مباح واللیل وقت مکروه ولو رمی قبل طلوع الفجر لم یصح اتفاقا وأما وقت الرمی فی الیوم الثانی والثالث فهو ما بعد الزوال الی طلوع الشمس من الغد حتی لا یجوز الرمی فیهما قبل

الـزوال إلا أن مـابـعـد الـزوال الـى عروب الـشـمـس وقت مسنون وما بعد الغروب الى طلوع الفجر وقـت مـكـروه واما وقته في اليوم الرابع فعند ابى حنيفة من طلوع الفجر الى غروب الشمس الا أن مـاقـابـل الـزوال وقـت مـكـروه وما بعده مسنون، وايضاً فيه(صـ ۲۳۱): ولو جاوز حد المزدلفة قبل طـلـوع الـفجر فعليه دم لتركـ الوقوف بها الا اذا كان به علة اومرض او ضعف فخاف الزحام فدفع منها ليلا فلاشى عليه.

وفيالـدرالـمـخـتـار(۲/ ۵۱۱): (ثـم وقف) بـمـزدلفة ووقته من طلوع الفجرالى طلوع الشمس ولو ماراكما في عرفة لكن لو تركه بعذر كزحمة بمزدلفة لاشى عليه،

وفـي الشـامية تـحته (قوله ثم وقف) هذا الوقوف واجب عندنا لاسنة والبيتوتة بمزدلفة سنة مؤكدة الـى الـفـجر لا واجبة خلافا للشافعي فيهما كما في اللباب وشرحه(قوله ووقته) اى وقت جوازه قال فـي اللباب واول وقته طلوع الفجر الثاني من يوم النحر واخره طلوع الشمس منه فمن وقف بها قبل طـلـوع الفجر اوبعد طلوع الشمس لايعتدبه وقدر الواجب منه ساعة ولو لطيفة وقدر السنة استداد الـوقـوف الـى الاسفار جدا واما (قوله كزحمة) عبارة اللباب الا اذا كان لعلة او ضعف او يكون امرأة تـخـاف الزحام فلا شى عليه لكن قال في البحر ولم يقيد في المحيط خوف الزحام بالمرأة بل اطـلـقه فشمل الرجل، قلت وهوشامل لخوف الزحمة عند الرمى فمقتضاه انه لودفع ليلا ليرمى قبل دفـع الـنـاس ورحمتهم لاشي عليه لكن لاشكـ ان الزحمة عند الرمى وفي الطريق قبل الوصول اليه امـر مـحـقق في زماننا فيلزم منه سقوط واجب الوقوف بمزدلفة فالاولى تقيد خوف الزحمة بالمرأة ويـحـمـل عـلـى اطـلاق الـمحيط عليه لكون ذلكـ عذر ظاهرا في حقها يسقط به الواجب بخلاف الـرجـل اويـحـمـل على ماذا خاف الزحمة لنحو مرض ولذا قال في السراج الا اذا كانت به علة او مـرض اوضعف فخاف الزحام فدفع ليلا فلاشى عليه ....(قوله لاشى عليه) وكذا كل واجب اذا تـركـه بـعـذر لاشـى عليه كما في الـبـحر اى بخلاف فعل المحظور لعذر كلبس المخيط ونحوه فان العذر لايسقط الدم كما سياتى.

وفـيـه ايـضـاً (۲/۵۱۵): تـحـتـه (قوله ووقته) اى وقت جوازه اداء من الفجر اى فجر النحر الى فجر الـيـوم الـثـانـى قـال فـى الـبـحر حتى لواخره حتى طلع الفجر في اليوم الثاني لزمه دم عنده خلافا لهما ولـورمـى قـبـل طـلـوع فجر الـنحر لم يصح اتفاقا.... (قوله ويكره للفجر) اى من الغروب الى الفجر وكـذا يكره قبل طلوع الشمس بحر وهذا عند عدم العذر فلا إساءة برمى الضعفة قبل الشمس ولا

برمی الرعاة ليلا كما في الفتح.

(۴۵) رمی جمار کیلئے عذر کی وجہ سے جمرات کے آس پاس سے کنکریاں اٹھا کر رمی کرنے کا حکم

سوال ... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ماموں گھٹیا کے مریض ہیں۔اس سال جب وہ حج پر گئے تھے تو سردی کی وجہ سے مرض میں بھی شدت آ گئی تھی۔جس کی وجہ سے چلنے میں کافی دشواری ہورہی تھی۔انہوں نے جمرات کے پاس سے ہی کنکریاں لے کر رمی کرلی تھی۔اوراب حج سے واپسی پر اس کا تذکرہ کیا۔مجھے تشویش ہوئی کہ کہیں اس سے ان کے حج پر تو کوئی اثر نہیں پڑا؟ براہ کرم اپنی تحقیق سے سرفراز فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیا...... مستحب یہ ہے کہ رمی جمرات کے لئے کنکریاں مزدلفہ سے لے لے، اگر کسی نے جمرات کے آس پاس سے کنکریاں اٹھا کر رمی کی تو یہ مناسب نہیں کیونکہ ان کنکریوں کے بارے میں آتا ہے کہ وہ مردود ہیں یعنی جن کا حج قبول نہیں ہوتا اس کی کنکریاں رمی کی جگہ باقی رہ جاتی ہیں اور جن کا حج قبول ہوتا ہے ان کی کنکریاں اللہ کے حکم سے اٹھالی جاتی ہیں اس لئے بدشگونی سے بچنے کے لئے جمرات کے آس پاس سے کنکریاں اٹھا کر رمی نہ کرے لیکن اگر کسی نے وہاں سے کنکریاں اٹھا کر رمی کی تو جائز ہے مگر مکروہ ہوگا۔

لما في الهندية(۱/۲۳۳): ويستحب ان ياخذ حصى الجمار من المزدلفة اومن الطريق ولا يرمي بحصاة اخذها من عند الجمرة فان رمى بها جاز وقد اساء.

وفي الطحطاوي على الدر (۱/۵۰۶): ولم يبين المصنف الموضع الذي تؤخذ منه الجمرات وقد قالوا انه يجوز اخذها من اى موضع شاء فياخذها من مزدلفة او قارعة الطريق وتعين الاخذ من مزدلفة ليس مذهبنا قاله الكرماني (قوله لانها مردودة) اى فيتشاء م بأخذها.

وفي الشامية (۲/۵۱۵):(ويكره اخذها من عند الجمرة) وماهي الا كراهة تنزيه فتح، اشار الى انه يجوز أخذه من أي موضع سواه وفي اللباب يستحب ان يرفع من مزدلفة سبع حصيات....... (قوله لانها مردودة)اى فيتشاء م بها.

(۴۶) لاعلمی کی بنا پر جمرات یعنی موضع رمی سے کنکریاں اٹھا کر رمی کرنے کا حکم

سوال ... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں اس سال حج پر گیا باقی کام تو میں نے صحیح کیے لیکن کنکریوں کے وقت میں نے حوض سے کنکریاں اٹھا کر رمی کرلی اب جب گھر واپس آ گیا تو معلوم ہوا کہ حوض سے کنکریاں اٹھا کر رمی کرنا صحیح نہیں ہے تو مجھے سخت افسوس ہوا اب میرے لئے شرعاً کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیا...... رمی جمار کیلئے مستحب یہ ہے کہ کنکریاں مزدلفہ سے یا راستہ سے اٹھائی جائیں نیز اس کے علاوہ بھی ہر جگہ سے

کنکریاں اٹھانا جائز ہے سوائے جمرات یعنی مجمع رمی کے کیونکہ وہاں پر موجود کنکریاں ان لوگوں کی پھینکی ہوئی ہوتی ہیں جن کا حج قبول نہیں ہوا بلکہ مردود ہوگیا اس بناء پر ان سے رمی کرنا فقہاء کرام نے مکروہ تنزیہی لکھا ہے لہٰذا آپ نے مکروہ فعل کا ارتکاب کیا ہے جس پر آپ صرف استغفار کریں دم وغیرہ واجب نہیں۔

لـمافي فتاوىٰ الهندية(۱/۲۳۳): ويستحب ان ياخذ الحصى الجمار من المزدلفة او من الطريق ولا يرمى بحصاة أخذها من عند الجمرة فان رمى بها جاز وقداساء كذا في السراج.

وفي الشامية(۲/۵۱۵): (قوله ويكره اخذها من عند الجمرة) وما هي الاكراهة تنزيه فتح، أشار الى انة يجوز اخذه من اى موضع سواه وفي اللباب يستحب أن يرفع من مزدلفة سبع حصيات ويرمى بها جمرة العقبه وإن رفع من المزدلفة سبعين او من الطريق فهو جائز وقيل مستحب قال شارحه: لكن قال الكرماني وهذا خلاف السنة وليس مذهبنا وأما ما في البدائع وغيرها من أنه ياخذ حصى الجمار من المزدلفة اومن الطريق فينبغى حمله على الجمار السبعة وكذا مافى الظهيرية من انه يستحب إلتقاطها من قوارع الطريق. والحاصل: ان التقاط ماعدا السبعة ليس له محل مخصوص عندنا (قوله لأنها مردودة) اى فيتشاء م بها سراج.

(۴۷) کمزور یا ضعیف العمر شخص کی طرف سے کنکریاں مارنے کا حکم

سوال ...کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص کمزور یا ضعیف العمر ہو، اور کنکریاں مارتے وقت کسی نقصان کا اندیشہ ہو، تو ان کی طرف سے کوئی دوسرا شخص کنکریاں مار سکتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلياً ایسا کمزور یا ضعیف العمر شخص جو خود کنکریاں مارنے پر قادر نہ ہو تو اس کی طرف سے دوسرے شخص کا کنکریاں مارنا جائز ہے۔

لمافي الهندية(۱/۲۳۶): مريض لايستطع الرمى توضع الحصاة في كفه ليرمى به أو يرمى عنه غيره بامره كذافي محيط السرخسي في صفة الرامي.

وفي الشامية(۲/۵۱۱): (قوله كزحمة) عبارة اللباب الا اذا كان لعلة اوضعف او يكون امرأة تخاف الزحام فلا شئ عليه اهـ، لكن قال في البحر ولم يقيد في المحيط خوف الزحام بالمرأة بل أطلقه فشمل الرجل. قلت وهو شامل لخوف الزحمة عند الرمى فمقتضاه انه لودفع ليلا ليرمى قبل دفع الناس وزحمتهم لاشي عليه لكن لا شك ان الزحمة عند الرمى وفي الطريق قبل الوصول اليه امر محقق في زماننا.

﴿فصل فی اشتراط المحرم للمرأۃ﴾

(عورتوں کیلئے محرم کی شرط کا بیان)

(۴۸) عورت کا بغیر محرم کے حج کرنا جائز نہیں

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری بڑی بہن جو کہ بیوہ ہیں ان کے پاس اتنی رقم جمع ہوگئی ہے کہ وہ تنہا حج پر چلی جائیں۔لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ محرم کوئی نہیں ہے، کیا عورت بغیر محرم کے حج نہیں کرسکتی؟ اگر کوئی ایسی صورت ہو کہ عورت جس میں بغیر محرم کے حج پر چلی جائے تو تحریر فرمائیں۔نیز کن افراد کیساتھ عورت حج یا سفر کرسکتی ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً عورت بغیر محرم کے حج نہیں کرسکتی جبکہ اسکے اور مکہ مکرمہ کے درمیان اڑتالیس (۴۸) میل کی مسافت ہو، اگر اس سے کم مسافت ہو تو عورت بغیر محرم کے سفر کرسکتی ہے۔محرم وہ ہوتا ہے جس سے اس عورت کا نکاح ہمیشہ کیلئے حرام ہو مثلاً باپ، بیٹا، دادا، نانا، نواسہ، پوتا، بھانجا، بھتیجا وغیرہ۔

عورت خاوند یا محرم کیساتھ حج یا سفر کرسکتی ہے بشرطیکہ محرم معتبر اور امانتدار ہو اور وہ عورت کی حفاظت کرسکتا ہو۔

وفی الشامیة (۲/۴۶۴): (قوله مع زوج أو محرم) ...... والمحرم من لایجوزله مناکحتها علی التأبید بقرابة اورضاع أوصهرية......(قوله فی سفر) هو ثلاثة ايام ولياليها فيباح لها الخروج الی مادونه لحاجة بغير محرم.

(۴۹) عورت کا حج کیلئے ''صرف جہاز میں بغیر محرم کے'' سفر کرنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم نے سنا ہے کہ عورت بغیر محرم کے حج نہیں کرسکتی۔ آجکل اس طرح ہوتا ہے کہ باپ یا شوہر اپنی بیٹی یا بیوی کو یہاں ائیرپورٹ سے جہاز میں سوار کرکے روانہ کردیتے ہیں اور وہاں سعودی ائیرپورٹ پراسکا کوئی محرم بیٹا وغیرہ اسکو لینے کیلئے آجاتے ہیں تو اس طرح کرنے سے عورت حج کرسکتی ہے؟ اور جو اس طرح حج کرلے تو کیا اسکا حج ادا ہوگیا یا دوبارہ سے کرنا پڑیگا؟

الجواب حامداًومصلیاً عورت کا بغیر شوہر یا محرم کے سفر شرعی (۴۸ میل: ۷۷ کلومیٹر) میں اکیلے جانا جائز نہیں ہے، اسی طرح عورت کو جہاز میں تنہا سفر کرانا جائز نہیں ہے البتہ جو عورت اس طرح سفر کرکے حج کریگی اسکا حج تو ادا ہوجائیگا لیکن گناہگار ہوگی۔

مر دلائلہ(رقم ۴۹ صـ ۳۷۱)

(۵۰) بیٹا سعودیہ میں ہے والدہ کا بغیر محرم کے حج کیلئے جہاز میں سفر کرنے کا حکم

سوال ... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت کا بیٹا سعودیہ عرب میں رہتا ہے اور یہ اپنے خاوند کے ساتھ پاکستان میں رہتی ہے اب اس کا حج کرنے کا ارادہ ہے لیکن اتنا پیسہ نہیں ہے کہ شوہر کو یا کسی اور محرم کو ساتھ لے جائے اب اگر یہ حج پر چلی جائے ادھر پاکستان سے شوہر اس کو جہاز پر سوار کردے اور اُدھر جدہ میں بیٹا آجائے وہ جہاز سے اتارے تو کیا اس طرح عورت حج پر جاسکتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... سفر شرعی میں عورت کیلئے ضروری ہے کہ پورے سفر میں شوہر یا کوئی دوسرا محرم ساتھ ہو، لہٰذا یہ عورت حج کیلئے بغیر محرم کے نہیں جاسکتی، البتہ عورت اگر محرم کا خرچہ برداشت کرے تو حج کیلئے جاسکتی ہے۔

لمافی التاتارخانیہ(۲/۴۳۵): ویجب علیه النفقة والراحلة فی مالها للمحرم لیحج بها وروی الحسن عن ابی حنیفة فی المرأة القادرة علی نفقة نفسهاو نفقة المحرم ان الحج یفترض علیها واضطربت الروایات عن محمد فی هذا اکثر المتاخرین علی انها اذا وجدت محرماً لا تکون علیها نفقته یفترض علیها الحج وإلافلا.

وفی الهندیة(۱/۲۱۹): وتجب علیه النفقة والراحلة فی مالها للمحرم لیحج بها وعند وجود المحرم کان علیها ان تحج حجة الاسلام.

وفی الشامی(۲/۴۶۴): قوله مع وجوب النفقة) ای فیشترط ان تکون قادرة علی نفقتها ونفقته (قوله لمحرمها) قیدبه لانه لوخرج معها زوجها فلا نفقة له علیها بل هی لها علیه النفقة وان لم یخرج معها فکذالک عند ابی یوسف وقال محمد لانفقة لها لانها مانعة نفسها بفعلها.

(۵۱) سفرِ حج میں شوہر کی وفات کی صورت میں عورت کیلئے شرعی حکم

سوال ..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت اپنے شوہر کے ساتھ حج کرنے کیلئے گئی راستے میں اس کا شوہر فوت ہوگیا اب یہ عورت اکیلے حج کرسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... عورت کے حج ادا کرنے کیلئے شوہر یا محرم کا ساتھ ہونا ضروری ہے اگر کسی عوت کا شوہر یا محرم احرام باندھنے کے بعد دوران سفرِ حج راستے میں فوت ہوجائے اور مکہ اور اس جگہ میں ۴۸ میل سے کم کا فاصلہ ہو تو پھر عورت اکیلی حج کیلئے جاسکتی ہے اور اگر ۴۸ میل یا اس سے زیادہ کا فاصلہ ہو تو پھر وہ عورت محصرہ شمار ہوگی اور محصرہ کا حکم یہ ہے کہ وہ بکری یا اس کی قیمت کو حرم بھیج دے اس بکری کو یا

اس قیمت سے بکری خرید کراس کی طرف سے ذبح کرنے سے وہ حلال ہوجائے گی یہ اس وقت ہے جب واپس آنا یا وہاں ٹھہرنا ممکن ہو اگر نہ واپس آسکتی ہے اور نہ وہاں ٹھہر سکتی ہے تو اس وقت ایسی عورت کیلئے اکیلے حج کرنے کی گنجائش ہے۔

لمافی الهندية(۱/۲۱۹): ووجود المحرم للمرأة شرط لوجوب الحج ام لادائه بعضهم جعلوها شرطا للوجوب و بعضهم شرطا للاداء وهو الصحيح. (وفی صـ۲۵۵): واذا مات محرم المرأة فی الطريق وبينها وبين مكة مسيرة ثلاثة ايام فصاعداً فهی بمنزلة المحصر ......(وأما حكم الاحصار) فهو ان يبعث بالهدی او بثمنه ليشتری به هديا ويذبح عنه وما لم يذبح لايحل وهوقول عامة العلماء سواء شرط عند الاحرام الا هلال بغير ذبح عند الاحصار اولم يشترط ويجب ان يواعد يوماً معلوماً يذبح عنه فيحل بعد الذبح ولا يحل قبله حتی لو فعل شيئاً من محظورات الاحرام قبل ذبح الهدی يجب عليه مايجب علی المحرم اذا لم يكن محصراً.

وفی الشامية(۲/۵۹۰):(قوله اوموت محرم) اراد به من لا تحرم خلوته بالمرأة فيشمل زوجها و كموتهما عدمهما ابتداءً، فلو احرمت وليس لها محرم ولازوج فهی محصرة كما فی اللباب والبحر، ثم هذا اذا كان بينها و بين مكة مسيرة سفر وبلدها أقل منه أو أكثر، لكن يمكنها المقام فی موضعها والافلا احصار فيما يظهر.

(۵۲) معتدہ کیلئے حج پر جانے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں، میرے شوہر اور میرا چھوٹا بھائی اس سال حج پر جارہے تھے، سب تیاریاں مکمل ہیں ایک ماہ بعد بعد ہماری فلائٹ ہے، لیکن چند روز قبل میرے شوہر کا اچانک انتقال ہوگیا ہے، میں پریشان ہوں اگر حج پر نہیں جاتی تو اتنا پیسہ ضائع ہوگا اور جاتی ہوں تو شوہر سے ابھی ابھی جدائی ہوئی ہے، آپ بتائیں ایسی صورت میں شرعاً مجھے کیا کرنا چاہئے؟ کیا مجھ پر عدت میں بیٹھنا لازمی ہے؟ براہ کرم جلد جواب عنایت فرما کر احسان مند فرمائیں۔

الجواب حامداًومصلیاً...... وہ عورت جس کا شوہر انتقال کرجائے تو اس پر عدت میں بیٹھنا واجب ہوتا ہے اگر وہ عورت غیر حاملہ ہو تو اس کی عدت چار ماہ دس دن ہے، اگر حاملہ ہو تو اس کی عدت وضع حمل ہے، اس دوران گھر سے نکلنا جائز نہیں ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ کو عدت میں بیٹھنا لازم وضروری ہے۔ حج کیلئے جانا جائز نہیں۔ چاہے پیسے واپس ملیں یا نہ ملیں۔

لمافی الهندية(۱/۲۱۹): (ومنها عدم قيام العدة فی حق المراة)عدة وفاة كانت......

فلا تخرج المرأة الی الحج فی عدة طلاق أو موت وكذا الووجبت العدة ......فی مصر...... لا تخرج من ذلک المصر مالم تنقض عدتها كذفی قاضيخان.

وفی الدر المختار(۴۶۵/۲): (و) مع (عدم عدة علیها مطلقاً) اية عدة كانت ابن ملک (والعبرة لو جوبها) ای العدة المانعة من سفرها (وقت خروج اهل بلدها).

وفی الشامية(۴۶۵/۲): (قوله ومع عدم عدة الخ) ای فلا يجب عليها الحج اذا وجدت كمافی شرح المجمع واللباب قال شارحه وهو مشعر بانه شرط الوجوب...... (قوله أية عدة كانت ای سواء كانت عدة وفاة...... (قوله المانعة من سفرها)...... فان كانت فی مصر قرت فيه الى ان تنقضی عدتها ولا تخرج وان وجدت محرما خلافا لهما.

وفی الفقه الاسلامی وادلته(۳۶/۳): الثانی الا تكون معتدة عن طلاق أو وفاة لان الله تعالى نهى المعتدات عن الخروج. بقوله عزوجل (ولا تخرجوهن من بيوتهن ولا يخرجن) ولان الحج يمكن اداؤه فی وقت آخر. فاما العدة فانها تجب فی وقت مخصوص وهو ما بعد الطلاق او الوفاة مباشرة ...... فكان الجمع بين الامرين اولى.

(۵۳) متبنّٰی کے ساتھ حج کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی، اس وجہ سے میں نے اپنی سہیلی کے بیٹے کو گود لے لیا تھا جبکہ اس کی عمر پونے تین سال تھی اور اسے اپنا بیٹا بنالیا تھا۔ اس کی مکمل پرورش میں نے ہی کی تھی۔ اب ماشاءاللہ وہ جوان ہوگیا ہے۔ میرے شوہر کا دو سال قبل انتقال ہوگیا تھا۔ اس لڑکے کے سوا میری کوئی اولاد بھی نہیں ہے۔ اب میں حج پر جانا چاہتی ہوں تو کچھ لوگ کہہ رہے ہیں کہ آپ اس لڑکے کے ساتھ حج نہیں کرسکتیں۔ کیا یہ بات صحیح ہے؟ وہ تو میرے بیٹے کی طرح ہے۔ کیا میں اسے حج پر ساتھ نہیں لے جاسکتی؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... زمانۂ جاہلیت میں یہ طریقہ رائج تھا کہ لوگ کسی دوسرے کی اولاد کو اپنا بیٹا بنالیا کرتے تھے۔ جس کو متبنّٰی کہا جاتا تھا، اور اس کو حقیقی اولاد کے حقوق سے نوازا جاتا تھا۔ لیکن شریعت اسلامیہ میں متبنّٰی کے تصور کو ختم کرکے نسبی اولاد کو ہی حقیقی اولاد قرار دیا گیا اور متبنّٰی کو نامحرم قرار دیا گیا۔ لہٰذا صورت مسئولہ کے پیش نظر آپ اپنے منہ بولے بیٹے کے ساتھ سفر حج نہیں کرسکتیں کیونکہ وہ نامحرم ہے اور نامحرم کے ساتھ سفر حج کرنا ناجائز ہے۔ البتہ کسی محرم (باپ، بھائی، ماموں وغیرہ) کے ساتھ حج پر جاسکتی ہیں۔

لمافی روح المعانی(۱۴۶،۱۴۷/۷): الجزء الحادی والعشرون (وما جعل ادعياء كم ابنائكم) ابطال لما كان فی الجاهلية أيضا وصدر من الاسلام من أنه اذا تبنى الرجل ولد غيره اجريت احكام البنوة عليه وقد تبنى رسول الله ﷺ قبل بعثة زيد بن حارثه والخطاب عامر بن ربيعة...... (ادعوهم لآبائهم) ای انسبوهم اليهم وخصوهم بهم اخرج الشيخان والترمذی والنسائی وغيرهم عن ابن عمر رضی

اللہ عنھما ان زید بن حارثة مولی رسول اللہ ﷺ ماکنا ندعو الازید بن محمد حتی نزل القرآن (ادعوھم لآبائھم) الخ، فقال النبی ﷺ انت زید بن حارثہ بن شراحیل.

وفی الھندیة (۱/۲۱۸): (ومنھا المحرم للمراة) شابة کانت او عجوزا اذا کانت بینھا وبین مکة مسیرة ثلاثة ایام.

وفیالدرالمختار (۲/۴۶۳): (و) مع (زوج أو محرم) ولو عبداً او ذمیا او برضاع (بالغ) قید لھما کمافی النھر بحثا(عاقل والمراھق کبالغ) جوھرة (غیر مجوسی ولافاسق) لعدم حفظھما ...... ولو حجت بلا محرم جاز مع الکراھة.

وفی الشامیة (۲/۴۶۵): تحت (قولہ مع الکراھة) ای التحریمیة ینھی فی حدیث الصحیحین "ولا تسافر امراة ثلاثا الاومعھا محرم" زاد مسلم فی روایة "اوزوج"

(۵۴) عمر رسیدہ خاتون کا شوہر کے چچازاد بھائی کے بیٹے کے ساتھ سفرِ حج کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک خاتون (عمر رسیدہ) اپنے شوہر کے چچازاد بھائی کے بیٹے یا منہ بولے بھائی کے بیٹے کے ساتھ حج کرنے گئی تھی، شرعاً یہ حج ہوا ہے یا نہیں؟ اور رشتہ داروں میں عورت کے محرم کون کون سے حضرات ہوتے ہیں؟ برائے مہربانی قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... عورت چاہے بوڑھی ہو یا جوان حج کے لئے محرم کا ہونا ضروری ہے بغیر محرم کے حج کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے "**لاتحج امرأة الا ومعھا محرم**" (کوئی عورت بھی بغیر محرم کے حج نہ کرے) اور اگر عورت نے بغیر محرم کے حج کرلیا تو کراہت تحریمی کے ساتھ حج ادا ہوجائے گا اور عورت گنہگار ہوگی۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں شوہر کے چچازاد بھائی کا بیٹا یا منہ بولے بھائی کا بیٹا مذکورہ عورت کے لئے محرم نہیں ہیں ان کے ساتھ حج کرنا جائز نہیں تھا البتہ حج ادا کرلیا ہے تو حج کراہت کے ساتھ ادا ہوگیا ہے لیکن مذکورہ عورت ایسا فعل کرنے پر گنہگار ہوئی ہے اس پر توبہ واستغفار کرنا ضروری ہے۔ نیز عورت کے محرم رشتے دار میں ہر وہ شخص داخل ہے جس سے نکاح کرنا ہمیشہ کے لئے حرام ہو، جیسے والد، دادا، بھائی، بیٹا، داماد، ماموں، چچا اسی طرح رضاعی رشتے دار بھی شامل ہیں لیکن فقہاء نے فسادِ زمانہ کی وجہ سے ان کے ساتھ سفر کرنے سے منع فرمایا ہے۔

لمافی اعلاء السنن (۱۰/۱۱-۱۰): عن ابن عباس رضی اللہ عنہ: أن رسول اللہ ﷺ قال: لاتحج امرأة الا ومعھا محرم فقال رجل یا نبی اللہ! انی اکتتبت فی غزوة کذا وامرأتی حاجة قال: ارجع فحج معھا رواہ البزار. وأخرجه الدار قطنی بنحوہ واسنادہ صحیح (درایة ۱۹۳).

وفی الشامیة (۲/۴۶۴): (قولہ ومع زوج او محرم) ھذا وقولہ ومع عدم عدة علیھا شرطان مختصان

بالمرأة فلذا قال لا مرأة وما قبلهما من الشروط مشترک والمحرم من لا یجوز له مناکحتها علی التأبید بقرابة أو رضاع او صهرية کمافی التحفة و أدخل فی الظهیریة بنت موطؤته من الزنا حیث یکون محرما لها وفیه دلیل علی ثبوتها بالوطء الحرام، ولکن قال فی شرح اللباب ذکر قوام الدین شارح الهدایة انه اذا کان محرما بالزنا فلا تسافر معه عند بعضهم والیه ذهب القدوری وبه نأخذ وهو الأحوط فی الدین والأبعد عن التهمة.........

نقل السید ابو السعود عن نفقات البزازیة لاتسافر بأخیها رضاعاً فی زماننا، أی لغلبة الفساد. قلت ویؤیده کراهة الخلوة بها کالصهرة الشابة فینبغی استثناء الصهرة الشابة هنا أیضاً لان السفر کالخلوة ....(قوله ولو عجوزا) أی لا طلاق النصوص بحر قال الشاعر

لکل ساقطة فی الحی لاقطة وکل کاسدة یوماً لها سوق

(۵۵) عورت کیلئے بہنوئی یا دیور کے ساتھ سفر حج کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید اپنی اہلیہ کے ہمراہ حج کا فریضہ ادا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ زید کے ساتھ اس کی سگی بہن اور زید کے دو سالوں کی بیویاں (یعنی زید کی بیوی کے بھائی کی اہلیہ) ہمراہ حج پر جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ تو کیا زید کے ہمراہ مذکورہ عورتیں حج ادا کرنے جاسکتی ہیں۔ نیز اگر زید کے ساتھ اس کے بھائی یعنی بکر کی بیوی (جو زید کی اہلیہ کی سگی بہن ہے) حج پر جاسکتی ہے یا نہیں؟ مزید یہ ہے کہ زید کی خالہ بھی ہمراہ حج کو جائے گی واضح رہے کہ زید کا ایک سالا سعودی عرب میں موجود ہے۔ اور وہ بھی ان کے ساتھ حج ادا کرے گا۔ اگر اس طریقے سے حج کا فریضہ ادا کیا جائے تو گناہ ملے گا یا نہیں؟ نیز گناہ کس کو ملے گا؟ شریعت محمدی کے مطابق جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداًومصلیاً......عورت سفر شرعی (۴۸ میل) یا اس سے زیادہ شوہر یا اپنے کسی محرم کے ساتھ کرسکتی ہے اور محرم سے مراد وہ شخص ہے کہ جس کے ساتھ اس کا نکاح ہمیشہ کیلئے حرام ہو۔ اس کے علاوہ دیگر رشتہ داروں کے ساتھ سفر نہیں کرسکتی۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں زید کے ساتھ اس کی اہلیہ، بہن اور خالہ حج کیلئے جاسکتی ہیں۔ جبکہ زید کے سالوں کی بیویاں (اگر غیر محرم ہیں) اور اس کی بھابھی جو اگرچہ اہلیہ کی بہن ہے وہ زید کے ساتھ حج کیلئے نہیں جاسکتیں۔ اور اصل گناہ گار عورت ہوگی جو غیر محرم کے ساتھ حج کیلئے جارہی ہے۔ البتہ اگر غیر محرم کے ساتھ جانے کے باوجود بھی افعال حج ادا کرلیتی ہے تو کراہت تحریمی کے ساتھ حج ادا ہوجائے گا۔

لمافی قوله تعالیٰ(النساء:۲۳): حرمت علیکم امهاتکم وبناتکم واخواتکم وعماتکم وخلتکم وبنات الاخ و بنات الاخت وامهاتکم التی ارضعنکم واخواتکم من الرضاعة وامهات نسائکم وربائبکم التی فی حجورکم من نسآئکم التی دخلتم بهن فان لم تکونوا دخلتم بهن فلا جناح علیکم

وحلائل ابنائکم الذین من اصلابکم وان تجمعوا بین الاختین الا ماقدسلف.

وفی الصحیح للبخاری(۱/۱۴۷): عن ابن عمر عن النبی ﷺ قال لا تسافر المرأة ثلثا الا معها ذومحرم.

وفی الدر المختار(۲/۴۶۴): (و) مع(زوج أو محرم) ولو عبدا...... (بعد سطر) لامرأة حرة ولوعجوزا فی سفر

وفی الشامیة (۲/۴۶۲) : (قوله ومع زوج أومحرم) هذا وقوله مع عدم عدة علیها شرطان مختصان بالمرأة فلذا قال لامرأة...... والمحرم من لا یجوز له منا کحتها علی التابید بقرابة اورضاع اوصهرية كما فی التحفة.

وفی الدر المختار(۲/۴۶۵): ولو حجت بلا محرم جاز مع الکراهة

وفی الشامیة (۲/۴۶۵) (قوله مع الکراهة) ای التحریمیة للنهی فی حدیث الصحیحین "لاتسافر امرأة ثلاثا الا ومعها محرم" زاد مسلم فی روایة "اوزوج" ط.

(۵۶) عورت کا اجنبی شخص کو بھائی یاماموں بنا کر حج کی ادائیگی کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل بعض عورتوں کے پاس اتنا مال ہوتا ہے جس سے اکیلے وہ حج پر جاسکتی ہیں دوسرے کو ساتھ نہیں لے جاسکتیں، تو وہ حج پر جانے والے کسی قافلے کے ساتھ چلی جاتی ہیں اور قافلے میں سے کسی آدمی کو اپنا بھائی یاماموں وغیرہ بنالیتی ہیں تو کیا اس طرح کرنے سے ان کا حج ادا ہوجائے گا یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً...... عورت پر فرضیت حج کیلئے ایک شرط محرم شرعی کا ساتھ ہونا بھی ہے لہٰذا اگر کسی عورت کے پاس سفرِ حج کیلئے اپنا خرچہ تو ہے لیکن کوئی محرم اس کے ساتھ نہیں اور نہ اس کا خرچہ وہ عورت اٹھاسکتی ہے تو اس عورت پر حج فرض نہیں۔ اور عورت کا کسی اجنبی غیر محرم کو اپنا محرم ظاہر کرنے سے یہ اس عورت کا شرعاً محرم نہ بنے گا۔ تاہم اگر کوئی عورت ایسا کرکے حج پر چلی گئی اور حج کرلیا تو حج تو ادا ہوجائے گا لیکن یہ عورت سخت گنہگار ہوگی۔

لما فی الهندیة(۱/۲۱۸): ومنهاالمحرم للمرأة شابة کانت أو عجوزا اذا کانت بینها وبین مکة مسیرة ثلاثة ایام......والمحرم الزوج ومن لایجوز منا کحتها علی التابید بقرابة اورضاع او مصاهرة.

وفی الطحطاوی(۱/۴۸۳): (قوله مع الکراهة) ای التحریمیة للنهی الوارد فی حدیث الصحیحین لا تسافر امرأة ثلاثا الا ومعها محرم زاد مسلم فی روایة أو زوج.

وفي الدر المختار(۲/۴۶۴،۴۶۵): (و) مع (زوج اومحرم) ولو عبدا او ذميا او برضاع..... (مع) وجوب النفقة لمحرمها (عليها) لانه محبوس (عليها) ...... ولو حجت بلا محرم جاز مع الكراهة.

(۵۷) داماد کے ساتھ عمرہ یا حج کا سفر کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری ممانی صاحبہ عمرے کی ادائیگی کے لئے جانا چاہتی ہیں کیا وہ اپنے داماد اور بیٹی کے ساتھ جاسکتی ہیں۔ براہِ کرم رہنمائی فرمائیں۔اور ماموں کے انتقال کے بعد دورانِ عدت انہوں نے دامادوں سے پردہ نہیں کیا آیا یہ جائز تھا کہ نہیں، قرآن واحادیث کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... سفرِ شرعی (48 میل) عورت، شوہر یا ہر اُس محرم کیساتھ کرسکتی ہے جس کے ساتھ اس کا نکاح کرنا ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ناجائز ہو، اور داماد چونکہ ان محارم میں سے ہے جس کے ساتھ ساس کا نکاح ہمیشہ کے لئے نہیں ہوسکتا ہے۔ اس لئے آپ کی ممانی صاحبہ اپنے داماد کے ساتھ عمرہ کیلئے جاسکتی ہیں۔ نیز جن لوگوں سے عام دنوں میں پردہ ضروری نہیں ان لوگوں سے دورانِ عدت بھی پردہ نہیں۔لہٰذا اگر دورانِ عدت آپ کی ممانی نے اپنے داماد سے پردہ نہیں کیا ہے تو کوئی گناہ کی بات نہیں ہے۔

لما قوله تعالىٰ (سورة النساء ۲۳): حرمت عليكم امهاتكم وبناتكم واخواتكم وعمّٰتكم وخٰلٰتكم وبنات الاخ وبنات الاخت واُمّهٰتكم التى ارضعنكم واخوانكم من الرضاعة وامهات نسائكم.

وفي الصحيح لمسلم(۱/۴۳۳): عن عبد اللّٰهؓ بن عمر عن النبيﷺ لا يحل لامرأة تومن باللّٰه واليوم الاخر تسافر مسيرة ثلاث ليال الاّ معها ذومحرم،

وفي ملتق الابحر(صـ۲۰۹): وزوج او محرم للمرأة ان كان بينها وبين مكة مسافة سفر ولا تحج بلا احدهما (وفي هامشه) وزوج او محرم للمرأة: والمحرم هو الرجل الذى لا يحل له التزوج بهذا المرأة لشدة القرابة بينهما.

وفي الشامية (۲/۴۶۴): (قوله ومع زوج او محرم) هذا وقوله ومع عدم عدة عليها شرطان مختصان بالمرأة فلذا قال لامرأة وما قبلهما من الشروط مشترك، والمحرم من لا يجوز له مناكحتها على التابيد بقرابة او رضاع او صهرية كما فى التحفة وادخل فى الظهيرية بنت موطؤته من الزنا حيث يكون محرماً لها. . (قوله ولو عبداً) راجع لكل من الزوج والمحرم وقوله ذمياً او برضاع يختص بالمحرم كما لا يخفى ح لكن نقل ابو السعود عن نفقات البزازية لاتسافر باخيها رضاعاً فى زماننا اهـ اى لغلبة الفساد. قلت: ويؤيده كراهة الخلوة بها كصهرة الشابة فينبغى استثناء الصهرة الشابة هنا ايضا لان السفر كالخلوة.

(۵۸) خلیہ ساس کا اپنے بھانجی داماد کے ساتھ عمرے پر جانے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

دو بہنوں میں سے ایک کی کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اس کی نند نے اپنا بچہ پیدائش کے وقت اس کو دیدیا۔ اس بچے کی پرورش جوانی تک اس عورت نے کی اور اب اس کی شادی اپنی سگی چھوٹی بہن کی بچی سے کردی۔ اب یہ بتایا جائے کہ یہ عورت اس کے ساتھ عمرہ کی سعادت حاصل کرسکتی ہے؟ نیز لڑکا اپنی بیوی کو بھی عمرہ پر لے کر جارہا ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... عورت کے حج وعمرہ پر جانے کیلئے شوہر یا کسی محرم کا ساتھ ہونا ضروری ہے جس کے ساتھ وہ سفر حج وعمرہ کرسکے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں عورت کا اپنی نند کے بیٹے سے نامحرمیت کا رشتہ ہے جس کی بنا پر عورت کا اپنی نند کے بیٹے کے ساتھ حج وعمرہ پر جانا جائز نہیں البتہ اس لڑکے کے علاوہ کوئی اور محرم موجود ہو تو ان کے ساتھ جاسکتی ہیں۔ نیز مذکورہ لڑکا چونکہ نامحرم ہے اس لئے اس سے مذکورہ عورت کا پردہ کرنا بھی ضروری ہے اگرچہ انہوں نے اس کی پرورش کی ہے۔

لما في الشامية(۲/۴۶۴): (قوله ومع زوج أو محرم) هذا وقوله ومع عدم عدة عليها شرطان مختصان بالمرأة فلذا قال لامرأة وما قبلهما من الشروط مشترک والمحرم من لا يجوز له مناكحتها على التأبيد بقرابة او رضاع او صهرية كمافى التحفة وادخل فى الظهيرية بنت موطوء ته من الزنا حيث يكون محرمالها وفيه دليل على ثبوتها بالوطء الحرام وبما تثبت به حرمة المصاهرة كذا فى الخانية نهر ... (قوله ولو عبدا) راجع لكل من الزوج والمحرم وقوله او ذميا أو برضاع يختص بالمحرم كمالا يخفى ح لكن نقل السيد أبو السعود عن نفقات البزازية لاتسافر بأخيها رضاعا فى زماننا اهـ اى لغلبة الفساد.

قلت: ويؤيده كراهة الخلوة بها كالصهرة الشابة فينبغي استثناء الصهرة الشابة هنا ايضا لأن السفر كالخلوة...... (قوله حرة) مستدرک لأن الكلام فيمن يجب عليه الحج وقدمر اشتراط الحرية فيه، لكن أشار به إلى ان ما استفيد من المقام من عدم جواز السفر للمرأة إلا بزوج أو محرم خاص بالحرة.

﴿فصل فی الاحرام﴾

(احرام اور اس کے مباحات وممنوعات کا بیان)

(۵۹) جب کوئی شخص حج یا عمرہ کا احرام باندھ لیتا ہے تو وہ محرم ہی رہے گا یہاں تک کہ افعال حج یا عمرہ ادا کر لے

سوال ...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ رمضان المبارک میں جب میں عمرہ کے لئے جارہا تھا تو اتفاق ایسا ہوا کہ جس روز ہماری فلائٹ تھی اس روز صبح سے بڑی تیز بارش ہو رہی تھی اور موسم بڑا خراب تھا۔ فلائٹ بھی کینسل ہوگئی تھی۔ اگلی تاریخ پر جب میں روانہ ہوا تو دو صاحب جو کہ ہم زلف تھے، مجھے ملے۔ وہ بھی عمرہ پر جارہے تھے اور اس بارش والے دن بھی ائیرپورٹ آئے تھے، انہوں نے بتایا کہ ہم تو اس دن گھر سے ہی احرام کی نیت کر کے نکلے تھے۔ لیکن جب فلائٹ کینسل ہونے کا علم ہوا تو احرام کھول لیا اور آج پھر آئے ہیں۔ اور اب تو جہاز پرواز کرنے کے بعد نیت کریں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ پہلے احرام باندھ کر آپ نے کھول لیا، اس پر آپ کو دم دینا ہوگا، وہ کہنے لگے کہ ہم نے جان بوجھ کر کوئی ایسا کیا تھا وہ تو مجبوری ہوگئی تھی۔ بہرحال میں نے ان سے بحث نہیں کی۔ بس اتنا کہہ دیا کہ آپ کسی مفتی صاحب سے پوچھ ضرور لیجئے گا۔ اب واپس آکر سوچا کہ میں خود بھی دوبارہ سے صحیح طرح تحقیق کرلوں، آپ بتائیں کہ کیا ان پر دم لازم تھا یا نہیں؟ اور انہیں کیا کرنا چاہئے تھا؟

الجواب حامداً ومصلیاً ...... جب کوئی شخص حج یا عمرہ کی نیت کر کے احرام باندھ لیتا ہے تو پھر وہ محرم ہی رہے گا یہاں تک کہ افعال حج وعمرہ ادا کر لے اگرچہ وہ ان محظورات کا بھی ارتکاب کرے جو حالت احرام میں ان کے لئے جائز نہیں۔ صورت مسئولہ میں اگر ان لوگوں نے یہ سمجھ کر احرام کھول دیا کہ اب ہم احرام سے نکل چکے ہیں، اور ان تمام جنایات کا ارتکاب کیا ہے جو حالت احرام میں جائز نہیں ہے۔ مثلاً سلے ہوئے کپڑے پہنے ہوں، ایک دن یا ایک رات مکمل، ایک بالشت کے برابر خوشبو لگائی ہو، یا ایک بالشت سے کم ہو لیکن لوگ اس کو زیادہ محسوس کر رہے ہوں، یا ہمبستری کر لی یا ناخن کاٹے ہوں دونوں ہاتھ پاؤں کے، یا صرف ایک ہاتھ ایک پاؤں کے، لہٰذا ان تمام جنایات کی صورت میں ایک ہی دم کافی ہوگا البتہ جانور کا حدود حرم میں ذبح کرنا لازمی ہوگا، لیکن جماع کرنے کی صورت میں عمرہ فاسد ہو جاتا ہے اور افعال عمرہ کی ادائیگی کے بعد عمرہ کی قضا واجب ہوگی۔

لما فی الهندیة (۱/۲۴۲): اذا لبس المحرم المخیط علی الوجه المعتاد یوما الی اللیل فعلیه دم وان

کان اقل من ذالک فصدقة کذا فی المحیط، سواء لبسه ناسیاً او عامدا عالما او جاهلا مختارا او مکرها هکذا فی البحر الرائق.

(۱/۲۴۳): وان حلق رأسه من غیر ضرورة فعلیه دم لا یجزیه غیره کذا فی شرح الطحاوی سواء حلق فی الحرم او غیره ......وکذا اذا حلق ربع رأسه او ثلثه یجب علیه دم ...... وان کان اقل من الربع فعلیه فصدقة ...... وان حلق عانته او ابطیه او نتفهما او احدهما فعلیه دم کذا فی سراج الوهاج.

(۱/۲۴۴): ولیس للمحرم ان یقص اظفاره فاذا قص اظافیر ید واحده او رجل واحدة عن غیر ضرورة فعلیه دم وکذالک اذا قلم اظافیر یدیه ورجلیه فی مجلس واحد یکفیه دم واحد ولو قلم ثلاثة اظافیر من ید واحد او رجل واحد تجب علیه الصدقة ولکل ظفر نصف صاع من الحنطة

الجماع فیما دون الفرج واللمس والقبلة بشهوة لاتفسد الحج والعمرة أنزل اولم ینزل رعلیه دم ....

(۱/۲۴۵): وان جامع فی العمرة قبل ان یطوف اربعة اشواط فسدت عمرته فیمضی فیها ویقضیها

وفی الشامیة(۲/۵۴۴): (قوله کاملاً لأن المعتبر الکثرة، قال ابن الکمال فی شرح الهدایة واختلف المشایخ فی الحد الفاصل بین القلیل والکثیر لاختلاف عبارات محمد.

وفی الشامیة (۲/۵۴۵): (تحت قوله المطیب أکثرة)...... قلت: لکن نقلوا عن المجرد ان کان فی ثوبه شبر فی شبر فمکث علیه یوماً یطعم نصف صاع وان کان اقل من یوم فقبضة...... بل ظاهره ان مازاد علی شبر کثیر موجب للدم لکثرة الطیب حینئذ عرفاً فرجع الی اعتبار الکثرة فی الطیب لافی الثوب ...... وأیضاً (صـ۵۴۶) بان الطیب اذا کان فی نفسه کثیر لزم الدم وان اصاب من الثوب اقل من شبر، وان کان قلیلاً لایلزم حتی یصیب اکثر من شبر فی شبر.

وفیه ایضاً(۲/۵۵۳): قال فی اللباب: واعلم ان المحرم اذا نوی رفض الاحرام فجعل یصنع ما یصنعه الحلال من لبس الثیاب والتطیب والحلق والجماع وقتل الصید فانه لا یخرج بذالک من الاحرام وعلیه ان یعود کما کان محرماً ویجب دم واحد لجمیع ما ارتکب و لو کل المحظورات وانما یتعدد الجزاء بتعدد الجنایات اذا لم ینو الرفض، ثم نیة الرفض انما تعتبر ممن زعم انه خرج منه بهذا القصد لجهله مسألة عدم الخروج، واما من علم انه لا یخرج منه بهذا القصد فانها لا تعتبر منه، اهـ.

(۶۰) سفید رنگ کے علاوہ دوسرے رنگ کے احرام کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جب لوگ حج یا عمرہ کا احرام باندھتے ہیں تو سب سفید چادروں میں احرام باندھتے ہیں آیا سفید چادریں ضروری ہیں؟ یا کسی اور رنگ کی چادریں بھی پہن سکتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... حج اور عمرہ کا احرام باندھنے میں سفید چادروں کا استعمال افضل ہے۔ تاہم اگر کوئی شخص سفید رنگ کی چادروں کے علاوہ کسی دوسرے رنگ کی چادریں استعمال کرے تو یہ بھی جائز ہے۔

لمافی الهندية(۱/۲۲۲): وينزع المخيط والخف ويلبس ثوبين ازارا ورداء جديدين او غسيلين والجديد افضل كذا في فتاوىٰ قاضي خان.

وفي الشامية (۲/۴۸۱): (قوله جديدين) اشار بتقديمه الى افضليته، وكونه ابيض افضل من غيره.

(۶۱) احرام باندھنے سے پہلے کپڑوں پر خوشبو لگانے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نیت اور تلبیہ سے پہلے احرام کے کپڑوں پر خوشبو لگانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... نیت اور تلبیہ سے پہلے احرام کے کپڑوں پر ایسی خوشبو لگانا جو کہ جرم نہ ہو جائز ہے اگر چہ اس کی خوشبو احرام باندھنے کے بعد بھی باقی رہے اور اگر ذی جرم ہو جو احرام باندھنے کے بعد بھی باقی رہے تو ایسی خوشبو احرام باندھنے سے پہلے بھی کپڑوں پر لگانا جائز نہیں ہے۔

وفي الهندية(۱/۲۲۲): ولا يجوز التطيب في الثوب بما يبقى عينه على قول الكل على احد الروايتين عنهما قالوا وبه ناخذ كذا في البحر الرائق

وفي الدر المختار(۲/۴۸۱): (وطيب بدنه) ان كان عنده لاثوبه بما تبقى عينه هو الاصح.

وفي الشامية تحته : (قوله بما تبقى عينه) والفرق بين الثوب والبدن انه اعتبر في البدن تابعاً والمتصل بالثوب منفصل عنه، وايضاً المقصود من استنانه وهو حصول الارتفاق حالة المنع منه حاصل بما في البدن فاغنى عن تجويزه في الثوب نهر اهـ.

(۶۲) حالت احرام میں پیشاب یا مذی کے قطرات کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص کے حالتِ احرام میں مذی یا پیشاب کے

قطرات نکل آئیں تو اس کیلئے شرعاً کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... پیشاب، یا مذی کے قطرات نکل آنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، البتہ اِس سے حالت احرام پر شرعاً کچھ اثر نہیں پڑتا، ہاں اگر مذی ملاعبت، مس بالشہوۃ کی وجہ سے نکلے تو اس پر دم واجب ہوگا، اور اگر بغیر مس وملاعبت کے نکلے تو مذی اور پیشاب کے قطرات دونوں کا ایک حکم ہے کہ صرف وضو ٹوٹ گیا ہے۔ باقی افعال حج وعمرہ سوائے طواف کے وہ ادا کرسکتا ہے، طواف کے لئے طہارت شرط ہے، اس لئے اُس پر لازم ہے کہ وہ احرام کے کپڑے اور بدن کے اُن مقامات کو دھوئے جہاں مذی اور پیشاب کے قطرات لگے ہیں، اور وضو کر کے طواف کرے۔

لما في الهندية(۱/۲۲۷): والأصل أن كل عبادة تؤدى لا في المسجد من أحكام المناسك فالطهارة ليست من شرطها كالسعي والوقوف بعرفة والمزدلفة ورمي الجمار ونحوها وكل عبادة في المسجد فالطهارة من شرطها والطواف يؤدى في المسجد. وفيه ايضاً(صـ۲۴۶): ولو طاف طواف الزيارة محدثا فعليه شاة...... وفيه ايضاً (صـ۲۴۶): ولو طاف طواف الزيارة وفي ثوبه نجاسة أكثر من قدر الدرهم أجزاه ولكن مع الكراهة...... ومن طاف طواف الصدر محدثا فعليه صدقة......

وفي الدرالمختار(۲/۴۸۰): (توضأ وغسله أحب وهو للنظافة) لا للطهارة فيحب...... (في حق حائض ونفساء) وصبي (والتيمم له عند العجز) عن الماء (ليس بمشروع) لأنه ملوث.

وفي الشامية (۲/۴۸۰): (قوله ورجحه في النهر) حيث قال انه التحقيق كذا اعترض في البحر على الزيلعي بأن التيمم لم يشرع لهما عند العجز اذا كان طاهرا عن الجنابة ونحوها، والكلام فيه لأنه ملوث ومغبر لكن جعل طهارة ضرورة أداء الصلاة ولا ضرورة فيهما.

وفيه ايضاً(صـ۵۲۸): (تنبيه) قدمنا عن المحيط أن تقديم الطواف شرط صحة السعي، فعن هذا قال القهستاني: فلو حاضت قبل الإحرام إغتسلت وأحرمت وشهدت جميع المناسك ألا الطواف والسعي.

(۶۳) احرام کا کپڑا دھونے کیلئے دوسرا کپڑا بدلنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص نے احرام باندھا اور بعد میں وہ احرام کا کپڑا خراب ہو جائے تو اس کو دھونا اور دھونے کیلئے دوسرا کپڑا بدلنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر احرام کی چادریں کسی وجہ سے ناپاک ہو جائیں تو ان کو اتار کر دوسری چادریں اوڑھ کر دھو لینا چاہئے اسی طرح اگر میلی ہو جائیں تو بھی صفائی ونظافت کیلئے ان کو دھونے میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن محض زیب وزینت کیلئے نہیں دھونا چاہئے۔

لـمـافـي التاتارخانية(۲/۴۸۲): ولو القى ثوبه ولو يقصد به قتل القمل من حر الشمس فلا شي عليه كـمـا لـو غـسـل ثيـابه فمات القمل لم يكن عليه جزاء وفي المنتقى: عن محمد: محرم دفع ثوبه الى حلال ليغسله قال: اذا علم انه قتل قملا فعليه الكفارة.

وفـي مناسک لملا علي القاري(صـ۱۲۲): (فصل في مباحاته)....... (وغسل الثوب) اى للطهارة او النظافة، لا لقصد القمل والزينة.

(۶۴) بغیر احرام کے میقات سے گزرنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ڈرائیور اور گاڑی کا دوسرا عملہ جن کو بلدیت تک [illegible] آنا پڑتا ہے وہ خارج میقات سے آتے ہیں تو کیا ان کو ہر بار احرام باندھنا اور عمرہ کرنا لازم ہے؟ اگر احرام نہ باندھیں یا عمرہ نہ کریں تو [illegible] کیلئے کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... جو حضرات میقات سے باہر رہتے ہیں وہ جب مکہ میں داخل ہونے کا ارادہ کریں چاہے حج یا عمرہ کی نیت سے یا دوسری اغراض کی وجہ سے تو ان پر عندالاحناف ہر دفعہ میقات سے گزرتے ہوئے احرام باندھنا لازم ہے اور جو حضرات داخل میقات رہتے ہیں وہ اگر مکہ میں حج وعمرہ کی نیت سے داخل ہونا چاہیں تو ان پر احرام باندھنا لازم ہے اور اگر کسی دوسری غرض کیلئے داخل ہونا چاہیں تو ان کیلئے جائز ہے کہ بغیر احرام کے داخل ہوں کیونکہ حکماً اہل مکہ شمار ہوں گے اور مکہ کے ساتھ ان کے منافع متعلق ہیں اب اگر ہر دفعہ ان پر احرام لازم کیا جائے تو اس سے حرج لازم آئے گا تو دفعہ حرج کی وجہ سے ان سے احرام ساقط ہے یہی حرج کی علت ڈرائیور حضرات میں بھی پائی جاتی ہے کہ بار بار آنے جانے کی وجہ سے اگر ان پر ہر دفعہ احرام لازم کیا جائے تو حرج آئے گا اس لئے داخل میقات لوگوں پر قیاس کرتے ہوئے اگر ان سے احرام ساقط کیا جائے تو جائز ہے۔

لـمافي الهندية(۱/۲۲۱): ولا يجوز للآفاقي أن يدخل مكة بغير احرام نوى النسک أولا ولو دخلها فعليه حجة أو عمرة كذا في المحيط.

وفـي الـدر الـمـختـار(۲/۴۷۷): (وحرم تأخير الإحرام عنها) كلها (لمن) أى الأفاقي (قصد دخول مـكة، يـعـنـي الـحـرم (ولـو لـحـاجة) غير الحج أما لو قصد موضعا من الحل كخليص وجدة حل له مجاوزته بلا إحرام فإذا حل به التحق بأهله فله دخول مكة بلا إحرام وهو الحيلة لمريد ذلک.

وفي الفقه الاسلامي وادلته(۳/۲۱۳۰): ب: يستحب لكل داخل إلى مكة لا يتكرر دخوله الإحرام، ويكـره الـدخـول بـغـيـر احـرام، فمن دخل مكة لحاجة لاتتكرر كالتجارة والزيارة وعيادة المريض فالأصح عند الشافعية أنه يستحب له الإحرام، ولا يجب مطلقا، وقال مالک واحمد، يلزمه، وقال

أبو حنيفة: إن كانت داره في الميقات أو أقرب إلى مكة، جاز دخوله بلا إحرام، وإلا فلا.

ج: من كان يتكرر دخوله كالحطاب والحشاش والصياد والسقاء والبريد والسائقين ونحوهم، يجوز دخوله بغير نسک لما روى ابن عباس، لايدخل أحد مكة إلا محرماً، ورخص للحطابين ولأن في ايجاب الإحرام على هؤلاء مشقة.

(٦٥) بذریعہ ہوائی جہاز حج وعمرہ کرنے والے نیت احرام کہاں سے کریں؟

سوال ...کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل لوگ حج وعمرہ کیلئے ہوائی جہاز پر سفر کرتے ہیں راستے میں پتہ نہیں چلتا کہ میقات کہاں ہے تو ان لوگوں کو حج کی نیت کب کرنی چاہئے؟

الجواب حامداً ومصلیاً... جو حضرات حج کی سعادت حاصل کرنے کیلئے ہوائی جہاز سے سفر کرتے ہیں تو میقات آنے سے پہلے جہاز کا عملہ عام طور پر اعلان کرتا ہے کہ میقات آنے والا ہے، حج وعمرہ کرنے والے حضرات نیت کرکے احرام باندھ لیں، لیکن پھر بھی اگر کسی شخص کو بغیر احرام کے میقات سے گزرنے کا اندیشہ ہو تو بہتر یہ ہے کہ جہاز میں سوار ہوتے ہی نیت احرام کرلیں۔ اگر کوئی شخص بغیر احرام کے میقات سے گزر گیا اور میقات سے احرام باندھنے کیلئے واپس نہ آیا یا احرام تو میقات سے گزر کر باندھ لیا لیکن تلبیہ پڑھنے کیلئے میقات پر واپس نہ آیا تو اس صورت میں اس پر دم یعنی ایک بکری یا بکرا وغیرہ کی قربانی لازم ہوگی۔ پاک وہند سے جانے والے جہاز قرن المنازل سے گزر کر جدہ پر اترتے ہیں۔ پس اگر کسی نے قرن المنازل سے پہلے احرام نہ باندھا، اور جدہ سے احرام باندھ لیا تو اس پر دم لازم نہیں آتا، اس لئے کہ جدہ محاذات میقات میں ہے اور تجاوز حرم بلا احرام کے بعد اگر میقات یا محاذات میقات پر آکر احرام باندھ لیا جائے تو اس سے دم تو واجب نہیں ہوتا، البتہ احتیاطاً بکری/بکرا کی قربانی بہتر ہے، ہاں بلا احرام حدودِ حرم سے گزرنے کا گناہ ہوگا۔

لما في الهندية(١/٢٢١): فان قدم الاحرام على هذه المواقيت جاز وهو الافضل اذا امن مواقعة المحظورات والافالتاخير الى الميقات افضل...... ومن جاوز ميقاته غير محرم ثم أتى ميقاتا اخر فاحرم منه اجزأه الا ان احرامه من ميقاته افضل ((وفي صـ٢٥٣)) فان احرم بالحج او العمرة من غير ان يرجع الى الميقات فعليه دم لترك حق الميقات... ومن جاوز الميقات وهو يريد الحج والعمرة غير محرم فلا يخلوا اما ان يكون احرم داخل الميقات اوعاد الى الميقات ثم احرم فان احرم داخل الميقات ينظر ان خاف فوت الحج متى عاد فانه لايعود ويمضي في احرامه ولزمه دم وان كان لايخاف فوات الحج فانه يعود الى الوقت واذ اعاد الى الوقت فلا يخلو اما ان يكون حلالا اومحرما فان عاد حلالا ثم احرم سقط عنه الدم وان عاد الوقت محرما قال ابو حنيفة رحمه الله تعالىٰ ان لبى سقط عنه الدم وان لم يلب لايسقط وعندهما يسقط في الوجهين.

وفي الدر المختار (۲/۴۷۷): (لا) يحرم (التقديم) للاحرام (عليها) بل هو افضل

وفي الشامية (۲/۴۷۷،۴۷۸): قدمنا تفسير الصحابة الاتمام بالاحرام من دويرة اهله ومن الاماكن قال في فتح القدير: وانما كان التقديم على المواقيت افضل لانه اكثر تعظيما وأوفر مشقة والاجر على قدر المشقة الخ.

وفي الدر(صـ۵۸۰): (و جاوز وقته)...... (لم احرم لزمه دم، كما اذا لم يحرم فان عاد) الى ميقات ما (ثم احرم او)...... (محرم مالم يشرع في نسک)...... (ولبى)...... (سقط دمه)

وفي الشامية: لايسقط عنه الدم بالاتفاق.

وفي غنية الناسک في بغية المناسک(صـ۶۰): آفاقي مسلم مكلف اراد دخول مكة او الحرم، ولو لتجارة او سياحة وجاوز آخر مواقيته غير محرم ثم احرم اولم يحرم أثم ولزمه دم وعليه العود الى ميقاته الذي جاوزه او الى غيره اقرب او ابعد...... وعن ابي يوسف رحمه الله ان كان الذي يرجع اليه محاذيا لميقاته الذي جاوزه او ابعد منه، سقط الدم والافلا.

وفي مناسک الملا على القاري (صـ۸۰، ۸۱): (فمن سلک غير ميقات) أي طريقا ليس فيه ميقات معين (برا أو بحرا، اجتهد وأحرم إذا حاذى ميقاتا منها) اى من المواقيت المعروفة .... (وان لم يعلم المحاذاة) فانه لا يتصور عدم المحاذاة، (فعلى مرحلتين من مكة) كجدة المحروسة من طرف البحر.

(۶۶) اگر کوئی شخص منیٰ میں ہو تو احرام کی نیت کہاں سے کرے گا؟

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایام حج میں ایک چھوٹا سا کاروبار کرتا ہوں، اس سال میں نے اپنے چھوٹے بھائی کو بھی اپنے ساتھ لگا لیا تھا، وہ آٹھ ذوالحجہ سے پہلے ہی منیٰ میں تھا، چونکہ پہلی مرتبہ آیا تھا، اس لئے اس نے احرام کی نیت منیٰ سے ہی کرلی تھی، اب وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ آیا میرا احرام درست ہو گیا تھا یا مجھے مکہ مکرمہ آنا چاہئے تھا؟ میرے ایک دوست کہہ رہے ہیں کہ مکہ مکرمہ آنا ضروری تھا۔ آنجناب صحیح مسئلے سے ہمیں آگاہ فرمادیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً اگر کوئی شخص آٹھ ذوالحجہ سے پہلے منیٰ میں موجود ہو، اور اب وہ حج کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا حکم مکی جیسا ہے یعنی وہ منیٰ ہی سے احرام کی نیت کرسکتا ہے لیکن افضل یہ ہے کہ مسجد الحرام سے احرام کی نیت کرلے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ کے بھائی کا احرام درست ہو گیا تھا۔

لما في الدر المختار ۲/۴۷۸): (و) الميقات (لمن بمكة) يعني من بداخل الحرم (للحج الحرم

وللعمرة الحل)

في الشامية تحته: (قوله يعني الخ) اشار الى مافي البحر من قوله والمراد بالمكي من كان داخل الحرم سواء كان بمكة اولا وسواء كان من اهلها اولا فيشمل الآفاقي المفرد بالعمرة والمتمتع والحلال من أهل الحل اذا دخل الحرم لحاجة كما في اللباب.

وفي الدر المختار(۲/۴۷۴): (والمواقيت) اى المواضع التي لايجاوزها مريد مكة الامحرما.

وفي الدر المختار(۲/۴۷۷): (وحرم تاخير الاحرام عنها) كلها (لمن) اى لآفاقي (قصد دخول مكة) يعني الحرم (ولولحاجة) غير الحج اما لو قصد موضعا من الحل كخليص وجدة حل له مجاوزته بلااحرام فاذاحل به التحق بأهله فله دخول مكة بلا احرام وهو الحيلة لمريد ذلك الالمأمور بالحج للمخالفة.

وفي الشامية تحته (قوله امالو قصد موضعا من الحل الخ) اى مما بين الميقات والحرم والمعتبر القصد عند المجاوز لا عند الخروج من بيته كما سيأتي في الجنايات اى قصدا أوليا كي اذا قصده لبيع أوشراء وانه اذا فرغ منه يدخل مكة ثانيا اذ لو كان قصده الاولي دخول مكة ومن ضرورته ان يمر في الحل فلا يحل له.

(۶۷) حج یا عمرے کی نیت سے بغیر احرام باندھے جدہ ائیرپورٹ پر پہنچنے کا حکم

سوال ..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص یہاں پاکستان سے حج کی نیت سے جارہا ہو، اوراحرام کی نیت کے بغیر جدہ ائیرپورٹ پر اتر جائے اور پھر جدہ سے احرام باندھے تو ایسے شخص کے بارے میں کیا حکم ہوگا آیا یہ جدہ سے احرام باندھ سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... جو شخص حج یا عمرے کی نیت سے احرام باندھے بغیر حدود حرم کو کراس کرتے ہوئے جدہ ائیرپورٹ پر ا . جائے تو اس پر حدود حرم میں بغیر احرام کے داخل ہونے کی وجہ سے دم یعنی بکری وغیرہ کی قربانی لازم ہوگی اوراب اگر وہ شخص واپس اپنے یا دوسرے میقات یا کسی بھی میقات کے محاذات میں جاکر احرام باندھ لے تو اس سے دم ساقط ہوجائے گا چونکہ جدہ سے اپنا میقات بہت دور ہے لہٰذا کسی بھی میقات پر جاکر احرام باندھ سکتا ہے، اب جدہ محاذات میقات میں ہے کہ نہیں؟ تو بعض علماء کے نزدیک جدہ محاذات میقات میں ہے جبکہ بعض دیگر علماء کے نزدیک جدہ محاذات میقات میں نہیں ہے لہٰذا اگر جدہ سے احرام باندھا تو ایک قول کے مطابق محاذی میقات ہونے کی وجہ سے دم ساقط ہوجائے گا جبکہ دوسرے قول کے مطابق عدم محاذات کی وجہ سے دم ساقط نہیں ہوگا اور یہی احوط معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا احتیاط کی بنا پر جدہ سے احرام باندھنے کی صورت میں دم دینا لازم ہوگا۔

لمافي الهندية(۱/۲۵۳): من جاوز وقته غير محرم ثم أتى وقتا آخر أقرب منه وأحرم جازو لاشى عليه.

وفي الشامية (۲/۴۷۶): من جاوز ميقاتا بلا احرام إلى آخر جاز إلا أن المستحب أن يحرم من الأول كذا روى عن ابى حنيفة أنه قال في غير اهل المدينة اذا مروا بها فجاوزوها الى الجحفة فلا بأس بذلک وأحب إلى ان يحرموا من ذى الحليفة لانهم لما وصلوا إلى الميقات الأول لزمهم محافظة حرمته فيكره لهم تركها.

وفي مناسک لملا علي قاری (صـ۸۰): (فمن سلک غير ميقات) اى طريقا ليس فيه ميقات معين (برا أو بحرا اجتهد وأحرم اذ احاذى ميقاتا منها) أى من المواقيت المعروفة...... (وإن لم يعلم المحاذاة)فإنه لا يتصور عدم المحاذاة (فعلى مرحلتين من مكة) كجدة المحروسة من طرف البحر.

وفي هامشه قال: قوله: كجدة فإنها على مرحلتين عرفيتين من مكة وثلاث مراحل شرعية ووجهه أن المرحلتين أوسط المسافات وإلا فالإحتياط الزيادة. وأقول لعل وجهه أيضا أن أقرب المواقيت إلى مكة على مرحلتين عرفيتين من مكة فقدر بذلک.

وفي الهندية(۱/۲۲۱): وإن سلک بين الميقاتين في البحر أو البر اجتهد واحرم اذا حاذى ميقاتا منهما و أبعدهما أولىٰ بالإحرام كذا في التبيين فان لم يكن بحيث يحاذى فعلى مرحلتين إلى مكة.

وفي الدر المختار(۲/۴۷۶): ولو لم يمربها تحرى وأحرم اذا حاذى أحدها وأبعدها الفضل فإن لم يكن بحيث يحاذى فعلى مرحلتين.

(۶۸) مکہ میں مقیم آفاقی حج کی نیت واحرام کہاں سے باندھے

سوال : کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی آدمی کسی کام یا ڈیوٹی پر مکہ مکرمہ آیا اور حج کا وقت آ گیا تو کیا وہ اپنی جگہ پر جا کر حج کی نیت کرے گا یا حرم سے باہر نکل کر نیت کر سکتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً : ایسا شخص جو مکہ میں ہو، اور حج کا وقت آ جائے تو ایسا شخص حج کا احرام حدودِ حرم میں باندھے گا۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں یہ شخص حدودِ حرم میں کہیں سے بھی نیت کر لے اور احرام باندھ لے میقات جانے کی ضرورت نہیں۔

لمافي الطحطاوى على الدر(۱/۴۸۸): (والميقات لمن بمكة للحج الخ) ولو خالف فيهما وجب عليه دم بحر.(قوله يعني من بداخل الحرم) يعني سواء كان بمكة ام لامن اهلها ام لا.

وفي الدر المختار(۲/۴۷۸): (و)الميقات (لمن بمكة) يعني بداخل الحرم للحج الحرم وللعمرة الحل.

وفي الشامية تحته : (قوله يعني الخ) .... والمراد بالمكي من كان داخل الحرم سواء كان بمكة اولا سواء كان من اهلها اولا فيشمل الآفاقي المفرد بالعمرة والمتمتع والحلال من اهل الحل اذا دخل الحرم لحاجة.

(۶۹) حالت احرام میں عینک لگانے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص کی عینک لگانے کی عادت ہو، اور وہ حج یا عمرہ کیلئے جائے تو وہ حالت احرام میں چشمہ لگا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... عینک لگانے سے چہرہ نہیں چھپتا لہٰذا حالتِ احرام میں چشمہ لگانا بغیر کراہت کے جائز ہے چاہے چشمہ لگانے کی عادت ہو یا نہ ہو۔

لمافي الهندية (۱/۲۲۴): ولا يلبس مخيطا قميصا أو قباء أوسراويل أوعمامة أو قلنسوة.... ويتقي ستر الرأس والوجه ولا يغطي فاه ولاذقنه ولا عارضه ولا بأس بان يضع يده على انفه كذا في البحر.

وفي الدر المختار (۲/۴۸۷): (قولم الظفر وستر الوجه) كله او بعضه كفمه وذقنه نعم في الخانية لا بأس بوضع يده على انفه.

وفي الشامية (۲/۴۸۸): لكن في تغطية كل الوجه او الرأس يوما او ليلة دم والربع منهما كالكل وفي الاقل من يوم او من الربع صدقة كما في اللباب واطلقه فشمل المرأة لما في البحر عن غاية البيان من انها لا تغطي وجهها اجماعاً اى وانما تستر وجهها عن الاجانب باسدال شئ متجاف لايمس الوجه.

(۷۰) احرام کے کپڑوں پر خوشبو لگانا، قلیل وکثیر کی مقدار، نیز احرام کی چادریں تبدیل کرنا

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دوران حج میرے چھوٹے بیٹے نے میرے احرام پر الٹی کر دی تو اس میں بو پیدا ہوگئی تھی۔ میں نے ایک عطر اس پر لگا دیا، پھر میرے دوست نے تقریباً ایک گھنٹہ بعد مجھے یاد دلایا کہ حالت احرام میں عطر نہیں لگایا جا سکتا تو میں نے فوراً احرام تبدیل کر لیا۔ آیا مجھ پر اس صورت میں کوئی دم وغیرہ تو لازم نہیں ہوا؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... جب آپ کے چھوٹے بیٹے نے الٹی کر دی تھی اگر وہ زیادہ تھی تو زیادہ چونکہ ناپاک ہوتی ہے لہٰذا اس کو دھونا چاہئے تھا، اس بدبو کے عذر کی وجہ سے عطر لگانا جائز نہ تھا کیونکہ عطر محظورات احرام میں سے ہے بھول کر لگانے یا جان بوجھ کر لگانے ہر صورت میں جزا لازم آتی ہے، اگر کپڑے پر عطر لگائے اور وہ کثیر ہو، اور پورا دن لگا رہے تو دم لازم آتا ہے اور اگر قلیل ہو، یا کثیر ہی ہو لیکن

پورا دن نہ رہے بلکہ تھوڑی دیر کے بعد اتار دیا جائے تو صدقہ کرنا لازم آتا ہے آپ نے چونکہ جلدی اتار دیا پورا دن نہیں رہا ہے اگر کثیر بھی ہوتو دم لازم نہ آتا لہٰذا آپ پر صدقہ کرنا لازم ہے، صدقہ کی مقدار صدقۂ فطر کی مقدار ہے یعنی نصف صاع (پونے دو سیر) گندم یا ایک صاع کھجور یا جو یا ان کی قیمت ہے۔ باقی احرام کی چادریں تبدیل کرنے کی وجہ سے کوئی جزاء لازم نہیں آتی کیونکہ احرام ان دو چادروں کا نام نہیں ہے، یہ تو ستر کو چھپانے کیلئے باندھی جاتی ہیں بجائے اس کے کہ محرم پر سلا ہوا کپڑا پہننا حرام ہے۔

لمافي الهندية(۱/۲۴۰): فاذا استعمل الطيب فان كان كثيراً فاحشا فعليه الدم وان كان قليلاً فعليه الصدقة .. (صـ۲۴۱) هذا في البدن وأما الثوب والفراش اذا التزق به طيب اعتبرت فيه القلة والكثرة على كل حال وكان الفارق هو العرف والا فما يقع عن المبتلي...... ويستوي في وجوب الجزاء بالتطيب الذكر والنسيان والطوع والكره......

وفي الدر المختار (۱/۱۳۷، ۱۳۸): (و) ينقضه (قئ ملأ فاه) بأن يضبط بتكلف......... وهو نجس مغلظ ولو من صبي ساعة ارتضاعه هو الصحيح لمخالطة النجاسة ذكره الحلبي.

وفي الشامية تحته: (قوله وهو نجس مغلظ) هذا ماصرحوا به في باب الأنجاس، وصحح في المجتبى أنه مخلف، قال في الفتح: ولايعرى عن إشكال وتمامه في النهر............ (قوله ذكره الحلبي) أي في شرح المنية الكبير حيث قال والصحيح ظاهر الرواية أنه نجس لمخالطة النجاسة وتداخلها فيه بخلاف البلغم اهـ.

وفي الشامية(۲/۵۴۴): ان طيب عضوا كاملا اى المحرم عضواً اى من اعضائه كالفخذ والساق والوجه والرأس قوله كاملاً لان المعتبر الكثرة، قال ابن كمال في شرح الهداية واختلف المشايخ في الحد الفاصل بين القليل والكثير الى ان قال وبعضهم اعتبر الكثرة بربع العضو الكبير فقال لو طيب ربع الساق او الفخذ لزم الدم وان كان اقل يلزم الصدقة.

لمافي الهندية(۱/۲۲۱، ۲۲۲): الباب الثالث في الاحرام وله ركن وشرط فالركن ان يوجد منه فعل، من خصائص الحج وهو نوعان احدهما قول بان يقول لبيك اللهم لبيك الخ ونوى به الاحرام صار محرماً...... والثاني فعل وهو ان يقلد بدنة وان ساقها وتوجه معها يريد الحج يصير محرماً...... (واما شرطه فالنية) حتى لا يصير محرماً بالتلبية بدون نيّة الاحرام...... وينزع المخيط والخف ويلبس ثوبين ازارا ورداء جديدين او غسيلين والجديد افضل .... ولو لبس ثوباً واحداً يستر عورته جاز..........

وفي الشامية(۲/۵۴۵): قلت: لكن نقلوا عن المجرد ان كان في ثوبه شبر في شبر فمكث عليه يوما

يطعم نصف صاع .... قال في الفتح يفيد التنصيص على ان الشبر في الشبر داخل في القليل اهـ أى حيث اوجب به صدقة لادماً.

وفي الهندية(۱/۲۴۱): واما الثوب والفراش اذا التزق به طيب اعتبرت فيه القلة والكثرة على كل حال وكان الفارق هو العرف والا فما يقع عند المبتلى كذا في النهر الفائق.

وفي الدر المختار(ص۵۴۵،۵۴۶): واما الثوب المطيب اكثره فيشترط للزوم الدم دوام لبسه يوماً......

(۷۱) محرم کا کمرے میں دھونی دینے یا روم اسپرے کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ خوشبو لگانے سے تو دم آتا ہے۔ لیکن کیا اگر بتی کی دھونی دی جائے یا خیمے/کمرے وغیرہ میں روم اسپرے کرلیا جائے تو کیا اس سے بھی دم آتا ہے؟ دراصل کبھی کبھی گرمی کی وجہ سے خیمہ اور کمرے وغیرہ میں بو سی محسوس ہوتی ہے تو یہ کرنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً حج وعمرہ کا احرام باندھنے کے بعد محرم کیلئے بدن اور کپڑے پر خوشبو لگانا منع ہے اگر خوشبو لگائے۔ تو خوشبو کے زیادہ ہونے کی صورت میں دم لازم آئے گا۔ اور کم ہونے کی صورت میں صدقہ دینا لازم ہوگا۔ اور اگر محرم کسی ایسی جگہ داخل ہوا جو کہ خوشبو سے معطر کی گئی تھی۔ جیسے صورت مسئولہ میں کہ اگر کمرے کو اگر بتی کی دھونی دی جائے۔ یا روم اسپرے کرلیا جائے۔ تو اس صورت میں محرم پر کچھ بھی لازم نہیں آئے گا۔

لما في المبسوط للسرخسيؒ(۳-۴/۱۲۳): قال فان كان تطيب أو ادهن قبل الاحرام ثم وجد ريحه بعد الاحرام لم يضره وكذلك ان اجمر ثيابه قبل ان يحرم ثم لبسها بعد الاحرام فلا شئ عليه و ذكر هشام عن محمد رحمهما الله تعالىٰ أن المحرم اذا دخل بيتا قداجمر فيه فطال مكثه حتى علق ثوبه لا يلزمه شئ ولو أجمر ثيابه بعد الاحرام فعليه الجزاء لان الاجمار إذا كان في البيت فعين الطيب لم يتصل بثوبه ولا ببدنه انما نال رائحته فقط بخلاف ما إذا اجمر ثيابه فان عين الطيب قد علق بثيابه فاذا كان الاجمار قبل الاحرام لم يكن ممنوعاً عن استعمال عين الطيب يومئذٍ وانما بقي مع المحرم رائحته فلا يلزمه شئ.

وفي البحر الرائق(۳/۳): إذا دخل بيتاً قد اجمر فيه فعلق بثيابه رائحة فلا شئ عليه لانه غير منتفع بعينه، و لا بأس أن يجلس في حانوت عطار، ولا فرق أيضا بين أن يقصده أو لا.

وفي فتاوىٰ قاضيخان على هامش الهندية(۱/۲۸۷): ولو دخل بيتاً قد بخر فيه واتصل بثوبه شئ من

ذلک لا شئ علیه ولو شمّ ریحا تطیب به قبل الاحرام لا بأس به.

وفي الفتاوى الهندية(۱/۲۴۱): لو دخل بيتاً قد اجمر فعلق بثوبه رائحة فلا شئ عليه لانه غير منتفع بعينه بخلاف مالو استجمر ثوبه فعلق بثوبه فان كان كثيراً فعليه دم وإن كان قليلا فعليه صدقة لانه منتفع بعينه وان لم يعلق به شي منه فلا شي عليه كذا في محيط السرخسي.

وفي الشامية(۲/۴۸۷): وبهذا يشير إلى أن المراد بالتطيب استعماله في الثوب والبدن وقالوا: لو لبس ازارا مبخرا لا شئ عليه، لانه ليس بمستعمل لجزء من الطيب وإنما حصل مجرد الرائحة و من ثم قال في الخانية لو دخل بيتا قد بخر فيه واتصل بثوبه شي منه لم يكن عليه شي نهر.

(۷۲) حالت احرام میں پنجوں کے اوپر کے حصے کو کھولنے کا حکم

سوال ... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دوران احرام اکثر حجاج کرام کو دیکھا کہ وہ ہوائی چپل پہنتے ہیں اور جب پوچھنے پر یہ معلوم ہوئی کہ مردوں کیلئے اپنے پنجوں کے اوپر کے حصے کو کھولے رکھنا ضروری ہے، آپ سے پوچھنا یہ تھا کہ آیا یہ حکم عورتوں کیلئے بھی ہے یا صرف مردوں کیلئے ہی، اور اس میں حکمت کیا ہے؟

الجواب حامداًومصلياً حالت احرام میں مردوں کو اپنے پنجوں کے اوپر کے حصے کو کھولے رکھنا ضروری ہے چھپانا جائز نہیں ہے۔ عورتوں کو اپنے پنجوں کے اوپر کے حصے کو چھپانا جائز ہے لہٰذا صورت مسئولہ میں یہ حکم صرف مردوں کیلئے ہے اور عورتوں کو دوران احرام خفین وغیرہ پہننے کی شرعاً اجازت ہے اور اس میں حکمت یہ ہے کہ عورتوں کے بارے میں شریعت نے ستر کا حکم دیا ہے چونکہ پنجوں کے اوپر کے حصے کو چھپانا زیادہ استر ہے اس لئے عورتوں کیلئے پنجوں کے اوپر کا حصہ چھپانا جائز ہے۔

لمافي اعلاء السنن(۱۰/۲۵): وقال عياض: اجمع المسلمون على ان ما ذكر في هذا الحديث لا يلبسه المحرم وانه نبه بالقميص والسراويل على كل مخيط ... وبالخفاف على كل ما يستر للرجل انتهى.

وفي(۱۰/۵۴): قوله عن سالم الخ دلالته على جواز لبس المرأة الخفين ظاهرة، وهو مذهبنا معشر الحنفية.

وفي البحر الرائق(۲/۴۲۱): والمرأة كالرجل غير انها تكشف وجهها ... ولا تحلق راسها ولكن تقصر وتلبس المخيط الخ) لان اوامر الشرع عامة جميع المكلفين مالم يقم دليل على الخصوص وفي (صـ۴۲۳) وانما تلبس المخيط لما انها عورة... واشار بلبس المخيط الى لبس الخفين الخ.

وفي الهندية(۱/۲۲۴): ولا يلبس مخيطا قميصا ... او خفا الا ان يقطع الخف اسفل من الكعبين

کذا فی فتاویٰ قاضی خان، والکعب هنا المفصل الذی فی وسط القدم عند معقد الشراک کذا فی التبیین...... ولا یلبس الجوربین کمالا یلبس الخفین کذا فی المحیط.

وفی الشامیة (۲/۴۹۰): (قوله وخفین) ای للرجال فإن المرأة تلبس المخیط والخفین کمافی قاضیخان قهستانی (قوله الا ان لا یجد نعلین الخ) افاد انه لو وجد هما لا یقطعه لما فیه من اتلاف المال بغیر حاجة، افاده فی البحر وما عزی الی الامام من وجوب الفدیة اذا قطعهما مع وجود النعلین خلاف المذهب کما فی شرح اللباب (قوله فیقطعهما) اما لو لبسهما قبل القطع یوما فعلیه دم وفی اقل صدقة لباب (قوله اسفل من الکعبین)...... وهو افصح مماهنا ابن کمال والمراد قطعهما بحیث یصیر الکعبان وما فوقهما من الساق مکشوفا لا قطع موضع الکعبین فقط کمالا یخفی والنعل هو المداس بکسر المیم وهو ما یلبسه اهل الحرمین ممن له شراک (قوله عند معقد الشراک) وهو المفصل الذی فی وسط القدم کذا روی هشام عن محمد، بخلافه فی الوضوء فانه العظم الناتی ای المرتفع ولم یعین فی الحدیث احدهما لکن لما کان الکعب یطلق علیهما حمل علی الاول احتیاطا لان الاحوط فیما کان اکثر کشفا بحر.

(۷۳) احرام کے وقت پڑھی جانے والی نماز کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ احرام کے وقت جو دو رکعت نماز پڑھی جاتی ہے آیا یہ احرام کیلئے شرط ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً احرام کے وقت دو رکعت نماز پڑھی جاتی ہے، یہ احرام کیلئے شرط ہے اور نہ ہی رکن۔ البتہ مسنون وباعث تقرب الٰہی ہے۔ نیز اگر کوئی شخص نہ پڑھ سکے تو قضا بھی لازم نہیں۔

لمافی الهندیة (۱/۲۲۳): ثم یصلی رکعتین ویقرأ فیهما بماشاء وان قرأفی الرکعة الاولی بفاتحة الکتاب وقل یایها الکافرون، وفی الثانیه بفاتحة الکتاب وقل هو الله احد تبرکا بفعل رسول الله صلی علیه وسلم فهو افضل کذا فی المحیط. ولایصلیهما فی الوقت المکروه وتجزیه المکتوبة کذا فی البحر الرائق.

وفی الطحطاوی (۱/۴۹۰): (قوله شفعاً) أی فی موضع الاحرام یقرأ فیهما ماشآء والافضل الکافرون والاخلاص قهستانی، قوله وتجزیه المکتوبة) فهی کتحیة المسجد بحر.

وفی الدر المختار (۲/۴۸۱): (وصلی ندبا) بعد ذلک (شفعاً) یعنی رکعتین فی غیر وقت مکروه

وتحريه المكتوبة

وفي الشامية تحته : (قوله ندبا) وفي الغاية انها سنة. نهر، وبه جزم في البحر والسراج، (قوله بعد ذلك) اي بعد اللبس والتطيب. بحر (قوله يعني ركعتين) يشير إلى ان الأولىٰ التعبير بهما كما فعل في الكنز لان الشفع يشمل الاربع.

وفي حاشية الفقه على المذاهب الاربعة(۱/۶۴۱): ومنها: أن يصلي بعد ماتقدم ركعتين اذا كان الوقت ليس وقت كراهة وإلا فلا يصلي وهذه الصلاة سنة على الصحيح،

(۷۴) عورت کے احرام کے کپڑوں کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عورت جب حج یا عمرہ کیلئے جارہی ہو، تو وہ احرام کن کپڑوں میں باندھ سکتی ہے آیا عورتوں کیلئے کوئی خاص کپڑا احرام کیلئے متعین ہے یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً صورت مسئولہ میں عورت زعفران وغیرہ سے رنگ شدہ کپڑوں کے علاوہ ہر قسم کے سلے ہوئے کپڑوں میں احرام کی نیت کرسکتی ہے۔ اور عورت کیلئے بوقت نیت احرام کوئی خاص کپڑا متعین نہیں۔

لمافي الهندية(۱/۲۳۵): تلبس من المخيط مابدالها من الدرع والقميص والخمار والخف والقفازين ولكن لاتلبس المصبوغ بورس ولا زعفران ولا عصفر الا ان يكون قد غسل كذا في الكفاية.

وفي الطحطاوي على الدر(۱/۵۰۲): (قوله وتلبس المخيط) غير المصبوغ بورس او زعفران الا ان يكون غسيلا لان هذا تزين من دواعي الجماع وهي ممنوعة عن ذلك في الاحرام، ابو السعود، ويجوز لها لبس الحرير

(۷۵) حالت احرام میں عورت کیلئے چہرہ کھولنے کی حکمت

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عام حالات میں تو علماء فرماتے ہیں کہ عورت کیلئے چہرے کا پردہ بھی فرض ہے۔ لیکن احرام کی حالت میں کہا جاتا ہے کہ انہیں چہرہ کھولنا واجب ہے اس کی کیا حکمت ہے؟ ایسی صورت میں خواتین کیلئے چہرے کے پردے کی کیا صورت ہوگی؟

الجواب حامداًومصلیاً حالت احرام میں عورت کے لئے چہرہ کھولنا واجب ہے اور ساتھ ساتھ غیر محرم مرد سے پردہ کرنا بھی ضروری ہے کیونکہ جس طرح مرد کو سر کا ڈھکنا حالت احرام میں ناجائز ہے اسی طرح عورت کو چہرہ کا چھپانا ناجائز ہے لیکن پردے کے لحاظ سے ضروری ہے اس کا عمدہ طریقہ یہ ہے کہ کوئی ایسی چیز بنائی جائے کہ جس کو سر پر رکھ لیا جائے جو چہرہ سے جدار ہے (مثلاً چھجے دار ٹوپی یا لکڑی وغیرہ)

اور اس سے اوپر ہوتے ہیں ... اس صورت میں چہرہ پر پڑ جائے گا اب چہرہ کھولنے کی حکمت یہ ہے کہ عورت کے لئے چہرہ کا چھپانا یہ قسم عزت اور شرف کی علامت ہے اور یہ آزاد عورتوں کے ساتھ خاص ہے اور حج کے دوران اللہ تعالیٰ کے دربار میں تمام لوگ ایک جیسے ہیں لہذا عورت کو حکم دیا کہ چہرہ کھول کر حج کرے تاکہ باندی اور آزاد عورتوں کے درمیان فرق باقی نہ رہے اور سب عورتیں اللہ تعالیٰ کے دربار میں ایک جیسی ہو جائیں۔

لمافی مشکوٰۃ المصابیح (۱/ ۲۳۵): ولا تنتقب المرأۃ المحرمۃ ولا تلبس القفاز.

وفی (صـ۲۳۶) وعن عائشۃ قالت کان الرکبان یمرون بنا ونحن مع رسول اللہ ﷺ محرمات فاذا جازو ابنا سدلت احدانا جلبابها من رأسها علی وجهها فاذا جاوزونا کشفناہ رواہ ابو داؤد ولابن ماجۃ معناہ.

وفی الدرالمختار (۲/ ۵۲۷): والمرأۃ فیما مر کالرجل لعموم الخطاب مالم یقم دلیل الخصوص لکنها تکشف وجهها لا رأسها ولو سدلت شیأ علیه وجافته عنه جاز) بل یندب وفی الشامیۃ و (قوله وجافته) ای باعدته عنه: قال فی الفتح: وقد جعلوا لذلک اعوادا کالقبۃ توضع علی الوجه

(قوله جاز) ای من حیث الاحرام، بمعنی انه لم یکن محظورا لانه لیس بستر وقوله بل یندب: ای خوفا من رؤیۃ الاجانب: وعبر فی الفتح بالاستحباب، لکن صرح فی النهایۃ بالوجوب وفی المحیط. ودلت المسألۃ علی ان المرأۃ منهیۃ عن اظهار وجهها للأجانب بلا ضرورۃ لانها منهیۃ عن تغطیته لحق النسک لو لا ذلک والا لم یکن لهذا الارخاء فائدۃ اھ ونحوہ فی الخانیۃ.

وفق فی البحر بما حاصله ان محمل الاستحباب عند عدم الاجانب، واما عند وجودهم فالإرخاء واجب علیها عند الامکان، وعند عدمه یجب علی الاجانب غض البصر، ثم استدرک علی ذلک بان النووی نقل ان العلماء قالوا لا یجب علی المرأۃ ستروجهها فی طریقها، بل یجب علی الرجال الغض: قال: وظاهرہ نقل الاجماع واعترضه فی النهر بأن المراد علماء مذهبه قلت: یؤیدہ ماسمعته من تصریح علمائنا بالوجوب والنهی.

(تنبیه) علمت مما تقرر عدم صحۃ مافی شرح الهدایۃ لابن الکمال من أن المرأۃ غیر منهیۃ عن ستر الوجه مطلقا الا بشیء فصل علی قدر الوجه کالنقاب والبرقع.

(۷۶) حالت احرام میں عورت کیلئے موزے، دستانے اور سلے ہوئے کپڑوں کے استعمال کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر عورت حج پر جائے تو وہ حالت احرام میں موزے اور

دستانے پہن سکتی ہے؟ نیز عورت احرام کے وقت چادریں پہنے گی یا سلے ہوئے کپڑے استعمال کرے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً ...عورت افعال حج میں مرد کی طرح ہے مگر بعض چیزیں جو عورت کیلئے جائز اور مرد کیلئے جائز نہیں ہیں، ان ہی میں سے عورت کیلئے سلے ہوئے کپڑے، موزے اور دستانے شامل ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ عورت کا احرام اس کا چہرہ ہے اور مرد کا احرام اس کا سر ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں عورت سلے ہوئے کپڑے، موزے اور دستانے استعمال کرسکتی ہے۔

لمافي الهندية(۱/۲۳۵): والمرأة في جميع ذلک كالرجل غير أنها لا تكشف رأسها وتكشف وجهها ولو سدلت على وجهها شيئا وجافته عنه جاز . وتلبس من المخيط مابداخها من الدرع والقميص والخمار والخف والقفازين ولكن لا تلبس المصبوغ بورس ولا زعفران ولا عصفر إلا ان يكون قدغسل كذا في الكفايه. ولا بأس للمرأة المحرمة ان تلبس المخيط من حرير أو غيره وتلبس الحلي.

وفي الدر المختار(۲/۵۲۷): (والمرأة) فيمامر (كالرجل) لعموم الخطاب مالم يقم دليل الخصوص (لكنها تكشف وجهها لا رأسها ولو سدلت شيأ عليه وجافته عنه جاز)بل يندب (ولا تلبي جهراً) بل تسمع نفسها دفعاً للفتنة، وما قيل إن صوتها عورة ضعيف(ولا ترمل ولا تضطبع ولاتسعى بين الميلين ولا تحلق بل تقصر) عن ربع شعرها كمامر(وتلبس المخيط) والخفين والحلي.

وفي الشامية(۲/۵۲۸): (قوله والخفين) زاد في البحر وغيره والقفازين قال في البدائع لان لبس القفازين ليس إلا تغطية يديها وأنها غير ممنوعة عن ذلک، وقوله عليه الصلاة والسلام ولا تلبس القفازين) نهي ندب حملناه عليه جمعاً بين الأدلة شرح اللباب.... .

وفي النتف في الفتاوى(ص۱۳۱): والفرق بين حج المرأة والرجل احد عشر شيئاً. أحدها ليس على المرأة الحج بغير محرم والثاني ليس عليها الحج بغير وجود نفقة المحرم اذا طلب والثالث إحرام الرجل في رأسه وإحرام المرأة في وجهها، والرابع تخفيي المرأة التلبية ويجهر بها الرجل، والخامس الرجل لايلبس الثوب المخيط في قول أبي حنيفةؒ واصحابهؒ...... وأما المرأة فلها أن تلبس المخيطات الخ.

(۷۷) حالتِ احرام میں حیض یا نفاس آنے کی صورت میں ارکانِ حج کی ادائیگی کا حکم اور طریقہ

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک اہم دینی مسئلے کے سلسلے میں آپ کی رہنمائی

حاصل کرنا چاہتا ہوں، مسئلہ میری بیوی کا ہے لیکن ہے ایسا کہ جو اکثر خواتین کو پیش آ جاتا ہے اس کا صحیح آسان شرعی حل بتا دیں۔
میں اور میری بیوی اس سال بحمد للہ حج کی سعادت ان شاء اللہ حاصل کریں گے۔ لیکن چونکہ ہم جلد جا رہے ہیں اس لئے ہماری واپسی کی فلائٹ بھی جلدی کی ہے۔ آجکل آپ کو معلوم ہے کہ کتنے پروگرام کے تحت حج ہوتا ہے اور سیٹیں آگے پیچھے کروانا انتہائی مشکل بلکہ ناممکن ہوتا ہے۔ میری بیوی کے جو ایام آتے ہیں وہ پورے دس دن ہوتے ہیں۔ اور اتفاق سے حج کے مہینے میں جو آ رہے ہیں وہ آٹھ ذی الحجہ کی تاریخ بن رہی ہے اور ایام ختم ہونے سے پہلے ہی ہماری واپسی کی ٹکٹ بک ہے۔ اب میری بیوی اس سے بہت پریشان ہے کہ حج جیسی عبادت وہ کیسے کرے گی۔ ہم نے سنا ہے کہ طواف کے بغیر آنا جائز نہیں ہے تو پھر ہم اس حالت میں کیا کریں۔ کسی نے بتایا ہے کہ گولیاں وغیرہ استعمال کرلو۔ لیکن ڈاکٹرز اسے نقصان دہ بتاتے ہیں۔ ایک مولوی صاحب کہہ رہے تھے کہ اسی حالت میں طواف کرلیں اور پھر ایک اونٹ ذبح کریں۔ لیکن اونٹ کی قیمت تو بہت زیادہ ہے ہم نے تو جیسے تیسے بڑی مشکل سے حج کے اخراجات نکالے ہیں۔ ہمیں آپ کے مدرسہ کا بتایا گیا ہے کہ شرعی مسائل کا صحیح حل اور رہنمائی یہاں کی جاتی ہے۔ براہ کرم جلد از جلد ہمارے اس مسئلے کا شرعی حل بتا دیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے علم وعمل اور عمر میں برکت عطا فرمائے۔ آمین

الجواب حامداً ومصلیاً...... اللہ تعالیٰ حکمت والے ہیں، ان کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس خالق کائنات نے بے شمار حکمتوں کے تحت جو ہماری نظروں سے اوجھل ہیں "بنات حواء" کے جسمانی نظام کا ایک حصہ "ایام حیض" بھی بنائے ہیں، لہٰذا اگر آپ کی اہلیہ کے "ایام حیض" حج کے دنوں میں آ رہے ہیں تو انہیں پریشان نہیں ہونا چاہئے۔ اس سے ان شاء اللہ ثواب میں کمی نہیں آئے گی۔ کیونکہ حج بھی اللہ تعالیٰ نے فرض کیا ہے، اور یہ "ایام" بھی اللہ تعالیٰ ہی نے بنائے ہیں، اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ، ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جو حج فرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا ہے، وہ بھی اسی حالت میں ہوا ہے۔ لہٰذا اس معاملہ میں پریشان نہ ہوں۔ اب ذیل میں شرعی احکام لکھے جاتے ہیں ان کے مطابق عمل کیجئے۔

جو خاتون "احرام" کے وقت سے ہی "ایام حیض" میں ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ وہ احرام کیلئے غسل کرے، اور احرام باندھ لے، اور دوسرے حاجیوں کی طرح تمام "اعمال حج" ادا کرتی رہے سوائے "طواف" کے (اور یہ طواف جب پاک ہو جائے تو پھر طواف کرے) اس کے بعد سات چکر صفا، مروہ کے درمیان "سعی" کرے۔ اور آخری طواف جو "طواف الوداع" کہلاتا ہے ایسی عورت پر واجب نہیں ہوتا، اس کے بغیر واپس جا سکتی ہے، البتہ طواف زیارت کے بغیر آنا جائز نہیں، اگر کوئی حاجی اس کے بغیر واپس چلا آئے تو وہ ہمیشہ محرم رہے گا یعنی شوہر کیلئے بیوی، اور بیوی کیلئے شوہر حلال نہیں ہوگا، جب تک کہ وہ واپس جا کر اسی احرام کے ساتھ طواف نہ کرلے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے عورت کو حیض کا خون نہ آئے تو اس پر حیض کے احکام جاری نہیں ہوں گے۔ اس تفصیل کی روشنی میں آپ کے پاس تین صورتیں ہیں، جو آسان ہو اس پر عمل کرلیں۔

(۱)۔ سب سے پہلے کوشش کریں کہ سیٹ آگے کروائیں، اور پھر مذکورہ تفصیل کے مطابق حج کریں یعنی آپ کی اہلیہ طواف کے علاوہ تمام اعمال حج ادا کرتی رہیں، اور پھر پاک ہونے کے بعد طواف وسعی کرلیں، اس صورت میں طواف زیارت کو ایام نحر سے مؤخر کرنے پر کوئی دم

بھی واجب نہیں ہوگا۔

(۲) اگر یہ نہ ہو سکے تو پھر آپ کی اہلیہ اسی حالت حیض ہی میں ممکن ہو تو "طواف زیارت" کیلئے پہلے غسل کرلیں، اور حفاظتی پیڈ یا "انڈرویئر" وغیرہ اس طرح استعمال کریں کہ مسجد حرام میں نجاست گرنے کا اندیشہ نہ رہے، پھر طواف کرلیں، اور وہیں دو سالہ گائے بھینس کا جانور یا پانچ سالہ اونٹ کا جانور ذبح کروا کے تقسیم کروادیں۔

ان دونوں صورتوں سے متعلق ایک مشورہ یہ ہے کہ آپ کی اہلیہ "ایام" شروع ہونے سے پہلے احرام باندھ لیں تاکہ کچھ وقت "احرام" پاکی کی حالت میں ہو جس میں وہ نفلی نماز اور نفلی طواف ادا کرسکیں۔

(۳) اگر دوسری صورت کی بھی استطاعت نہ ہو تو پھر مانع حیض دوائی استعمال کرلیں۔ اور تسلی سے حج ادا کریں۔ ہمارے یہاں کے ایک ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ ایک آدھ دفعہ دوائی سے ایام کی تاریخ آگے کرنے سے نقصان نہیں ہوتا۔ باقی آپ اپنے حالات کے اعتبار سے کسی لیڈی ڈاکٹر سے مشورہ کرسکتے ہیں۔

لما في صحيح البخاري (۱/۴۴): عن عائشة رضي الله تعالىٰ عنها أنها قالت: خرجنا مع رسول الله ﷺ لا نذكر الا الحج، فلما جئنا سرف طمثت، فدخل عليّ النبي ﷺ وأنا أبكي. فقال: ما يبكيك؟ قلت: لوددت والله أني لم احج العام، قال: لعلّك نفست؟ قلت: نعم، قال: فإن ذلك شئ كتبه الله على بنات آدم، فافعلي ما يفعل الحاج غير أن لا تطو في بالبيت حتى تطهري

وفي الدر المختار (۲/۵۲۸): (وحيضها لايمنع) نسكا (إلا الطواف)، ولا شئ عليها بتأخيره اذا لم تطهر إلا بعد ايام النحر، فلو طهرت فيها بقدر أكثر الطواف لزمها الدم بتأخيره "لباب" (وهو بعد حصول ركنيه يسقط طواف الصدر) ومثله النفاس، (والبدن) جمع بدنة (من ابل وبقر. والهدى منهما ومن الغنم)".

وفي الشامية (۲/۵۱۹): (تنبيه) نقل بعض المحشين عن منسك ابن امير حاج: "لو هم الركب على القفول، ولم تطهر، فاستفتت: هل تطوف أم لا؟ قالوا: يقال لها: لايحل لك دخول المسجد، وإن دخلت، وطفت، أثمت، وصح طوافك وعليك ذبح بدنة. وهذه مسئلة كثيرة الوقوع يتحير فيها النساء اهـ."

وفي الدر المختار (۲/۶۱۴) باب الهدى: (هو) في اللغة والشرع (مايهدى إلى الحرم) من النعم (ليتقرّب به) فيه (أدناه شاة، وهو إبل) ابن خمس سنين، (وبقر) ابن سنتين (وغنم) ابن سنة.

وفي الشامية (۱/۳۰۴): وعليه فالمرضع التي لاترى الدم في مدة أرضاعها، لا تنقضي عدتها الا بالحيض، كما سيأتي التصريح به في باب العدة، وقال في السراج: سئل بعض المشائخ عن

المرضعة، اذا لم ترحيضاً فعالجته، حتّى رأت صفرة في أيام الحيض؟ قال: هو حيض تنقضي به العدة اهـ.

وفي الاشباه والنظائر(صـ۱۵۹):القاعدة الخامسة عشرة: من استعجل التي قبل أو انه عوقب بحرمانه، ومن فروعها...... وخرجت عنها مسائل...... السادسة: شربت دواء فحاضت لم تقض الصلوات.

وفي فتاوى اللجنة الدائمة (۱۱/۱۹۰): يجوز للمرأة أن تأكل حبوباً لمنع العادة الشهرية عنها أثناء أدائها للمناسك.

(۷۸) حالت احرام میں بحث ومباحثہ کرنا

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دوران احرام بحث ومباحثہ مناظرہ کرنا جائز ہے یانہیں؟ میرے ایک ساتھی کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک بدعتی نے اسکے سامنے علماء دیوبند کے بارے میں کچھ نامناسب الفاظ استعمال کئے اسپر خوب بحث ومباحثہ ہوااور کچھ ہاتا پائی بھی ہوئی لہٰذا آپ سے یہ دریافت کرنا ہے کہ احرام کی حالت میں بحث ومباحثہ اورلڑنا جھگڑنا کیسا ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......لڑنا جھگڑنااورایسا بحث ومباحثہ جسمیں ایک دوسرے کو برا بھلا کہا جائے اورنامناسب الفاظ استعمال کئے جائیں عام حالات میں بھی منع ہے اور گناہ ہے،احرام کی حالت میں اسکے اندراور بھی شدت آجاتی ہے لہٰذا حالت احرام میں بحث ومباحثہ کرنااورلڑنا جھگڑنا سخت منع ہےاور بہت بڑا گناہ ہے جسکی وجہ سے انسان حج مبرور کی جوفضیلت حدیث پاک میں آئی ہےاس سے محروم ہوجاتا ہے،البتہ علمی مذاکرہ منع نہیں ہے۔

وفي الشامية(۲/۴۸۷):(قوله والجدال) أي الخصومة مع الرفقاء والخدم والمكارين بحر.

(۷۹) حالت احرام میں غلاف کعبہ سے تبرک حاصل کرنا

سوال کیافرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا دوران احرام سرکوڈھانپنا منع ہے،اگرکوئی شخص غلاف کعبہ سے تبرک حاصل کرنے کیلئے اسکے پردہ سے سرکوڈھانپے تو کیا حکم ہے؟ نیزاس طرح غلاف کعبہ سے تبرک حاصل کرنا کیسا ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......غلاف کعبہ سے تبرک حاصل کرنا جائز ہے البتہ حالت احرام میں سرکوغلاف کعبہ سے اس طرح ڈھانپنا کہ غلاف کعبہ سر کے ساتھ مس ہوجائے مکروہ ہے۔

لمافي الطحطاوي على الدر(۱/۵۲۱):قوله فلاشئ عليه؛اى من دم وصدقة ولوادخل المحرم رأسه

تحت ستر الکعبۃفان کان یصیب رأسہ اووجھہ فھومکروہ ولاشئ علیہ والافلابأس بہ بحر.

(۸۰) کیا اہل تشیع مسجد شجرہ ہی سے احرام باندھتے ہیں؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے سنا ہے کہ شیعہ حضرات مسجد شجرہ سے احرام باندھتے ہیں کیا یہ بات درست ہے؟ اور یہ مسجد شجرہ کہاں ہے؟ سنی وشیعہ کی میقات میں بھی فرق ہے کیا؟

الجواب حامداًومصلیاً...... میقات اس مقام کو کہتے ہیں جس سے بغیر احرام کے گزرنا جائز نہیں اور یہ پانچ مقامات ہیں(۱) ذوالحلیفہ، مدینہ منورہ کی طرف سے آنے والوں کیلئے۔(۲) جحفہ شام کی طرف سے آنے والوں کیلئے۔(۳) ذات عرق، عراق کی طرف سے آنے والوں کیلئے۔(۴) قرن، نجد کی طرف سے آنے والوں کیلئے۔(۵) یلملم یمن کی طرف سے آنے والوں کیلئے اور شیعوں کے نزدیک بھی مواقیت یہی ہیں اور مسجد شجرہ ذوالحلیفہ میں واقع مسجد کو کہا جاتا ہے جو کہ مدینہ منورہ والوں کیلئے میقات ہے الگ سے کوئی مستقل میقات نہیں۔ لہٰذا سنی اور اہل تشیع کی میقات میں فرق نہیں اور مطلقاً یہ بات کہنا کہ ”شیعہ مسجد شجرہ ہی سے احرام باندھتے ہیں“ درست نہیں

لمافی البخاری(۱/۲۰۶): عن ابن عباس قال وقت رسول اللہ ﷺ لأھل المدینۃ ذا الحلیفۃ ولأھل الشام الجحفۃ ولأھل نجد قرن المنازل ولأھل الیمن یلملم فھن لھن ولمن أتی علیھن من غیر اھلھن لمن کان یرید الحج والعمرۃ فمن کان دونھن فمھلہ من أھلہ وکذاک حتی أھل مکۃ یھلون منھا.

وفی الشامیۃ(۲/۴۷۴): (قولہ علی ستۃ أمیال من المدینۃ) وقیل سبعۃ وقیل أربعۃ قال العلامۃ القطبی فی منسکہ والمحرر من ذلک ما قالہ السید نور الدین علی السمھودی فی تاریخہ قد اختبرت ذلک فکان من عتبۃ باب المسجد النبوی المعروف بباب السلام إلی عتبۃ مسجد الشجرۃ بذی الحلیفۃ تسعۃ عشر ألف ذراع...... وسبعمائۃ ذراع...... واثنین وثلاثین ذراعا ونصف ذراع بذراع الید اھ. قلت وذالک دون خمسۃ أمیال فان المیل عندنا أربعۃ الاف ذراع بذراع الحدید المستعمل الآن واللہ اعلم اھ.

وفی وسائل الشیعۃ إلی تحصیل مسائل الشریعۃ (۸/۲۲۲): وعنہ (عن علی بن ابراھیم) عن أبیہ عن ابن أبی عمیر عن حماد عن الحلبی قال قال أبو عبداللہ علیہ السلام الإحرام من مواقیت خمسۃ وقتھا رسول اللہ ﷺ لاینبغی لحاج ولا لمعتمر أن یحرم قبلھا ولا بعدھا ووقت لأھل المدینۃ ذاالحلیفۃ وھو مسجد الشجرۃ یصلی فیہ ویفرض الحج ووقت لأھل الشام الجحفۃ ووقت لأھل النجد العقیق ووقت لأھل الطائف قرن المنازل ووقت لأھل الیمن یلملم ولا ینبغی لأحد أن یرغب

عن مواقيت رسول الله ﷺ.

وفي الحدائق الناضرة في أحكام العترة الطاهرة(۱۴/۳۳۵): ومنها ماروا ه ثقة الاسلام في الصحيح او الحسن على المشهور على الحلبي قال قال ابو عبدالله عليه السلام الاحرام من مواقيت خمسة وقتها رسول الله ﷺ لا ينبغي لحاج ولا لمعتمر أن يحرم قبلها ولا بعدها وقت لأهل المدينة ذاالحليفة وهو مسجد الشجرة يصلي فيه ويفرض الحج ووقت لأهل الشام الجحفة ووقت لأهل نجد العقيق ووقت لأهل الطائف قرن المنازل ووقت لأهل اليمن يلملم و لاينبغي لأحد أن يرغب عن مواقيت رسول الله ﷺ.

﴿فصل فی القران والتمتع﴾

(حج قران اور تمتع سے متعلق مسائل کا بیان)

(۸۱) حج قران کو عذر کی وجہ سے حج افراد میں تبدیل کرنا اور آمر کی مخالفت کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے حج اور عمرہ کا احرام باندھا مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کے بعد اس کا زاد راہ کھو گیا اور قربانی کرنے کی استطاعت نہ رہی، اس نے اپنی نیت کو حج افراد کی نیت میں بدل دیا تو کیا ایسا کرنا ٹھیک ہے، اور یہ حج کسی اور کی طرف سے کر رہا تھا اور شرط یہ تھی کہ حج تمتع کرے گا تو اسے کیا کرنا چاہئے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں حج قران کو حج افراد میں تبدیل کرنا جائز نہیں اس لئے کہ جب کوئی شخص حج یا عمرہ کی نیت کرنے کے بعد تلبیہ پڑھ لیتا ہے تو وہ محرم بن جاتا ہے تو پھر نیت کو بدلنا جائز نہیں رہتا، بلکہ اس حج یا عمرہ کی تکمیل واجب ہوجاتی ہے۔ نیز حج بدل کرنے والے کیلئے آمر کی مخالفت جائز نہیں۔ صورت مسئولہ میں نیت کو تبدیل کرنے کے بجائے تین روزے یوم عرفہ تک رکھ لے اور سات روزے حج کی ادائیگی کے بعد (خواہ مکہ مکرمہ میں یا وطن پہنچ کر) رکھ لے تو یہ قربانی کے قائم مقام ہوجائیں گے۔

لما في الدر المختار (٢/ ١٠٥): ... أنه إذا أتم الاحرام بحج أو عمرة لايخرج عنه الا بعمل ما أحرم به وإن أفسده إلا في الفوات فبعمل العمرة وإلا الاحصار فبذبح الهدى.

وفي الشامية تحته: (قوله الا بعمل) استثناء من مقدر والأصل لايخرج عنه في حالة من الأحوال بعمل من الأعمال إلا بعمل الخ، وقوله إلا في الفوات فبعمل العمرة وإلا الاحصار) استثناء من حالة القدرة.

وفي ايضا (٢/ ٢٠٠): الرابع عشر عدم المخالفة، فلو أمره بالإفراد فقرن أو تمتع ولو للميت لم يقع عنه ويضمن النفقة كما سيأتي.

وفي الهندية (١/ ٢٣٩): ولا يحلق رأسه حتى يذبح وان كان معسرا لا يجد ثمن الهدى فانه يصوم ثلاثة أيام في الحج فاذا فعل ذلك ثم جاء يوم الحلق حلق أو قصر ثم يصوم سبعة أيام بعد ما مضت أيام التشريق عندنا كذا في الظهيرية وان صامها بمكة بعد فراغه من الحج جاز عندنا كذا في القدوري.

وفی الفقہ الاسلامی(۳/ ۲۱۱۲): عدم المخالفة: فلو أمره بالإفراد، فقرن أو تمتع، ولو عن الميت لم يقع عنه.

(۸۲) آفاقی مدینہ منورہ سے قران کرسکتا ہے

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ایک دوست نے گزشتہ سال حج تمتع کے ارادے سے سفر کیا۔ انہوں نے بتایا کہ جب وہ مدینہ طیبہ پہنچ گئے تو انہوں نے ارادہ کرلیا کہ اب میں حج قران کروں گا۔ اور پھر انہوں نے حج قران کیا۔ آپ سے مجھے پوچھنا یہ ہے کہ آیا انہیں حج قران کا ثواب ملا ہوگا؟ اور ان کا وہاں سے حج قران کرنا درست ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً صورت مسئولہ میں اگر وہ پہلے مدینہ منورہ گئے تھے اور وہاں سے قران کی نیت کی تھی تو درست ہے لیکن اگر انہوں نے پہلے عمرہ ادا کیا تھا اور پھر مدینہ منورہ گئے تھے تو بہتر یہ تھا کہ حج افراد کی نیت کرتے لیکن اگر قران کی نیت سے احرام باندھا ہے تو حج قران درست ہوگا۔

لمافی الشامية(۲/ ۵۳۹): (والمكي ومن في حكمه يفرد فقط) هذا مادام مقيما فاذا خرج إلى الكوفة وقرن صح بلا كراهة. قال المحبوبي هذا إذا خرج إلى الكوفة قبل اشهر الحج وأما اذا خرج بعدها فقد منع من القران وقول المحبوبي هو الصحيح.

وفي كتاب المناسك لملا علي القاري(صـ۳۲۹): والحاصل أن المكي ممنوع من أن يقرن بمكة وأما اذا خرج إلى الآفاق بأن جاوز الميقات قبل أشهر الحج أو بعدها وقرن صح قرانه ويكون مسنونا (وقيد المحبوبي بأن يكون الخروج قبل اشهر الحج واما بعدها فلا يصح قرانه) ثم قال بعد صفحة. والأظهر أن في المسئلة خلافاً لمافي الكرماني قال ابن سماعة عن محمد إذا دخلت عليه أشهر الحج وهو بمكة أو داخل الميقات ثم خرج لم يصح قرانه عند أبي حنيفه وهو الصحيح. قال في البحر وتقييده بقوله عند أبي حنيفة يقتضي أن يصح عندهما الخ.

وفي غنية المناسك (صـ۲۲۷): وأما الآفاقي اذا دخل الميقات أو دخل مكة بعمرة وحل منها قبل أشهر الحج فان مكث بها حتى دخل أشهر الحج فهو كالمكي بالاتفاق وإن خرج إلى الآفاق قبل أشهر الحج فكالآفاقي بالاتفاق أو فيها فكالمكي عند أبي حنيفة إلا أن يعود إلى أهله وكالآفاقي عندهما (كبير وغيره).

وفي فتح القدير(۳/ ۱۴): (قوله بخلاف المكي اذا خرج إلى الكوفة الخ)...... ثم قيد المحبوبي قران المكي بأن يخرج من الميقات إلى الكوفة مثلاً قبل أشهر الحج ... وقد يقال إنه لا يتعلق به

خطاب المنع مطلقا بل مادام بمكة إلى قوله فاطلاق المصنف حينئذ هو الوجه الخ.

(۸۳) حج تمتع اورقران کرنے والے کیلئے دم تمتع اورقران سے کھانا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اس سال اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے مجھے حج کی سعادت سے سرفراز فرمایا، میں نے حج تمتع کی نیت سے احرام باندھا تھا، جبکہ ہمارے ایک پڑوسی ہیں وہ بھی ساتھ تھے، انہوں نے قران کا احرام باندھا تھا۔ ہم نے جب اپنی اپنی قربانی کرلی تو میرے پڑوسی نے مجھ سے کہا کہ کچھ گوشت رکھ لو شام میں کوئی اچھا سا سالن خود پکائیں گے۔ لیکن میں نے ان سے کہا کہ میں نے تو سنا ہے کہ اس قربانی کا گوشت ہم یعنی تمتع اورقران کرنے والے نہیں کھاسکتے۔ اس پر انہوں نے کہا کہ چلو آپ میری قربانی کا گوشت لے لو اور میں آپ کی۔ اس پر میں پریشان ہوا کہ پتا نہیں یہ بھی جائز ہے یا نہیں؟ میں نے احتیاطاً انہیں منع ہی کردیا۔ اب یہاں آکر اس کا خیال آیا تو سوچا پوچھ لوں تاکہ آئندہ کام آئے، آپ ذرا صحیح طرح بتادیں کہ تمتع اور قران والے اپنی قربانی کا گوشت کھاسکتے ہیں یا نہیں؟ کیا ایک دوسرے کی قربانی کا کھاسکتے ہیں یا نہیں؟ اور نہ کھانے کی شرعی وجہ کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... حج تمتع اور حج قران کرنے والے کیلئے تمتع اور قران کی قربانی کے گوشت سے کھانا نہ صرف جائز بلکہ مستحب ہے کیونکہ یہ دم شکر ہے نہ کہ دم جبر جس کا تصدق واجب ہو، اور دوسروں کو بھی کھلا سکتے ہیں چاہے وہ غنی ہی کیوں نہ ہو۔

لمافي الهندية (۱/۲۶۲): ويستحب لصاحبه أن يأكل من هدى التطوع اذا بلغ الحرم ومن هدى المتعة والقران هكذا في التبيين ويجوز له أن يطعم الغني ولا يجوز الأكل من بقية الهدايا.

وفي الدر المختار (۲/۵۱۵): ويجوز أكله بل يندب كالأضحية من هدى التطوع اذا بلغ الحرم والمتعة والقران فقط)

وفي الشامية تحته: (قوله كالأضحية) أشاربه أن المستحب أن يتصدق بالثلث ويطعم الأغنياء الثلث ويأكل ويدخر الثلث.

(۸۴) متمتع کا تلبیہ کے وقت حج تمتع کی نیت نہ کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے میقات سے احرام باندھا لیکن تلبیہ میں یہ کہنا بھول گیا کہ وہ حج تمتع کی نیت کررہا ہے تو کیا متمتع کی حیثیت سے وہ حج کرسکتا ہے یعنی پہلے عمرہ کرکے حلال ہوجائے اور پھر مکہ مکرمہ سے حج کی نیت کرے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ کے پیش نظر مذکور شخص کا حج تمتع درست ہوجائے گا کیونکہ شرعاً مطلق حج وعمرہ کی نیت سے بھی فرضیت کی ادائیگی سمجھی جاتی ہے۔ اور اس میں تلبیہ کے ساتھ متعین حج کی نیت کرنا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ طواف شروع کرنے سے پہلے حج

تمتع کی نیت کرلی تو حج تمتع کی ادائیگی ہوجائے گی۔

لما فی الهندية(۱/۲۲۳): وعن محمد اذا خرج الرجل الى السفر يريد الحج فاحرم ولم تحضره النية قال هو حج قيل له فان خرج ولانية له واحرم ولم ينو شيئا قال له ان يجعله ماشاء مالم يطف بالبيت كذافي فتاوىٰ قاضيخان، فاذا طاف شوطا واحدا كان احرامه احرام عمرة.

وفى الطحطاوى على الدر(۱/۴۹۰): (قوله اللهم انى اريد الحج) لم يقيد بالفرض اشارة الى ان حجة الفرض تصاب بمطلق النية ويضرفيها نية المغاير كالنفل افاده صاحب البحر.

وفى الفتاوىٰ الشامية(۲/۴۸۳): (قوله بمطلق النيه) من اضافة الصفة للموصوف: اى بالنية المطلقة عن التقيد بالحج بان نوى النسک من غير تعيين حج او عمرة، ثم ان عين قبل الطواف فيها والا صرف للعمرة كما يأتى، قال فى اللباب وتعيين النسک من غير تعين حج او عمره، ثم ان عين قبل الطواف فيما والا حرف للعمرة كما يأتى، قال فى اللباب: وتعيين النسک ليس بشرط فصح مبهما وبما أحرم به الغير، ثم قال فى موضع آخر: ولو أحرم بما أحرم به غيره فهو مبهم فيلزمه حجة او عمرة وقيده شارحه بما اذا لم يعلم بما احرم به غيره اهـ وكذا لو اطلق نية الحج صرف للفرض ويأتى تمامه قريباً قبيل قوله ولو اشعرها.

(۸۵) متمتع کیلئے میقات سے نکل جانے کے بعد قران کا حکم اور موجودہ دور کا فتویٰ

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ متمتع میقات سے نکل جانے کے بعد امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک قران نہیں کرسکتا جبکہ صاحبین رحمہما اللہ اس کو قران کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ دونوں کے دلائل کیا ہیں۔ اور موجودہ حالت کے اعتبار سے فتویٰ کس کے قول پر ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اس بات پر اتفاق ہے کہ مکہ مکرمہ کے رہنے والوں کیلئے حج قران جائز نہیں۔

صورت مسئولہ میں امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک متمتع میقات سے نکل جانے کے بعد اس لئے قران نہیں کرسکتا کہ امام اعظم رحمہ اللہ کے ہاں متمتع کا وطن اصلی کے علاوہ دوسری جگہ جانے سے اس کا سفر اور تمتع باطل نہیں ہوگا۔ اور وہ مکی ہی شمار ہوگا۔ اور جب وہ مکی کے حکم میں ہے تو اس کیلئے قران جائز نہیں ہوگا۔

جبکہ صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک جیسے وطن اصلی چلے جانے سے تمتع اور سفر باطل ہوجاتا ہے اسی طرح میقات سے نکل جانے سے بھی تمتع اور اس کا سفر ختم ہوجاتا ہے اور اس کا وہی سفر باقی نہیں رہتا اور وہ مکی نہیں بلکہ آفاقی کے حکم میں ہے اور جب وہ آفاقی ہے تو اس کیلئے حج قران کرنا جائز ہوگا۔ ابتلاء عام کی وجہ سے آج کل صاحبین کے قول پر فتویٰ دینے کی گنجائش ہے۔

لـمـافی غنیة الناسک(صـ۲۲۸): کوفی اعتمر فی اشهر الحج، وحلق. ثم خرج الی البصرة ومکث هناک اتخذها دارا اولا، توطن بها اولا، ثم رجع وحج من عامه صح تمتعه عند ابی حنیفة.

وفی اعلاء السنن(۱۰/۳۴۷): واختلفوا ایضا فیمن لم یرجع الی اهله وخرج من مکة حتی جاوز المیقات، فقال ابو حنیفة: هو متمتع ان حج من عامه ذلک، لانه لم یحصل له الىام باهله بعد العمرة، فهو بمنزلة کونه بمکة وروی عن ابی یوسف انه لیس بمتمتع، لان میقاته الآن فی الحج میقات اهل بلده (لامیقات اهل مکة) فصار بمنزلة عوده الی اهله والصحیح هو الاول لما بینا اهـ ای لان المیقات لاذکرله فی النص، وانما ذکره فیه حضور الاهل، فاذا لم یلم باهله کان داخلا فیمن لم یکن اهله حاضری المسجد الحرام، لا حقیقة ولا حکما فافهم.

وفی الشامیة(۲/۵۳۰): وقد عدّ فی اللباب للقران سبعة شروط

الاول: ان یحرم بالحج قبل طواف العمرة کله او اکثره، فلو احرم به بعد اکثر طوافها لم یکن قارنا......

السادس ان یکون آفاقیا ولو حکما فلا قران لمکی الا اذا خرج الی الآفاق قبل اشهر الحج.

وفی الدر المختار(۲/۵۴۱): (کوفی) ای آفاقی حل من عمرته فیها) ای الاشهر (وسکن بمکة، ای داخل المواقیت (او بصرة) ای غیر بلده (وحج من عامه (متمتع) لبقاء سفره

وفی الشامیة تحته: (قوله لبقاء سفره) اما اذا اقام بمکة او داخل المواقیت فلانه ترفق بنسکین فی سفر واحد فی اشهر الحج وهو علامة التمتع.

واما اذا اقام خارجها فذکر الطحاوی ان هذا قول الامام وعندهما لا یکون متمتعا لان المتمتع من کانت عمرته میقاتیة وحجته مکیة وله ان حکم السفر الاول قائم مالم یعد الی وطنه واثر الخلاف یظهر فی لزوم الدم......

﴿فصل فی الحج عن الغیر والبدل والوصیة﴾

(حج بدل اور نفلی حج سے متعلق مسائل کا بیان)

(۸۶) حج بدل کی شرائط

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے مالی اعتبار سے الحمد للہ حج کی استطاعت حاصل ہے لیکن معذوری کی بناپر نہیں جاسکتا، یہ میں حج پر کسی اور کو بھیج سکتا ہوں؟ نیز حج بدل کی کیا شرائط ہیں براہ مہربانی تفصیل سے تحریر فرمادیں۔

الجواب حامداًومصلیاً: بصورت مسئولہ میں اگر آپ صاحب استطاعت ہیں اور آپ وواقعی ایسی معذوری لاحق ہے کہ جس کی وجہ سے آپکا حج کرنا ممکن نہیں اور مستقبل میں بھی اس معذوری کے دور ہونیکا امکان نہیں ہے تو آپ پر کسی اور شخص کو حج بدل کیلئے بھیجنا واجب ہے۔ حج بدل کی اہم شرائط یہ ہیں کہ آپ اتنی رقم جو آپ کے حج کیلئے جانے سے لیکر واپس آنے کی جملہ ضروریات کیلئے کافی ہو، کسی ایسے شخص کے حوالہ کریں جو آپ کے وطن سے سفر حج کرے اور آپ کی طرف سے احرام باندھ کر حج بدل ادا کرے اور مناسب ہے کہ وہ شخص ایسا ہو کہ جو اپنا فرض حج پہلے ادا کر چکا ہو۔

لمافی البحرالرائق(۳/ ۶۱): واماشرائط جوازالنیابة: فمنهاان یکون المحجوج عنه عاجزاعن الاداء بنفسه وله مال ...... ومنهاالعجزالمستدام الی الموت ومنهاالامربالحج فلایجوزحج الغیرعنه بغیرامره الاالوارث ...... ومنهانیة المحجوج عنه عندالاحرام ومنهاان یکون حج المامور بمال المحجوج فان تطوع الحاج عنه بمال نفسه لم یجز عنه....... ومنها الحج راکبا.

(۸۷) حج بدل کرنے والے کیلئے شرائط

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک صاحب کسی عذر کی وجہ سے اپنا حج فرض ادا نہیں کر سکتے مگر وہ صاحب مکمل خرچ پر ایسے شخص کو حج پر بھجوا رہے ہیں جو دیندار ہے لیکن اس نے پہلے حج نہیں کیا اور نہ ہی اس پر حج فرض ہے، تو اس صورت میں بھجوانے والے صاحب کا حج فرض ادا ہو جائے گا یا حج کرنے والے کا حج ہوگا، قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرما کر ثواب دارین حاصل کریں۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... بہتر تو یہ ہے کہ ایسے شخص کو بھیجا جائے جس نے پہلے حج فرض ادا کیا ہو، تاہم اگر ایسا شخص نہ مل سکا یا نہ بھیجا اور ایسے شخص کو بھیجا جس نے حج ادا نہ کیا ہو، پھر بھی جائز ہے (گو مکروہ ہوگا)، لیکن دونوں صورتوں میں اگر مندرجہ ذیل شرائط پائی جائیں تو اس حج سے منوب یعنی بھجوانے والے صاحب کا فرض حج ادا ہو جائے گا۔ حج کرنے والے کی طرف سے ادا نہیں ہوگا۔ شرائط یہ ہیں: (۱)۔ بھیجنے والے کا عذر حج کروانے کے وقت سے موت تک برقرار رہے اگر موت سے پہلے صحت یاب ہو گیا تو اس کا حج فرض ادا نہیں ہوگا۔ (۲)۔ یہ حج کرنے والا بھیجنے والے کے امر یعنی کہنے سے حج کرے بغیر امر کے حج کرنے سے کرنے والے کا حج ادا ہوگا۔ (۳)۔ حج کرنے والا احرام باندھنے کے وقت منوب یعنی بھیجنے والے کی طرف سے نیت کرے، افضل یہ ہے کہ وہ یہ الفاظ کہے "لبیک عن فلان" اور صرف دل کی نیت بھی کافی ہو جائے گی۔ (۴)۔ حج کرنے والا بھیجنے والے کی دی ہوئی رقم سے ہی حج کرے، اپنی رقم سے حج نہ کرے ورنہ حج کرنے والے کا حج ادا ہوگا۔

اگر مندرجہ بالا شرائط پائی جائیں تو اس سے حج بدل بھجوانے والے کا فرض حج ادا ہو جائے گا اور اس کا ذمہ بری ہو جائے گا۔

لما في الصحيح للبخاري(۱/ ۲۵۰): حدثنا ابو عاصم عن ابن جريج...... عن ابن عباس ان امرأة قالت ح و ثنا موسىٰ ابن اسماعيل..... عن ابن عباس قال جاء ت امرأة من خثعم عام حجة الوداع فقالت يا رسول الله ان فريضة الله على عباده في الحج ادركت ابي شيخا كبيرا لا يستطيع ان يستوى على الراحلة فهل يقضى عنه ان احج عنه؟ قال نعم.

وفي الهندية(۱/ ۲۵۷): (العبادات ثلثة انواع) مالية محضة كالزكوة وصدقة الفطر، وبدنية محضة كالصلوة والصوم ومركبة منهما كالحج والانابة تجرى في النوع الاول في حالتي الاختيار والاضطرار ولا تجرى في النوع الثاني وتجرى في النوع الثالث عند العجز كذا في الكافي، ولجواز الانابة في الحج شرائط منها استدامة العجز من وقت الاحجاج الى وقت الموت هكذا في البدائع وانما شرط عجز المنوب للحج الفرض لاللنفل كذا في الكنز...... ومنها الامر بالحج فلا يجوز حج الغير عنه بغير امره...... ومنها نية المحجوج عنه عند الاحرام والأفضل أن يقول بلسانه لبيك عن فلان...... ومنها ان يكون حج المأمور بمال المحجوج عنه......ومنها ان يحج راكباً...... ثم الصحيح من المذهب فيمن حج عن غيره ان اصل الحج يقع عن المحجوج عنه ولهذالايسقط به الفرض عن المأمور وهوالحاج كذا في التبيين.

وفي الشامية(۲/ ۶۰۳): قال في البحر والحق انها تنزيهية على الآمر لقولهم والافضل الخ تحريمية على الصرورة المأمور الذى اجتمعت فيه شروط الحج ولم يحج عن نفسه لانه اثم بالتأخير، قلت وهذا لاينافي كلام الفتح لانه في المامور ويحمل كلام الشارح على الامر فيوافق مافي البحر من ان

الكراهة فى حقه تنزيهية وان كانت فى حق المأمور تحريمية.

(۸۸) حج بدل صحیح ہونے کیلئے شرائط

سوال… کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ماموں کی عمر ستر سال کے لگ بھگ ہے وہ دونوں ٹانگوں سے محروم ہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں کافی دولت سے نوازا ہے لیکن اس مجبوری کی بنا پر وہ حج نہیں کر سکتے اب وہ مجھے اپنی جگہ حج پر بھیجنا چاہتے ہیں۔ مجھے آپ سے یہ معلوم کرنا ہے اس طرح حج کرنے کی میں نے سنا ہے کہ کچھ شرائط ہیں۔ برائے کرم ایسی تمام شرائط مجھے تحریری صورت میں دیدیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً…… حج بدل (یعنی دوسرے کی طرف سے حج کرنے) کیلئے شرائط یہ ہیں کہ محجوج عنہ یعنی (جس کی طرف سے حج کیا گیا ہو) خود اداء حج سے عاجز ہو اور وہ مال کا مالک ہو، اور وہ عجز موت تک قائم ہو اور امر بالحج ہو اور مأمور (حج بدل کرنے والا) نے احرام کے وقت نیت محجوج عنہ کی طرف سے کی ہو، افضل صورت یہ ہے کہ مامور زبان سے کہے احرمت عن فلان اور مامور کا حج محجوج عنہ کے مال سے ہو۔ مذکورہ شرائط کے ساتھ حج بدل کیا جائے تو حج بدل درست ہے۔

وفى الهندية(۱/۲۵۷): منها ان يكون المحجوج عنه عاجزا عن الاداء بنفسه وله مال… ومنها استدامة العجز من وقت الاحجاج الى وقت الموت هكذا فى البدائع ……(ومنها) الامر بالحج منها نية المحجوج عنه عند الاحرام والافضل ان يقول بلسانه لبيك عن فلان ومنها ان يكون حج المامور بمال المحجوج عنه.

وفى الشامية(۲/۶۰۰): (قوله النفقة من مال الآمر الخ) أى المحجوج عنه ومحترزه قوله الآتى ولو انفق من مال نفسه.

(۸۹) حج بدل کروانا کب ضروری ہے؟

سوال… کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص حج یا عمرہ کیلئے جارہا ہو لیکن اس کو یہ خوف ہو کہ میں کسی بیماری کی وجہ سے حج یا عمرہ نہیں کر سکوں گا تو اس شخص کو کیا کرنا چاہئے؟

الجواب حامداً ومصلیاً…… اگر ایسا دائمی مرض جس میں سفر حج کرنے یا افعال حج ادا کرنے کی وجہ سے زیادتی مرض یا موت کا خوف ہو تو ایسی صورت میں اس مریض کو چاہئے کہ اپنا نائب مقرر کرے جو اس کی طرف سے حج بدل ادا کرے، اور اگر ایسا مرض نہیں تو خود ہی جا کر حج کا فریضہ ادا کرنا ضروری ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر مذکورہ شخص کو بیمار ہو جانے کا صرف وہم ہے یا بیماری تو ہے لیکن وہ بیماری موجب ہلاکت نہیں اور نہ ہی زیادہ ہونے والی ہے اور نہ ہی ارکان حج ادا کرنے میں مانع ہے تو بہر دو صورت میں خود ہی جا کر حج کا فریضہ ادا کرنا

ضروری ہے۔اور اگر ایسا دائمی بیمار ہے کہ سفر حج یا افعال حج ادا کرنے کی وجہ سے اس بیماری میں زیادتی آنے کا یا موت کا خوف ہے تو ایسی صورت میں اپنا نائب مقرر کرے جو اس کی طرف سے حج بدل ادا کرے۔البتہ ''عمرہ'' میں یہ تفصیل نہیں ہے، وہ از خود جا کر ادا کرے یا قدرت کے باوجود دوسرے شخص کو بھیج دے جو اس کی طرف سے ادا کرے دونوں طرح درست ہے۔

وفی الهندية(۱/۲۵۷): ولجواز النيابة في الحج شرائط:(منها) ان يكون المحجوج عنه عاجزا عن الاداء بنفسه وله مال.... ومنها: استدامة العجز من وقت الاحجاج الى وقت الموت هكذا في البدائع، حتى لو أحج عن نفسه وهو مريض يكون مراعى فان مات اجزأه وان تعافى بطل..... ففي الحج النفل تجوز النيابة حالة القدرة لان باب النفل اوسع كذا في السراج الوهاج.

وفی الدر المختار(۲/۵۹۸): (والمركبة منهما) كحج الفرض (تقبل النيابة عند العجز فقط) لكن (بشرط دوام العجز الى الموت) لانه فرض العمر حتى تلزم الاعادة بزوال العذر... (هذا) اى اشتراط دوام العجز الى الموت (اذا كان) العجز كالحبس و (المرض يرجى زواله) اى يمكن (وان لم يكن كذلک كالعمى والزمانة سقط الفرض) بحج الغير(عنه) فلا اعادة مطلقا سواء (استمر به ذلک العذر ام لا.

وفی الشامية تحته: (قوله كحج الفرض) اطلقه فشمل الحجة المنذورة كما في البحر وقيده نظر الشرط دوام العجز الى الموت، لان الحج النفل يقبل النيابة من غير اشتراط عجز فضلا عن دوامه، ....(قوله حتى تلزم الاعادة بزوال العذر) اى العذر الذى يرجى زواله كالحبس والمرض....

(وفی ص ۵۹۹) (قوله فلا اعادة مطلقا الخ) ظاهر اطلاق المتون اشتراط عجز الدائم انه لافرق بين مايرجى زواله وغيره في لزوم الاعادة بعد زواله، وعليه شي في الفتح قال في البحر: وليس بصحيح بل الحق التفصيل كما صرح به المحيط والخانية والمعراج اهـ واقره في النهر، وتبعه المصنف وحققه في الشرنبلالية، ونقل التصريح به عن كافي النسفي.

(۹۰) کیا حج بدل کیلئے حاجی کا پہلے سے حج کیا ہونا ضروری ہے؟

سوال... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حج بدل ایسا شخص ادا کرے جس نے کبھی حج نہ کیا ہو، تو اس صورت میں جس کے بدلے میں حج ادا کیا جا رہا ہے کیا یہ حج اس کی طرف سے ادا ہو جائے گا یا حج کرنے والے کا حج ادا ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً... اگر کوئی شخص اپنی طرف سے حج بدل کروانا چاہتا ہو تو اس کیلئے افضل یہ ہے کہ کسی ایسے شخص کا انتخاب کرے جس نے اپنا حج فرض ادا کیا ہو، کیونکہ کسی ایسے شخص کو بھیجنا جس نے اپنا حج فرض ادا نہیں کیا ہو مکروہ تنزیہی ہے، اگرچہ حج صحیح ہوگا اور اس صورت

میں بھی حج بھجوانے والے کی طرف سے ہی ادا ہوگا نہ کہ جانے والے کی طرف سے۔

لما في الهندية(۱/۲۵۷): ثم الصحيح من المذهب فيمن حج عن غيره ان اصل الحج يقع عن المحجوج عنه ولهذا لايسقط به الفرض عن المأمور وهو الحاج كذا في التبيين والافضل للانسان اذا اراد ان يحج رجلاً عن نفسه ان يحج رجلاً قدحج عن نفسه ومع هذا لواحج رجلاً لم يحج عن نفسه حجة الاسلام يجوز عندنا وسقط الحج عن الآمر كذا في المحيط.

وفي الدر المختار(۲/۶۰۳): (فجاز حج الصرورة) بمهملة: من لم يحج(والمرأة) ولوامة (والعبد وغيره) كالمراهق وغيرهم أولى لعدم الخلاف)

(۹۱) بغیر وصیت کے حج بدل کا حکم

سوال ... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حج بدل ضروری ہے(بغیر وصیت) یا معذور بولنے اور سننے سے اور بیمار افراد پر 3,67,000 روپے کا استعمال ضروری ہے، جبکہ ان کی ایک بچی کی شادی بھی ہے اور گھر میں کمانے والا کوئی بھی جوان نہیں ہے۔

تفصیل...... ڈاکٹر رافع صاحب کا انتقال 2003ء میں ہوگیا تھا۔ ڈاکٹر رافع صاحب نے سرجانی ٹاؤن میں ایک مکان اپنی بہن کے نام خریدا تھا اور اس مکان میں اپنے بہنوئی جو بولنے، سننے سے معذور ہیں اور بہن جو بولنے سننے سے معذور ہیں اور ان کی ایک بچی ترنم ہے جس کی عمر 20 سال ہے (تقریباً) ساتھ رہتے تھے اور ان کی مالی طور پر مکمل پرورش کی ہے۔ ڈاکٹر رافع صاحب نے اپنے انتقال سے پہلے مکمل رقم جو بینک میں تھی اپنا وارث ترنم (اُن کی بھانجی ہے) کو کردیا ہے ڈاکٹر رافع صاحب نے شادی نہیں کی تھی۔ ڈاکٹر رافع صاحب کے 3 بھائی اور 4 بہنیں ہیں ایک بہن انڈیا میں ہیں اور ان کا ہمیں کوئی اتا پتا نہیں۔ ان تمام لوگوں نے کسی قسم کی رقم کا مطالبہ نہیں کیا اور یہ کہہ دیا ہے یہ رقم ہماری معذور بہن اور بہنوئی اور ان کی بچی کے استعمال کے لئے ہے۔ رقم کل 2,88,000 روپے ہے۔ البتہ ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے وقت کل رقم 3,67,000 تھی جس میں سے ترنم نے کچھ رقم نکال کر اپنے اور والدین کے استعمال میں لے لی۔ جبکہ ابھی ڈاکٹر رافع صاحب (مرحوم) کی بھانجی ترنم کی شادی ہے اور اس پر تقریباً 170,000 یا 150,000 رقم خرچ ہوگی۔ باقی رقم 113,000 روپے معذور رشتے دار بہن اور بہنوئی کے استعمال کیلئے بچتے ہیں۔

مفتی صاحب باقی رقم جو شادی کے خرچ کے بعد بچتی ہے 113,000 روپے سے حج بدل کرنا ضروری ہے یا ان کے معذور بہن اور بہنوئی پر استعمال کرنا بہتر ہوگا۔ اگر حج بدل نہیں ہوسکتا تو وہ کونسا عمل ہے جو ہم رشتے دار ان کیلئے کریں۔ جو حج بدل کا ذریعہ بن جائے اور ذخیرہ آخرت بن جائے یا کوئی وظیفہ ثواب کیلئے بتائیں۔ شرعی جواب دیں۔ جزاک اللہ

الجواب حامداً ومصلیاً ....صورت مسئولہ میں مذکورہ رقم کی مالکہ مسماۃ ترنم، مرحوم کی بھانجی ہے اور مسماۃ مذکورہ کی شادی کے بعد جو رقم بچتی

ہے اگر مسماۃ مذکورہ اس بچی ہوئی رقم سے ڈاکٹر صاحب کی طرف سے حج بدل کروائیں تو یہ ان کی طرف سے تبرع ہوگا ورنہ بغیر وصیت کے حج بدل کرنا کوئی ضروری نہیں ہے، البتہ مرحوم کیلئے دیگر عبادات جیسے نوافل، روزہ، قرآن کی تلاوت، صدقہ نافلہ، ذکر واذکار وغیرہ کر کے ایصال ثواب کیا جائے تو انشاء اللہ یہ بھی ان کیلئے ذخیرۂ آخرت بنے گا۔

اگر مسماۃ مذکورہ اس رقم میں سے اپنے والدین پر خرچ کرے تو یہ بھی باعث سعادت ہے اور ایسے معذور والدین کے ساتھ جتنا ممکن ہو سکے ان کے ساتھ تعاون اور حسن سلوک کے ساتھ پیش آنا چاہئے اور ایسے موقع پر والدین پر خرچ کرنا زیادہ بہتر ہے، اگر اتنی رقم جس سے حج ہو سکے مسماۃ مذکورہ کے پاس حج فارم جمع ہونے تک موجود رہی تو اس صورت میں ان پر حج لازم ہوگا۔

لما فی القرآن الکریم (آل عمران:۹۷): لقوله تعالیٰ: وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیه سبیلاً ط.

وفی الدر المختار(۱۲۴/۳): وبالغ له ابوان او احدهما لان طاعتهما فرض عین وقال علیه السلام للعباس بن مرداس لما اراد الجهاد الزم امک فان الجنة تحت رجل امک.

وفی الفقه الاسلامی(۲۰۹۵/۳): اتفق العلماء علی وصول ثواب الدعاء والصدقة والهدی للمیت للحدیث السابق اذامات الانسان. انقطع عمله الامن ثلاث، صدقة جاریة، اوعلم ینتفع به، وولد صالح یدعوله.

وفی الشامیة(۵۹۹/۲): (وان لم یوص به) ای بالاحجاج (فتبرع عنه الوارث) وکذا من هم اهل التبرع(فحج) ای الوارث ونحوه(بنفسه) ای عنه (اوحج عنه غیره جاز)

(۹۲) میت کے حج بدل کی وصیت اور عدم وصیت کا حکم، اور حج بدل کہاں سے ادا کیا جائے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ گزشتہ سال میرے والد پر حج فرض ہوا تھا لیکن اتفاق کی بات یہ ہے کہ میرے والد کا گزشتہ برس ہی انتقال ہو گیا تھا، اب مفتی صاحب آپ سے معلوم کرنا ہے کہ ہم ان کی طرف سے حج کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اور ان کو اس کا ثواب ملے گا یا نہیں؟... ہمارے ایک بھائی وہیں جدہ میں ملازمت کرتے ہیں تو اگر ہم ان کو کہہ دیں کہ وہ حج کر لیں آیا یہ صحیح ہے، یا یہاں پاکستان سے کسی کو جانا ہوگا، نیز یہ بات یاد رہے کہ ہمارے والد صاحب نے اس کی وصیت بھی کی تھی اور یہ بات بھی بتادیں کہ اگر کوئی وصیت نہ کرے تو اس صورت میں کیا حکم ہوتا ہے؟ براہِ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً　مذکورہ صورت میں آپ کے والد مرحوم کے متروکہ مال کے ثلث حصہ تک وصیت نافذ کرتے ہوئے ان کی طرف سے حج بدل کرنا ضروری ہے، اور حج بدل اسی شہر سے کروانا لازم ہے جہاں آپ کے والد مرحوم مقیم تھے، ہاں اگر ثلث مال کے اندر اندر وصیت نافذ کرتے ہوئے وہاں سے حج بدل کروانا دشوار ہو تو جہاں سے سہولت ہو وہاں سے حج بدل کروالیا جائے۔ چنانچہ اگر آپ کے

بھائی جوجدہ میں ہیں آپ کے والد مرحوم کی طرف سے حج بدل کرنا چاہیں تو دو شرطوں کے ساتھ اس کی گنجائش ہے، اولاً یہ کہ ثلث مال سے وہیں سے حج بدل کروانا دشوار ہو جہاں آپ کے والد مرحوم مقیم تھے، ثانیاً یہ کہ حج کے اخراجات مرحوم کے ترکہ سے ادا کئے جائیں۔ اگر کسی پر حج فرض ہو اور اسے ادا نہ کر سکے، اور اس حال میں وصیت کئے بغیر مر جائے تو وہ گنہگار ہوگا، تاہم اگر ان کی طرف سے کوئی تبرعاً حج بدل ادا کردے تو امید ہے کہ ان شاء اللہ مواخذہ نہ ہوگا۔

وفي الدر المختار (۲/۶۰۴): (خرج) المكلف (الى الحج ومات في الطريق واوصى بالحج عنه) انما تجب الوصية به اذا أخره بعد وجوبه، أما لو حج من عامه فلا.

وفي الشامية تحته: (قوله خرج المكلف الخ) اما اذا لم يخرج واوصى بان يحج عنه واطلق: اى لم يعين مالا ولا مكانا فانه يحج عنه من ثلث ماله من بلده إن بلغ الثلث، لأن الواجب عليه الحج من بلده الذى يسكنه والا فمن حيث يبلغ، وان لم يمكن من مكان بطلت الوصية.

وفي الشامية (۲/۶۰۸): وان لم يوص به فتبرع الوارث عنه بالإحجاج او الحج بنفسه، قال ابو حنيفة يجزيه إن شاء الله تعالىٰ، لقوله ﷺ للخثعمية أرايت لو كان على ابيك دين، الحديث انتهى. وبهذا ظهر فائدة اخرى للتقييد بالابوين في هذه المسئلة وهي سقوط الفرض عن الذى عينه له بعد الإبهام لو بدون وصية......الخ.

(۹۳) حج بدل میں آمر کی اجازت ضروری ہے

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے والد صاحب کی عرصہ پانچ سال سے بہت حالت خراب ہے، پیشاب پاخانہ بھی بستر ہی پر ہوتا ہے، ان کے ذمہ فریضۂ حج باقی ہے۔ ہمارا پچھلے سال سے ارادہ ہو رہا تھا کہ ان کی طرف سے کسی سے حج بدل کروالیا جائے۔ اس سال حج کے بعد میرے والد صاحب کے ایک دوست ہمارے یہاں آئے وہ حج کر کے آئے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ میں نے یہ حج آپ کے والد کی طرف سے ہی کیا ہے، بس حج کرنے سے پہلے میں اطلاع نہ کر سکا تھا۔ آنجناب سے گزارش تھی کہ آپ ہمیں بتادیں کہ آیا ہمارے والد صاحب کی طرف سے ان کے دوست کا حج بدل درست ہو گیا؟ اور ہمارے والد صاحب فریضۂ حج سے سبکدوش ہو گئے ہیں؟ اگر نہیں تو کیا ہم ان کے اس دوست کو جوان کا خرچہ ہوا دیدیں تو کیا پھر ہو جائے گا؟ از راہ کرم اس مسئلہ کو جلد حل فرمادیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... حج بدل کے صحیح ہونے کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ حج کرنے والے کی طرف سے اُمر بالحج بھی موجود ہو۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ کے والد صاحب کی طرف سے اُمر نہ ہونے کی وجہ سے حج بدل صحیح نہیں ہے اور والد صاحب کے دوست کو ان کا خرچہ دے کر حج کا ثواب لینا درست نہیں ہے۔

لمافی البحر الرائق(۳/۱۰۹): وذكر فی البدائع وأما شرائط جواز النيابة فمنها ان يكون المحجوج عنه عاجزا عن الاداء بنفسه وله مال فلا يجوز إحجاج الصحيح غنيا كان أو فقيرا لان المال من شرائط الوجوب ومنها العجز المستدام إلى الموت ومنها الامر بالحج فلا يجوز حج الغير عنه بغير أمره الا الوارث يحج عن مورثه فانه يجزئه إن شاء الله تعالىٰ لوجود الأمر دلالة ومنهانية المحجوج عنه عند الاحرام ومنها ان يكون حج المأمور بمال المحجوج عنه فان تطوع الحاج عنه بمال نفسه لم يجز عنه حتى يحج بماله ......اهـ.

وفی الهندية(۱/۲۵۷): ولجواز النيابة فی الحج شرائط منها ان يكون المحجوج عنه عاجزا عن الاداء بنفسه وله مال ...... ومنها الامر بالحج فلا يجوز حج الغيرعنه بغير أمره الا الوارث يحج عن مورثه بغير أمره فانه يجزيه... ومنها ان يكون حج المأمور لمال المحجوج عنه فان تطوع الحاج عنه بمال نفسه لم يجز عنه حتى يحج بماله ......اهـ.

وفی الدر المختار(۲/۵۹۹،۶۰۰): (وبشرط الأمر به) أی بالحج عنه (فلا يجوز حج الغير بغير إذنه إلا اذا حج) أو أحج (الوارث عن مورثه) لوجود الأمر دلالة......اهـ.

وفی الشامية(۲/۵۹۵): (تنبيه) قال فی البحر ولم أرحكم من أخذ شيأ من الدنيا ليجعل شيأ من عبادته للمعطی وينبغی ان لا يصح ذلک اهـ أی لأنه ان كان أخذه علی عبادة سابقة يكون ذلک بيعالها وذلک باطل قطعا وإن كان أخذه ليعمل يكون إجارة علی الطاعة وهی باطلة ايضا كما نص عليه فی المتون والشروح والفتاوی الا فيما استثناه المتأخرون من جواز الاستئجار علی التعليم والأذان والامامة وعللوه بالضرورة وخوف ضياع الدين فی زماننا لا نقطاع ما كان يعطی من بيت المال ......اهـ.

(۹۴) حج بدل میں مامور کیلئے آمر کے شہر سے ہی حج پر جانے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے والدصاحب پچھلے سات سال سے بہت سخت بیمار ہیں، خود سے چلنے پھرنے سے بھی معذور ہیں۔ ان پر حج فرض ہے، اب ہم چاہتے ہیں کہ ان کی طرف سے کسی کو حج پر بھیج دیں۔ میرے بڑے بھائی ریاض میں مقیم ہیں انہوں نے پہلے دو مرتبہ حج بھی کیا ہوا ہے۔ اب اگر وہ والدصاحب کی طرف سے حج کرلیں تو کیا والدصاحب سے فرضیت ساقط ہوجائے گی؟ کیا بیٹا باپ کی طرف سے حج کرسکتا ہے؟ براہ کرم جلد اس مسئلے کو حل فرمادیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... حج بدل میں مأمور کیلئے آمر کے شہر سے ہی حج پر جانا ضروری ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ کے بڑے بھائی

آپ کے والد صاحب کی طرف سے حج بدل نہیں کر سکتے ہاں اگر وہ آپ کے شہر یعنی جہاں آپ کے والد صاحب رہتے ہیں وہاں سے حج کیلئے روانہ ہوں تو پھر ان کا حج بدل درست ہوگا۔ جی ہاں! بیٹا باپ کی طرف سے حج بدل کر سکتا ہے۔

لما فی بدائع الصنائع(۲۹۲/۳): وان مات عن وصية لايسقط الحج عنه ويجب ان يحج عنه لان الوصية بالحج قد صحت واذا حجّ عنه يجوز عند استجماع شرائط الجواز وهي نية الحج عنه وان يكون الحج بمال الموصي او باكثره الا تطوعا وان يكون راكبا لا ماشيا لما ذكرنا فيما تقدم ويحج عنه من ثلث ماله. سواء قيد الوصية بالثلث بان يحج عنه بثلث ماله أو اطلق بان أوصى أن يحج عنه امّا اذا قيد فظاهر وكذا اذا اطلق لان الوصية تنفذ من الثلث و يحج عنه من بلده الذى يسكنه لان الحج مفروض عليه من بلده فمطلق الوصية ينصرف اليه ولهذا قال محمد رحمه الله تعالىٰ روى ابن رستم عنه في خراساني أدركه الموت بمكة فاوصى أن يحج عنه يحج عنه من خراسان.

وفي الفقه الاسلامي وادلته(۲۱۰۸/۳): ان يحرم من الميقات على النحو الذى طالب به الاصيل فلو اعتمر وقد امره بالحج ثم حج من مكة لايجوز ويضمن اى لو أمره بالافراد بالحج فتمتع بالعمرة لم يقع حجه عنه ويضمن باتفاق الحنفية ولو أمره بالافراد فقرن بالحج والعمرة فهو مخالف ضامن للنفقات عند ابى حنيفة ويجوز ذلک عند الصاحبين.

وفي مناسک ملا على القارى(ص۴۴۰): الثامن أن يحج عنه من وطنه ان اتسع الثلث اى ثلث مال الميت وان لم يتسع اى الثلث يحج عنه من حيث يبلغ اى استحسانا وان لم يمكن اى ان يحج عنه بثلث ماله من مكان بطلت الوصية ولعل المكان مقيد بما قبل المواقيت والا فبادنى شئ يمكن ان يحج عنه من مكة وكذا الحكم اذا اوصىٰ ان يحج عنه بماله وسمى مبلغه فانه ان كان يبلغ ان يحج عنه من بلده حج عنه منه وإلا فمن حيث يبلغ.

(۹۵) حج بدل میں مدینہ منورہ کا خرچ آمر پر ہوگا یا مامور پر؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل لوگ بکثرت دوسرے لوگوں کے ذریعے حج بدل کرواتے ہیں، آیا حج بدل کی صورت میں مدینہ طیبہ کا خرچہ بھی آمر پر آئے گا یا حج بدل کرنے والے پر، کیونکہ حکومت مصارف حج میں مدینہ کے خرچے کو بھی شامل کرتی ہے۔ اس صورت میں مدینہ طیبہ کی حاضری کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: جو آدمی حج بدل کراتا ہے تو حج کا خرچہ اس کے ذمہ لازم ہے۔ سفر مدینہ اگرچہ أفضل القربات میں سے ہے لیکن حج اس کے بغیر تام ہو جاتا ہے پس اصل حکم کے اعتبار سے تو آمر پر سفر مدینہ کا خرچ نہیں ہے۔ البتہ اس وقت مدینہ کا خرچ جمع کرائے بغیر

حج پر روانگی ممکن نہیں لہٰذا اس کا خرچ آمر (حج کرانے والے) پر ہوگا۔ البتہ اگر مامور اپنی طرف سے ادا کردے تب بھی حج آمر کی طرف سے ادا ہو جائے گا، اور اس کے حج میں کچھ بھی خلل واقع نہ ہوگا۔

لمافي المناسك لملا علي القاري (صـ۴۵۸): ولو خرج الحاج المأمور به قبل أيام الحج، ينبغي أن ينفق من مال الآمر إلى بغداد أو إلى الكوفة أو إلى المدينة أو إلى مكة واذا اقام ببلدة ينفق من مال نفسه حتى يجيئ أوان الحج، ثم يرحل وينفق من مال الميت، ليكون المأمور منفقاً من مال الآمر في الطريق فان أنفق من مال الميت في مدة إقامته يكون ضامناً، هذا اذا أقام ببلدة خمسة عشر يوماً، لانه مقيم...... ولو أقام ببلدة اى في أوان الحج إن كان لانتظار القافلة فنفقته مال الميت سواء أقام خمسة عشره يوماً أو أقل أو أكثر.

وفي الهندية(۱/۲۵۸): المأمور بالحج ينفق من مال الآمر ذاهباً وجائياً.

وفيه ايضاً(صـ۲۶۰): لو حج عن الميت ثم اعتمر لنفسه لا يضمن النفقة ومادام مشغولاً بالعمرة فنفقته في مال نفسه فاذا فرغ منها فنفقته في مال الميت.

(۹۶) حج بدل میں مامور کے پاس بچی ہوئی رقم کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے ایک صاحب نے اپنے والد کی طرف سے حج کرنے کیلئے بھیجا تھا، میں نے بڑی کفایت شعاری سے وہاں خرچ کیا تو کچھ رقم بچ گئی۔ اب جب میں واپس آیا تو وہ صاحب دبئی گئے ہوئے تھے۔ مجھ سے وہ رقم خرچ ہوگئی۔ اب فی الفور ہاتھ میں نہیں ہے۔ لیکن ارادہ واپس کرنے کا تھا اگرچہ انہوں نے واپسی کا کہا نہ تھا، لیکن اب دل میں آرہا تھا کہ انہوں نے تو پورے حساب سے رقم دی تھی وہ جو بچی تھی میری کفایت شعاری کی بنا پر تھی، آیا میں یہ رقم رکھ سکتا ہوں، انہیں نہ دوں تو گناہ تو نہیں ہے؟ یا ان کو بتا بھی دوں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... حج بدل میں آمر کی طرف سے جو مال مامور کو دیا جاتا ہے، اگر حج کرنے کے بعد مأمور کے پاس کچھ رقم بچ جاتی ہے۔ تو اس کا واپس کرنا مأمور پر لازم اور ضروری ہے۔ الا یہ کہ آمر نے باقی رقم کو استعمال کرنے کی اجازت دی ہو۔ پس صورت مسئولہ میں آپ یہ رقم اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے اور نہ دینے پر گناہ گار ہوں گے ہاں اگر بتادینے کے بعد اجازت دیدی تو پھر استعمال کر سکتے ہیں۔

لـمـافي التاتارخانية(۲/۵۴۷): وينفق المأمور من مال الميت ذاهبا وجائيا الى بلد الميت ويرد بقية النفقة الموصى وهذا اذا لم يوسع الميت عليه اما اذا وسع بان جعل الباقي صلة له بعد رجوعه فلا بأس بذلك.

وفي الشامية(۲/۶۱۲): (قوله وعليه ردما فضل من النفقة) قال في البحر فالحاصل ان المأمور لا

يكون مالكاً لما أخذه من النفقة بل يتصرف فيه على ملك الآمر حيا كان أو ميتا معينا كان القدر او لا ولا يحل له الفضل الا بالشرط الآتي سواء كان الفضل كثيرا او يسيرا كيسير من الزاد كما صرح به في الظهيرية اهـ.

(۹۷) حج بدل کرنے والا اگر واپس نہیں آیا اور وہیں ٹھہر گیا تو حج بدل کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک شخص کو حج بدل کرنے کیلئے بھیجا وہ حج کر کے مکہ میں ٹھہر گیا وطن واپس نہیں آیا تو کیا میری طرف سے حج ادا ہو جائے گا یا دوبارہ کسی کو بھیجنا ہوگا؟ یاد رہے کہ میں ایسی بیماری میں مبتلا ہوں جس کی وجہ سے خود نہیں جا سکتا؟

الجواب حامداًومصلیاً......جس شخص کو حج بدل کیلئے بھیج دیا جائے تو اس کیلئے بہتر یہ ہے کہ حج سے فراغت کے بعد واپس آ جائے البتہ اگر وہ وہاں ٹھہر جائے اور واپس نہ آئے تو بھی جائز ہے۔لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ کا حج ادا ہو گیا ہے دوبارہ کسی کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

لمافي الهندية(۱/۲۵۸): ولو أحج رجلا يؤدی الحج ويقيم بمكة جاز والافضل أن يحج ويرجع.

وفي الطحطاوی على الدر(۱/۵۵۳): ولو توطن مكة سقطت نفقته قل او كثر ثم إذا عادلا تعود بالاتفاق.

وفي الشامية(۲/۶۱۲): (والأفضل أن يعود إليه) ای إلى منزل الآمر المذكور في المتن قال في البحر: ولو أحج رجلا فحج ثم أقام بمكة جاز لأن الفرض صار مؤدى والأفضل أن يحج ثم يعود إلى أهله.

(۹۸) جس پر حج فرض ہو اس سے حج بدل کرانا

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے والد صاحب فوت ہو چکے ہیں میں چاہتا ہوں کہ انکی طرف سے حج ادا کروں، تو کیا میں اپنی جگہ کسی اور دیندار شخص کو خرچہ دیکر تیار کر سکتا ہوں یا مجھے خود جانا ہوگا؟ نیز جس شخص کو میرا تیار کرنیکا ارادہ ہے اسپر خود بھی حج فرض ہے اور مجھے خود احکامات صحیح طرح معلوم نہیں ہیں اس بارے میں میری رہنمائی فرما کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداًومصلیاً......اگر آپ احکام حج سے واقف نہیں ہیں تو خرچہ دیکر ایسے دیندار شخص کو حج پر بھیج سکتے ہیں جو احکام حج سے پوری طرح واقف ہو اور اسپر حج بھی فرض نہ ہو لیکن اگر ایسے شخص کو حج پر بھیجا جس پر حج خود بھی فرض ہے تو یہ بھی جائز ہے مگر ایسا کرنے سے مامور کے ذمہ اپنا فرض حج پھر بھی باقی رہیگا اور فرض حج میں تاخیر کی بنا پر گناہ گار بھی ہوگا۔

لما في الشامية(۲/۶۰۳): والافضل احجاج الحر العالم بالمناسک الذی حج عن نفسه وذکر فی البدائع کراهة احجاج الصرورة لانه تارک فرض الحج.....قلت .....ویحمل کلام الشارح علی الامر فیوافق مافی البحر من ان الکراهة فی حقه تنزیهیة وان کانت فی حق المامور تحریمیة.

وفیه ایضاً(۲/۴۵۷) قلت لایخفی مافیه بل الظاهر أن الصواب اِثم التاخیر اذبعدالاداء لاتفویت وفی الفتح: ویاثم بالتاخیر.

(۹۹) گرفتاری کے خوف کی وجہ سے حج بدل کروانا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی آدمی پر حج فرض ہو چکا ہو اور جانے کیلئے تیار بھی ہو لیکن حکومت کی طرف سے اسکی گرفتاری کا وارنٹ جاری ہو چکا ہو، اب اس صورت میں کیا کیا جائے، جبکہ اس شخص نے کوئی بھی جرم نہیں کیا ہے صرف اسکا جرم یہ ہے کہ اس نے جہادی تنظیم کو چندہ دیا تھا۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... ایسا شخص جس پر حج فرض ہو چکا ہو اور جانیکے لئے تیار بھی ہو لیکن کسی عذر کی بناء پر مثلاً حکومت کی طرف سے پابندی کی وجہ سے جانے پر قدرت نہ رکھتا ہو تو اسکی دو صورتیں ہیں۔اول: یہ کہ عذر وقتی اور عارضی ہو یعنی اسکے زائل ہونے کی امید ہو۔دوم: یہ کہ عذر دائمی ہو یعنی موت تک اسکے زائل ہونیکی امید نہ ہو۔دونوں صورتوں میں حکم یہ ہے کہ اس پر بذات خود حج کرنا فرض نہیں ہے البتہ کسی دوسرے شخص کو مال دیکر حج کیلئے بھیجنا لازم ہے، پھر اگر عذر وقتی ہے تو عذر زائل ہو جانے کے بعد قدرت علی الحج ہونیکی صورت میں حج کا اعادہ کرنا لازم ہوگا اور اگر عذر دائمی ہے تو حج بدل اسکی طرف سے کافی ہو جائیگا اور مرض الموت میں اس پر حج کی وصیت کرنا بھی لازم نہ ہوگی۔

لما في الدر المختار (۲/۵۹۸): (تقبل النیابة عندالعجز فقط) لکن (بشرط دوام العجز الی الموت) لانه فرض العمر حتی تلزمه الاعادة بزوال العذر .... (هذا)ای اشتراط دوام العجز الی الموت (اذا کان) العجز کالحبس (والمرض یرجی زواله)ای یمکن(وان لم یکن کذلک کالعمی والزمانة سقط الفرض)بحج الغیر (عنه)فلااعادة مطلقاسواء (استمر به ذلک العذر ام لا).

(۱۰۰) صحت مند شخص حج بدل نہیں کرا سکتا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں ایک آدمی ہے، عمر کافی زیادہ ہے لیکن صحت مند ہے اور دوسری شادی کی فکر میں لگا ہوا ہے البتہ اس نے اپنی جگہ اپنے پوتے کو رقم دیکر حج کیلئے روانہ کیا کہ میری طرف سے حج ادا کر لینا تو اب معلوم یہ کرنا ہے کہ ایسے آدمی کی طرف سے جبکہ وہ خود جا سکتا ہو اسکی طرف سے حج کرنا جائز ہے؟ نیز اس سے متعلق مزید جو شرائط ہوں وہ بھی تحریر فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً.....صورت مسئولہ میں مذکورہ شخص کا صحت مند ہوتے ہوئے اپنی جگہ پوتے یا کسی اور شخص کو حج کیلئے بھیجنا درست نہیں ہے۔حج بدل کی شرط یہ ہے کہ بیماری وعذر وغیرہ ایسا ہو کہ اسکی وجہ سے پوری زندگی حج پر نہ جا سکتا ہو، ورنہ اس پر خود حج کرنا لازم ہے۔

لما فی التاتارخانیة(۲/۵۴۵):رجل احج رجلا وهو مریض فلم یزل مریضا حتی مات فهو جائز عن حجة الاسلام وان صح لایجزیه عن حجة الاسلام.

(۱۰۱) بیوی کی طرف سے حج کرنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں جدہ میں رہتا ہوں جبکہ میری بیوی کراچی میں ہے، میں اتنا زیادہ مالدار نہیں ہوں کہ بیوی کو حج کیلئے بلا سکوں، کیا میں خود بیوی کی طرف سے حج کر سکتا ہوں؟ کیا یہ حج میری بیوی کی طرف سے ادا ہو جائیگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....صورت مسئولہ میں جب آپ کی بیوی نہ خود صاحب استطاعت ہے اور نہ آپ کے پاس اتنا مال ہے کہ بیوی کو حج کرا سکیں تو اس صورت میں آپ کی بیوی پر حج فرض نہیں ہے اور جو حج آپ اپنی بیوی کی طرف سے کرینگے وہ بیوی کی طرف سے نفلی حج ہوگا البتہ جب آپ کی بیوی کے پاس اتنا مال آ جائے کہ وہ مع محرم سفر حج کے اخراجات ادا کر سکے تو اس پر اس وقت فرض حج ادا کرنا لازم ہوگا۔

لما فی الشامیة(۲/۶۰۲):اما الحج النفل فلایشترط فیه العجز لانه لم یجب علیه واحدة من المشقتین ای مشقة البدن ومشقة المال فاذا کان له ترکهما کان له ان یتحمل احداهما تقربا الی ربه عزوجل فله الاستنابة فیه صحیحا.

وفی الدرالمختار(۲/۴۶۴): (و) مع (زوج اومحرم) ولوعبداأوذمیاأوبرضاع.....(مع) وجوب النفقة لمحرمها.

وفی الشامیة تحته :(قوله مع وجوب النفقة) ای فیشترط ان تکون قادرة علی نفقتهاونفقته.

(۱۰۲) حج بدل میں میقات پر تلبیہ کے وقت محجوج عنہ کی نیت نہ کی

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی نے اپنی والدہ کی طرف سے حج کیا میقات پر تلبیہ حج کہا لیکن اپنی والدہ کی طرف سے تلبیہ نہ کہا تو ایسے آدمی کیلئے کیا حکم ہوگا؟ آیا یہ حج اس کی والدہ کی طرف سے ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....صورت مسئولہ میں جبکہ مذکورہ شخص نے اپنی والدہ کی جانب سے (جبکہ یہ حج ان پر فرض تھا اور انہوں نے اس کی ادائیگی کی وصیت بھی کی تھی) حج کرتے وقت (اگر احرام باندھتے وقت والدہ کی نیت کر لی تھی) اپنی والدہ کی جانب سے تلبیہ کہنا بھول گیا تو اس صورت میں بھی یہ حج والدہ کی جانب سے ادا ہو جائیگا۔اور اگر یہ فرض نہیں تھا تو اس کا ثواب والدہ کو پہنچ جائے گا۔اور اگر فرض تھا اور

وصیت بھی تھی اور احرام باندھتے وقت بھی والدہ کی جانب سے نیت نہیں کی تھی، تو اس صورت میں یہ فریضہ والدہ کی جانب سے ادا نہ ہوگا مگر ان کو ثواب پہنچ جائے گا۔

لمافي الهندية(۱/۲۵۷):الأصل في هذا الباب ان الانسان له ان يجعل ثواب عمله لغيره صلاة كان أو صوما أو صدقة اوغيرها كالحج ..ففي الحج النفل تجوز النيابة حالة القدرة. لان باب النفل أوسع. كذا في السراج الوهاج،(ومنها) الأمر بالحج، فلا يجوز حج الغير عنه بغير امره، الا الوارث يحج عن موروثه بغير أمره فانه يجزيه، (ومنها) نية المحجوج عنه عند الاحرام، والأفضل أن يقول بلسانه لبيک عن فلان.

وفي الشامية (۲:۵۹۵): (قوله بعبادة ما) اى سواء كانت صلاة أو صوماً او صدقة الخ.... لان عدم الثواب لايستلزم عدم سقوط عن ذمته، على ان الثواب لاينعدم كما علمت. وسنذكر فيما لوأهل بحج عن أبويه، إنه قيل انه يجزيه عن حج الفرض، وهذا يؤيد ما بحثه في البحر..... وبحث أيضاً ان الظاهر انه لافرق بين ان ينوى به عند الفعل للغير او يفعله لنفسه ثم يجعل ثوابه لغيره لإطلاق كلامهم، قلت، واذا قلنا بشموله للفريضة أفاد ذالک لأن الفرض ينويه عن نفسه، فاذا صح جعل ثوابه لغيره دل على انه لا يلزم في وصول الثواب ان ينوى الغير عند الفعل.

(۱۰۳) معتدہ کا بوجہ عدت حج بدل کروانا

سوال ...کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے اور میرے شوہر نے بڑی مشکل سے اتنے پیسے جوڑ کے جمع کئے کہ ہم حج پر جاسکیں، اس سال ہی درخواست جمع کرادی تھی، خدا کا فضل ہوا اور ہم دونوں کا نام نکل آیا، اور ہم نے تیاریاں شروع کردیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا حکم نہ تھا، قضائے الٰہی سے میرے شوہر کا تین دن قبل انتقال ہوگیا۔ اب میں عدت میں بھی ہوں اس وجہ سے میرا جانا مشکل ہوگیا، آپ سے پوچھنا یہ ہے کہ کیا اب جبکہ میں اس سال حج پر نہ جاسکی تو حج بدل کروانا مجھ پر لازم ہوگا؟ کیا میں کسی اور کو اپنی طرف سے اپنی جگہ بھیج دوں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ...عورت کیلئے وجوب حج کے شرائط میں سے ایک یہ بھی ہے کہ عورت عدت میں نہ ہو۔ اور اسی طرح حج بدل کیلئے شرط یہ ہے کہ وہ عذر موت تک برقرار رہے۔ صورت مسئولہ میں چونکہ آپ عدت میں ہیں اور عدت کے اندر آپ کیلئے سفر کرنا جائز نہیں۔ اس لئے عدت میں آپ کیلئے حج پر جانا بھی جائز نہیں۔ اور حج بدل آپ اس لئے نہیں کرواسکتیں کہ عدت ایسا عذر نہیں جو موت تک برقرار رہے۔

لمافي الهندية(۱/۲۵۷): لجواز النيابة في الحج شرائط..... منها استدامة العجز من وقت الاحجاج الى وقت الموت.

وفی الشامیة(۲/۵۹۸): (والمرکبة منهما) کحج الفرض (تقبل النیابة عند العجز فقط) لکن (بشرط دوام العجز الی الموت) لأنه فرض العمر حتی تلزم الإعادة بزوال العذر وفی الشامیة(قوله لأنه فرض العمر) تعلیل لاشتراط دوام العجز إلی الموت ای فیعتبر فیه عجز مستوعب لبقیة العمر لیقع به الیاس عن الأداء بالبدن.

وفی الشامیة(۲/۴۶۵): (قوله المانعة من سفرها) أما الواقعة فی السفر فإن کان الطلاق رجعیا لایفارقها زوجها اوبائنا فإن کان إلی کل من بلدها، ومکة أقل من مدة السفر تخیرت أو الی احدهما سفر دون الآخر تعین أن تصیر إلی الاخر أو کل منهما سفر فإن کانت فی مصر قرت فیه الی أن تنقضی عدتها ولا تخرج وإن وجدت محرما خلافا لهما وإن کانت فی قریة أو مفازة لاتأمن علی نفسها فلها أن تمضی إلی موضع امن ولا تخرج منه حتی تمضی عدتها وان وجدت محرما عنده خلافا لهما کذا فی فتح القدیر.

(۱۰۴) کیا حج فرض ادا کرنے سے حج نذر ادا ہو جائیگا؟

سوال... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے نذر مانی کہ میرا فلاں کام ہو گیا تو میں حج کروں گا، اب زید پر حج فرض ہو گیا ہے اور اس نے پہلے حج فرض ادا نہیں کیا، تو اب زید پر کتنے حج ہیں ایک یا دو اور اگر زید حج ادا کرلے تو کون سا حج ادا ہوگا یعنی حج فرض ادا ہوگا یا نذر کا حج ادا ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورتِ مسئولہ میں اس شخص کا حج فرض ادا ہوگا اور جو نذر کا حج مانا تھا اگر اس کا کام ہو گیا تو حج منذور کو ادا کرنا بھی اس پر واجب ہوگا لیکن حج فرض ادا کرنے سے حج منذور ساقط ہو جائے گا، البتہ اگر صرف حج منذور کی نیت کرلی تو پھر حج منذور ادا ہوگا اور حج فرض اس کے ذمہ باقی رہے گا۔

لما فی خلاصة الفتاویٰ(۱/۲۷۷): ولو قال المریض ان عافانی الله تعالیٰ من مرضی هذا فعلی حجة فبرأ لزمته حجة وان لم یقل حجة للّٰه لان الحجة لایکون الا للّٰه تعالیٰ ولو برأ وحج جاز ذالک عن حجة الاسلام ولو نوی غیر حجة الاسلام صحت نیته.

و فی الهندیة(۱/۲۶۲): بان قال ان فعلت کذا فللّٰه علی ان احج حتی یلزمه الوفاء اذا وجد الشرط ولا یخرج بالکفارة فی ظاهر الروایة عن ابی حنیفة.(وفی ص ۲۶۳) ولو قال المریض ان عافانی الله من مرضی هذا فعلی حجة فبرأ لزمته حجة وان لم یقل علی حجة للّٰه لان الحجة لاتکون الا للّٰه. ولو قال ان برأت فعلیّ حجة فبرأ وحج جاز ذالک عن حجة الاسلام ولو نوی غیر حجة الاسلام صحت نیته.

﴿فصل فی الجنایات﴾

(جنایات کا بیان)

(۱۰۵) حالت احرام میں سر ڈھانپنے کا حکم

سوال:... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دوران حج سر کوڈھانپنے کا کیا حکم ہے؟ میں نے سنا ہے کہ اگر کوئی شخص سر کوڈھانپ لے تو دم لازم آتا ہے، اگر کوئی شخص بیمار ہو اور سر کھلا رکھنے کی صورت میں بیماری بہت زیادہ ہونیکا اندیشہ ہو تو اسکے لئے کیا حکم ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً:... حالت احرام میں سر ڈھانپنا ناجائز وحرام ہے، اگر کسی نے ارتکاب کیا تو دم لازم آئیگا۔ البتہ اگر کوئی شخص ایسا معذور ہے کہ سر کھلا رکھنے میں ہلاکت کا غالب گمان ہے (سردی کی وجہ سے یا بیماری کی وجہ سے) تو اس صورت میں سر ڈھانپنے کی اجازت ہے لیکن پھر بھی تین چیزوں میں سے ایک کوبطور کفارہ کے ادا کرنا لازم ہوگا، تین روزے رکھنا ہونگے یا چھ محتاجوں کو کھانا کھلانا ہوگا یا دنبہ وغیرہ ذبح کرنا ہوگا۔

لما فی الشامیة (۲/۵۵۷): (قوله بعذر) قید للثلاثة ولیست الثلاثة قیدافان جمیع محظورات الاحرام اذاکان بعذرففیه الخیارات الثلاثة کمافی المحیط قهستانی.

(۱۰۶) دورانِ غسل محرم کے بال گرنیکا حکم

سوال:... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے بال بہت زیادہ گرتے ہیں خصوصاً جب کنگی کرتا ہوں یا غسل کرتا ہوں تو اسوقت تو بہت ہی زیادہ بال گرتے ہیں اب اگر دوران احرام اگر میں غسل کروں تو اس سے کفارہ وغیرہ کے بارے میں کیا حکم ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً:... دوران احرام کنگی کرنا منع ہے لیکن غسل کرنیکی اجازت ہے چاہے غسل طہارت کیلئے ہو یا گرد وغبار دور کرنے کیلئے ہو یا ٹھنڈک حاصل کرنے کیلئے ہو البتہ احتیاط کریں کہ بال نہ گریں، اگر گر جائیں تو صدقہ دینا پڑے گا۔

لما فی الدرالمختار (۲/۴۹۱): (و حک رأسه وبدنه) لکن برفق ان حاف سقوط شعره او قملة فان فی الواحدة یتصدق بشیٔ وفی الثلاث کف من طعام.

وفی الشامیة تحته : (قوله یتصدق بشئ) ای کتمرة و کسرة خبز (قوله وفی الثلاث) ای من الشعر والقمل.

(۱۰۷) دورانِ حج بال گرنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں گزشتہ سال حج پر گیا تھا لیکن میرے ساتھ ایک مسئلہ پیش آیا جس کی وجہ سے میں کافی پریشان ہوگیا ہوں، وہ یہ کہ میرے بال بہت گرتے ہیں بلکا سا بھی ہاتھ لگے تو کچھ بال ضرور گریں گے اور جب میں وہاں مسح کرتا تھا سر کا اس وقت بھی بال گرتے تھے ایسی صورت حال کو جب میں نے وہاں اپنے حج گروپ کے ساتھیوں کے سامنے ذکر کیا تو وہ کہنے لگے کہ آپ کو ہر بال کے بدلے میں ایک قربانی کرنی ہوگی جب میں نے ان کی بات سنی تو میں کافی پریشان ہوا کیونکہ میری تو اتنی استطاعت نہیں ہے خیر وہاں سے تو میں واپس آ گیا اب آپ بتائیں مجھ کو کیا کرنا ہوگا اور جو بھی چیز یعنی کچھ صدقہ یا قربانی کرنی ہوگی تو یہاں کرنے سے ادا ہو جائے گی یا وہاں کسی کو کہنا ہوگا اور میرا تو کوئی وہاں جاننے والا ہے نہیں؟ براہ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورت مسئولہ میں اگر آپ کے بال مسح وغیرہ کرنے کی بناء پر گرے ہیں اور وہ چوتھائی سر کی مقدار کے برابر یا اس سے زیادہ تھے، تو اس صورت میں آپ کو تین چیزوں میں سے کسی ایک چیز میں اختیار ہے، چاہے تو آپ دم دیں، جس کی ادنیٰ مقدار ایک بکری ہے، یا تین روزے رکھیں یا تین صاع گندم (9.54 کلو) صدقہ کریں، جس کا طریقہ یہ ہے کہ چھ مسکینوں میں سے ہر ایک کو نصف صاع گندم (2 کلو) دے دیں۔ البتہ اگر آپ دم ادا کرنا چاہتے ہیں تو دم حرم کے ساتھ خاص ہے، اور باقی دو چیزیں آپ کہیں بھی ادا کر سکتے ہیں، اور اگر آپ کے بال سر کے چوتھائی حصے سے کم گرے تھے، تو آپ پر کم از کم نصف صاع گندم (2 کلو) کا ادا کرنا لازم ہے۔

لمافی الهندیة (۲۴۳/۱): واذا حک المحرم رأسه أو لحیته فانتثر منها شعر فعلیه صدقة......

وفیه ایضاً (ص۲۴۴): اذا فعل ذلک بعلة او ضرورة فعلیه ایّ الکفارات شاء ... و ذلک اما النسک أو الصدقة أو الصوم فإن اختار النسک ذبح فی الحرم ... وان ذبح فی غیر الحرم لا یجوز عن الذبح الا اذا تصدق بلحمه علی ستة مساکین علی کل واحد منهم قیمة نصف صاع من الحنطة...... وان اختار الصوم صام ثلاثة ایام فی ای مکان شاء ... . وان اختار الصدقة تصدق بثلاثة اصوع حنطة علی ستة مساکین لکل مسکین نصف صاع والافضل أن یتصدق علی فقراء مکة ولو تصدق علی غیر فقراء مکة جاز.

وفی الدرالمختار (۴۹۱/۲): وحک رأسه وبدنه لکن برفق ان خاف سقوط شعره او قملة فان فی

الواحدة يتصدق بتي وفي الثلاثة كف من طعام غرر أذكار.

وفي الشامية (۲/ ۵۴۹): (قوله أي أزال) اى اراد بالحلق الإزالة بالموسىٰ او بغيره مختارا اولا، فلو ازاله بالنورة أو نتف لحيته او احترق شعره بخبزه أو مسه بيده وسقط فهو كالحلق بخلاف ما اذا تناثر شعر بالمرض او النار. قوله "ربع رأسه الخ" هذا هو الصحيح المختار الذى عليه جمهور اصحاب...

(۱۰۸) حالت احرام میں بالوں کے جھڑنے اور کاٹنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری بڑی بہن اس سال حج پر جارہی ہیں ان کا نام بھی آ چکا ہے، ان کے شوہر ساتھ میں ہیں، میری بہن کے بال بہت جھڑتے ہیں، انہیں کسی سے معلوم ہوا ہے کہ اگر دوران حج بال توڑے یا وہ خود ٹوٹے تو بھی دم آتا ہے۔ اب وہ بہت پریشان ہیں کہ کیا کریں۔ آنجناب کی خدمت میں درخواست تھی کہ یہ مسئلہ صحیح طرح تفصیلاً بتا دیں اور اس عذر کی بنا پر کوئی گنجائش ہے تو وہ بھی ضرور بتا دیں۔

الجواب حامداومصلیا...... اگر محرم کے بال بیماری کی وجہ سے جھڑ جائیں خواہ کم جھڑیں یا زیادہ تو اس صورت میں محرم پر کچھ واجب نہیں ہوتا اور اگر محرم جان بوجھ کر اپنے بال توڑے یا کٹوائے اور وہ سر کے چوتھائی حصہ کی مقدار سے کم ہیں تو اس صورت میں محرم پر صدقہ آتا ہے اور اگر چوتھائی سر یا اس سے زیادہ سر کے بال خود کاٹے یا توڑے یا کٹوائے تو اس صورت میں محرم پر دم آتا ہے لہٰذا صورت مسئولہ میں کیونکہ آپ کی بہن کے بال بیماری کی وجہ سے گر رہے ہیں اس پر کچھ واجب نہیں ہوگا۔

لما في البحر الرائق (۳/ ۱۵): وانما كان حلق ربع الراس أو ربع اللحية موجباً للدم لتكامل الجناية بتكامل الارتفاق..... فلو أزاله بالنورة أو نتف لحيته واحترق شعره بخبزة أو مسه بيده فسقط فهو كالحلق بخلاف ما اذا تناثر شعره بالمرض أو النار فلا شئ عليه لأنه ليس للزينة وإنما هو شين.

وفي الطحطاوى على الدر (۱/ ۵۲۲): قوله ربع رأسه: سواء بقى بعد ذلك شئ من الراس ام لا كاصلع ليس على رأسه الا مقدار الربع ولو لم يزله بل تناثر بمرض أو نار فلاشئ عليه لانه ليس للزينة بل هو شين وقيد اعتبار الربع بالرأس واللحية للاشارة الى أنه لا يعتبر في غيرهما فلا يجب الدم الا بحلق كل الفخذ والساق والصدر لابربعها كمافي البحر اه.

وفي الشامية (۲/ ۵۴۹): فلو أزاله بالنورة أو نتف لحيته أو احترق شعره بخبزه ... فهو كالحلق، بخلاف ما إذا تناثر شعر بالمرض أو النار الخ. قوله ربع رأسه الخ، هذا هو الصحيح المختار الذي عليه جمهور أصحاب المذهب. وذكر الطحاوى في مختصره ان في قول أبي يوسف

ومحمد لا يجب الدم مالم يحلق أكثر رأسه شرح اللباب وإن كان أصلع إن بلغ شعره ربع رأسه فعليه دم وإلافصدقة وإن بلغت لحيته الغاية في الخفة إن كان قدر ربعها كاملة فعليه دم وإلا فصدقة لباب، واللحية مع الشارب عضو واحد فتح.

(۱۰۹) کیا حاجیوں کیلئے حجام سے بال کٹوانا ضروری ہے؟

سوال ...کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حاجیوں کیلئے حجام سے بال کٹوانا ضروری ہے یا ایک دوسرے کے بال بھی کاٹ سکتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......احرام سے نکلنے کے وقت حاجیوں کیلئے حجام سے بال کٹوانا ضروری نہیں ہے بلکہ ایک دوسرے کے بال خود بھی کاٹ سکتے ہیں۔

لمافي غنية المناسک(ص۱۷۴): ولو حلق رأسه أو راس غيره من حلال أو محرم جازله الحلق لم يلزمهما شئ.

وفي مناسک لملا علي القاري(ص۲۳۰): (واذا حلق) اى المحرم (رأسه) اى راس نفسه (أو راس غيره) اى ولو كان محرما (عند جواز التحلل) اى الخروج من الاحرام بأداء أفعال النسک (لم يلزمه شئ) الاولى لم يلزمهما شئ وهذا حكم يعم كل محرم في كل وقت.

(۱۱۰) حاجی اگر دوسرے حاجی کے بال کاٹے تو کیا صدقہ لازم ہوگا؟ فقہاء کرام کی عبارتوں میں ظاہری تعارض اور اس کی توجیہ

سوال　کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حاجیوں کیلئے آپس میں ایک دوسرے کے بال کاٹنے کا کیا حکم ہے؟ اس صورت میں جو حاجی ابھی تک محرم ہے آیا اس پر دم یا صدقہ کچھ لازم ہوگا یا نہیں؟ غنية المناسک (ص۱۷۴) ولو حلق راسه او راس غيره من حلال او محرم جاز له الحلق لم يلزمهما شئ. کی اس عبارت سے جواز معلوم ہوتا ہے اور کچھ شئی لازم نہ ہونے کا پتہ چلتا ہے جبکہ ہندیہ (۲۴۳/۱) حلق رأس محرم أو حلال وهو محرم عليه صدقة الخ سے عدم جواز اور صدقہ کا لزوم معلوم ہوتا ہے۔ براہ کرم اس مسئلے کا صحیح حل قرآن وسنت کی نصوص سے عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً　حالت احرام میں حاجیوں پر ایک دوسرے کے بال کاٹنے کی وجہ سے حلق کرنے والے پر صدقہ اور حلق کروانے والے پر دم لازم ہوتا ہے۔ لیکن اگر حاجی دیگر مناسک حج سے فارغ ہو چکا ہو اور صرف حلق باقی ہو تو حلال ہونے کی نیت سے حاجی ایک

دوسرے کے بال کاٹ سکتے ہیں۔ اس صورت میں کچھ بھی لازم نہیں ہوگا۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں ہندیہ اور غنیۃ الناسک کی عبارت میں جو تعارض معلوم ہو رہا ہے اس کا حل یہ ہے کہ ہندیہ کی عبارت اس صورت پر محمول ہے جب مناسک حج مکمل نہ ہوئے ہوں۔ جیسا کہ ان عبارات سے معلوم ہو رہا ہے۔

لـمـافـي مناسک ملا علي القاري(۱/۳۲۹): فصل في حلق المحرم رأس غيره وحلق الحلال رأسه اى رأس المحرم (اذا حلق محرم رأس محرم) اى غير نفسه (أو حلال، فعليه صدقة، سواء حلق بأمره أو بغيره) اى بغير امر المحلوق طائعا أو مكرها (وان حلق الحلال رأس محرم فلا شئ على الحالق الحلال)...... اذ الحلال غير داخل في موجبات محظورات الاحرام، وهل يحرم عليه او يباح فعله هذا أو يكره؟ الظاهر الاخير لظاهر قوله تعالىٰ: "ولا تحلقوا رؤوسكم" اذ المعنى لا تأمروا بحلق رؤوسكم او لايحلق بعضكم رأس بعض...... وان حلق المحرم رأس حلال تصدق بشي، وان حلق المحرم رأس محرم آخر بأمره أوبغير امره فعلي المحلوق دم وعلي الحالق صدقة.

وفي غنية الناسک(۱/۲۵۸): وان حلق محرم رأس محرم قبل أوان التحلل بأمره أو بغير امره فعليه صدقة، وعلي المحلوق دم. ولايتخير فيه، وان كان مكرها، اونائما لانه عذر من جهة العباد وكذا اذا حلق رأس محرم فعلي الحالق الحلال صدقة، كما لو حلق نبات الحرم.

اور غنیۃ الناسک کی عبارت اس صورت پر محمول ہے کہ جب حاجی دیگر مناسک حج مکمل کر چکا ہو اور صرف حلق باقی ہو اور حلال ہونے کی نیت کی ہو۔ جیسا کہ مناسک ملا علی القاری کی اس عبارت سے معلوم ہو رہا ہے۔

وفي مناسک ملا علي القاري(۱/۳۳۰): (واذا حلق) اى المحرم (رأسه) اى رأس نفسه، (أو رأس غيره) أى ولو كان محرما، (عند جواز التحلل) اى الخروج من الاحرام بأداء افعال النسک (لم يلزمه شئ) الاولى لم يلزمهما شئ، وهذا حكم يعم كل محرم في كل وقت.

(۱۱۱) حالت احرام میں خوشبو والے صابن سے غسل کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل غسل کرنے کیلئے جو صابن آتے ہیں وہ خوشبو والے ہوتے ہیں آیا حالت احرام میں خوشبو والے صابن سے غسل کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: خوشبودار صابن سے حالت احرام میں غسل کرنا جائز نہیں ہاں اگر بغیر خوشبودار صابن ہو تو اس سے غسل کرنا جائز ہے۔

لـمـافـي الهندية(۱/۲۴۱): ولا يغسل رأسه ولحيته بالخطمي فان غسل فعليه دم في قول ابي حنيفة

ولو غسل المحرم باشنان فيه طيب فان كان من رآه سماه اشنانا كان عليه الصدقة وان كان سماه طيبا كان عليه الدم.

وفي الشامية (۲/۴۸۹): لو غسل باالصابون والحرض لارواية فيه وقالوا لا شئ فيه لانه ليس بطيب.

وفي الفقه الاسلامي(۳/۲۲۹۹): وللمحرم غسل رأسه وبدنه في حمام وغيره بلا تسريح لان تسريحه تعريض لقطع الشعر وله مع الكراهة الغسل بسدر وخطمي ونحوهما كصابون واشنان وله غسل ثياب الاحرام.

وفيه ايضاً (ص ۲۳۰۰): ويجوز الاغتسال ولو بالصابون عند الشافعية والحنابلة ولا يجوز بالصابون ونحوه عند الحنفية.

(۱۱۲) حالت احرام میں پان کھانے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص پان کھانے کا عادی ہو، اور وہ حج پر جائے تو حالت احرام میں پان کھا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً حالت احرام میں خوشبودار چیز استعمال کرنے سے دَم لازم آتا ہے۔لیکن کھانے کی چیزوں میں تفصیل یہ ہے کہ کھانے کی چیز میں خوشبو مغلوب ہو تو اس چیز کے کھانے سے دم لازم نہیں آتا مگر کراہت سے خالی نہیں، اور اگر کھانے کی چیز میں خوشبو غالب ہو تو اس کے کھانے کی صورت میں دَم ضرور لازم ہوگا۔لہٰذا پان کا عادی شخص اگر حالت احرام میں خوشبودار پان کھائے گا تو دَم لازم آئے گا۔لیکن اگر وہ ایسا پان استعمال کرے جس میں خوشبو مغلوب ہو تو اس صورت میں دَم لازم نہیں آئے گا۔البتہ کراہت سے خالی نہیں۔بہتر یہ ہے کہ حالت احرام میں پان کھانے سے مکمل اجتناب کیا جائے۔

لمافي الهندية (۱/۲۴۱): ولو كان الطيب في طعام طبخ وتغيّر فلا شئ على المحرم في أكله سواء كان توجد رائحته اولا، كذا في البدائع، وإن خلطه بما يؤكل بلاطبخ فان كان مغلوباً فلا شئ عليه غير أنه إن وجدت معه الرائحة كره وإن كان غالباً وجب الجزاء.

وفي الدر المختار(۲/۵۴۶): ولو جعله في طعام قد طبخ فلا شيء فيه، وان لم يطبخ وكان مغلوبا كره أكله كشمّ طيب وتفّاح:

وفي الشامية تحته : (قوله ولو جعله) أى الطيب في طعام. الخ. إعلم أن خلط الطيب بغيره على وجوه، لأنه إما أن يخلط بطعام مطبوخ أولا، ففي الأول لاحكم للطيب سواء كان غالباً أم مغلوبا، وفي الثاني الحكم للغلبة إن غلب الطيب وجب الدم،وإن لم تظهر رائحته كمافي الفتح،وإلا فلاشئ

علیہ غیر أنہ إذا وجدت معہ الرائحۃ کرہ.

(۱۱۳) حالت احرام میں خوشبودار دوائی لگانا

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھ کو خارش کی بیماری لگی ہوئی تھی، ڈاکٹر نے بطور علاج ایک خوشبودار صابن استعمال کرنے کو کہا ہے، اب مسئلہ یہ ہے کہ میں حج کو جا رہا ہوں جبکہ دوران احرام خوشبودار چیزوں کا استعمال ممنوع ہے تو اب میرے لئے کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....احرام کی حالت میں خوشبو لگانا ناجائز وحرام ہے اسلئے آپ کو دوسری دوائی سے علاج کرنا چاہئے البتہ اگر کوئی ماہر ڈاکٹر آپ کو بتائے کہ اسکے علاوہ کوئی اور دوا موثر نہیں ہوسکتی اور آپ کو تکلیف بھی ہے تو اس صورت میں آپ اس خوشبودار صابن کا استعمال کرسکتے ہیں، لیکن استعمال کی صورت میں آپ پر فدیہ دینا لازم ہوگا جسمیں آپ کو اختیار ہوگا یا تو تین دن روزے رکھیں یا تین صاع گندم یا اسکی قیمت چھ مسکینوں پر صدقہ کردیں یا حرم میں بکری وغیرہ ذبح کردیں۔

لمافی الشامیۃ(۲/۵۵۷) (قولہ بعذر) قید للثلاثۃ ولیست الثلاثۃ قیداً فان جمیع محظورات الاحرام اذا کان بعذر ففیہ الخیارات الثلاثۃ کمافی المحیط قہستانی.

(۱۱۴) حالت احرام میں خوشبودار مسواک استعمال کرنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل حاجی صاحبان اپنے ساتھ چند عدد مسواک جو اعلیٰ وعمدہ قسم کی خوشبو سے معطر ایک تھیلی میں بند ہوتی ہیں، سفر حج میں لے جاتے ہیں۔ تو کیا اس قسم کی مسواک کو حالت احرام میں استعمال کرنے سے ''دم'' لازم آئے گا یا نہیں؟ میں نے سنا ہے کہ حالت احرام میں خوشبو کا استعمال ممنوع ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً.....محرم کیلئے خوشبو کا استعمال حالت احرام میں ممنوع ہے تاہم اگر خوشبو بدن پر استعمال ہونے والی اشیاء کے ساتھ ملا کر استعمال کی جائے اور اس شے کو خوشبو ملانے کے بعد دیکھنے والا خوشبو کہتا ہو تو اس صورت میں محرم پر دم لازم ہوگا اور اگر دیکھنے والا اس شے کو خوشبو نہیں کہتا تو اس صورت میں صدقہ لازم ہوگا الا یہ کہ اس کو تین یا اس سے زائد مرتبہ استعمال کرے تو اس صورت میں بھی دم لازم ہوگا۔ البتہ تھیلی میں پیک شدہ مسواک جس کا سوال میں ذکر ہوا ہے ہماری معلومات کے مطابق اس میں خوشبو نہیں ملائی جاتی بلکہ پودینہ وغیرہ کا عرق بہت کم مقدار میں ملایا جاتا ہے جس پر خوشبو کی تعریف صادق نہیں آتی لہٰذا ایسی مسواک کے استعمال سے نہ صدقہ لازم ہوگا نہ دم۔ تاہم اگر کوئی مسواک ایسی ہے جس میں واقعتاً خوشبو ملائی جاتی ہے تو اس کے استعمال سے محرم پر صدقہ لازم ہوگا لیکن اگر تین یا اس سے زائد مرتبہ استعمال کرے گا تو دم لازم ہوگا۔

لمافی شرح معانی الاثار(۱/۴۴۳): عن عائشۃ قالت قال رسول اللہ ﷺ اذا رمیتم وحلقتم فقدحل

لكم الطيب والثياب وكل شيئ الا النساء.

وفي الهندية(۱/۲۴۰): الطيب كل شئ له رائحة مستلذة ويعده العقلاء طيبا(ص ۲۴۰) ولو غسل المحرم بأشنان فيه طيب فان كان من راٰه سماه أشناناً كان عليه الصدقة وان كان سماه طيبا كان عليه الدم...... وعن محمد رحمه الله تعالىٰ فيمن اكتحل بكحل مطيب مرة اومرتين فعليه صدقة وان كان مرارا كثيرة فعليه دم.

وفي الشامية (۲/۵۴۷): اعلم ان خلط الطيب بغيره على وجوه لانه اما ان يخلط بطعام مطبوخ او لاففي الاول لاحكم للطيب سواء كان غالبا ام مغلوبا وفي الثاني الحكم للغلبة ان غلب الطيب وجب الدم وان لم تظهر رائحته كما في الفتح والا فلا شيئ عليه غير انه اذا وجدت معه الرائحة كره وان خلط بمشروب فالحكم فيه للطيب سواء غلب غيره ام لا غير انه في غلبة الطيب يجب الدم وفي غلبة الغير تجب الصدقة الا ان يشرب مرارا فيجب الدم وبحث في البحر انه ينبغي التسوية بين الماكول والمشروب المخلوط كل منهما بطيب مغلوب اما بعدم وجوب شيئ اصلا اوبوجوب الصدقة فيهما ...... قلت لكن قول الفتح المار في غير المطبوخ وان لم تظهر رائحته يفيد اعتبار الغلبة بالاجزاء لا بالرائحة...... هذا حكم الماكول والمشروب واما اذا خلط بما يستعمل في البدن كأشنان ونحوه ففي شرح اللباب عن المنتقى ان كان اذا نظر اليه قالوا هذا أشنان فعليه صدقة وان قالوا هذاطيب عليه دم.

وفي الهندية(۱/۲۳۲): ثم اذا حلق اوقصر حل له كل شيئ حرم عليه بالاحرام الاالنساء.

(۱۱۵) حالتِ احرام میں خوشبو لگے ہوئے کپڑے پہننے سے دم اور صدقہ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حالت احرام میں جمعہ کے دن میں نے اپنے احرام کے کپڑے تبدیل کیے، ان کپڑوں پر پہلے سے کچھ عطر لگا ہوا تھا جو بوقت پیکنگ لگایا تھا، میں نے وہ کپڑے پہن لیے، اب جب جمعہ کی نماز پڑھ کر واپس ہو رہا تھا تو ایک دوست مل گئے اور کہنے لگے کہ حالت احرام میں خوشبو لگے ہوئے کپڑے پہننا مطلقاً منع ہے خواہ پہن کر لگائے یا لگے ہوئے پہنے، میں بڑا پریشان ہوا اور گھر جاتے ہی کپڑے تبدیل کر لیے، لیکن یہ سمجھ نہیں آیا کہ دم دوں؟ یا صدقہ کروں؟ آپ بتائیں مجھے ایسی صورتحال میں کیا کرنا چاہئے تھا؟

الجواب حامداً ومصلیاً......حج کی نیت اور تلبیہ سے پہلے ایسے کپڑے پہننا جن پر ایسی خوشبو لگی ہو جس کا (جثہ) محرم ہونے کی حالت میں باقی نہ رہے جائز ہے دم وغیرہ لازم نہیں ہوگا، نیت اور تلبیہ کے بعد خوشبو لگے ہوئے کپڑے پہننا ناجائز ہیں لہٰذا صورت مسئولہ میں چونکہ

آپ نے حالت احرام میں خوشبو والے کپڑے پہنے ہیں اس لئے اگر خوشبو ایک بالشت کے بقدر لگی ہوئی تھی اور پورے دن پہنے رکھے تھے تو نصف صاع صدقہ کرنا لازم ہوگا اور اگر ایک دن سے کم کپڑے پہنے ہوئے تھے تو ایک مٹھی طعام صدقہ کرنا ہوگا اور اگر ایک بالشت سے زیادہ لگی ہوئی تھی اور پورے دن پہنے تھے تو دم لازم ہوگا البتہ اگر ایک بالشت سے کم تھی لیکن اتنی زیادہ مہک رہی تھی کہ لوگ اس کو کثیر محسوس کررہے ہوں اور پورے دن پہنے رکھے ہوں تو اس صورت میں بھی دم لازم ہوگا۔ دم کی صورت میں آپ کو جانور حرم ہی میں ذبح کرنا ہوگا البتہ صدقہ میں اختیار ہے جس جگہ کے بھی فقراء کو دیں صدقہ ادا ہوجائے گا۔

لما في البدائع الصنائع(۳/۲۱۷): وإن طيب عضواً كاملاً كالرأس والفخذ والساق ونحو ذلك فعليه دم وان طيب أقل من عضو فعليه صدقة وقال محمدؒ يقوم ما يجب فيه الدم، فيتصدق بذلك القدر حتى لو طيب ربع العضو فعليه من الصدقة قدر قيمة ربع شاة وان طيب نصف عضو تصدق بقدر قيمة نصف شاة هكذا.

وفي الفقه الاسلامي وادلته(۳/۲۳۲): وتجب الصدقة عند الحنفية فيما يأتي من الحالات التي اشرت اليها سابقاً وهي (أ) إن طيب المحرم أقل من عضو كامل.(ب) ان حلق أقل من ربع الرأس أو اللحية أو حلق شاربه (ج) إن لبس المخيط او ستر راسه اقل من يوم أو أقل من ليلة (د) إن قص أقل من خمسة أظافير متفرقة، فلكل ظفر صدقة، اهـ. ان طاف للقدوم أو للوداع أو لكل طواف نطوع محدثاً، فإن طاف للقدوم جنباً أو طاف طواف الزيارة محدثا فعليه شاة وإن طاف للزيارة جنباً فعليه بدنة، وإن طاف للوداع جنباً فعليه شاة. (و) وإن ترك شوطاً من أشواط طواف الوداع أو السعي، أو نقص حصاة من إحدى الجمار، (ز) إن حلق المحرم رأس غيره سواء أكان الغير محرماً أم حلالاً ولا شئ عليه إن طيب عضو غيره أو البسه مخيطاً اجماعاً.

وفي البحر الرائق(۳/۵): واذا وجب الجزاء بالتطيب فلا بدمن ازالته من بدنه أو ثوبه لأنه معصية فلا بدمن الاقلاع عنها، وذبح الهدى لا يبيح بقاءه فلو لم يزله بعد ما كفرله اختلفوا في وجوب دم اخر لبقائه واظهر القولين الوجوب لأن ابتداءه كان محظوراً فيكون لبقائه حكم ابتدائه.

وفي الشامية(۲/۵۴۵): قلت: لكن نقلوا عن المجرد إن كان في ثوبه شبر في شبر فمكث عليه يوماً يطعم نصف صاع وإن كان أقل من يوم فقبضة قال في الفتح يفيد التنصيص على أن الشبر في الشبر داخل في القليل اهـ أى حيث أوجب به صدقة لا دماً، ومع هذا يفيد اعتبار الكثرة في الثوب لافي الطيب إلا انه لا يفيد أن المعتبر أكثر الثوب، بل ظاهره أن ما زاد على الشبر كثير موجب للدم لكثرة الطيب حينئذ عرفاً، فرجع الى اعتبار الكثرة في الطيب لافي الثوب وعلى هذا فيمكن اجراء

التوفيق المارّهنا أيضا بأن الطيب اذا كان في نفسه كثيراً لزم الدم وإن اصاب من الثوب اقل من شبر، وإن كان قليلاً لا يلزم حتى يصيب اكثر من شبر في شبر، وربما يشير إليه قولهم لو ربط مسكاً أو كافوراً أو عنبراً كثيراً في طرف إزاره أو ردائه لزمه دم، أي إن دام يوماً ولو قليلاً فصدقة.

(۱۱۶) محرم کے کپڑوں میں حالت احرام میں عطر کے قطرات لگ جانے کا حکم

سوال ... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص حالت احرام میں عطار کی دوکان پر بیٹھ جائے تو اس پر دم لازم ہوگا یا نہیں؟ جبکہ عطر کے قطرات بسا اوقات کپڑوں کو لگ جاتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ...... محرم کے لئے حالت احرام میں خوشبو کا استعمال جائز نہیں البتہ فقہاء نے لکھا ہے کہ محرم کے لئے حالت احرام میں خوشبو سونگھنا جائز ہے لیکن مکروہ ہے اسی طرح حالت احرام میں عطار کی دوکان میں بھی بیٹھ سکتا ہے مگر خوشبو سونگھنے کی نیت سے بیٹھنا مکروہ ہے۔ اس دوران اگر عطر کے قطرات اس کے کپڑوں میں لگ گئے تو اگر کم لگ گئے ہوں تو صدقہ لازم ہوگا اور اگر زیادہ لگ گئے ہوں تو دم آئے گا۔

لما في الهندية(۱/ ۲۴۱): هذا في البدن واما الثوب والفراش اذا التزق به طيب اعتبرت فيه القلة والكثرة على كل حال وكان الفارق هو العرف. والا فما يقع عند المبتلى...... ولو دخل بيتاقد اجمر فيه فعلق بثوبه رائحة فلا شئ عليه لانه غير منتفع بعينه بخلاف مالوا ستجمر ثوبه فعلق بثوبه فان كان كثيراً فعليه دم وان كان قليلاً فعليه صدقة لانه منتفع بعينه وان لم يعلق به شئ منه فلا شئ عليه.

وفي (صـ ۲۴۲): ولا يلزمه شئ بشم الريحان والطيب والثمار الطيبة مع كراهة شمه...... ولا باس ان يقعد في دكان عطار او موضع يتبخر فيه الا أنه يكره اذا كان جلوسه هناك لاستشمام الرائحة.

وفي الطحطاوي على الدر (۱/ ۵۱۹ـ۵۲۰): ولا بأس ان يجلس في حانوت عطار او موضع يتبخر فيه إلاانه يكره اذا كان الجلوس هناك لاشتمام الرائحة.

وفي الدر المختار(۲/ ۴۸۶ـ۴۸۷): (بعده) أى الاحرام بلا مهلة (يتقي الرفث) اى الجماع الى ان قال ...... (والتطيب) وان لم يقصده وكره شمه.

وفي الشامية تحته (قوله وكره شمه) اى فقط فلا شئ عليه به كما في الخانية وبهذا يشير إلى ان المراد بالتطيب استعماله في الثوب والبدن وقالوا لو لبس ازاراً مبخراً لا شئ عليه لانه ليس بمستعمل لجزء من الطيب وانما حصل مجرد الرائحة ومن ثم قال في الخانية لو دخل بيتاً قد بخر فيه واتصل بثوبه شئ منه لم يكن عليه شئ.

وفی الشامیة (۲/۵۴۴): (قوله إن طیب)..... وعلم من مفهوم شرطه انه لوشم طیباً او ثمارا طیبة لا کفارة علیه وان کره.

(۱۱۷) طواف زیارت نہ کرنے کی صورت میں بیوی کے حرام ہونے کی تفصیل

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی طواف زیارت نہیں کرسکا تو کیا اس پر اس کی بیوی حرام ہے اور اب طواف زیارت سے پہلے پہلے مرد یا عورت دوسرا نکاح کرسکتے ہیں؟ اگر نہیں تو وجہ کیا ہے؟ نیز یہ حکم حج فرض کا ہے یا حج نفل اور حج بدل کا بھی ہے۔ اور اگر اتنی مالی استطاعت نہیں ہے کہ دوبارہ حج پر جاسکے تو اب کیا کرے، کیا بیوی ہمیشہ کیلئے حرام رہے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً صورت مسئولہ میں جو شخص طواف زیارت نہیں کرسکا اس کے بارے میں پوچھے گئے مختلف احکامات کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱) جو شخص طواف زیارت نہیں کرسکا اس طرح کہ ایام نحر کے شروع ہونے کے بعد کوئی طواف نہیں کیا تو اس پر اس کی بیوی حرام رہے گی جب تک طواف زیارت ادا نہ کرے، ہاں البتہ اگر اس نے ایامِ نحر شروع ہونے کے بعد طواف صدر کرلیا ہو، یا طواف نذر یا نفلی طواف کیا ہو تو یہ طواف زیارت کے قائم مقام ہوجائے گا اور بیوی اس کیلئے حلال ہوجائے گی۔

(۲) ...طواف زیارت کی ادائیگی سے پہلے پہلے دوسرے نکاح کی تفصیل یہ ہے کہ اگر تو نکاح سے سائل کی مراد زوجین کا آپس میں دوسرا نکاح ہے تو اس کی ضرورت نہیں اس لئے کہ ترک طواف سے بیوی سے جماع تو حرام ہوا ہے لیکن اس سے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑا بلکہ نکاح باقی ہے اور اگر نکاح سے مراد کسی اور سے نکاح کرنا ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں اگر تارک طواف مرد ہے تو اس کیلئے دوسرا نکاح کرنا تو جائز ہے لیکن جماع کرنا حلال نہ ہوگا تاوقتیکہ طواف زیارت نہ کرے اور اگر عورت ہے تو وہ دوسرا نکاح اس وقت تک نہیں کرسکتی جب تک پہلا نکاح ختم نہ ہو، اس لئے کہ حرمت ترک طواف کی وجہ سے آئی ہے جس سے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑتا، لہٰذا یہ عورت منکوحۃ الغیر ہے اور منکوحۃ الغیر سے نکاح نہیں ہوسکتا ہاں جب یہ نکاح طلاق وغیرہ کے ذریعے سے ختم ہوجائے تو یہ عورت بھی نکاح کرسکتی ہے لیکن ہمبستری اس کیلئے بھی حلال نہیں ہوگی۔ باقی یہ حکم حج فرض، حج بدل اور حج نفل سب کیلئے یکساں ہے۔

(۳)...... اگرچہ اتنی مالی استطاعت نہیں ہے کہ حج پر جاسکے اس کے باوجود بیوی اس کیلئے حرام رہے گی جب تک بذات خود طواف زیارت ادا نہ کرے دیگر خلاصی کی کوئی صورت نہیں ہے۔

وفی البدائع الصنائع(۳/۱۸۹): ولا یکون الحاج محصراً بعد ما وقف بعرفة ویبقی محرماً عن النساء الی ان یطوف طواف الزیارة.

وفیه ایضاً(ص ۸۰): فصل فی حکم الطواف اذا فات: واما حکمه اذا فات عن ایام النحر فهو انه لایسقط بل یجب ان یأتی به لان سائر الاوقات وقته بخلاف الوقوف بعرفة وقال بعد سطر ثم إن

کان بمکۃ یأتی بہ باحرامہ الاول لانہ قائم اذالتحلل بالطواف ولم یوجد وعلیہ لتأخیرہ عن ایام النحر دم عند ابی حنیفۃ وان کان رجع الی اھلہ فعلیہ ان یرجع الی مکۃ باحرامہ الاول ولا یحتاج الی احرام جدید ومحرم عن النساء الی ان یعود فیطوف.

وفی الھندیۃ (۲۳۲/۱): ولو لم یطف اصلالم تحل لہ النساء وان طال ومضت سنون وھذا باجماع کذا فی غایۃ السروجی شرح الھدایۃ.

وفی الشامیۃ (۵۱۸/۲): (قولہ وحل لہ النساء) ای بعد الرکن منہ وھو اربعۃ اشواط بحر ولو لم یطف اصلاً لایحل لہ النساء وان طال ومضت سنون باجماع کذا فی الھندیۃ.

(۱۱۰۹) ایامِ مخصوصہ کی بناپرعورت طواف زیارت نہ کرسکی اوروطن لوٹ گئی تواب کیا کرے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت کے طواف زیارت کرنے سے پہلے مخصوص ایام شروع ہوگئے۔جس کی وجہ سے وہ طواف زیارت نہ کرسکی۔اورابھی مخصوص ایام چل ہی رہے تھے کہ واپسی کی فلائٹ کاوقت آگیا۔اور طواف زیارت کئے بغیر وہ واپس اپنے گھرپاکستان آگئی ہے۔اب شریعت مطہرہ کااس کے متعلق کیا حکم ہے؟نیزاب تاخیربھی کافی ہوگئی ہےاورسب حقوق زوجیت بھی اداہورہے ہیں۔

الجواب حامداًومصلیاً: طواف زیارت افعالِ حج میں رکن کی حیثیت رکھتا ہے۔اگرکوئی شخص طواف زیارت کئے بغیرلوٹ آئے تو وہ ہمیشہ کیلئے فی حق النساء(عورتوں سے قربت)کے اعتبار سے محرم رہے گااگروہ مرد ہےاگرعورت ہوتو وہ بھی شوہر سے قربت کے حق میں محرم رہے گی۔یہاں تک کہ وہ دوبارہ جائے اورطواف زیارت کرلے۔اور بلاعذرتاخیرکی وجہ سے دم(بکری کاذبح کرنا)بھی لازم ہوگا۔ اوراس دوران عورتوں سے قربت کرنا بھی جنایت شمار ہوگا۔اوردم لازم ہوگا۔اوراگرمختلف مجالس میں متعددمرتبہ قربت کی تو ہرقربت مستقل جنایت شمارہوگی اوردم لازم ہوگا۔لیکن اگرکوئی اس مسئلہ سے ناواقف ہو۔اورعورتوں سے قربت کرنے سے احرام کےختم ہوجانے کاگمان ہوتوایسی صورت میں فقط پہلی قربت جنایت شمارہوگی۔اوردم لازم ہوگا۔اس کے بعدکی جنایات سے دم ساقط ہوجائے گا۔لیکن احرام پھربھی باقی رہے گا۔اس پرلازم ہے کہ اسی پہلے والے احرام سے دوبارہ واپس جاکرطواف زیارت اداکرے۔لہٰذاصورت مسئولہ میں مذکورہ عورت کیلئے ضروری ہے کہ وہ اسی احرام سے دوبارہ جاکرطواف زیارت اداکرے۔اور بلاعذر(ایام مخصوص کے بعدتاخیرکرنا) تاخیرکی وجہ سے حرم میں بکری ذبح کرے۔باقی شوہر سے قربت(ہمبستری)اگراحرام سے نکلنے کےگمان سے ہوئی ہے۔تو فقط ایک دم (بکری)لازم ہوگا۔اوراگریہ معلوم تھا کہ طواف زیارت نہ کرنے کی وجہ سے شوہر سے قربت جائزنہیں ہے۔اس کے باوجودقربت پائی گئی توہرمجلس کی قربت مستقل جنایت شمارہوگی اوراس پردم لازم ہوگا۔

لمافی البخاری (۲۲۳/۱): ... عن عائشۃ انھا قالت قدمت مکۃ وانا حائض ولم اطف بالبیت ولا

بین الصفا والمروۃ قالت فشکوت ذلک إلی رسول اللہ ﷺ فقال افعلی کما یفعل الحآج غیر أن لا تطوفی بالبیت حتی تطھری.

وفی بدائع الصنائع(۳/ ۸۰، ۸۱): (فصل فی حکم الطواف إذا فات) وأما حکمه اذا فات عن أیام النحر، فھو أنه لا یسقط، بل یجب ان یأتی به، لأن سائر الاوقات وقته، بخلاف الوقوف بعرفة أنه اذا فات عن وقته یسقط، لانه مؤقت بوقت مخصوص، ثم ان کان بمکة یأتی به بإحرامه الأول، لانه قائم، اذا التحلل بالطواف ولم یوجد، وعلیه لتأخیره عن ایام النحر دم عند أبی حنیفة، وإن کان رجع إلی اھله، فعلیه أن یرجع إلی مکة بإحرامه الاوّل ولا یحتاج إلی احرام جدید وھو محرم عن النساء إلی أن یعود فیطوف وعلیه للتأخیر دم عند ابی حنیفة، ولا یجزئ عن ھذا الطواف بدنة، لانه رکن، وارکان الحج لا یجزئ عنھا البدل ولا یقوم غیرھا مقامھا، بل یجب الإتیان بعینھا کالوقوف بعرفة.

وفی الشامیة (۲/ ۵۵۳): (قوله بقی محرما) فإن رجع إلی أھله فعلیه حتما أن یعود بذلک الإحرام، ولا یجزی عنه البدل لباب (قوله فی حق النساء) لأنه بالحلق حل له ما سواھن حتی یطوف (قوله لزمه دم) أی شاة أو بدنة علی ماسیاتی (قوله إلا أن یقصد الرفض) أی فلا یلزمه بالثانی شئ وان تعدد المجلس مع أن نیة الرفض باطلة لانه لا یخرج عنه الا بالأعمال، لکن لما کانت المحظورات مستندة إلی قصد واحد وھو تعجیل الإحلال کانت متحدة فکفاہ دم واحد بحر.

قال فی اللباب: واعلم أن المحرم إذا نوی رفض الإحرام فجعل یصنع ما یصنعه الحلال من لبس الثیاب والتطیب والحلق والجماع وقتل الصید فإنه لا یخرج بذلک من الإحرام، وعلیه أن یعود کما کان محرما، ویجب دم واحد لجمیع ما ارتکب ولو کل المحظورات، وإنما یتعدد الجزاء بتعدد الجنایات إذا لم ینو الرفض، ثم نیة الرفض إنما تعتبر ممن زعم أنه خرج منه بھذا القصد لجھله مسألة عدم الخروج، وأما من علم أنه لا یخرج منه بھذا القصد فانھا لا تعتبر منه اھ.

(۱۱۹) طوافِ زیارت سے پہلے جماع کر لینے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص اپنی بیوی کے ساتھ حج کیلئے گیا لیکن اس نے طوافِ زیارت سے پہلے اپنی بیوی سے جماع کر لیا تو ان کے حج کا کیا حکم ہوگا اور ان پر کیا کفارہ ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر حاجی نے وقوفِ عرفہ کے بعد حلق یا قصر یعنی سر کے بالوں کو مونڈنے یا کاٹنے اور طوافِ زیارت کرنے سے پہلے بیوی سے جماع یعنی ہمبستری کی، تو حج تو فاسد نہیں ہوا، البتہ اس پر ایک بدنہ (اونٹ یا اونٹنی) کی قربانی لازم ہوگی اور اگر حلق کرنے

کے بعد اور طواف زیارت کرنے سے پہلے جماع کیا تو اس صورت میں اس پر بکری وغیرہ (چھوٹے جانور) کی قربانی لازم ہوگی۔

لمافي الهندية(۱/۲۴۵): ولو جامع امرأته بعد الوقوف بعرفة لايفسد حجه جامع ناسيا اوعامدا كذا في فتاوىٰ قاضيخان ويجب على كل واحد منهما بدنة...... وان جامع بعد الحلق فعليه شاة كذا في الكافي.

وفي الطحطاوي على الدر(۱/۲۶-۵۲۷): (قوله لم يفسد حجه) لقوله ﷺ من وقف بعرفة فقد تم حجه...... (قوله لخفة الجناية) لوجود الحل الاول بالحق هذا ما عليه المتون وخالف الكمال وجماعة فاوجبوا البدنة مطلقا واوضح ردّه في البحر(تتمة) حكم القارن اذا جامع...... وان كان بعد الطواف والوقوف قبل طواف الزيارة لم يفسد وعليه بدنة للحج وشاة للعمرة وان كان بعد الحلق لزمه شاتان شاة للحج وشاة للعمرة على ما اختاره الاكثر.

وفي الدرالمختار (۲/۵۶۰): (و)وطؤه (بعد وقوفه لم يفسد حجه وتجب بدنة بعد الحلق) قبل الطواف (شاة) لخفة الجناية

وفي الشامية تحته: (قوله بعد وقوفه) أى قبل الحلق والطواف...... (قوله لخفة الجناية) اى لوجود الحل الاول بالحلق في حق غير النساء وما ذكره من التفصيل هو ما عليه المتون ومشى في المبسوط والبدائع والا سبيجابى على وجوب البدنة قبل الحلق وبعده. وفي الفتح انه الاوجه لا طلاق ظاهر الرواية وجوبها بعد الوقوف بلا تفصيل وناقشه في البحر والنهر...... اما لو جامع بعد طواف الزيارة كله او اكثره قبل الحلق فعليه شاة لباب...... ولعل وجهه ان تعظيم الجناية انما كان لمراعات هذا الركن، وكان مقتضاه ان يستمر هذا الحكم ولو بعد الحلق قبل الطواف الا انه سومح فيه لصورة التحلل ولو كان متوقفا على اداء الطواف بالنسبة الى الجماع.

(۱۲۰) دورانِ حج کئی ساری جنایات کے تداخل کا مسئلہ

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص دورانِ حج کئی واجبات کو ترک کرتا ہے اور کئی جنایات کرتا ہے آیا اس شخص پر ایک دم آئے گا یا کئی دم آئیں گے، آیا تداخل کی صورت ممکن ہے اور تداخل کا اصول کیا ہے جبکہ فقہاء کرام کی عبارتوں سے تضاد معلوم ہوتا ہے کسی جگہ جنس واحد کا اعتبار کیا ہے تداخل کے اندر، کہیں مجلس کا اعتبار کیا ہے اور کسی جگہ محل کا اعتبار کیا ہے۔ اس تضاد کے دور کرنے کا کوئی حل ہے یا پھر تداخل کی کوئی اور وجہ بھی ہے؟ اس مسئلہ کا جواب دیکر مشکور وممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... حالت احرام میں ترک واجبات اور جنایات کے ارتکاب پر جو کفارات لازم ہوتے ہیں ان میں تداخل ہوسکتا

ہے۔لیکن یہ سوال کہ تداخل کا مدار اور اصول کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس مسئلہ میں ہمارے ہی ائمہ کرام کا اختلاف ہے۔اسی اختلاف کی بناء پر کفارات کے تداخل کی بعض صورتوں میں اتفاق پایا جاتا ہے اور بعض میں اختلاف۔

کفارات کے تداخل اور عدم تداخل کی کل تین صورتیں بنتی ہیں۔(۱)۔محل کا ایک ہونا، (۲)۔جنس کا ایک ہونا، (۳)۔خلاف الجنس ہونا۔ ہر ایک کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

(۱)۔تداخل کی پہلی صورت محل کا ایک ہونا...... جب کسی جنایت یا ترک واجب میں محل ایک ہو تو وہاں سب کے نزدیک بالاتفاق تداخل ہوسکتا ہے چاہے مجلس ایک ہو یا مختلف اور متعدد ہوں۔یا یوں تعبیر کیجئے جو جنایت یا ترک واجب متحد الجنس ذاتا ومحلا ہو تو وہاں بلا قید مجلس واحد کے،سب کے نزدیک کفارات کے اندر تداخل ہوسکتا ہے۔اس صورت کی دو مثالیں یہ ہیں:

(الف)۔ایک آدمی نے اپنے سر کا چوتھائی حصہ منڈایا (احرام کی حالت میں سر کا چوتھائی حصہ قائمقام ہے مکمل سر کے منڈانے کا) پھر جا کر دوسری مجلس میں بقیہ حصہ منڈایا (جو کہ ایک الگ مستقل جنایت شمار کی جاسکتی ہے) اب ان دونوں جنایتوں کے کفارات میں تداخل ہوسکتا ہے کیونکہ یہ ایک ایسی جنایت ہے جو کہ متحد الجنس ذاتا (منڈانا) اور محلا (سر میں ہونا) ایک ہے۔

(ب)۔ایک آدمی نے چاروں دن کو جمرات پر کنکری مارنا چھوڑا تو حقیقت کے لحاظ سے یہاں تین دم لازم آئیں گے لیکن ان کفارات میں تداخل جائز ہے کیونکہ یہاں ترک واجب متحد الجنس ذاتا (مارنا) اور محلاً (شیطان کی جگہیں) میں پایا گیا۔

قال في الهداية(۲۹٦/۱): ومن ترك الجمار في الايام كلها فعليه دم: لتحقق ترك الواجب ويكفيه دم واحد لأن الجنس متحد (وفي الحاشية: الجنس متحد ذاتاً ومحلاً فيكفيه دم واحد) كمافي الحلق.

(۲)۔تداخل کی دوسری صورت جنس کا ایک ہونا (اختلافی صورت)...... جب ترک واجبات یا جنایات کے ارتکاب میں جنس ذات کے اعتبار سے ایک ہو اور محل کے لحاظ سے نہیں تو اس صورت میں اختلاف ہے تو حضرات شیخین رحمہما اللہ فرماتے ہیں اس صورت میں کفارات کے اندر تداخل اس وقت ہوگا جب مجلس ایک ہو،ورنہ تعدد کفارات لازم آئے گا۔اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ مطلقاً تداخل کفارات ہوگا خواہ مجلس ایک ہو یا متعدد۔

اس دوسری صورت کی مثال یوں ہے کہ ایک محرم ایک ہاتھ کے ناخن کاٹ لے (جو الربع قائم مقام الکل کے قبیل سے ہے) پھر جا کر دوسری مجلس میں دوسرے ہاتھ اور دونوں پاؤں کے ناخن کاٹ لے (جو کہ ایک الگ جنایت ہے)۔

تو اس صورت میں امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک تداخلِ کفارات نہیں ہوسکتا کیونکہ مجلس ایک نہیں ہے **وعند الامام محمد يجوز التداخل مطلقا سواء اتحد المجلس اولا.**

قال في الهداية(۲۹۱/۱): وان قص اظافير يديه ورجليه فعليه دم لأنه من المحظورات...... ولا يزاد على دم ان حصل في مجلس واحد لأن الجناية من نوع واحد، فان كان في مجالس فكذلك عند

محمد لأن مبناها على التداخل فاشبه كفارة الفطر الا اذا تخللت الكفارة لارتفاع الاولى بالتكفير وعلى قول ابى حنيفة وابى يوسف يجب اربعة دماء ان قلم فى كل مجلس يداً او رجلاً لأن الغالب فيه معنى العبادة فيتقيد التداخل باتحاد المجلس كمافى اى السجدة.

وفى حاشية (صـ۲۹۶) بخلاف قلم الاظفار حيث اعتبرنا هناك اتحاد المجلس لان الجنس هناك وان اتحد ذاتاً فقد اختلف محلاً فاعتبرنا اتحاد المجلس ليترجح جانب الاتحاد.

(۳)۔عدم تداخل کی اتفاقی صورت...... عدم تداخل کی اتفاقی صورت یہ ہے کہ کوئی محرم خلاف الجنس ذاتا. جنایات یا ترک واجبات کرے تو اس صورت میں بالاتفاق کفارات کے اندر تداخل نہیں ہوسکتا چاہے مجلس ایک ہو یا متعدد۔

قال فى البحر الرائق(۳/۲۱): "وقيد التداخل بكونه من جنس واحد لانه لو قلم اظافير يده وحلق ربع رأسه وطيب عضواً فانه يلزمه لكل جناية دم سواء اتحد المجلس ا‍ اختلف اتفاقاً."

وفى المحيط البرهانى(۳/۴۳۶): ولو اختلف الافعال حقيقة بأن جامع، وتطيب ولبس المخيط أليس أنه يلزمه لكل فعل دم؟

اختلافی صورت میں فتویٰ کس قول پر ہے؟

تلاش بسیار کے بعد بھی کسی ایک قول کے اوپر مفتی بہ ہونے کی صراحت نہیں ملی، لیکن چونکہ مسئلہ عبادات سے متعلق ہے اور عبادات میں علی الاطلاق امام صاحب کے قول پر فتویٰ دیا جاتا ہے لہٰذا یہاں امام صاحبؒ اور امام ابو یوسفؒ ہی کے قول میں احتیاط ہے۔

قال فى مقدمة الشامى(صـ۷۱): "قد جعل العلماء الفتوى على قول الامام الاعظم فى العبادات مطلقاً وهو الواقع بالاستقراء مالم يكن عنه رواية كقول المخالف."

لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر کوئی محرم دورانِ حج کئی واجبات کو ترک کرتا ہے اور کئی جنایات کرتا ہے تو تداخل اور عدم تداخل کی ان تینوں صورتوں پر محمول ہوگا۔

(۱۲۱) محرم آدمی اگر حج یا عمرہ نہ کر سکے تو اس پر قضاء کیساتھ ساتھ کفارہ بھی لازم ہوگا

سوال۔ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ایک دوست اس سال ربیع الاول کے آخر میں عمرہ کی سعادت حاصل کرنے کیلئے گئے تھے، لیکن ان کے پاسپورٹ میں کچھ غلطی اور خرابی کی وجہ سے انہیں جدہ ائیر پورٹ سے ہی واپس پاکستان بھیج دیا گیا، وہ کراچی ائیر پورٹ سے ہی احرام باندھ کر گئے تھے، لیکن پھر بھی انہیں عمرے کی ادائیگی کیلئے نہیں چھوڑا گیا۔ اب وہ اس احرام کا کوئی کفارہ وغیرہ دیں گے یا صرف ان پر اس کی قضاء ہے؟

کی ادائیگی سے رک جائے اور محصور ہو جائے تو ایسے شخص کو حج یا عمرے کی قضاء کیساتھ ساتھ احرام کا کفارہ بھی ادا کرنا ہوتا ہے اور کفارے کی ادنیٰ مقدار ایک بکری ہے جو کہ حرم میں بھیجی جائے یا اس کی قیمت وہاں بھیجی جائے تا کہ اس کے ذریعے سے وہاں بکری وغیرہ خریدی جائے اور وقت بھی متعین کرلیا جائے جب اس متعینہ وقت پر اس کو حرم میں ذبح کر دیا جائے تو ایسا شخص حلال ہوسکتا ہے اور اپنا احرام کھول سکتا ہے اور اگر اس کی خلاف ورزی کرے بایں معنیٰ کہ کفارے کی ادائیگی سے پہلے ہی وہ اپنا احرام کھول دے تو ایسے شخص پر کفارے کے ساتھ مزید بقدر جنایت دم دینا ضروری ہوگا لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ کے مذکورہ دوست کو عمرے کی قضاء کے ساتھ ساتھ احرام کا کفارہ بھی ادا کرنا ہوگا جو کہ حرم میں بھیجا جائے یعنی بکری وغیرہ یا اس کی قیمت وہاں بھیجی جائے تا کہ وہاں جانور خرید کر متعینہ وقت پر حرم میں ذبح کیا جائے اس کے بعد آپ کے دوست یہاں حلال ہو سکتے ہیں یعنی اپنا احرام کھول سکتے ہیں اور اگر آپ کے دوست نے کفارے کی ادائیگی سے پہلے ہی اپنا احرام کھول دیا تھا تو اس صورت میں کفارے کے ساتھ مزید بقدر جنایات دم ان پر لازم ہوں گے۔

لما في الهندية(۱/۲۵۵): المحصر من احرم ثم منع عن مضى في موجب الاحرام سواء كان المنع من العدو أو المرض او الحبس او الكسر او القرح أو غيرها من الموانع من اتمام ما احرم به حقيقة او شرعا... واما حكم الاحصار فهو ان يبعث بالهدى او بثمنه ليشترى به هديا ويذبح عنه ومالم يذبح لا يحل وهو قول عامة العلماء سواء شرط عند الاحرام الاهلال بغير ذبح عند الاحصار اولم يشترط ويجب ان يواعد يوما معلوما يذبح عنه فيحل بعد الذبح ولا يحل قبله حتى لوفعل شيأ من محظورات الاحرام قبل ذبح الهدى يجب عليه ما يجب على المحرم اذا لم يكن محصرا وان كان مفردا بالعمرة فعليه عمرة مكانها.

وفي الشامية (۲/۵۹۲): (قوله لزمه جزاء ماجنى) ويتعدد بتعدد الجنايات ط

قلت: ولم ارمن صرح بذلک، نعم هو ظاهر كلامهم

وفي الفقه الاسلامي وادلته (۳/۲۳۴۹): ان قال المحرم: انا أرفض الاحرام واحل فلبس الثياب وذبح الصيد وعمل ما يعمله الحلال، يظل محرما ويكون الاحرام باقيا في حقه، تلزمه احكامه ويلزمه جزاء كل جناية جناها عليه فعليه في كل فعل فعله دم وان وطئ فعليه ايضا للوطء بدنة مع ما يجب عليه من الدماء.

وفي الشامية(۲/۵۴۴): ولو فاته الوقوف بمزدلفة باحصار فعليه دم هذا غير ظاهر لان الاحصار من جملة الاعذار الا ان يقال ان هذا مانع من جانب المخلوق فلا يؤثر، ويدل له مافي البدائع فيمن احصر بعد الوقوف حتى مضت ايام النحر ثم خلى سبيله ان عليه دما لترک الوقوف بمزدلفة ودما لترک الرمي ودما لتاخير طواف الزيارة اهـ ومثله في احصار البحر، وسيأتي توضيحه هناک ان شاء الله تعالیٰ.

(۱۲۲) جنایت ناقصہ کیا ہوتی ہے اور اس پر صدقہ سے کیا مراد ہے

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک عالم صاحب کا حج کے موقع پر بیان سنا تھا، وہ فرمارہے تھے کہ ''جنایت کاملہ میں دم آتا ہے اور جنایت ناقصہ میں صدقہ'' میں ان کی یہ بات تو سمجھ گیا کہ جنایت کاملہ میں دم آتا ہے لیکن اس کے بعد کی ان کی بات نہ سن سکا تھا۔ مہربانی فرما کر آپ مجھے بتادیں کہ یہ جنایت ناقصہ کیا ہوتی ہے؟ اور اس پر صدقہ سے کیا مراد ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... احرام باندھ کر تلبیہ پڑھنے کے بعد کچھ امور ایسے ہیں جن سے محرم کو روک دیا جاتا ہے مثلاً خوشبو لگانا، سلے ہوئے کپڑے پہننا، سر چھپانا ناخن کاٹنا وغیرہ وغیرہ۔ پس محرم اگر حالت احرام میں ان کا ارتکاب کرلے تو اس جنایت کی تلافی کیلئے شریعت نے کفارہ لازم کیا گیا ہے لہٰذا اگر محرم ان جنایات کا ارتکاب علی وجہ الکمال کرتا ہے مثلاً پورے ایک عضو کو خوشبو لگائے یا پورے دن سلے ہوئے کپڑے پہنے وغیرہ وغیرہ ان کو جنایت کاملہ کہا جاتا ہے اور اس پر دم لازم ہے اور اگر ان جنایات کا ارتکاب علی وجہ الکمال نہ ہو، مثلاً ایک عضو سے کم کو خوشبو لگائے یا ایک دن سے کم سلے ہوئے کپڑے پہنے وغیرہ وغیرہ ان کو جنایت ناقصہ کہا جاتا ہے اور اس پر صدقہ لازم آتا ہے۔ صدقہ بعض صورتوں میں (جیسے ناخن کاٹنا یا کچھ دیر کیلئے خوشبو لگانا وغیرہ) یہ ہے کہ نصف صاع (پونے دو سیر) گندم یا اس کی قیمت فقیر پر صدقہ کردے اور بعض صورتوں میں جیسے چیونٹی وغیرہ کو ماردے یہ ہے کہ حسب توفیق جتنا صدقہ کردے۔

لما في فتح القدير (۳/۲۴): الجناية فعل محرّم والمرادههنا خاص منه وهو ما تكون حرمته بسبب الاحرام او الحرم (واذا تطيب المحرم......) فعليه الكفارة فان تطيب عضواً كاملا فمازاد فعليه دم .... لان الجناية تتكامل بتكامل الارتفاق وذالک في العضو الكامل فيترتب عليه كمال الموجب (..................) لقصور الجناية.

وفي الهندية (۱/ ۲۴۰): فاذا استعمل الطيب فان كان كثيراً فاحشاً ففيه الدم وان كان قليلاً ففيه الصدقة كذا في المحيط.......... وايضاً (صـ ۲۴۲) اذ لبس المحرم المخيط على الوجه المعتاد يوماً الى الليل فعليه دم وان كان اقل من ذالک فصدقة كذا في المحيط.

وفي الدر المختار (۲/ ۵۵۶، ۵۵۷): وان طيب اقل من عضوا وستر رأسه او لبس اقل من يوم اوحلق شاربه او اقل من ربع راسه او لحيته او بعض رقبته او قص اقل من خمسة اظافيره او خمسة الى ستة عشر متفرقة من كل عفوا ربعة وقد اسقرّ ان لكل ظفر نصف صاع الا ان يبلغ دماً فينقص ماشاء اوطاف للقدوم او للصدر محدثاً وترک ثلاثة من سبع الصدر او احدى الجمار الثلاث...... او حلق راس غيره ..... تصدق بنصف صاع من برّ......... وفي الشامية (صـ ۵۵۶) (تنبيه) قال في اللباب كلّ صدقة تجب في الطواف فهي لكل شوط نصف صاع اوفي الرمي فلكل حصاة صدقة او في قلم الاظفار فلكل ظفر او في الصيد ونبات الحرم فعلى قدر القيمة اهـ فليحفظ.

﴿فصل فی العمرة﴾

(عمرہ سے متعلق مسائل کا بیان)

(۱۲۳) عمرہ کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک دوست عمرہ پر جانے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن اس کو طریقہ معلوم نہیں ہے آپ حضرات مہربانی فرما کر عمرہ کا طریقہ تفصیل سے بیان فرمادیں تا کہ وہ اس کو دیکھ کر صحیح طریقے سے عمرہ ادا کرے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... عمرہ پانچ دنوں (۹/ذوالحجہ ۱۰/ذوالحجہ اور تین دن ایام تشریق) کے علاوہ تمام دنوں میں جائز ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ عمرہ کی نیت سے احرام باندھے اور تلبیہ پڑھ لے اس کے بعد بیت اللہ کے سات چکر لگائے اور پہلے چکر میں استلام حجر اسود کے بعد تلبیہ ترک کردے اور سات چکر مکمل کرنے کے بعد دو رکعت مقام ابراہیم کے پاس یا جہاں کہیں ممکن ہو پڑھے اور پھر اس کے بعد صفا مروہ کے درمیان سعی کرلے اور اس کے بعد حلق (سر منڈھوانا) اور یا قصر (بال کاٹنا) کر کے حلال ہوجائے۔

لمافی الهندية(۱/۲۳۷): المفرد بالعمرة يحرم للعمرة من الميقات او قبل الميقات في اشهر الحج او في غير اشهر الحج ويذكر العمرة بلسانه عند التلبية مع قصد القلب فيقول لبيك بالعمرة او يقصر بقلبه ولايذكرها بلسانه والذكر بلسانه افضل ويجتنب المحرم بالعمرة مايجتنب المحرم بالحج ويفعل في احرامه وطوافه وسعيه بين الصفا والمروة مايفعله الحاج فاذا طاف وسعى وحلق يخرج عن احرام العمرة ويقطع التلبية كما استلم الحجر في اصح الروايات كذا في الظهيرية.

وفي الدر المختار(۲/۴۷۲): (والعمرة) في العمر (مرة سنة مؤكدة) على المذهب وصحح في الجوهرة وجوبها، قلنا المامور به في الآية الاتمام وذلك بعد الشروع وبه نقول (وهي احرام وطواف وسعي) وحلق او تقصير فالاحرام شرط ومعظم الطواف ركن وغيرهما واجب هو المختار ويفعل فيها كفعل الحاج.

(۱۲۴) عمرہ کرنے سے حج لازم نہیں ہوتا

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کچھ لوگ اپنی طرف سے دین کی باتیں بتاتے رہتے ہیں

اور چونکہ میں ایک تاجر ہوں اس لئے میرا حلقہ احباب کافی وسیع ہے، ابھی چند دن پہلے ایک صاحب یہ فرما رہے تھے کہ جس شخص نے ایک دفعہ عمرہ کرلیا تو اس پر حج فرض ہو جاتا ہے ان کی بات سن کر میں کافی پریشان ہوا کیونکہ ایک دفعہ تو عمرہ میں بھی کر چکا ہوں لیکن فی الحال تو میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں حج کی سعادت حاصل کرسکوں، نیز انہوں نے مجھ کو یہ کہا کہ اگر کوئی بچہ بھی عمرہ کرے تو اس پر بھی حج فرض ہو جاتا ہے۔ اب مفتی صاحب آپ میری صحیح رہنمائی فرمائیں کہ آیا مذکورہ باتیں صحیح ہیں یا نہیں؟ براہِ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں جلدی جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... حج اور عمرہ میں سے ہر ایک مستقل عمل ہے ان میں سے کسی ایک کا دوسرے پر کوئی دارومدار نہیں ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں صرف عمرہ ادا کرنے کی وجہ سے آپ پر حج لازم نہیں ہوا البتہ اگر عمرہ اشہر حج میں کیا ہو یا زمانہ حج (درخواست جمع ہونے کے دنوں) آپ کے پاس اتنا زادِراہ تھا کہ آپ حج کی ادائیگی کر سکتے تھے اور اہل خانہ کے خرچہ کا بھی انتظام تھا تو اس صورت میں چونکہ آپ اہل استطاعت تھے اس وجہ سے آپ پر حج فرض ہو گیا ورنہ نہیں۔ نیز نابالغ بچہ چونکہ احکام کا مکلف نہیں ہے اس لئے بلوغت سے پہلے اس پر کوئی حکم لاگو نہیں ہوگا۔

لما في البحر الرائق (۲/۲۴۴): لو بداله بعد العمرة ان لا يحج من عامه لا يؤاخذ بذلك فانه لم يحرم بالحج بعد.

وفي طحطاوي على الدر (۱/۴۸۷): والعمرة في العمر مرة سنة مؤكدة) في الطحطاوي فمن اتى بها مرة فقد اقام السنة غير مقيد بوقت غير ما ثبت النهي عنها فيه، الا انها في رمضان افضل.

وفي فتاوى اللجنة الدائمة (۱۱/۵۸): كل من الحج والعمرة نسك مستقل وقد بين النبي عليه الصلاة والسلام كيفية ادائهما قرانا وافرادا وتمتعاً بالعمرة الى الحج.

(۱۲۵) اشہر حج میں عمرہ کرنے سے فرضیت حج کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی رمضان شریف میں عمرہ کرنے کیلئے جائے اور تکمیل عمرہ کے بعد دس شوال تک مکہ مکرمہ میں قیام پذیر ہو اب وہ زادِراہ (خرچہ) اور ویزے کی مدت ختم ہونے کی وجہ سے واپس آرہا ہے اور اشہر حج کا مہینہ (شوال) بھی شروع ہو چکا ہے اب آپ حضرات سے پوچھنا یہ ہے کہ آیا اس آدمی پر صرف اشہر حج کے شروع ہونے کی وجہ سے حج واجب ہے یا نہیں جبکہ ابھی وہ مکہ مکرمہ میں موجود ہے اور زادِراہ اور مدتِ ویزا ابھی ختم ہو چکے ہیں۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں مدلل جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... حج کی فرضیت کے لئے ضروری شرائط میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آدمی زادِراہ اور حج کے سفر پر (اور آجکل کے اعتبار سے جہاز وغیرہ کے خرچہ پر) مکمل قادر ہو ورنہ اس پر حج لازم نہیں ہوگا۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں مذکورہ شخص پر عدم استطاعت

وقدرت (زادراہ اور مدت ویزا کا ختم ہونا وغیرہ) کی وجہ سے حج واجب نہیں ہے البتہ اگر وہ گھر سے پیسہ منگوا لیتا ہے اور مدت ویزا میں باآسانی توسیع بھی ممکن ہوتو اس پر حج لازم ہوجائے گا۔

لمافی القرآن الکریم(سورۃ ال عمران:۹۷): وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا.

وفی اعلاء السنن (۸/۱۰): عن انس رضی اللہ عنہ فی قولہ تعالیٰ (وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا) قیل یا رسول اللہ ما السبیل قال الزاد والراحلۃ.

وفی البدائع الصنائع (۳/۴۳): اما شرائط فرضیہ...... الذی یعم الرجال والنساء فمنها البلوغ......

وفی (صـ۴۷) ومنها صحۃ البدن (صـ۵۱) ومنها ملک الزاد والراحلۃ فی حق النائی عن مکۃ ... ولنا أن رسول اللہ ﷺ فسر الاستطاعۃ بالزاد والراحلۃ جمیعا فلا تثبت الاستطاعۃ باحدهما وبہ تبین ان القدرۃ علی المشی لا تکفی لاستطاعۃ الحج، ثم شرط الراحلۃ انما یراعی لوجوب الحج فی حق النائی عن مکۃ واما اهل مکۃ ومن حولهم فان الحج یجب علی القوی منهم القادر علی المشی من غیر راحلۃ، لأنہ لا حرج یلحقہ فی المشی الی الحج کما لا یلحق الحرج فی المشی الی الجمعۃ.

وفی الفقہ الاسلامی (۳/۲۰۷۶): ومنها هو شرط للوجوب فقط وهو الإستطاعۃ ...... وفی صـ۲۰۹۲، قال الحنفیۃ الاستطاعۃ انواع ثلاثۃ ..... بدنیۃ ومالیۃ وامنیۃ...... واما الاستطاعۃ المالیۃ: فهی ملک الزاد والراحلۃ زائدا عن نفقۃ عیالہ الذین تلزمہ نفقاتهم الی حین عودتہ ....

ویشترط فی القدرۃ علی الراحلۃ شروط الف:. ان تکون مختصۃ بہ فلا یکفی القدرۃ علی راحلۃ مشترکۃ والقدرۃ الیوم بالاشتراک فی السیارات او البواخر او الطائرات...... اهـ

وفی اللجنۃ الدائمۃ (۱۱/۳۰): اما الاستطاعۃ بالنسبۃ للحج: فان یکون صحیح البدن، وان یملک من المواصلات ما یصل بہ الی بیت اللہ الحرام من طائرۃ او سیارۃ او دابۃ او اجرۃ ذلک حسب حالہ، وان یملک زادا یکفیہ ذهابا وایابا وفی (صـ۳۲) من اجل عدم استطاعتہ المالیۃ فلا یلزمہ الحج اهـ.

وفی الهندیۃ (۱/۲۱۷): منها القدرۃ علی الزاد والراحلۃ...... وتفسر ملک الزاد والراحلۃ ان یکون لہ مال فاضل عن حاجتہ وهو ما سوی مسکنہ ولبسہ وخدمہ واثاث بیتہ قدر ما یبلغہ الی المکۃ ذاهبا وجائیا اهـ.

وفی الشامیۃ (۲/۴۵۹): (قولہ ذی زاد وراحلۃ) افاد انہ لا یجب الا بملک الزاد وملک أجرۃ

الراحلة فلا يجب بالأباحة او العارية

وفي اللجنة الدائمة (۱۱/۴۵): الاستطاعة على الحج شرط من شروط وجوبه فان قدرت عليه وعلى دفع القسط للمطلوب منك حين الحج لزمك ان تحج. اهـ

(۱۲۶) مکہ مکرمہ پہنچ کر بیماری کی وجہ سے احرام کھولنے کے بعد عمرہ کرنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص عمرہ کیلئے روانہ ہوا، اس نے کراچی سے احرام باندھا مکہ مکرمہ پہنچا تو عمرہ کے افعال ادا کرنے سے پہلے وہ سخت بیمار ہوگیا اس نے احرام کھول دیا تو اب اس شخص کیلئے کیا حکم ہوگا آیا یہ افعال عمرہ ادا کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اگر کوئی شخص عمرہ کا احرام باندھ کر میقات سے گزر جائے پھر کوئی مانع پیش آ جائے جو اس کو طواف سے روک دے تو یہ شخص محصر شمار ہوگا اس کو چاہئے کہ کسی کو حرم میں قربانی کا جانور ذبح کرنے کا وکیل بنائے اور جب جانور ذبح ہوجائے تو یہ حلال ہوجائے گا جانور ذبح ہونے سے پہلے اگر کسی قسم کی جنایت کا ارتکاب کرے گا مثلاً (احرام کے کپڑے اتار دیئے، حلق یا قصر کیا وغیرہ) تو دم لازم آئے گا۔ جب مانع زائل ہوجائے تو افعال عمرہ ادا کرلے، اگر اس سال ادا نہیں کیا تو اگلے سال اس کی قضاء واجب ہے۔ اسی طرح بغیر ہدی (جانور) بھیجے ہوئے اگر حالت احرام میں رہ کر مانع کے زائل ہونے کا انتظار کرتا ہے تو بھی جائز ہے اور حالتِ احرام کے منافی کوئی عمل کرے گا مثلاً (احرام کے کپڑے اتار دیئے حلق یا قصر کردیا) تو دم لازم ہوگا۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں ٹھیک ہونے کے بعد افعال عمرہ ادا کرسکتا ہے اگر اس سال ادا نہیں کیا تو اگلے سال اس پر اس کی قضاء واجب ہے۔ البتہ احرام کھولنے کی وجہ سے اس پر دم لازم ہوگا۔

كما في الهندية(۱/۲۵۵): المحصر من احرم ثم منع عن مضى في موجب الاحرام سواء كان المنع من العدو أو المرض أو الحبس أو الكسر أو القرح أو غيرها من الموانع من اتمام ما احرم به حقيقة او شرعا ... واما حكم الاحصار فهو ان يعث بالهدى او بثمنه ليشترى به هديا ويذبح عنه وما لم يذبح لايحل وهو قول عامة العلماء.

وفي الدر المختار(۲/۴۷۳): (وجازت في كل السنة) وندبت في رمضان (وكرهت) تحريما يوم عرفة واربعة بعدها) اى كره انشاؤها بالاحرام حتى يلزمه دم وان رفضها لا اداؤها فيها بالاحرام السابق.

وفي الدر المختار(۲/۵۹۰): هو لغة المنع وشرعا منع عن ركن(اذا أحصر بعدوّ أومرض)... حل له التحلل فحينئذ (بعث المفرد) دما أو قيمته فان لم يجد بقي محرما حتى يجد او يتحلل

بطواف .. (وعين يوم الذبح) ليعلم متى يتحلل ويذبحه(في الحرم ولو قبل يوم النحر) خلافا لهما (ولو لم يفعل ورجع الى اهله بغير تحلل وصبر) محرما (حتى زال الخوف جاز فان ادرک الحج فيها) ونعمت (والا تحلل بالعمرة) لان التحلل بالذبح انما هو للضرورة حتى لايمتد احرامه فيشق عليه زيلعي (وبذبحه يحل) ولو (بلا حلق وتقصير)...... (و) يجب (عليه ان حل من حجه) ولو نفلا (حجة)...... (وعلى المعتمر عمرة).

وفي الشامية (صـ۵۹۳):لايتصور في حق المعتمر فقط عدم ادراک العمرة لان وقتها جميع العمر.

(۱۲۷) جس شخص نے عمرہ کیا اور روزے نہیں رکھے اس کے عمرے کا حکم

سوال... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں اور میرے دوست اس سال رمضان المبارک میں ساتھ عمرہ کرنے کیلئے گئے تھے، الحمد للہ یہ میرا چوتھا عمرے کا سفر تھا، میرے دوست ویسے تو بہت اچھے آدمی ہیں، لیکن ان کی ایک بات مجھے بہت عجیب لگی، وہ یہ کہ رمضان کے روزے انہوں نے وہاں چھوڑ دیئے تھے، چونکہ گرمی تھی تو کہنے لگے کہ ہم تو مسافر ہیں دس روز کی نیت کر کے آئیں ہیں، بعد میں رکھ لیں گے۔ مجھے تو چھوڑتے ہوئے بڑا بُرا محسوس ہو رہا تھا کہ ایک تو رمضان کے روزے وہ بھی حرم میں چھوڑے جائیں۔ مجھے آپ سے صرف اتنا معلوم کرنا ہے کہ آیا ان کا اس طرح گرمی کا بہانا بنا کر اور مسافر ہونے کا کہہ کر روزے چھوڑنا کیسا تھا؟ آیا عمرہ کا سفر کر کے رمضان کے روزے چھوڑنا صحیح ہے؟ ایسا عمرہ کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ براہِ مہربانی تفصیل سے جواب عنایت کریں۔

الجواب حامداً ومصلیاً... صورت مسئولہ میں آپ اور آپ کے دوست چونکہ عمرہ کیلئے گئے ہوئے تھے اس لئے افضل روزے رکھنا تھا جبکہ کوئی مشقت بھی نہ تھی۔ لہٰذا ایسے موقع پر بلاوجہ روزہ نہ رکھنا بڑی بے ہمتی اور محرومی کی بات ہے البتہ اس پر کوئی مواخذہ نہیں کیونکہ شرعاً اجازت بھی ثابت ہے اور اس سے عمرے کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

لما في اعلاء السنن(۹/۱۵۱): فانه ثبت بالحديث الاول من الباب: اباحة الصوم في السفر بغير كراهة وبقول أبي سعيد الخدري في الحديث الثاني من الباب: اباحة الصوم في السفر بغير كراهة، وبقول ابي سعيد الخدري في الحديث الثاني من الباب: ثم لقد رأيتنا نصوم مع رسول الله ﷺ بعد ذالک في السفر اهـ. افضلية الصوم في السفر فان هذا الصيام كان بعد الاجازة في الافطار، والظاهر حمل تقريره على الاحب والافضل الا اذا عارض ذلک معارض وليس هناک والله تعالیٰ اعلم بالصواب.

وفي الدر المختار(۱/۲۲۳). (ويندب لمسافر الصوم) لآية. وان تصوموا. والخير بمعنى البر لا افعل تفضيل (ان لم يضره) فان شق عليه او على رفيقه فالفطر افضل لموافقته الجماعة.

(۱۲۸) عمرہ کے بعد اپنے بال خود کاٹنے کا حکم

سوال ... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عمرہ کرنے کے بعد احرام کی حالت میں عورت اپنے بال خود کاٹ سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ... کاٹ سکتی ہے۔

لما في الصحيح البخاري(۱/۲۳۳): عن ابن عباس رضي الله عنهما قال قدم النبي ﷺ مكة امر اصحابه أن يطوفوا بالبيت وبالصفا والمروة ثم يحلوا و يحلقوا أو يقصّروا.

وفي مناسك ملا علي قاري(۲۳۰): واذا حلق اى المحرم رأسه أى رأس نفسه، أو رأس غيره أى ولو كان محرما عند جواز التحلل اى الخروج من الاحرام بأداء أفعال النسك، لم يلزمه شئ الأولى لم يلزمهما شئ وهذا حكم يعم كل محرم في كل وقت، فلا مفهوم لتقيد المصنف في الكبير بقوله عند جواز الحلق يوم النحر.

(۱۲۹) عمرہ میں طواف وداع کا وجوب؟ بعد از طواف مکہ میں خرید وفروخت کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا عمرہ میں طواف وداع واجب ہے؟ اگر طواف کے بعد کوئی شخص مکہ مکرمہ سے کوئی چیز خریدنا چاہے تو اس کیلئے جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... عمرہ میں طواف وداع واجب نہیں ہے، عمرہ کے بعد مکہ مکرمہ سے خرید وفروخت جائز ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ حج وعمرہ کا مبارک سفر خرید وفروخت کی نیت سے نہ کرے۔

وفي الهندية(۱/۲۳۴): وطواف الصدر واجب على الحاج اذا اراد الخروج من مكة فليس على المعتمر طواف الصدر ولا يجب على اهل مكة وأهل المواقيت ومن دونهم.

وفي الشامية(۲/۴۷۳): ولا طواف قدوم ولا صدر،

وفي الفقه الاسلامي (۳/۲۰۹): التفرغ للعبادة والإخلاص: يستحب ان يتفرغ للعبادة خالياً عن التجارة لانها تشغل القلب، فان اتجرمع ذلك صح حجه لقوله تعالىٰ (ليس عليكم جناح ان تبتغوا فضلا من ربكم).

(۱۳۰) بیوہ عورت عدت پوری کرنے سے پہلے عمرہ نہیں کرسکتی

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے سوچا تھا کہ ربیع الاول کے مہینے میں اپنے والد

اور والدہ کو عمرہ میں لیکر جاؤنگا (اور میری ترتیب بھی ہے) کیوں کہ میں نے اس سلسلے میں کمیٹی بھی ڈالی تھی جواب ملنے والی ہے۔ اور حج کی میری استعداد نہیں ہے میں چاہتا تھا کہ میرے والدین بھی مکہ، مدینہ کی زیارت کرلیں، کیونکہ اب وہ ضعیف بھی ہوگئے تھے لیکن اب مسئلہ یہ ہے کہ والد کا انتقال ہوگیا اور والدہ عدت میں ہیں۔ مگر میں اب بھی چاہتا ہوں کہ والدہ کو عمرہ کرواؤں کیونکہ میری ترتیب تبلیغ کے ساتھی جو ہر سال جاتے ہیں ربیع الاول میں عمرے کیلئے ان کے ساتھ ہے اس سلسلے میں علماء کرام مفتی حضرات کیا فرماتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں آپ کی والدہ عدت پوری کرنے سے پہلے عمرہ کیلئے نہیں جاسکتیں۔

لما فی الشامیة (۲/۴۶۵): (قوله اية عدة كانت) اى سواء كانت عدة وفاة اوطلاق بائن او رجعی.

و فی الفقه الاسلامی (۲۰۹۳/۳): واماشروط الخاصة با لنساء فهی اثنا ن..... والثانی الاتكون معتدة عن الطلاق او وفاة.

(۱۳۱) بکثرت عمرے اوران میں قصر کی وجہ عورت کے بال بہت چھوٹے رہ جانے کی صورت میں مزید عمرے کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عورت کیلئے حج وعمرے میں قصر کا حکم ہے، اگر عورت بار بار عمرہ کررہی ہے تو کیا ہر بار قصر کرنا ہوگا کیونکہ اگر ہر بار قصر کرے گی تو عورت کے بال بہت چھوٹے رہ جائیں گے یا بالکل ختم ہوجائیں گے۔ لہٰذا عورت کیلئے ایک ہی زمانے میں متعدد عمرے کرنے کی صورت میں قصر کا کیا حکم ہوگا؟ اور ایسی صورت میں جبکہ بال بہت چھوٹے ہونے کا خدشہ ہوتو افضل کیا ہے؟ عمرے کرنا یا نہ کرنا؟

الجواب حامداً ومصلیاً......سال میں ایک سے زائد عمرے کرنا مستحب اور جائز ہے اور عمرہ کرنے والا ہر عمرہ میں حلق یا قصر ضرور کرے گا اس لئے کہ یہ واجبات میں سے ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں عورت پر ہر بار قصر کرنا ضروری ہے نیز عورت پر ایک ہی زمانہ میں متعدد عمرے کرنے کی صورت میں بھی قصر کرنا ضروری ہے۔ البتہ عورت کیلئے سوائے ضرورت شدیدہ کے بالوں کا کاٹنا حرام اور باعث لعنت ہے اور ایک سے زائد عمرہ مستحب عمل ہے اور مستحب عمل کیلئے حرام کا ارتکاب جائز نہیں ہے لہٰذا ایسی صورت میں جبکہ بال بہت چھوٹے ہونے کا خدشہ ہوتو عمرے نہ کرنا افضل وبہتر ہے۔ جبکہ بعض علماء کے نزدیک طواف کرنا عمرہ سے افضل ہے اور اس میں قصر کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی۔ لہٰذا عمرہ کی فضیلت کے بجائے طواف والی فضیلت کو اختیار کیا جائے تاکہ بال کٹوانے کی حرمت سے بچ جائے، اور یہی بہتر ہے۔

لمافی القرآن الكريم (الفتح: ۲۷): مُحَلِّقِيْنَ رُؤُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ لَاتَخَافُوْنَ.

وفی مشكوة المصابيح (صـ۲۳۳): عن علی وعائشة قالا نهى رسول الله ﷺ ان تحلق المرأة راسها

رواه الترمذی.

وعن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ لیس علی النساء الحلق انما علی النساء التقصیر رواه ابو داؤد والدارمی.

وفی بذل المجهود (۱۸۴/۳): فی شرح حدیث ابی داؤد المذکور. وقدر التقصیر فاقله بقدر انملة قال الشوکانی فیه دلیل علی ان المشروع فی حقهن التقصیر وقد حکی الحافظ الاجماع علی ذلک...... الحلق مسنون للرجال ومکروه للنساء والتقصیر مباح لهم ومسنون ای مؤکد بل واجب لهن لکراهة الحلق کراهة تحریم الا لضرورة قلت ولو اعتمرت المرأة ایاما وقصرت من شعرها کل یوم حتی بقیت شعرها قدر انملة فان حلقت راسها وقعت فی الحرمة او الکراهة وان لم تحلق فلا تحل ولم ارحکمه فی ذلک فی شی من کتب المذاهب الا ان یقال کما ان اجراء الموسیٰ علی من لیس له شعر فی الرأس کذلک اجراء المقص لعلها تکفیها والله اعلم.

وفی البنایة (۱۳۷/۵): والتقصیر ان یأخذ من رؤس شعره مقدار الانملة وهذا التقدیر مروی عن ابن عمر رضی الله تعالیٰ عنه وعلیه اجماع الامة والمرأة فیه کالرجل وفی الولوالجی تقصر ربع راسها مقدار الانملة. وفی (ص۱۶۷) ولا تحلق ولکن تقصر لما روی ان النبی ﷺ نهی النساء عن الحلق وامرهن بالتقصیر.......... ولان حلق الشعر فی حقها مثلة کحلق اللحیة فی حق الرجال. المثلة حرام فلا تجوز اقامة السنة بارتکاب الحرام والسنة فی حقها التقصیر.

وفی الشامیة (۴۰۷/۶): وفیه قطعت شعر رأسها اثمت ولعنت زاد فی البزازیة وان باذن الزوج لانه لاطاعة لمخلوق فی معصیة الخالق. قوله و المعنی الموثر ای العلة المؤثرة فی اثمها التشبه بالرجال فانه لا یجوز کالتشبه بالنساء.

وفی الطحطاوی (۲۰۳/۴): قوله اثمت محمول علی ما اذا قصدت التشبه بالرجال وان کان لوجع اصابها فلا بأس به کذا فی الهندیة عن الکبریٰ.

وفی الشامیة (۵۰۲/۲): مطلب الصلاة افضل من الطواف وهو افضل من العمرة.......... واجاب العلامة القاضی ابراهیم بن ظهیرة المکی حیث سئل هل الافضل الطواف او العمرة من ان الارجح تفضیل الطواف علی العمرة اذا شغل به مقدار زمن العمرة الا اذا قیل انها لا تقع الافرض کفایة فلا یکون الحکم کذلک.

وفی بدائع الصنائع (۱۱۹/۳): وترک الحرام اولیٰ من الاتیان بالسنة.

﴿فصل فی زیارة المدینة المنورة والمقامات المتبرکة﴾

(مدینۂ منورہ اور مقامات مقدسہ سے متعلق مسائل کا بیان)

(۱۳۲) حج وعمرہ کرنے والے کیلئے روضۂ رسول ﷺ کی زیارت کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جو شخص حج یا عمرہ کرنے کیلئے جائے تو اس کو روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر جانا ضروری ہے یا نہیں؟ نیز جو شخص روضۂ مبارک کی زیارت کیلئے جانا چاہتا ہو تو اسے مدینہ منورہ داخل ہونے سے پہلے کیا کرنا چاہئے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... حج وعمرہ پر جانے والے کیلئے روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کیلئے جانا سنت ہے، بلکہ بعض فقہاء نے اس کو واجب کے قریب لکھا ہے۔ اس لئے کہ ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ" جو شخص باوجود قدرت کے میری زیارت نہ کرے تو اس نے میرے ساتھ بے وفائی کی۔" اور جو شخص روضہ مبارک کی زیارت کیلئے جانا چاہتا ہو تو راستے میں جاتے وقت کثرت سے درود شریف پڑھتے ہوئے جائے خاص کر جب مدینہ کے درخت وغیرہ نظر آنے لگیں اور مدینہ منورہ میں داخل ہونے سے پہلے غسل کرلے اور سب سے اچھے کپڑے جو پاس ہوں پہن لے اور ہر وہ عمل کرے جس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ادب اور احترام ظاہر ہوتا ہو۔

لمافی الهندیة(۱/۲۶۵): (خاتمة فی زیارة قبر رسول اللہ ﷺ) قال مشائخنا رحمهم اللہ تعالیٰ انها افضل المندوبات وفی مناسک الفارسی وشرح المختار انها قریبة من الوجوب لمن له سعة والحج ان کان فرضا فالاحسن ان یبدأبه ثم یثنی بالزیارة وان کان نفلا کان بالخیار فاذا نوی زیارة القبر فلینو معه زیارة مسجد رسول اللہ ﷺ فانه احد المساجد الثلاثة التی تشد الیها الرحال وفی الحدیث لاتشد الرحال الاثلاثة مساجد المسجد الحرام ومسجدی هذا والمسجد الاقصیٰ اذا توجه الی الزیارة یکثر من الصلوة والسلام علی النبی ﷺ مدة الطریق کذا فی الفتح.

وفی الدر المختار(۲/۶۲۶): وزیارة قبره مندوبة بل قیل واجبة لمن له سعة ویبدأ بالحج لو فرضا ویخیر لو نفلا مالم یمربه فیبدأ بزیارته لامحالة ولینومعه زیارة مسجده فقد اخبر "ان صلاة فیه خیر من الف فی غیره الا المسجد الحرام" وکذا بقیة القربات.

وفي الشاميه(۲/۲۲۶): (قوله مندوبة) اى باجماع المسلمين كما في اللباب وما نسب الى الحافظ ابن تيميه الحنبلى من انه يقول بالنهى عنها فقد قال بعض العلماء انه لا اصل له وانما يقول بالنهى عن شد الرحال الى غير المساجد الثلاث اما نفس الزيارة فلا يخالف فيها كزيارة سائر القبور ومع هذا فقد رد كلامه كثير من العلماء.

(۱۳۳) ارکان حج سے فارغ ہونے کے بعد حاجی کیلئے روضۂ اقدس اور مسجد نبوی میں حاضری دینا کیا درجہ رکھتا ہے؟

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حاجی حضرات جب ارکان حج سے فارغ ہوتے ہیں تو بڑے اہتمام کے ساتھ روضہ اقدس اور مسجد نبوی کا رخ کرتے ہیں۔ آیا ہر حاجی کیلئے یہ حاضری ضروری ہے۔ اگر کوئی حج کر کے سیدھا گھر آ جائے تو اس کا کیا حکم ہوگا کیا اس کا حج درست ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً......حاجی کیلئے ارکان حج سے فارغ ہونے کے بعد روضۂ اقدس اور مسجد نبوی میں حاضری دینا قواعد شرعیہ کے مطابق فرض وواجب تو نہیں۔ اگر حج کر کے سیدھا گھر آ جائے تو اس کا حج درست ہو جائے گا۔ البتہ محسن کائنات، شفیع اعظم، ہم تک قرآن اور اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے والی ذات کے دربار پر بلا ضرورت شدیدہ حاضر نہ ہونا مروت کے خلاف اور بدبختی کی علامت ہے اور پھر سرور کائنات نے اپنے دربار میں حاضر نہ ہونے والے کے بارے میں فرمایا کہ اس نے مجھ سے جفا کی کیا یہ کسی انسان کے لئے مناسب ہے کہ محسن کے ساتھ جفا کرے؟ مزید یہ کہ حاضر ہونے والوں کیلئے شفاعت کا وعدہ اور بہت سی بشارتیں ہیں اس لئے ہر شخص کو چاہئے کہ حج کے ارکان سے فارغ ہو کر زیارت کیلئے بہت ذوق وشوق، بڑے اہتمام کے ساتھ مسجد نبوی اور روضۂ اقدس کی حاضری کیلئے جائے۔

لمافي الهندية (۱/۲۶۵): في زيارة قبر النبي ﷺ قال مشائخنا رحمهم الله تعالى أنها افضل المندوبات وفي مناسك الفارسي وشرح المختار أنها قريبة من الوجوب لمن له سعة والحج ان كان فرضاً فالأحسن ان يبدأ به ثم يثنى بالزيارة وإن كان نفلاً كان بالخيار.

وفي الدرالمختار (۲/۲۲۶و۲۲۷): وزيارة قبره مندوبة، بل قيل واجبة لمن له سعة ويبدأ بالحج لو فرضاً، ويخير لو نفلاً مالم يمر به فيبدأ بزيارته لا محالة ولينو معه زيارة مسجده.

(۱۳۴) زیارات پر جانے کی شرعی حیثیت

سوال ......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں کراچی کا رہائشی ہوں، اور الحمدللہ پابند صوم وصلاۃ

ہوں۔اس سال اپنے ایک دوست کے ہمراہ حج پر بھی جانے کا ارادہ رکھتا ہوں، میرے دوست ذرا گھومنے پھرنے کے بھی شوقین ہیں اس لئے وہ اصرار کر رہے ہیں کہ ہم اس گروپ میں شامل ہوں جو زیارات پر بھی لے جائے گا۔ مجھے زیارات کے بارے میں زیادہ علم نہیں ہے سوچا پہلے آپ سے معلوم کرلوں کہ آیا ان زیارات کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اور ان پر جانے میں کوئی مسئلہ تو نہیں؟ کیا ہمارے بزرگوں سے ان زیارات پر اہتمام کے ساتھ جانا ثابت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......زیارات کیلئے جانا شرعاً جائز ہے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے اور ہمارے اسلاف کا زیارات پر جانا ثابت ہے لہٰذا آپ تسلی کے ساتھ زیارات پر جائیں۔

لمافی فتح القدير(۳/۱۷۹): قال مشايخنا رحمهم الله من افضل المندوبات وفي مناسك الفارسي وشرح المختار انها قريبة من الوجوب لمن له سعة، روى الدار قطني والبزار عنه عليه الصلوة والسلام من زار قبري وجبت له شفاعتي

والحج ان كان فرضا فالاحسن ان يبدأ به ثم يثني بالزيارة، وان كان تطوعاً كان بالخيار، فاذا نوى زيارة القبر فلينو معه زيارة المسجد: اى مسجد رسول الله ﷺ فانه احد المساجد الثلاثة التي تشد اليها الرحال.

وفيه ايضاً(صـ۱۸۲):ويزور القبور المشهورة كقبر عثمان بن عفان رضي الله عنه وقبر العباس ويزور جبل احد نفسه الى اخره.

وفي الدر المختار(۲/۶۲۶): وزيارة قبره مندوبة بل قيل واجبة لمن له سعة ويبدأ بالحج لو فرضاً ويخير لو نفلا وفي الشامية وقدروى الحسن عن ابي حنيفة انه اذا كان الحج فرضاً فالاحسن للحاج ان يبدأ بالحج ثم يثني بالزيارة وان بدأ بالزيارة جاز اهـ وهو ظاهر اذ يجوز تقديم النفل على الفرض اذا لم يخش الفوت بالاجماع اهـ.

وفي الفقه الاسلامي(۳/۱۳۳): قال ابن جزى: من المواضع التي ينبغي قصدها تبركاً: قبر اسماعيل عليه السلام وامه هاجر وهما في الحجر وقبر آدم عليه السلام في جبل ابي قبيس...... والغار الذى في جبل حراء حيث ابتدأ نزول الوحي على رسول الله ﷺ وزيارة قبور من بمكة والمدينه من الصحابة والتابعين والائمة.

(۱۳۵) حرمین شریفین سے ماءِ زمزم اور کھجور کا بطور تبرک لانا

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ایک استاذ ہیں وہ جب بھی حرمین شریفین کے سفر

پہ جاتے ہیں تو صرف ماءِزمزم اور کھجوریں لاتے ہیں۔کیا واقعی ماءِزمزم اور کھجوروں کو بطور تبرک کے لانا چاہئے؟ صحابہ کرام وغیرہ سے، یا کسی حدیث سے یہ ثابت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......احادیث مبارکہ سے ثابت ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام ماءِزمزم منگواتے تھے اور پھر مدینہ طیبہ میں بیماروں وغیرہ کو پلاتے تھے۔لہٰذا ماءِزمزم کا اور کھجور کا بطور تبرک لانا درست ہے۔

لمافي الترمذی(۱/۱۹۰): عن هشام بن عروة عن ابيه عن عائشةؓ انها كانت تحمل من ماء زمزم وتخبر أن رسول الله ﷺ كان يحمله.

وفي الشامية(۲/۲۲۵): ويستحب حمله إلى البلاد، فقد روى الترمذی عن عائشة رضي الله عنها ((انها كانت تحمله وتخبر أن رسول الله ﷺ كان يحمله)) وفي غير الترمذی أنه كان يحمله ((وكان يصبه على المرضى ويسقيهم، وانه حنك به الحسن والحسين رضي الله عنهما)) من اللباب وشرحه.

وفي مشكوة المصابيح(صـ۳٦۵): عن عائشة رضي الله عنها أن رسول الله ﷺ قال إن في عجوة العالية شفاء و انها ترياق أوّل البكرة.رواه مسلم

(۱۳۶) حج یا عمرے پر جا کر مختلف مقامات کی تصاویر بنانا

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگ حج یا عمرے پر جب جاتے ہیں تو وہاں جا کر مختلف زیارتوں پر بھی جاتے ہیں اوران مقامات کی تصاویر بناتے ہیں، کیا ان مقامات کی تصاویر بنانا درست ہے؟ اوراس سے حج وعمرہ پر تو کچھ اثر نہیں پڑتا؟ براہ کرم جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... حج نام ہے،فعل مخصوص کے ساتھ، زمانِ مخصوص میں، مکان مخصوص کی زیارت کا۔اور عمرہ نام ہے احرام،طواف اور سعی کا۔

دورانِ حج وعمرہ اگر کوئی مختلف مقامات کی تصاویر بناتا ہے۔جس میں جاندار کی تصاویر نہ ہوں، درست ہے۔اس سے حج اور عمرہ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔البتہ حج وعمرہ کیلئے جا کر ان چیزوں میں مشغول ہونا اچھا نہیں۔اگر ان مقامات کی تصاویر بنانے میں جاندار کی تصاویر بھی آتی ہوں تو پھر بنانا درست نہیں ہے۔اس لئے کہ جاندار کی تصاویر بنانا حرام ہے۔اور دورانِ حج وعمرہ گناہ کی برائی مزید بڑھتی ہے۔اس کے علاوہ حاجی کیلئے سب سے بڑی بشارت،''نومولود بچے کی طرح گناہوں سے پاک ہونا'' اس قید کے ساتھ ہے کہ وہ دوران حج گناہوں سے بچا ہو۔

وفي الدر المختار(۲/۴۵۴): وشرعا(زيارة) اى طواف ووقوف (مكان مخصوص) اى الكعبة

وعرفة (فی زمن مخصوص) فی الطواف من فجر النحر الی اخر العمر وفی الوقوف من زوال شمس عرفة لفجر النحر (بفعل مخصوص) بان یکون محرما بنیة الحج

وفی الصفحة ۴۷۲، ۴۷۳: (والعمرة) فی العمر (مرة سنة مؤکدة) علی المذهب وصحح فی الجوهرة وجوبها. قلنا المامور به فی الایة الاتمام وذلک بعد الشروع وبه نقول (وهی احرام وطواف وسعی) وحلق او تقصیر فالاحرام شرط ومعظم الطواف رکن وغیرهما واجب هو المختار ویفعل فیها کفعل الحاج (وجازت فی کل السنة).

وفی عمدة القاری شرح البخاری (۲۲/۷۰): وفی التوضیح قال اصحابنا وغیرهم تصویر صورة الحیوان حرام اشد التحریم وهو من الکبائر وسواء صنعه لما یمتهن او لغیره فحرام بکل حال لان فیه مضاهاة لخلق الله وسواء کان فی ثوب اوبساط او دینار او درهم او فلس او اناء اوحائط واما مالیس فیه صورة حیوان کالشجر ونحوه فلیس بحرام سواء کان فی هذا کله ماله ظل وما لا ظل له وبمعناه قال جماعة العلماء مالک والثوری وابو حنیفة وغیرهم.

وفی الشامیة (۱/۶۴۷): وظاهر کلام النووی فی شرح مسلم الاجماع علی تحریم تصویر الحیوان، وقال: وسواء صنعه لما یمتهن او لغیره، فصنعته حرام بکل حال، لان فیه مضاهاة لخلق الله تعالیٰ، وسواء کان فی ثوب او بساط او درهم واناء وحائط وغیرها.

وفی الدر المختار (۱/۶۴۹): (او لغیر ذی روح لا) یکره لانها لا تعبد. وقال العلامة الشامی رحمه الله تحته (قوله او لغیر ذی روح) لقول ابن عباس للسائل ((فان کنت لابد فاعلا فاصنع الشجر ومالا نفس له)) رواه الشیخان، ولا فرق فی الشجر بین المثمر وغیره خلافا لمجاهد بحر

(۱۳۷) مکہ اور منیٰ دورِ حاضر میں الگ الگ شہر ہیں؟

سوال ... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مکہ اور منیٰ دورِ حاضر میں الگ الگ شہر کے حکم میں ہیں یا ایک ہی شہر کے حکم میں ہیں، آیا مکہ سے منیٰ جاکر آدمی مسافر بنے گا یا نہیں۔ قرآن وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً ..... منیٰ اور مکہ شرعاً الگ الگ مقامات ہیں اور کوئی مکی مکہ مکرمہ سے منیٰ جائے گا تو سفرِ شرعی کی مسافت نہ ہونے کی وجہ سے پوری نماز پڑھے گا اگر غیر مکی مکہ مکرمہ میں 15 دن رہنے کی نیت سے آیا مکہ پہنچنے کے بعد منیٰ چلا گیا تو بھی پوری نماز پڑھے گا، اگر دونوں شہروں میں 15 دن رہنے کی غرض سے جاتا ہے تو وہ قصر کرے گا کیونکہ اقامت کیلئے کسی ایک شہر میں رہنے کی نیت ضروری ہے البتہ اگر کسی شہر کے قریب کوئی قصبہ وغیرہ اس طور پر ہو کہ وہاں کے رہنے والوں پر بھی جمعہ وغیرہ واجب ہو تو پھر ان دو جگہوں کو حکماً ایک شہر جیسا

جائے گا۔

لما في عمدة القاری (۷/۱۱۹): وقال اكثر اهل العلم منهم عطاء والزهري والثوري والكوفيون وابو حنيفة واصحابه والشافعي واحمد و ابو ثور لايقصر الصلوٰة اهل مكة بمنىٰ وعرفات اذا كانوا حجاجا اتموا.

وفي الجوهرة النيرة (۱/۱۹۵): منىٰ وهي قرية فيها ثلث سكك بينها و بين مكة فرسخ وهي من الحرم.

وفي الدرالمختار (۲/۱۲۶): بموضعين مستقلين كمكة ومنىٰ فلودخل الحاج مكة ايام العشر لم تصح نيته لأنّه يخرج الىٰ منىٰ وعرفة (الى قوله) اوكان احدهما تبعا للآخر بحيث تجب الجمعة علىٰ ساكنه للاتحاد حكما

وفي الشامية تحته لانه لما كان عازماً على الخروج قبل تمام نصف شهر لم يصر مقيما.

(۱۳۸) عرفات، مزدلفہ اور منیٰ کی حدود میں توسیع شرعاً ممکن ہے یا نہیں؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ پچھلے سال جب حج پر گیا تھا تو میں نے ایک عجیب ترتیب دیکھی تھی۔ اسی سے متعلق آپ سے پوچھنا تھا کہ آیا یہ درست بھی ہے یا نہیں؟ منیٰ اور عرفات کے قیام میں خیمے ان کی حدود سے باہر بھی لگے ہوئے تھے، میں نے ایک صاحب سے کہا کہ آپ حدود میں نہیں ہیں تو انہوں نے کہا کہ جناب یہ بھی حدود ہی ہے۔ اور ایک صاحب تو کہنے لگے کہ جناب اب کچھ عرصے بعد تو باقاعدہ حکومت منیٰ، مزدلفہ اور عرفات میں توسیع کر رہی ہے۔ جناب عالی مجھے آپ سے پوچھنا یہ تھا کہ شرعی لحاظ سے منیٰ، مزدلفہ اور عرفات کی حدود کیا ہیں؟ اور موجودہ دور میں اس کی کیسے پہچان ہوگی؟ اور کیا اس کی حدود میں اضافہ کیا جا سکتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... عرفات کی پہلی حد شرقی جانب راستہ کی کشادگی تک اور دوسری حد عرفات کی غربی جانب، پہاڑوں کے کناروں تک اور تیسری حد وہ باغات ہیں جو عرفہ کی بستی سے ملے ہوئے ہیں اور چوتھی حد وادیٔ عرنہ تک ہے۔ اور وادیٔ عرنہ اور وادی نمرہ حدود عرفات سے باہر ہیں اور مسجد نمرہ کی کئی مرتبہ توسیع سے عرفات کا کچھ حصہ مسجد نمرہ میں داخل ہوا ہے اور مسجد میں حدود عرفات پر نشانات لگائے گئے ہیں جن کا پہچاننا مسجد نمرہ میں وقوف کے وقت وقوف عرفہ کی درستگی کیلئے ضروری ہے۔ اور مزدلفہ کی حد عرفہ کی دونوں گھاٹیوں کے درمیانی راستہ سے وادیٔ محسر کی دونوں چوٹیوں تک شمالاً وجنوباً ہیں اور غربی جانب سے وادی محسر سے لے کر شرقی جانب مزدلفہ کی جانب پہنچی گھاٹی تک ہے اور مزدلفہ کی مقدار سات ہزار سات سو اسی ذراع ہے کما في فتاوىٰ اللجنة اور منیٰ کی حدود جمرۃ العقبہ اور وادی محسر کے درمیانی علاقہ ہے اور وہ پہاڑ جو اس کا احاطہ کئے ہوئے ہیں

دو حصہ جو منیٰ کی طرف ہے وہ حدود منیٰ میں داخل ہے اور جو حصہ دوسری طرف ہے وہ حدود سے خارج ہے اور جمرۃ العقبہ اور محسر منیٰ کی حدود سے باہر ہیں امام ازرقی سے منقول ہے کہ منیٰ کا علاقہ سات ہزار دو سو ذراع ہے کما فی غنیۃ الناسک میں عرفات اور مزدلفہ اور منیٰ کی حدود شارع علیہ السلام کی طرف سے متعین ہیں اور ان میں توسیع کی گنجائش نہیں ہے اور موجودہ دور میں ان کی حدود پر بینرز اور بورڈ وغیرہ لگائے گئے ہیں جن سے حدود پہچانی جاتی ہیں۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر افعال حج عرفات کی حدود کے اندر ادا کئے ہوں اور صرف آرام و قیام حدود سے باہر تھا تو حج درست ہوا ہے نیز وقوف عرفہ ارکان حج میں سے ہے اگر ایک لمحہ بھی حدود کے اندر وقوف کیا ہے تو حج ادا ہوگیا اگر پورا دن حدود سے باہر گزرا ہے تو اس صورت میں حج ادا نہیں ہوا اور مزدلفہ کا وقوف واجب ہے اور یہ عذر کی وجہ سے ساقط ہوجاتا ہے، اور وقوف منیٰ سنت ہے اس کے چھوٹنے سے بھی حج میں فساد نہیں آتا۔ لہٰذا مزدلفہ اور منیٰ میں خیمہ عذر کی وجہ سے حدود سے باہر لگایا گیا ہے تو آپ کا حج صحیح ہوا۔

لما في المشكوة المصابيح (١ /٢٢٨): عن جابر ان رسول الله عليه السلام قال نحرت ههنا ومنى كلها منحر فانحروا في رحالكم ووقفت ههنا وعرفة كلها موقف ووقفت ههنا وجمع كلها موقف.

وفيه ايضاً (١ /٢٢٩): عن جابر ان رسول الله عليه السلام قال كل عرفة موقف وكل منى منحر وكل المزدلفة موقف وكل فجاج مكة طريق ومنحر.

وفي الفقه الاسلامي وادلته (٣ /٢٢٤٧) مقدار الوقوف: اتفق العلماء على انه يكفي الوقوف في جزء من ارض عرفة ولو في لحظة لطيفة ... فالقدر المفروض من الوقوف هو وجوده بعرفة ساعة من هذا الوقت سواء كان عالماً اوجاهلا ... وسواءً وقف بها اومرّ.

وفي غنية الناسك في بغية المناسك (ص١٦٩): ومنى شعب طوله نحو ميلين وعرضه يسير والجبال المحيطة بها ما اقبل منها عالية فهو من منى وما ادبر منها فليس من منى وحد منى وادى محسر وجمرة العقبة وليست الجمرة ولا العقبة من منى بل منى تنتهي اليهما

قال الازرقي رحمه الله ذرع منى ذرع مابين جمرة العقبة ومحسر سبعة آلاف ذراع ومائتا ذراع.

وعن عطاء حد منى راس العقبة مما يلي منى الى محسر خلافا للمحب الطبرى رحمه الله حيث قال العقبة كلها من منى.

وفي مناسك ملا علي قارى (ص٢٢٣): اعلم ان منى شعب طوله ميلان وعرضه يسير والجبال المحيطة بها ما اقبل منها عالية فهو من منى وليست العقبة منها. وفي حاشيته. قال الامام النووى ... اعلم ان حد منى مابين وادى محسر وجمرة العقبة ومنى شعب طوله نحو ميلين وعرضه يسير والجبال المحيطة به ما اقبل منها عليه فهو من منى وما ادبر منها فليس من منى.

ولیست العقبة التی تنسب الیها الجمرة من منیٰ.

وفی موطا امام مالک (ص۱۱۴): والمزدلفة کلها موقف الخ وفی حاشیته. وحد المزدلفة بین مازمی عرفة و قرنی محسر ولیس المازمان ولا وادی محسر من المزدلفة.

وفی فتاوی اللجنة الدائمة (۲۱۳/۱۱): این تبدأ حدود مزدلفة من عرفة؟ تبدأ مزدلفة غرباً من وادی محسر وتنتهی شرقاً بأول المأزمین من جهتها وقدر ما بین سبعة آلاف ذراع وسبعمائة ذراع وثمانون ذراعا واربعة اسباع ذراع. ۷۷۸۰ ذراع

وفی فتاوی اللجنة(۲۶۶/۱۱): اما کن الحج وازمنته محددة من الشارع ولیس فیها مجال للاجتهاد...... وحدود منی من وادی محسر الی جمرة العقبة. فعلی من حج ان یلتمس مکاناً له داخل حدود منی فان تعذر علیه حصول المکان نزل فی اقرب المکان یلی منی ولا شئ علیه.

وفی الهندیة(۲۱۹/۱): واما رکنه. الوقوف بعرفة وطواف الزیارة...... واما واجباته...... السعی بین الصفا والمروة والوقوف بمزدلفة. واما سننه. فطواف القدوم...... والبیتوتة بمنی فی لیالی ایام النحر والدفع من منی الی عرفة بعد طلوع الشمس ومن مزدلفة الی منی قبلها والبیتوتة بمزدلفة.

وفی الشامیة(۵۱۱/۲): هذا الوقوف واجب عندنا لاسنة والبیتوتة بمزدلفة سنة مؤکدة الی الفجر...... وقدر الواجب منه ساعة ولو لطیفة . (لو ترکه بعذر کزحمة) عبارة اللباب الا اذا کان لعلة او ضعف او یکون امرأة تخاف الزحام فلا شئ علیه...... لکن لا شک ان الزحمة عند الرمی وفی الطریق قبل الوصول الیه امر محقق فی زماننا فیلزم منه سقوط الوقوف بمزدلفة.

(۱۳۹) سعی کا صحیح طریقہ اور مسعیٰ کی مقدار

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ چندروز کے بعد ہی میری حج کیلئے روانگی ہے، میں حج کے سلسلے میں کئی کتابیں دیکھ چکا ہوں اور علمائے کرام سے ضروری ضروری کئی مسائل بھی معلوم کرے ہیں۔ مجھے بس آپ سے سعی سے متعلق پوچھنا ہے کہ اس کا صحیح شریعت کے مطابق طریقہ کیا ہے؟ اور آجکل تو پہاڑ کی سی شکل تقریباً نہیں ہے تو لمبائی کے لحاظ سے صفا مروہ میں کہاں تک جانا ضروری ہے اور عرضاً کتنی مقدار مسعیٰ میں داخل ہے اگر کوئی عہدِ نبوت کی مقدار سے باہر نکل جائے تو سعی درست رہے گی؟

الجواب حامداًومصلیاً...... سعی کا شریعت کے مطابق طریقہ یہ ہے کہ صفا پر پہنچ کر قبلہ رخ ہوکر نیت کریں پھر اللہ اکبر، لا الہ الا اللہ پڑھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام بھیج کر دعا کریں پھر مروہ کی طرف وقار کے ساتھ چلیں اور سبز بتیوں اور سبز ستونوں کے درمیانی حصہ کو

دوڑتے ہوئے عبور کریں (دوڑنے کا حکم صرف مردوں کیلئے ہے) پھر مروہ پر پہنچ کر ایسے ہی اللہ اکبر، لا الہ الا اللہ اور درود پڑھیں اور دعا کریں۔ یہ ایک چکر ہوا، دوسرے چکر کیلئے جانے والے راستے سے صفا کیلئے چلیں، تمام افعال ایسے ہی کریں جیسے پہلے چکر میں کئے تھے اس طرح سات چکر پورے کریں جو صفا سے شروع ہو کر مروہ پر ختم ہوں گے، سعی کے دوران مسنون دعائیں اوراذکار کرتے رہیں۔

صفا ومروہ کی موجودہ صورت لوگوں کو تنگی اور مشقت سے بچانے کیلئے اختیار کی گئی ہے، اس سے حکم میں کوئی فرق نہیں آتا، لہٰذا لمبائی کے اعتبار سے موجودہ صفا ومروہ کے آخری حصہ تک جانا چاہئے تاکہ سعی کی مقدار چھوٹنے کا شبہ بھی نہ رہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مسعی ابتداء چوڑائی کے اعتبار سے کافی عریض تھی جہاں بعد میں دکانیں اور مکانات تعمیر کردیئے گئے جو بعد کے توسیعی کاموں میں ختم کردیئے گئے، لہٰذا موجودہ مسعی میں عرضاً جس جگہ سے بھی سعی کرے ہوجائے گی۔

لما في الفقه النافع (۱/ ۴۲۲، ۴۲۳): ثم يخرج الى الصفا ويبدأ به لقوله عليه السلام (ابدأ بما بدأ الله به) فيصعد عليه ويستقبل البيت ويكبر ويهلل ويصلي على النبي ﷺ ويرفع يديه ويدعو بحاجته ويرفع يديه ... وينحط عن المروة ويمشي على هينته فاذا بلغ بطن الوادى سعى بين الميلين الاخضرين سعياً كذلك السنة حتى ياتي المروة فيصعد عليها ويفعل كما فعل على الصفا وهذا شوط فيطوف سبعة اشواط يبتدئ بالصفا ويختم بالمروة.

وفي الشامية(۱/ ۱۹۰): قال العلامة الشامي عليه الرحمة تحت "تنبيه مهم في طرح الزيل في القساطل" ...... لما علمت من الضرورة من ان المشقة تجلب التيسير ومن أنه اذا ضاق الأمر اتسع والله تعالىٰ اعلم.

وفي الاشباه والنظائر (ص۷۵): القاعدة الرابعة: المشقة تجلب التيسير ... قال العلماء يتخرج على هذه القاعدة جميع رخص الشرع وتخفيفاته........... (ص۸۳)المشقة والحرج، انما يعتبران في موضع لانص فيه ......(ص۸۴) ذكر بعضهم، أن الامر اذ اضاق اتسع واذا اتسع ضاق.

وفي منحة الخالق على البحر (۲/ ۵۸۵): ذكر الشيخ عبدالرحمن المرشدى في شرحه على الكنز ان مسافة ما بين الصفا والمروة سبعمائة وخمسون ذراعاً، فعليه فعدة السعي خمسة الاف ومائتان و خمسون ذراعاً اهـ...... واما عرض المسعى فحكى العلامة الشيخ قطب الدين الحنفي في تاريخه نقلاً عن تاريخ الفاكهي انه خمسة وثلاثون ذراعاً ثم قال: وههنا اشكال عظيم ما رأيت احداً تعرض له (ص۵۸۶) وهو ان السعي بين الصفا والمروة من الامور التعبدية في ذلك المكان المخصوص، وعلى ما ذكر الثقات ادخل ذلك المسعى في الحرم الشريف وحول ذلك المسعى الى دار ابن عباد كما تقدم والمكان الذى يسعى فيه الآن لايتحقق انه من عرض المسعى الذى سعى

فيه رسول الله ﷺ أو غيره، فكيف يصح السعي فيه وقد حول عن محله؟ ولعل الجواب ان المسعى عريضاً وبنيت تلك الدور بعد ذلك في عرض المسعى القديم فهدمها المهدى وأدخل بعضها في المسجد الحرام وترك البعض ولم يحول تحويلا كلياً والا لأنكره علماء الدين من الائمة المجتهدين.

وفي المناسك لملا علي القارى عليه الرحمه (ص۱۷۸، ۱۷۹): واجبات السعي منها ... وقطع جميع المسافة بينهما، وهو ان يلصق عقبيه بهما وكذا عقبي حافر دابته اذا كان راكباً وهذا هو الاحوط أو يلصق عقبيه في الابتداء بالصفا، واصابع رجليه بالمروة وفي الرجوع عكسه وهذا هو الأظهر. لكن تصويرهما انما كان يتصور في العهد الأول، حيث يوجد كل من الصفا والمروة مرتفعاً عن الأرض. واما في هذا الزمان فلكون دفن كثير من اجزائهما لا يمكن حصول ما ذكر فيهما، فيكفي المرور فوق أوائلهما.

(۱۴۰) حج میں میلین اخضرین پر دوڑنے کے چند اسباب

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ صفا ومروہ کی سعی کے دوران "میلین اخضرین" پر دوڑا جاتا ہے، اس دوڑنے کی اصل علت کیا ہے؟ بعض لوگوں سے سنا ہے کہ بی بی ہاجرہ کے دوڑنے کی وجہ سے ہے۔ اور ایک صاحب جو کہ دینی معلومات کافی رکھتے ہیں وہ کہہ رہے تھے کہ حدیث میں اسی طرح کرنے کا حکم آیا ہے بس صرف یہ وجہ ہے۔ براہ کرم آپ اصل بات اور علت بیان فرما کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً ... محققین کے نزدیک حج میں میلین اخضرین پر دوڑنے کا حکم امور توقیفیہ میں سے ہے اس کی اصل علت اللہ کے علم میں ہے لیکن بعض علماء کرام اس کی مشروعیت کے بعض اسباب بیان فرماتے ہیں ان میں سے پہلا سبب حضرت بی بی ہاجرہ کا دوڑنا ہے اس واقعہ کو امام بخاری نے اپنی کتاب (۱/۴۷۴) میں تفصیلاً ذکر کیا ہے اور ان میں سے دوسرا سبب یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حج کا حکم دیا تو سعی کے دوران شیطان نے ان سے مسابقت کی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے شیطان پر سبقت پائی اس سبقت پانے کی وجہ سے میلین اخضرین پر دوڑا جاتا ہے اور ان میں سے تیسرا سبب یہ بیان فرمایا ہے کہ سعی کے دوران حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین مکہ کو اپنی قوت دکھانے کیلئے میلین اخضرین پر دوڑنے کا حکم فرمایا اسی وجہ سے میلین اخضرین پر دوڑا جاتا ہے۔

لما في حاشية الطحطاوى على الدر المختار (۱/۵۰۰): قيل في سبب مشروعية السعي ان ابراهيم عليه السلام لما ترك هاجر و اسماعيل هناك عطش اسماعيل فصعدت الصفا تنظر هل بالموضع ماء فلم ترشيئا فنزلت فسعت في بطن الوادى حتى خرجت منه الى جهة المروة لانها توارت

بالوادی عن ولدها فسعت شفقة علیه فجعل ذلک نسکا لها اظهارا لشرفها وتفخیما لامرها وعن ابن عباس ان ابراهیم علیه السلام لما امر بالمناسک عرض له الشیطان عند السعی فسابقه فسبقه ابراهیم علیه السلام وقیل انما سعی رسول الله ﷺ بین المیلین اظهارا للجلد والقوة للمشرکین الناظرین الیه.

وفی البخاری(۱/۲۲۳): حدثنا علی بن عبدالله قال حدثنا سفین عن عمرو بن دینار عن عطاء عن ابن عباس قال انما سعی رسول الله ﷺ بالبیت وبین الصفا والمروة لیری المشرکین قوته.... وفی هامشها(۱۰). وقد وردایضا سبب آخر وهو سعی هاجرة علیها السلام علی ماصرّح به البخاری وروی ان ابراهیم علیه السلام لما امر بالمناسک عرض له الشیطان عند السعی فسابقه فسبقه ابراهیم علیه السلام ۱۲ ع.

(۱۴۱) مسجد خیف منیٰ کے حدود میں واقع ہے؟

سوال ...کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے پڑوسی اس سال حج کر کے آئے تو انہوں نے بتایا کہ انہیں تو بڑی آسانی ہوگئی تھی کہ ایک رشتہ دار نے انہیں مسجد خیف میں اپنے ساتھ جگہ دیدی تھی، اس طرح انہیں کوئی دقت نہیں ہوئی، لیکن انہوں نے عجیب بات یہ بتائی کہ میں نے منیٰ میں قیام بھی نہیں کیا بس مسجد خیف میں ہی ٹھہرا رہا، میرے رشتہ دار نے کہا تھا کہ یہیں رہو آپ کا قیام منیٰ بھی ہوجائے گا، حضرت کیا واقعی اس مسجد میں قیام سے منیٰ کا قیام ہوجاتا ہے؟ براہ کرم تسلی بخش جواب سے سرفراز فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً مسجد خیف منیٰ میں ایک مشہور مسجد ہے اور چونکہ یہ منیٰ کے حدود میں ہے لہٰذا مسجد خیف میں ٹھہرنے سے منیٰ کا قیام ہوجاتا ہے۔ واللہ اعلم

لمافی المرقاة(۳/۲۱۰): (فصلیت معه صلاة الصبح فی مسجد الخیف) وهو مسجد مشهور بمنی.

وفیه ایضاً(۵/۳۶۸): (فصلی بها) أی بمنی فی مسجد الخیف(الظهر والعصر والمغرب والعشاء والفجر) أی فی أوقاتها.

وفی مراقی الفلاح(ص۴۰۲): ویستحب ان یصلی الظهر بمنی ولا یترک التلبیة فی أحواله إلا فی الطواف ویمکث بمنی إلی ان یصلی الفجر بها بغلس وینزل بقرب مسجد الخیف.

وفی الشامیة(۲/۵۰۳): وفی المبسوط یستحب ان یصلی الظهر یوم الترویة بمنی ویقیم بها إلی تسبیحة عرفة اهـ ویصلی الفجر بها لو قتها المختار وهو زمان الإسفار.

(۱۴۲) کیا منیٰ حدودِ حرم میں داخل ہے یا نہیں؟ عجوہ کھجور کا درخت کس نے لگایا، حجر اسود کب اور کہاں سے آیا، احرام کیلئے رنگین چادر استعمال کرنے کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے حج کے سلسلے میں چند مسائل آپ سے دریافت کرنا تھے، امید ہے کہ تشفی بخش جوابات دے کر ممنون فرمائیں گے۔

(۱)۔ منیٰ حدودِ حرم میں داخل ہے یا نہیں؟

(۲)۔ عجوہ کھجور کے متعلق سنا ہے کہ اس کا درخت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود لگایا تھا آیا یہ بات کس حد تک درست ہے؟

(۳)۔ حجر اسود یہ کب اور کہاں سے آیا؟ اور کیا یہ قیامت میں جنت میں جائے گا؟

(۴)۔ احرام کیلئے رنگین چادر استعمال کرنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً :۔ (۱)۔ منیٰ حدودِ حرم میں داخل ہے۔

(۲)۔ عجوہ کھجور کے متعلق یہ بات کہ اس کا درخت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود لگایا تھا کسی حد تک درست معلوم ہوتی ہے کیونکہ ملا علی قاری نے مرقاۃ (۸/۱۰۳) پر اور علامہ عینی نے عمدۃ القاری (۲۱/۲۸۷) پر عجوہ کھجور کے فضائل میں اس بات کا تذکرہ کیا ہے۔ کہ یہ آپ علیہ الصلاۃ والسلام کا لگایا ہوا ہے۔

(۳)۔ حجر اسود جنت سے آیا ہے جس وقت حضرت آدم علیہ الصلاۃ والسلام کو جنت سے زمین پر اتارا گیا تھا تو اسی وقت ان کے ساتھ حجر اسود کو بھی اتارا گیا تھا اور یہ قیامت میں دوبارہ جنت میں جائے گا۔

(۴)۔ احرام میں افضل تو یہ ہے کہ سفید چادر استعمال کی جائے۔ اور اگر کوئی رنگین چادر استعمال کرے تو یہ بھی جائز ہے۔

لمافي عمدة القاري (۱۰/۴۸): وقال في شرح المهذب قال الشافعي واصحابنا يجوز نحر الهدى ودماء الجبرانات في جميع الحرم لكن الافضل في حق الحاج النحر بمنى وافضل موضع فى منى للنحر موضع نحر رسول الله ﷺ وما قاربه.

وفي الشامية(۲/۲۱۲): في الدر المختار مع هامش ردالمحتار ويتعين الحرم لا منى

وفي الشامية (قوله لامنى) اى بل يسن لمافي المبسوط من أن السنة في الهدايا أيام النحر منى وفي غير أيام النحر فمكة هي الاولى.

وفي مرقاة المفاتيح (۸/۱۰۳): في النهاية العجوة نوع من تمر المدينة اكبر من الصيحاني يضرب

وفی عمدة القاری(۲۱/۲۸۷): قید التمرات بالعجوة لان السر فیها انها من غرس النبی ﷺ

وفی ترمذی (۱/۱۷۷): عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ نزل الحجر الاسود من الجنة وهو اشد بیاضا من اللبن فسودته خطایا بنی آدم.

وفی اخبار مکة (۱/۳۲۵): عن ابن عباس رضی الله عنه قال انزل الرکن والمقام مع آدم علیه السلام لیلة نزل بین الرکن والمقام فلما اصبح رأی الرکن والمقام فعرفهما فضمهما الیه و أنس بهما.

وفی تاریخ طبری (۱/۸۵): عن ابن عباس قال نزل آدم علیه السلام معه ریح الجنة فعلق بشجرها وأودیتها وامتلا ما هنالک طیبا فمن ثم یؤتی بالطیب من ریح الجنة وقالوا أنزل معه من طیب الجنة وقال أنزل معه الحجر الاسود وکان أشد بیاضاً من الثلج الخ.

وفی عمدة القاری(۹/۲۴۲): روی الطبرانی عن عائشة رضی الله عنها (استمتعوا من هذا الحجر الاسود قبل ان یرفع فانه خرج من الجنة وانه لا ینبغی لشئ خرج من الجنة ان لا یرجع الیها قبل یوم القیامة).

وفی اخبار مکة (۱/۳۴۲): عن عائشة رضی الله عنها انها قالت: قال رسول الله ﷺ اکثروا استلام هذا الحجر فانکم توشکون ان تفقدوه بینما الناس یطوفون به ذات لیلة اذا اصبحوا وقد فقدوه ان الله عزوجل لا یترک شیئا من الجنة فی الارض الا اعاده فیها قبل یوم القیامة.

وفی مناسک ملا علی قاری (ص۹۱): (ولبس ثوبین) ای أبیضین کمافی نسخة (جدیدین) أی غیر ملبوسین، قیاسا علی الکفن، أو لکونهما لم یعص الله فیهما، (او غسیلین) تبعیدا عن النجاسة وتنزیها عن الوساخة فیفید أن اصل لبس الازار والرداء سنة و بقیة الاوصاف مستحبة.

وفی الشامیة(۲/۴۸۱): (قوله جدیدین) اشار بتقدیمه الی افضلیه، وکره أبیض أفضل من غیره..... فیجوز فی ثوب واحد وأکثر من ثوبین وفی اسودین.

(۱۴۳) طواف کی دو رکعتیں مقام ابراہیم کے پیچھے پڑھنا ضروری ہے یا نہیں؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا طواف کی دو رکعتیں مقام ابراہیم کے پیچھے پڑھنا ضروری ہے؟ اگر کوئی شخص دو رکعت پڑھنا بھول جائے تو اس کیلئے کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداًومصلیاً ...صورت مسئولہ میں افضل اور مستحب یہ ہے کہ مقام ابراہیم کے پیچھے نماز پڑھے لیکن اگر یہاں نماز پڑھنے پر قادر نہ

ہو سکے تو جہاں بھی نماز پڑھے گا کفایت کر جائے گا نیز جو شخص یہ دو رکعت پڑھنا بھول جائے تو اس کیلئے حکم یہ ہے کہ جب بھی اس کو یاد آئے وہ دو رکعت پڑھ لے اگرچہ وطن کی طرف کیوں نہ لوٹ گیا ہو لیکن ایسا کرنا مکروہ ہے۔

لمافی الهندية(۱/۲۲۶): واذا فرغ من الطواف يأتي مقام ابراهيم عليه السلام ويصلي ركعتين وان لم يقدر على الصلاة في المقام بسبب المزاحمة يصلي حيث لايعسر عليه من المسجد كذا في الظهيرية وان صلى في غير المسجد جاز.

وفي الطحطاوی على الدر(۱/۴۹۹): قوله وهل يتعين المسجد قولان) المعتمد أن تعينه على سبيل الافضلية فلو صلاهما بعد رجوعه الى اهله اجزأه لانهما على التراخي وهذا قول الامام واصحابه وقال ابو طاهر ان ترک صلاتهما في المسجد وجب عليه دم وقواه صاحب النهر ولا وجه للعدول عن مذهب الامام واصحابه

وفي الدر المختار(۲/۴۷۰): و صلاة ركعتين لكل اسبوع) من اى طواف كان فلو تركها هل عليه دم قيل نعم فيوصي به والضابط ان كل مايجب بتركه دم فهو واجب صرح به في الملتقى.

وفي الشامية تحته: (قوله قيل نعم) ضعفه هنا وان جزم به في شرحه على الملتقى لانه جزم بخلافه صاحب اللباب فقال ولا تختص أى هذه الصلاة بزمان ولابمكان: اى باعتبار الجواز والصحة ولا تفوت اى إلا بالموت ولو تركها لم تجبر بدم أى انه لايجب عليه الإيصاء بالكفارة وذكر شارحه ان المسألة خلافية .... وفي بعض المناسک الاكثر على انه لايجب وبه قال الشافعية وقيل يلزم، (قوله والضابط الخ) لما لم يستوف الواجبات كما علمته ممازدناه عن اللباب ذكر هذا الضابط وليفيد بعكس القضية حكم الواجب لكنها تنعكس عكسا منطقيا لالغوياً فيقال بعض ماهو واجب يجب بتركه دم لاكل ما هو واجب لأن ركعتي الطواف لا يجب بتركهما الدم وكذ اترک الواجب بعذر على ماسنذكره في اول الجنايات لكن في الاول خلاف تقدم فعلى القول بوجوب الدم فيه مع تقييد الترک بلا عذر يصح العكس كلياً.

وفيه ايضاً (ص۴۹۹): (قوله قولان) لم أر من حكى القولين سوى ماتوهمه عبارة النهر وفيها نظر والمشهور في عامة الكتب ان صلاتها في المسجد أفضل من غيره وفي اللباب: ولا تختص بزمان ولامكان ولا تفوت فلو تركها لم تجبر بدم ولو صلاها خارج الحرم ولو بعد الرجوع الى وطنه جاز ويكره ويستحب مؤكدا أداؤها خلف المقام.

(۱۴۴) دوگانہ طواف اگر مقام ابراہیم پر ادا نہ کیا تو اس کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے پڑوسی اس سال حج کرنے گئے۔ انہوں نے بتایا کہ طواف کے بعد میں نے دو دوگانہ طواف کئے ہیں وہ نفل مقام ابراہیم پر نہیں پڑھ سکے۔ اب پتا چلا ہے کافی پریشان ہو رہے ہیں کہ پتا نہیں اس طرح کرنے سے میرے حج کا ثواب خراب تو نہیں ہو گیا۔ اسی وجہ سے اب میرے ذریعے وہ آپ کو زحمت دے رہے ہیں کہ آپ صحیح بات بتائیں کہ آیا ان کا حج ہو گیا یا نہیں؟ اور ان کے اس طرح کرنے سے ان پر کوئی گناہ تو نہیں ہوا؟

الجواب حامداً ومصلیاً: آپ کے دوست کا حج صحیح ہوا، ان پر کوئی گناہ نہیں البتہ افضل یہ تھا کہ وہ ان دو رکعتوں کو مقام ابراہیم پر پڑھتے۔ اگر مقام پر جگہ نہیں تو قریب ادا کرنی چاہئے جہاں جگہ ہو۔

لمافي فتاوى قاضي خان (١/ ١٣٩): ثم يصلي بعد الطواف ركعتين عند المقام او حيث ما تيسر له من المسجد وان صلى في غير المسجد جاز وركعتا الطواف عندنا واجبة.

وفي المنحة الخالق على البحر الرائق (٢/ ٥٨٠): (فواجبة على الصحيح) اى بعد كل طواف فرضا كان او واجبا او سنة او نفلا. ولا تختص بزمان ولا بمكان ولا تفوت. ولو تركها لم تجبر بدم.

فصل فی المسائل المتفرقة المتعلقة بالحج

(حج کے متعلق متفرق مسائل کا بیان)

(۱۴۵) حج کی اقسام وافضل حج

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حج کی کتنی قسمیں ہیں اوران میں سے افضل کون سا حج ہے؟ نیز جو لوگ پاکستان سے حج کیلئے جاتے ہیں وہ کون سا حج ادا کر سکتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: حج کی تین قسمیں ہیں (۱) قران (۲) تمتع (۳) افراد [illegible] آفاقی [illegible] سے [illegible] سکتے ہیں [illegible] حق میں حج قران سب سے افضل ہے۔

لما فی الهندية (۱ / ۲۳۹): القران في حق الآفاقي افضل من التمتع والإفراد والتمتع في حقه افضل من الإفراد وهذا هو المذكور في ظاهر الرواية هكذا في المحيط. وليس لأهل مكة تمتع ولا قران وإنما لهم الإفراد خاصة.

وفي الدر المختار (۲ / ۵۲۹، ۵۳۰) باب القران هو أفضل ((لحديث)) ((أتاني الليلة آت من ربي وأنا بالعقيق فقال: يا آل محمد أهلوا بحجة وعمرة معاً، ولأنه أشق (ثم التمتع ثم الإفراد).

وفي الشامية (۲ / ۵۲۹) (قوله هو افضل) أي من التمتع وكذا من الإفراد بالاولى وهذا عند الطرفين وعند الثاني هو التمتع سواء فيستوي [illegible] المكي في الآفاقي وإلا فالإفراد أفضل كما سيأتي [illegible] ثم قال [illegible] حجته عليه الصلاة والسلام [illegible] الإمام الطحاوي [illegible] فمن روى الإفراد سمعه يلبي بالحج وحده ومن روى التمتع سمعه يلبي بالعمرة وحدها ومن روى القران سمعه يلبي بهما [illegible] عليه الصلاة والسلام [illegible] من افضل ما أمر به الذي هو وحي وقد بسط في الفتح في بيان تقديم أحاديث القرآن فارجع إليه

(۱۴۶) حج جانی ومالی عبادت کامرکب ہے

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کہتے ہیں کہ حج جانی ومالی عبادات کا مرکب ہے۔اب اگر کوئی مالدار آدمی جو کہ حرم میں ہی رہتا ہے وہ بغیر خرچ کئے حج کرلے تو آیا اس کو ثواب ملے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً حج ایک ایسی عبادت ہے جو جانی ومالی عبادت سے مرکب ہے۔اور مالی عبادت سے مرکب ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ ادائیگی حج میں مال بھی ضرور خرچ کیا جائے۔اس کے بغیر حج ہی نہ ہوگا۔البتہ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ حج کی ادائیگی میں جان ومال دونوں خرچ ہوتے ہیں جبکہ اگر کسی کے پاس زاد راہ وغیرہ حج کے اخراجات نہ ہوں تو اس پر حج فرض ہی نہیں ہوتا۔اس لئے کہا جاتا ہے کہ حج جانی ومالی عبادت سے مرکب ہے۔لیکن اگر کوئی شخص مال خرچ کئے بغیر افعال حج کی ادائیگی کرلیتا ہے۔جیسا کہ صورت مسئولہ میں تو اس کا حج ہوجائے گا اور ان شاء اللہ ثواب کا بھی مستحق ہوگا۔

لما في اعلاء السنن(۱۰/۸) قلت: والحج مركب من العبادة البدنية والمالية ولذاتجرى فيه النيابة عند العذر ولا ملك للعبد فلا يقدر على تملك الزاد والراحلة فلم يكن اهلا لوجوبه، فلذا لا يجب على عبيد اهل مكة بخلاف اشتراط الزاد والراحلة في حق الفقير فانه للتيسير لا الاهلية فوجب على فقراء مكة وفقراء الافاق اذا وصلوا الى ارض الحرم بسؤال ونحوه.

وفي الشامية(۲/۴۵۳): لما كان مركبا من المال والبدن وكان واجباً في العمر مرة ومؤخرا في حديث "بني الاسلام على خمس" اخره الى ان قال: وأورد في النهر على قولهم مركب انه عبادة بدنية محضة والمال انما هو شرط في وجوده لا انه جزء مفهومه انتهى، وفيه ان كونه عبادة مركبة مما اتفقت عليه كلمتهم اصولا وفروعاً حتى اوجبوا الحج عن الميت وان فات عمل البدن لبقاء الجزء الاخر وهو المال وليس قولهم انه مركب تعريفا له لبيان ماهيته حتى يقال ان المال شرط فيه لاجزء مفهومه، بل المراد بيان ان التعبد به لا يتوصل اليه غالباً الا باعمال البدن وانفاق المال لاجله.

وفي الهندية(۱/۲۵۷): العبادات ثلاثة انواع. مالية محضة كالزكوة وصدقة الفطر وبدنية محضة كالصلاة والصوم ومركبة منهما كالحج.

(۱۴۷) سابقہ امم پر حج کی فرضیت

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے بڑے بھائی کو دینی معلوماتی کتابیں پڑھنے کا

بہت شوق ہے، وہ کبھی کبھی ہم سے بھی کوئی سوال کر لیتے ہیں۔ دو تین دن پہلے حج کے بارے میں بات ہو رہی تھی تو انہوں نے مجھ سے حج کے بارے میں ایک دو سوال پوچھ لئے، چونکہ حج کے موضوع پر مجھے بھی کچھ معلوم نہ تھا میں خاموش رہا۔ لیکن پھر خیال آیا کہ آپ کے یہاں سے مجھے اس سلسلے میں کافی رہنمائی مل سکتی ہے۔ آپ مجھے فی الحال اتنی بات بتا دیں کہ حج کب فرض ہوا۔ کیا پہلی امتوں پر بھی حج فرض تھا یا یہ صرف اس امت کی خصوصیت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ... حج راجح قول کے مطابق نو ہجری میں فرض ہوا ہے۔ نیز تتبع روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ تمام انبیاء پر حج فرض تھا جیسا کہ اکثر انبیاء کا حج کرنا ثابت بھی ہے البتہ ان انبیاء کی امتوں کے بارے میں راجح قول یہی ہے کہ ان پر حج فرض نہیں بلکہ مستحب تھا۔

لمافي مراقي الفلاح(۱/۷۹۵): واختلف هل كان في شريعة من قبلنا واجب ام لا؟ والصحيح انه لم يجب الا على هذه الامة. وفي حاشية العلامة نوح اختلف العلماء في السنة التي فرض فيها الحج والمشهور انها سنة ست وهو الصحيح وقيل سنة خمس وقيل سنة تسع وصححه القاضي عياض.

وفي الدر المختار(۲/۴۵۵): (فرض) سنة تسع وانما اخره عليه الصلاة و السلام لعشر لعذر مع علمه ببقاء حياته ليكمل التبليغ.

(۱۴۸) حج پر جانے سے پہلے دعوت کرنے کا حکم

سوال ... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل جب کوئی شخص حج پر جاتا ہے تو جانے سے پہلے اپنے عزیز و اقارب کی دعوت کرتا ہے آیا یہ دعوت کرنا شرعاً صحیح ہے یا نہیں اور اس کا ثبوت خیر القرون سے ملتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ... (۱)۔ چونکہ حج پر جانے والے کیلئے مستحب ہے کہ اگر اس پر کسی کے حقوق ہوں تو ان کو ادا کر دے، کسی کو ناراض کیا ہو تو اس کو راضی کر لے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر عزیز و اقارب کی دعوت اس لئے کرتا ہے کہ عموماً رشتہ داروں میں آپس میں تھوڑی بہت ناراضگی ہوتی ہے وہ دور ہو جائے تو یہ دعوت کرنا مستحب ہوگا بشرطیکہ اس میں ریا و نمود اور بے جا اسراف نہ ہو، لیکن اگر اس دعوت کو حج کا جزو لازمی سمجھ کر کیا جاتا ہو یا ریا و نمود کیلئے ہو تو اس سے بچنا لازم ہے۔

(۲)۔ خیر القرون سے اس کے ثبوت کی کوئی دلیل نہیں ملی۔

وفي الدر المختار(۲/۴۷۱): ويستأذن ابويه ودائنه وكفيله ويودع المسجد بركعتين ومعارفه ويستحلهم ويلتمس دعائهم.

وفي احياء العلوم(۲/۱۷): امّا الدعوة: فينبغي للداعي ان يعمد لدعوته الاتقياء دون الفساق قال ﷺ اكل طعامك الابرار في دعائه لبعض من دعاله...... وينبغي ان لايهمل اقاربه في ضيافته فان

اهـمالهم ايحاش وقطع رحم وكذلك يراعى الترتيب فى اصدقائه ومعارفه فإن فى تخصيص البعض ايحاشا لقلوب الباقين وينبغى ان لا يقصد بدعوته المباهاة والتفاخر بل استمالة قلوب الاخوان والسنن بسنة رسول الله ﷺ فى اطعام الطعام وادخال السرور على قلوب المؤمنين.

(۱۴۹) حج سے واپسی پر آبِ زمزم، کھجور، تسبیحات وغیرہ لوگوں کیلئے لانا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اکثر علاقوں میں یہ رواج ہے کہ جب کوئی شخص حج پر جاتا ہے تو جانے سے پہلے اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کی دعوت کرتا ہے اور واپسی میں آکر لوگوں کو آبِ زمزم، کھجور، تسبیحات اور دیگر اشیاء دیتا ہے۔ تو ایک شخص کا کہنا ہے کہ یہ بدعات ہیں ان کا ثبوت کہیں سے نہیں ملتا، تو اب آپ حضرات سے معلوم یہ کرنا ہے کہ ان چیزوں کا ثبوت خیر القرون سے ملتا ہے یا واقعی یہ بدعت ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: حج پر جاتے وقت اگر رشتہ داروں اور دوستوں کی دعوت اس وجہ سے کی جاتی ہے کہ ناراضگیاں ختم ہوں اور ایک دوسرے کے حقوق اگر ہوں تو لوٹائے جائیں یا معاف کرائے جائیں، تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ آبِ زمزم کا لانا اور دوسروں کو پلانا مستحب ہے۔ اسی طرح واپسی پر کھانے والی اشیاء جیسے کھجور وغیرہ، نہ کھانے والی چیزیں جیسے تسبیح وغیرہ کا اپنے عزیزوں کو دینا بھی درست ہے، حدیث میں جس طرح عام حالات میں تحائف دینے کی ترغیب آئی ہے اسی طرح سفر سے واپسی پر بھی اپنے عزیزوں کو تحفہ دینے کی ترغیب آئی ہے۔ آبِ زمزم کے لانے کا ثبوت تو حدیث سے ثابت ہے البتہ دوسری اشیاء کا ثبوت نہیں، لیکن تحائف میں یہ چیزیں بھی شامل ہیں۔ البتہ ان چیزوں کو ضروری اور دین کا حصہ سمجھا جائے تو یہ بدعت ہے۔

وفى معارف السنن(۳۲۵/۲): أخرج فيه حديث عائشه فى حمل ماء زمزم وتفرد به الترمذى من بين أرباب الامهات الست وأخرجه الحاكم وصححه. والبيهقى. والحديث هذا دل على جواز حمل ماء زمزم وانه صلى الله عليه وسلم كان يحمله، فإذن هو سنة مطلوبة، وقد اخرج الطبرى فى "القرى" عدة روايات من رواية الازرقى وأبى موسى المدينى والواقدى ما ملخصه انه ﷺ بعث الى سهيل بن عمرو يستهديه من ماء زمزم فبعث إليه براويتين، وجعل عليهما كرا غوطيا "نكرة" [illegible] تيب [illegible] وعن [illegible] كعب الاحبار كان يحمل معه [illegible] "الشام".

وفى تحفة الأحوذى(۱۲۳/۲): (قوله كان يحمله) فيه دليل على استحباب حمل ماء زمزم إلى المواضع الخارجة عن مكة.

وفى الهندية(۲۱۹/۱): (وأما آدابه) فانه اذا أراد الرجل ان يحج قالوا ينبغى أن يقضى ديونه كذا فى

الظهيرية وبشاور ذاراى فى سفره فى ذلك الوقت لافى نفس الحج فانه خير وكذا يستخير الله تعالىٰ فى ذلك وسنتهاأن يصلي ركعتين بسورة الإخلاص ويدعو بالدعاء المعروف للاستخارة عنه عليه السلام ثم يبدء بالتوبة وإخلاص النية ورد المظالم والاستحلال من خصم مدوس كل من عامله.

(۱۵۰) حجاج کرام کا دوسری جگہوں سے کھجور خرید کر یہ کہنا کہ یہ حرمین کی کھجوریں ہیں کیسا ہے؟

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض حاجی حج سے واپسی پر پاکستان میں کھجور خرید کر خالص وہی کھجور زائرین کو کھلاتے ہیں۔ اور بعض حاجی اپنی خریدی ہوئی کھجوروں کے ساتھ حرم شریف کی کچھ کھجور ملا کر زائرین کو کھلاتے ہیں۔ حالانکہ زائرین ان کو حرم شریف کی کھجوریں سمجھ کر کھاتے ہیں۔ آیا حاجیوں کیلئے اس طرح کرنا شرعاً جائز ہے؟

الجواب حامداومصلیا کھجور حاجی کرام کا حرمین شریفین سے لاکر واپسی پر لوگوں کو دینا ایک اچھا کام ہے اگر کسی آدمی کی گنجائش ہو تو اس کو دینی چاہئے لیکن اگر کسی کی گنجائش نہیں تو وہ نہ لائے شرعاً یہ کوئی لازم نہیں البتہ اگر کھجور حرمین شریفین کی اور دوسری کھجور ملا کر یہ کہتا ہے کہ یہ حرمین کی کھجور ہے یہ دھوکہ ہے اور یہ جائز نہیں البتہ اگر حرمین شریفین اور دوسری کھجور ملا کر کھلائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

لمافى الموسوعة الفقهية (۲۴/۱۵): اتفق الفقهاء على انه يجوز التزود من ماء زمزم ونقله لانه يستخلف فهو كالثمرة وليس بشيء يزول فلا يعود.

وذهب الحنفية والمالكية والشافعية إلى انه يستحب التزود من ماء زمزم وحمله إلى البلاد فانه شفاء لمن استشفى وقدروى الترمذى عن عائشة رضى الله عنها انها كانت تحمل من ماء زمزم وتخبران رسول الله ﷺ كان يحمله) وروى غير الترمذى انه ﷺ (كان يحمله وكان يصبه على المرضى ويسقيهم) وانه حنك به الحسن والحسين رضى الله عنهما وروى ابن عباس رضى الله عنهما ان رسول الله ﷺ استهدى سهيل بن عمرو من ماء زمزم وفى تاريخ الازرقى ان النبى ﷺ استعجل سهيلا فى ارسال ذالك اليه وانه بعث الى النبى ﷺ براويتين

وفى الشامية (۲/۶۲۴): ويستحب حمله الى البلاد فقد روى الترمذى عن عائشة رضى الله عنها انها كانت تحمله وتخبر ان رسول الله ﷺ كان يحمله) وفى غير الترمذى (انه كان يحمله وكان يصبه على المرضى ويسقيهم وانه حنك بالحسن والحسين رضى الله عنهما) من اللباب وشرحه.

(۱۵۱) جس کا حج قبول ہوتا ہے اس کی کنکریاں اٹھالی جاتی ہیں

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اس دفعہ جب میں حج پر گیا تو وہاں مجھے ایک بہت

پرانے دوست مل گئے۔ ہم نے حج کے افعال بھی ساتھ ساتھ ادا کیئے، جب جمرات پر کنکریاں مارنے کا وقت آیا تو میرے دوست نے ایک شیشی نکالی جس میں پانی تھا اور کنکریاں تھیں۔ میرے پوچھنے پر میرے دوست کہنے لگے کہ دراصل جس کا حج قبول ہو جاتا ہے تو اس کی کنکریاں اٹھالی جاتی ہیں۔ میں نے اس لئے انہیں اٹھا کر ماءزمزم میں رکھا ہے کہ جب میری کنکریاں اٹھالی جائیں تو وہ بالکل صاف ستھری ہوں۔ اور ماءزمزم چونکہ سب سے افضل پانی ہے اس لئے دھونے میں اس کا انتخاب کیا، مجھے ان کی بات سن کر بڑا تعجب ہوا، لیکن میں خاموش ہوگیا، اور سوچا کہ واپسی پر آپ سے اس بارے میں تحقیق کروں گا کہ آیا واقعی ایسا ہوتا ہے کہ جس کا حج قبول ہو جائے اس کی کنکریاں اٹھ جاتی ہیں؟ براہ کرم تحقیقی جواب بحوالہ مطلع فرمادیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً... روایات سے ثابت ہے کہ جس کا حج قبول ہوتا ہے اس کی کنکریاں اٹھالی جاتی ہیں اور کنکریوں کا دھونا مناسب ہے البتہ ماءزمزم سے دھونے کو ضروری سمجھنا درست نہیں کسی بھی پانی سے دھوئی جاسکتی ہیں۔

لمافي مصنف ابن ابي شيبة(۳/ ۳۸۲): عن ابي سعيد الخدريؓ قال: ما يقبل من حصي الجمار رفع.

وفي هامش الشيخ الشلبي على تبيين الحقائق(۲/ ۳۰۲): قوله في المتن(بسبع حصيات) اى ويستحب أن يغسل الحصيات قبل أن يرميها ليتيقن طهارتها فانه يقام بها قربة ولورمى بمتجنسة بيقين كره وأجزأه اهـ.

وفي الفتاوىٰ التاتارخانية(۲/ ۴۹۲): والرابع في بيان صفة المرمي به فنقول ينبغي ان تكون الحصاة مغسولة وينبغي ان تكون ماخوذة من قوارع الطريق وفي شرح الطحاوي أو من مزدلفة لامن موضع الرمي فقد جاء في الآثار أن ما بقي من الحصاة في موضع الرمي حصى من لم يقبل حجته فلا يأخذ من موضع الرمي تفاؤلاً وفي السغناقي ومع هذا لو فعل أجزأه.

(۱۵۲) حج کی قبولیت کی علامت

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں سعودی عرب میں مزدوری کرتا ہوں گاؤں میں بہت سے لوگوں سے سنا ہے کہ جن کنکریوں سے حاجی حضرات شیطان کو مارتے ہیں تو جن کا حج قبول ہوتا ہے ان کی کنکریاں غائب ہو جاتی ہیں اور جن کا حج قبول نہیں ہوتا ان کی کنکریاں غائب نہیں ہوتیں بلکہ وہاں پر جس عملہ کی ڈیوٹی ہوتی ہے وہ ان کنکریوں کو اٹھا کر پھینک دیتے ہیں حالانکہ میں نے خود دیکھا ہے کہ بڑی بڑی گاڑیوں کے ذریعہ سے وہ ان کنکریوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتے ہیں۔ آیا واقعی یہ بات درست ہے۔(۱) کہ جن حضرات کا حج قبول ہوتا ہے ان کی کنکریاں غائب ہو جاتی ہیں اور جن کا حج قبول نہیں ہوتا ان کی کنکریاں غائب نہیں ہوتیں؟

(۲)۔اور گاڑیوں میں جن لوگوں کی کنکریاں منتقل ہوتی ہیں ان کا حج قبول نہیں ہوتا؟

الجواب حامداً ومصلیاً احادیث مبارکہ سے یہ بات ثابت ہے کہ جن حضرات کا حج قبول ہوتا ہے ان کی کنکریاں من جانب اللہ غائب ہو جاتی ہیں اور جن کا حج قبول نہیں ہوتا ان کی کنکریاں وہیں پڑی رہتی ہیں۔ اور اس بات کو فقہاء کرام نے بھی ذکر کیا ہے۔

لمافی المستدرک علی الصحیحین (۱/۶۵۰): اخبرنی یحیی بن منصور القاضی عن عمرو بن مرة، عن عبدالرحمن ابن ابی سعید الخدری عن ابیه ابی سعیدؓ قال: قلنا یا رسول الله هذه الاحجار التی ترمی بها تحمل فتحسب انها تنقعر قال: ((انه ما یقبل منها یرفع ولولا ذالک لرأیتها مثل الجبال)) هذا حدیث صحیح الاسناد ولم یخرجاه، یزید بن سنان لیس بالمتروک.

وفی الدرالمختار (۲/۵۱۵): (ویکره) اخذها (من عند الجمرة) لانها مردودة لحدیث ((من قبلت حجته رفعت جمرته)) الخ.

وفی الشامیة (۲/۵۱۵): (قوله لحدیث الخ) ای مارواه الدار قطنی والحاکم وصححه عن ابی سعید الخدری رضی الله عنه قال: قلت یا رسول الله هذه الجمار التی نرمی بها کل عام فنحسب انها تنقص فقال ((ان ما یقبل منها رفع ولو لا ذالک لرأیتها امثال الجبال)) .... وفی الفتح عن سعید بن جبیر: قلت لابن عباس ما بال الجمار ترمی من وقت الخلیل علیه السلام ولم تصر هضاباً ای تلالاتسد الافق؟ فقال اما علمت ان من یقبل حجه یرفع حصاه............ الخ.

(۱۵۳) مکہ مکرمہ میں طواف افضل ہے یا عمرہ؟

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک ملازمت پیشہ آدمی ہوں، میں نے اپنی کمائی میں سے پیسہ بچا بچا کر اتنی رقم جمع کر لی ہے کہ اب میں با آسانی حج وعمرہ کی سعادت حاصل کر سکتا ہوں، میرا ارادہ ہے کہ جلد وہاں پہنچ کر پہلے خوب عمرے کرلوں، میرے ایک پڑوسی ہیں انہیں دینی معلومات بہت زیادہ ہیں ان کو جب میرے اس ارادے کا پتا چلا تو وہ مجھ سے کہنے لگے آپ وہاں بجائے عمرے خوب کرنے کے طواف زیادہ کیجئے گا، آپ کیلئے یہ زیادہ افضل ہے۔ میرے دل میں آیا کیوں نہ آپ سے بھی اس بارے میں مشورہ کرلوں، براہ کرم آپ بتائیں مجھے کیا کرنا چاہئے؟

الجواب حامداً ومصلیاً حضرات فقہاء کرام نے کتابوں میں اس بات کی صراحت فرمائی ہے کہ نماز، طواف سے افضل ہے اور جہاں تک طواف کا عمرہ سے افضل ہونے کا تعلق ہے دیگر کتابوں میں اس کی صراحت نظر سے نہیں گزری۔ البتہ علامہ شامی رحمہ اللہ نے افضلیت طواف کی طرف اشارہ فرمایا ہے لیکن اس میں اس بات کی قید ملحوظ ہے کہ وہ سارا وقت جو عمرہ کی ادائیگی میں صرف ہوتا ہے اسے طواف کی ادائیگی میں صرف کیا جائے۔ نہ یہ کہ صرف ایک طواف، عمرہ سے افضل ہے۔

لمافی الشامیة (۲/۵۰۲): فی شرح المرشدی علی الکنز قولهم ان الصلوة افضل من الطواف لیس

مراده ان صلوة ركعتين مثلا افضل من اداء سبوع لان الاسبوع مشتمل على ركعتين مع زيادة بل مراده به ان الوقت الذي يؤدي فيه اسبوعا هل الافضل فيه ان يصرفه الى الطواف ام يشغله بالصلوة ونظيره ما اجاب به العلامة القاضي ابراهيم بن ظهيرة المكي حيث سئل هل الافضل الطواف او العمرة من أن الأرجح تفضيل الطواف على العمرة اذا شغل به مقدار زمن العمرة الا اذا قيل انها لا تقع الافرض كفاية فلا يكون الحكم كذلك.

(۱۵۴) حج کی درخواستوں پر قرعہ اندازی کرنا جوئے کی تعریف میں داخل نہیں

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے کئی لوگوں سے سنا ہے کہ قرعہ اندازی جوا ہے، اور جوا اسلام میں حرام ہے۔ لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ حج کی درخواستوں کی بھی تو قرعہ اندازی ہوتی ہے، کیا یہ بھی جوا ہے؟ اور کیا ہم اس حرام کا ارتکاب کرکے حج کو جائیں گے؟ براہ کرم اس مسئلے پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالیں، تاکہ لوگ اس حرام کام سے بچیں۔ نیز جوئے کی کوئی واضح تعریف بھی فرمادیجئے گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کے علم وعمل میں برکت عطا فرمائے۔

الجواب حامداً ومصلیاً قرعہ اندازی اثبات حق کیلئے تو جائز نہیں ہے لیکن تعیین حق کیلئے جائز ہے۔ لہٰذا مطلقاً قرعہ اندازی کو جوا کہہ کر حرام بنا درست نہیں ہے۔ مسئلہ بالا میں اگر تمام حاجیوں کی جمع شدہ رقم برابر ہو، اور جس کا قرعہ نہ نکلے اس کو جمع شدہ رقم بھی واپس کردی جاتی ہو، اور اس قرعہ اندازی میں اور کوئی شرعی ممنوعات کا ارتکاب نہ کیا جاتا ہو، تو ان درخواستوں پر قرعہ اندازی کرنا جائز ہے۔ باقی جوا اس کو کہتے ہیں کہ کسی کام یا بات کے ہونے یا نہ ہونے پر مال کی شرط اس طور پر لگائی جائے کہ وہ مال دوسرے مال کو بھی لے آئے یا پورا کا پورا خود بھی ڈوب جائے۔

لما في الهندية(۵/۲۱۷): ذكر الناطفي ان القرعة ثلاث، الاولى لاثبات حق البعض وابطال حق البعض وانها باطلة كمن اعتق احد عبديه بغير عينه ثم يقرع والثانية لطيبة النفس وانها جائزة كالقرعة بين النساء للسفر والقرعة بين النساء في البداية للقسم، والثالثة لاثبات حق واحد في مقابلة مثله فيفرزبها حق كل واحد منهما وهو جائز كذا في فتاوى قاضيخان.

وفي احكام القرآن(۲/۴۶۵): واما الميسر فقدروى عن على انه قال الشطرنج من الميسر وقال قوم من اهل العلم القمار كله من الميسر. واصله من تيسر امر الجزور بالاجتماع على القمار فيه وهو السهام التي يجيلونها فمن خرج سهمه استحق منه ماتوجبه علامة السهم فربما اخفق بعضهم حتى لا يحظى بشيء وينجح البعض فيحظى بالسهم الوافر وحقيقته تمليك المال على المخاطرة

وفي معالم السنن شرح سنن ابي داؤد (۲۲۱/۲، الجزء ۲): عن معنى القمار الذي انما هو مواضعة بين اثنين على مال يدور بينهما في الشقين فيكون كل واحد منهما اما غانماً أو غارما

(۱۵۵) بیت اللہ شریف پر جب پہلی مرتبہ نظر پڑے تو دعا کرنا چاہئے

سوال　کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے سنا ہے کہ بیت اللہ پر پہلی نگاہ کی دعا قبول ہوتی ہے کیا واقعی یہ بات کسی حدیث سے ثابت ہے؟ نیز بیت اللہ کو دیکھنا بھی عبادت شمار ہوگا؟ اور اس بارے میں بھی کوئی حدیث آئی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً　احادیث مبارکہ سے ثابت ہے کہ بیت اللہ شریف پر پہلی مرتبہ نگاہ پڑے تو دعا کرنا چاہئے کیونکہ اس وقت دعا قبول ہوتی ہے۔ نیز روایات سے یہ بھی ثابت ہے کہ بیت اللہ شریف کو دیکھنا بھی عبادت ہے۔

لمافي المصنف لابن ابي شيبة (۳/۲۲۴، رقم ۱۴۷۵۷): حدثنا　عن ليث عن طاؤس قال النظر الى البيت عبادة والطواف بالبيت صلاة.

(۱۴۷۵۸) حدثنا ...عن مجاهد قال النظر الى البيت عبادة.

(۱۴۷۵۹) حدثنا... عن عطاء قال النظر الى البيت عبادة.

(۱۴۷۶۰) حدثنا　عن عبدالرحمن بن الأسود قال النظر الى البيت عبادة.

وفي الشامية (۲/۴۹۲): (تحت قوله لئلا يقع نوع شرك)　قال في البحر ولم يذكر في المتون الدعاء عند مشاهدة البيت وهي غفلة عما لا يغفل عنه فإنه عندها مستجاب الخ.

وفي الفقه الاسلامي وادلته (۳/۲۳۸۷): ويستحب اذا وقع بصره على البيت أن يرفع يديه فقد جاء انه يستجاب دعاء المسلم عند رؤية الكعبة ويقول اللهم زدهذا البيت تشريفا الخ.

(۱۵۶) حج میں نفل کی نیت سے نفل ہونے اور صوم رمضان میں نفل کی نیت کے باوجود بھی فرض ادا ہونے کی وجہ

سوال　کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں روزے سے متعلق ایک کتاب کا مطالعہ کررہا تھا، میں نے درس نظامی سے آٹھ سے پانچ سال تک ... ایک مسئلہ دیکھتے ہوئے ایک سوال ذہن میں آیا، مجھے اس کا جواب نہیں ملا اس لئے ... آپ کو یہ مسئلہ تحریری صورت میں بھیج رہا ہوں، خود حاضر خدمت نہ ہونے پر معذرت قبول فرمائیں۔ سوال ... یہ مسئلہ لکھا ہے کہ مسافر ومریض اگر رمضان کا فرض

روزہ چھوڑ کر نفل رکھنا چاہیں تو کچھ بھی نیت کرنے کے باوجود ان کا روزہ نفل ادا نہیں ہوگا بلکہ فرض ہی ادا ہوگا۔ البتہ حج کے مسائل میں لکھا ہے کہ اگر کوئی فقیر آدمی مکہ پہنچ جائے اور نفل کی نیت سے حج کرتا ہے تو اس کا نفل حج ہوگا فرض ادا نہ ہوگا۔ آخر ان دونوں میں کیا فرق ہے؟ روزے میں نفل کی نیت کرنے کے باوجود فرض ادا ہوتا ہے اور حج میں نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ آپ کے علم وعمل میں خوب برکتیں عطا فرمائے۔

الجواب حامداً ومصلیاً روزے کیلئے وقت معیار ہے اور یہ شارع کی جانب سے متعین ہے اس لئے روزے میں نیت صرف اس لئے ہے تاکہ عادت اور عبادت میں فرق ہو جائے پس جب مطلق روزے کی نیت کی مسافر نے یا مریض نے یا دونوں نے رمضان میں نفل روزے کی نیت کی تو دونوں صورتوں میں فرض روزہ ہی ادا ہوگا کیونکہ یہ وقت متعین ہی فرض روزے کیلئے ہے۔ بخلاف حج کے کہ حج میں وقت حج کیلئے من وجہ معیار ہے اور من وجہ ظرف ہے من وجہ معیار ہونے کی وجہ سے روزے کے مشابہ ہے اور من وجہ ظرف ہونے کے اعتبار سے نماز کے مشابہ ہے، نیز مطلق نیت سے جب حج ادا کرے گا تو حج فرض ہی ادا ہوگا جیسے رمضان میں مطلق روزے کی نیت سے فرض روزہ ہی ادا ہوگا، حج میں جو مطلق نیت کی وجہ سے جو حج فرض ادا ہو رہا ہے اس کی وجہ دلالت حال ہے کہ اتنی مشقتیں برداشت کر رہا ہے لیکن اس دلالت حال کا اعتبار بھی تب ہوگا جب کوئی صراحت اس کے مخالف نہ ہو جیسے نفل کی نیت کی تو حج نفل ہی ادا ہوگا کیونکہ حج کا وقت من وجہ ظرف بھی ہے جیسے نماز، اب کوئی شخص نماز نفل ادا کرے تو اس سے نفل ہی ادا ہوگا کیونکہ وقت ظرف ہے نماز کیلئے فرض نفل دونوں ادا کر سکتے ہے، اسی طرح حج میں کہ جب اس نے نفل کی نیت کی تو نفل کی نیت کی وجہ سے حج نفل ہی ادا ہوگا فرض ادا نہ ہوگا۔

لـمـا فـي الـعـنـاية عـلى هامش فتح القدير (۲/۳۱۰): فانهما قالا: اذا نوى المريض عن واجب آخر فـالصحيح انه يقع صومه عن رمضان وعن ابى حنيفة فى نية التطوع من المسافر روايتان فى رواية ابن سماعة: يقع عن الفرض.

وفـي فـتـح الـقـديـر (۲/۳۳۷): والـمـذهـب انه يسقط الفرض باطلاق نية الحج بخلاف تعيين النية لـلـنفل. فإنه يكون نفلاً وإن كان لم يحج الفرض بعد.. لان رمضان حكمه تعيين المشروع فيـه فيـحتـاج بـعـد هـذا الـى مـطـلـق نية الـصـوم لتـمـيز العبادة عن العادة فاذا وجدت انصرف إلى الـمـشـروع فى الوقت بخلاف وقت الحج لم يتمحض للحج كوقت الصوم لما عرف بل يشبهه من وجه دون وجه فللمشابهة جاز عن الفرض بالاطلاق ولأنه الظاهر من حال الـمـسـلم خصوصا فى مثل هـذه الـعـادة الـمـشـق تـحـصـيلها والمطلق يحتمل كلاً من الخصوصيات فصرفناه إلى بعض محتملاته بـدلالة الـحـال ولـلـمـفارقة لم يجز عن الفرض بتعين النفل، وايضاً فالدلالة تعتبر عند عدم معارضة الـصـريـح، والـمـعـارضـة ثابتة حيث صرح بالضد وهو النفل بخلاف صورة الاطلاق اذلا منافاة بين الأخص والأعم.

وفـي الهـنـدية (۱/۱۹۶): اذا صـام الـمـسـافر بـنـية واجب اخر يقع عنه ولونوى النفل ففيه روايتان

كـذا فـي الـكـافـي والاصـح انـه يـقـع عن رمضـان . ....واما المريض فالصحيح ان صومه يقع عن رمضان. ....

وايضاً (صـ۲۲۳) وإذا أحرم بحجة وعليه حجه الاسلام ولم ينوفرضا ولا تطوعاً فهي عن حجة الاسلام تتأدى بمطلق النية (....) ولو احرم نذراً او نفلا كان نفلاً او نوى فرضا وتطوعاً كان تطوعاً عنده وكذا عند ابي يوسفؒ في الاصح كذا في فتح القدير.

وفي الشامية(۲/۳۷۸):(تحت قوله على ما عليه الأكثر بحر) اما في حق المسافر فان نوى واجبا اخر يقع عنه عند الاماموان نوى النفل او أطلق ففيه روايتان اصحهما وقوعه عن رمضان . .... وينبغي وقوعه من المريض عن رمضان في النفل على الصحيح كالمسافر اهـ.

وحاصله ان المسافر والمريض لونويا واجباً اخر وقع عنه ولو نويا نفلاً او اطلقا فعن رمضان......

(قوله وقوع الكل عن رمضان الخ) المراد بالكل هو ما اذا نوى المريض النفل أو اطلق أو نوى واجبا اخر وما اذا نوى المسافر كذلك الا اذا نوى واجبا اخر فانه يقع عنه لا عن رمضان لان المسافر له ان يصوم فله ان يصرفه الى واجب اخر لان الرخصة متعلقة بمظنة العجز وهو السفر وذلك موجود بخلاف المريض فانها متعلقة بحقيقة العجز فاذا صام تبين انه غيرعاجز...... بان المرخص هو المرض الذى يزداد بالصوم لاالمرض الذى لايقدر به على الصوم فلا نسلم انه اذا صام ظهر فوات شرط الرخصة.

(۱۵۷) حاجی صاحبان کا بینک کے ذریعے قربانی کروانا اوران کی ٹائمنگ پر اعتماد کرنا

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عام طور پر حاجی صاحبان بینکوں کے ذریعے قربانی کرواتے ہیں، آیا بینکوں کے ذریعے قربانی کروانا اوران کی ٹائمنگ پر اعتماد کرنا، ازروئے شرع درست ہے؟ اس میں کوئی قباحت تو نہیں ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ...بینکوں کے اندر چونکہ سودی لین دین ہوتا ہے اسلئے حتی الامکان ان سے بچنے کی کوشش کرنی چاہئے کیونکہ شریعت میں ربا اور ریبۃ دونوں سے بچنا مقصود ہے اگر کوئی متبادل ہوتو اس کو اختیار کرنا چاہئے مثلاً افضل تو یہی ہے کہ خود اپنے ہاتھ سے قربانی کرے یا کسی کا کوئی عزیز واقارب وہاں ہوتو اس کے ذریعے سے کروالے ورنہ بحالت مجبوری کہ وہ خود اپنے ہاتھ سے بھی نہ کرسکے اور کوئی عزیز واقارب بھی وہاں نہ ہو، اوراس کو آسانی بھی بینک کے ذریعے سے کروانے میں ہوتو بینک کے ذریعے سے قربانی کروائی جاسکتی ہے جہاں تک بات رہی ان کی ٹائمنگ کی تو موجودہ دور میں ایسی سہولیات موجود ہیں کہ آپ ان سے تحقیق کرکے کہ آیا آپ کا جانور ذبح ہوا یا

نہیں اس کے بعد آپ حلال ہوں بالفرض اگر کچھ تاخیر ہوئی تو احناف کا مذہب یہ ہے کہ عذر کی بنا پر ترک واجب سے دم واجب نہیں آتا اور صاحبین کا مذہب بھی ہے کہ تقدیم وتاخیر واجب نہیں اس لئے گنجائش ہے کہ دم نہ آئے دفع حرج اور ضرورت کی بنا پر مگر احتیاط اسی میں ہے کہ جو ٹائم دیا ہے اس پر معلومات کر کے اس کے کچھ دیر بعد حلال ہوا جائے تا کہ شبہ کا امکان باقی نہ رہے۔

لما فی الهندية(۱/۲۵۵): فهو ان يبعث بالهدى او بثمنه ليشترى به هديا...... ويجب ان يواعد يوما معلوما يذبح عنه فيحل بعد الذبح ولا يحل قبله حتى لو فعل شيئا من المحظورات الاحرام قبل ذبح الهدى يجب عليه ما يجب على المحرم اذا لم يكن محصرا...... ان حل فى يوم وعده على ظن انه ذبح هديه عنه فى ذلك اليوم ثم علم انه لم يذبحه كان محرما..............

وفى الشامية(۲/۵۹۲، ۵۹۱):(قوله وعين يوم الذبح) لابد ايضا من تعيين وقته من ذلك اليوم اذا اراد التحلل فيه لئلا يقع قبل الذبح فاذا عين وقت الزوال مثلاً يتحلل بعده، والا احتمل ان يكون الذبح وقت العصر والتحلل قبله ..... وفى الدرالمختار(صـ۵۹۲) (قوله ويذبح يحل) ......هذا فائدة التعيين، فلو ظن ذبحه ففعل كالحلال فظهر انه لم يذبح...... لزمه جزاء ماجنى.

وفى الدرالمختار (۲/۶۱۲):(ويتعين يوم النحر) اى وقته وهو الايام الثلاثة (لذبح المتعة والقران) فقط فلم يجز قبله بل بعده وعليه دم (الشامية) (قوله بل بعده) اى بل يجزئه بعده اى بعد يوم النحر اى ايامه الا أنه تارك للواجب عند الامام فليزمه دم للتاخير اما عندهما فعدم التاخير سنة حتى لو ذبح بعد التحلل بالحلق لاشئ عليه.

وفى بدائع الصنائع(صـ۱۴۷، ۱۴۸): فان حلق قبل الذبح من غير احصار فعليه لحلقه قبل الذبح دم فى قول ابى حنيفة وقال ابو يوسف ومحمد وجماعة من اهل العلم رحمهم الله انه لا شئ عليه.

(۱۵۸) صاحب استطاعت حاجی کیلئے سفر حج میں قربانی کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جو حاجی حج پر جاتے ہیں اور وہاں حج کی ادائیگی کرتے ہیں اور قربانی بھی کرتے ہیں تو کیا جب وہاں قربانی کرلی تو کیا ان کی ادا ہوگئی یا ان کو اپنے آبائی وطن میں بھی قربانی کرنی لازم ہوگی۔ یعنی حج میں جو کی جاتی ہے تو وہ حج کی شمار ہوگی یا دونوں حج اور اضحیہ کی شمار ہوگی اور اگر صرف حج کی شمار ہوگی تو پھر اپنے علاقہ میں صاحب استطاعت آدمی کو کرنا ضروری ہوگی یا نہیں اس کا جواب جلدی دیں کیونکہ میرے بڑے بھائی حج پر جانے والے ہیں۔ شکریہ

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر کوئی شخص حج افراد کی نیت سے حج پر جاتا ہے تو اس پر جانور کا ذبح کرنا واجب نہیں ہے۔ اگر حج قران یا تمتع کی نیت سے جاتا ہے تو اس پر جانور کا ذبح کرنا واجب ہے۔ اگر حاجی کسی جگہ پندرہ دن یا اس سے زائد ٹھہرنے کی نیت کرے اور وہ صاحب

نصاب جتنی ہوتو اس پر قربانی کرنا واجب ہوگا چاہے وہاں خود کرے یا علاقے میں کسی سے کروائے۔

لمافی التاتارخانیة (۲/۴۶۴،۴۶۵): ان کان مفرداً بالحج یحلق او یقصر ولم یذکر الذبح بعد هذا الرمی قبل الحلق لانه مفرد فلا یلزمه الذبح ولا اضحیة علیه لانه مسافر، وان کان قارنا او متمتعا یذبح الخ.

وفی الهندیة (۱/۲۳۱): ثم یرجع الی منی فان کان معه نسک ذبحه وان لم یکن فلا یضره لانه مفرد بالحج ولو کان قارنا او متمتعا فلا بدله من الذبح.

وفی الهندیة (۱/۱۳۹): ولا یزال علی حکم السفر حتی ینوی الاقامة فی بلدة او قریة خمسة عشر یوماً او اکثر کذا فی الهدایة.

وفی الدرالمختار (۲/۵۱۵): (ذبح ان شاء) لانه مفرد وقال الشامی تحته: (قوله لانه مفرد) تعلیل لما استفید من التخییر بقوله ان شاء والذبح له افضل ویجب علی القارن والمتمتع ط، واما الأضحیة فان کان مسافراً فلا یجب علیه وإلا کالمکی فتجب کما فی البحر.

(۱۵۹) مسجد نبوی میں چالیس نمازیں ادا کرنے پر بشارت اور خواتین کیلئے اس کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عام طور پر دیکھا یہ جاتا ہے کہ لوگ مدینہ منورہ جا کر مسجد نبوی میں چالیس نمازوں کا اہتمام کرتے ہیں، اور حج گروپ وغیرہ میں باقاعدہ اس میعاد کا ذکر بطور خصوصیات کے کیا جاتا ہے۔ کیا قرآن وحدیث سے اس کا کوئی ثبوت ملتا ہے؟ اور لوگوں کا اس کا اہتمام کرنا شرعاً کیسا ہے؟ نیز کیا خواتین کیلئے بھی یہ چالیس نمازوں کا حکم ہے؟ حالانکہ انہیں تو گھروں پر نماز پڑھنے کی تاکید آئی ہے۔

الجواب حامداًومصلیاً مسجد نبوی میں چالیس نمازیں ادا کرنے پر مسند احمد (۳/۱۲۸)، جمع الفوائد (۱/۵۳۳)، المعجم الأوسط للحافظ الطبرانی (۶/۲۱۱) وغیرہ میں جہنم، عذاب اور نفاق سے براءت کی بشارت ہے۔ لہٰذا اس کا اہتمام شرعاً درست اور باعث ثواب ہے۔ البتہ خواتین کیلئے چونکہ دوسری احادیث مبارکہ میں گھر میں نماز پڑھنے کی تاکید آئی ہے لہٰذا ان کیلئے افضل یہ ہے کہ یہ نمازیں اپنے گھروں میں ادا کریں۔

لمافی مسند الامام احمد بن حنبلؒ (۳/۱۲۸): ......حدثنا عن انس ابن مالکؓ عن النبی ﷺ انه قال: ((من صلّی فی مسجدی اربعین صلاة لا یفوته صلاة، کتبت له براءة من النار، ونجاة من العذاب، وبریٔ من النفاق))

وفی جمع الفوائد (۱/۵۳۳): عن أنس رضی الله عنه رفعه من صلّی فی مسجدی اربعین صلوة لا

تفوته صلاة كتب له براء ة من النار وبراء ة من العذاب وبراء ة من النفاق، لأحمد والأوسط.

المعجم الأوسط للحافظ الطبراني(۶/۲۱۱): عن أنس بن مالک قال: قال رسول الله ﷺ: ((من صلّى في مسجدي أربعين صلاة لا يفوته صلاة كتب الله له براء ة من النار ونجاة من العذاب.

وفي اعلاء السنن(۴/۲۶۱): عن أم سلمة رضي الله عنها قالت: قال رسول الله ﷺ: صلاة المرأة في بيتها خير من صلاتها في حجرتها، وصلاتها في حجرتها خير من صلاتها في دارها، وصلاتها في دارها خير من صلاتها في مسجد قومها الخ. وفي (صـ۲۶۲) وأما أن تأتي المسجد الحرام أو المسجد النبوي لأجل الصلاة فحسب فينا فيه قوله ﷺ:(صلاتك في بيتک خير من صلاتک في حجرتک)) الى ان قال: ((ومن صلاتک في مسجدي)) والله تعالىٰ اعلم.

(۱۶۰) عورت کا حرم میں مردوں کے محاذاۃ اور عدم محاذاۃ میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اس دفعہ میری اہلیہ بھی میرے ساتھ سفر حج پر جارہی ہیں، ان کی شدید خواہش ہے کہ وہ حرم میں نماز پڑھیں، میں نے ایک عالم صاحب سے مسئلہ معلوم کیا تو انہوں نے بتایا کہ خواتین کو حرم میں جا کر نمازیں نہیں پڑھنا چاہیے بلکہ جہاں ان کی رہائش ہے وہاں پر ہی تمام نمازیں پڑھا کریں۔ اور خواتین اگر مردوں سے لگ کر نمازیں پڑھیں تو نماز فاسد ہوجائے گی لیکن میں نے حرم میں بے شمار خواتین کو دیکھا جو مردوں کی صف میں کھڑی ہیں۔ کیا ان کی نماز سے مردوں کی نماز فاسد ہوجائے گی؟ اور کیا خواتین کیلئے حرم میں نماز پڑھنے کی کسی صورت میں بھی اجازت نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً عورت کیلئے بہتر یہی ہے کہ تنہائی میں بغیر جماعت کے نماز ادا کرے لیکن اگر کوئی عورت جماعت کی نماز میں شریک ہوجائے اور امام اس کی امامت کی نیت کرلے تو نماز ادا ہوجائے گی۔ البتہ اگر مردوں کی صف میں کھڑی ہوگی تو اس صورت میں ان تین مردوں کی نماز فاسد ہوگی جو اس کے دائیں بائیں اور پیچھے کھڑے ہیں۔ اور اگر اکیلی یا عورتوں کی صف میں کھڑی ہوگی یا امام نے اس کی امامت کی نیت نہ کی تو ان صورتوں میں کسی مرد کی نماز فاسد نہ ہوگی۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں عورت کیلئے بہتر یہی ہے کہ جہاں رہائش ہے وہیں نماز پڑھ کر طواف کیلئے حرم میں آئے اور اگر نماز کیلئے بھی حرم میں آتی ہے تو پھر اگر امام نے اس کی امامت کی نیت کی ہو، تو ان تین افراد کی نماز فاسد ہوگی جو اس کے دائیں بائیں اور پیچھے کھڑے ہیں۔ البتہ اگر اکیلی یا عورتوں کی صف میں کھڑی ہے یا امام نے اس کی امامت کی نیت نہ کی ہو تو ان صورتوں میں مردوں کی نماز فاسد نہ ہوگی۔ البتہ امام نے اس کی امامت کی نیت نہ کی ہو تو عورت کی نماز نہ ہوگی۔ نیز اگر عورت طواف کی نیت سے حرم میں یا روضہ اقدس پر حاضری کی نیت سے مسجد نبوی میں داخل ہوجائے اور اسی دوران جماعت کی نماز میں شرکت کرلے۔ تو عورت کی نماز بلا کراہت ادا ہوجائے گی۔

لمافی اعلاء السنن(۴/۲۴۳): وعنه: قال "ماصلت امرأة (فی مصلی) خیرلها من قعر بیتها الا ان یکون المسجد الحرام او مسجد النبی ﷺ الا امرأة تخرج فی منقلیها یعنی خفیها."(رواه الطبرانی فی الکبیر، ورجاله رجال الصحیح(مجمع الزوائد، ۱/۱۵۵)

قوله "وعنه" الخ قلت: فیه دلالة علی جواز خروج النساء مطلقا سواء کن شواب او عجائز للصلاة فی مسجد الحرام او مسجد النبی ﷺ وعلیه عمل اهل الحرمین الیوم ولکن ینبغی تقییده بوقت الضرورة، کما اذا حضرت المسجد للطواف فی الحج والعمرة، فلا بأس لها بان تصلی فیه وحدها او جماعة او حضرت المسجد النبوی للتسلیم والصلاة علی النبی ﷺ فلا بأس لصلاتها فی المسجد تحیة او مکتوبة واما ان تأتی المسجد الحرام او المسجد النبوی لاجل الصلاة فحسب فینا فیه قوله ﷺ "صلاتک فی بیتک خیر من صلاتک فی حجرتک" الی ان قال "ومن صلاتک فی مسجدی". والله تعالیٰ اعلم

وفی الشامیة(۱/۵۷۵): (قوله فسدت صلاته) جواب قوله و اذا حاذته ای فسدت صلاته دونها ان لم یکن اماما نهر فلو کان اماما فسدت صلاة الجمیع......

ونیة الامام امامة النساء تعتبر وقت الشروع لابعده اھ وظاهره ان ذالک شرط فی صحة اقتدائهن، فلو نوی امامة المرأة بعد شروعه لم یصح اقتداء ها فلا تفسد صلاة من حاذته تأمل.

وفی الشامیة(۱/۵۷۶): لو اقتدت غیر محاذیة لاحد صح اقتداؤها وان لم ینوها الا اذا نفی امامة النساء، کمافی القهستانی وحینئذ فلا یشترط لصحة اقتداء المرأة نیة الامام امامتها الا اذا کانت محاذیة والا فلا یشترط.

(۱۶۱) کیا حج اور عمرہ میں خریداری کرنے سے ثواب میں کمی واقع ہوگی؟

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عام رواج یہ ہوگیا ہے کہ اب لوگ حج وعمرہ کرنے جاتے ہیں اور وہاں جاکر بازاروں اور مارکیٹوں میں خوب خریداری کرتے ہیں۔ایسا لگتا ہے وہ یہاں اسی غرض سے آئے ہیں اور بعض لوگ تو اللہ معاف کرے آلات معصیت ٹی وی وغیرہ بھی خرید کر ساتھ لاتے ہیں۔آیا حج وعمرہ کی نیت سے جاکر وہاں اس طرح بازاروں میں جانا شرعاً درست ہے؟ نیز وہاں جاکر اگر خریداری کی جائے تو اس سے حج وعمرہ کے ثواب پر کچھ اثر پڑے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... جو لوگ اصلاً حج اور عمرہ کرنے کیلئے جاتے ہیں اور ان کی نیت حج، اور عمرہ کرنے کی ہوتی ہے اور وہاں جاکر اگر کچھ خریداری کرلیں تو یہ شرعاً درست ہے۔اس سے حج اور عمرہ کے ثواب میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔تاہم خریداری وغیرہ دوسرے کاموں میں

اس قدر منہمک ہونا کہ ایسا معلوم ہو کہ یہ سفر اسی غرض سے ہوا ہے درست نہیں۔ نیز آلات معصیت ''ٹی وی'' وغیرہ کی خریداری کرنا عام حالات میں بھی جائز نہیں ہے اوران مقامات مقدسہ پر جا کر تو ان لغویات اور معصیت وغیرہ آلات کی خریداری کرنے کی شناعت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ لہٰذا اس سے اجتناب ضروری ہے۔

لما فی احکام القرآن لابن العربی(۱/۱۹۲): قال علماؤنا: فی هذا دلیل علی جواز التجارة فی الحج للحاج مع اداء العبادة وان القصد الی ذلک لا یکون شرکاً، ولا یخرج به المکلف عن رسم الاخلاص المفترض علیه.

وفی تکمله فتح الملهم(۴/۱۶۴): أما التلفزیون والفدیو فلا شک فی حرمة استعمالهما بالنظر الی مایشتملان علیه من المنکرات الکثیرة. من الخلاعة والمجون، والکشف عن النساء المتبرجات او العاریات وما الی ذالک من اسباب الفسوق.

وفی الاشباه والنظائر(صـ۹۳): وصرحو فی کتاب السیر بان السوقی لاسهم له لانه عند المجاوزة لم یقصد الا التجارة لا اعزاز الدین وارهاب العدو، فان قاتل استحق لانه ظهر بالمقاتلة انه قصد القتال، والتجارة تبع فلا تضره کالحاج اذا اتجر فی طریق الحاج. لاینقص اجره. وظاهره ان الحاج اذا خرج تاجرا فلا اجر له.

وفی الشامیة(۶/۳۹۱): (بخلاف بیع الامرد ممن یلوط به وبیع سلاح من اهل الفتنة)..... ان ما قامت المعصیة بعینه یکره بیعه تحریما والافتنزیهاً فلیحفظ توفیقاً.

وفی فتاوی اللجنة(۱/۲۶۷): واما التلیفزیون فآلة لا یتعلق بها فی نفسها حکم وانما یتعلق الحکم باستعمالها، فان استعملت فی محرم کالغناء الماجن واظهار صور فاتنة وتهریج وکذب وافتراء والحاد وقلب للحقائق واثارة للفتن الی امثال ذلک فذلک حرام، وان استعمل فی الخیر کقراءة القران وابانة الحق والامر بالمعروف والنهی عن المنکر والی امثال ذلک فذلک جائز، وان استعمال فیهما فالحکم التحریم ان تساوی الامران اوغلب جانب الشرفیه.

(۱۶۲) حجاج کرام کیلئے مفت تقسیم ہونے والی اشیاء کے استعمال کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ گزشتہ دفعہ جب میں حج کیلئے گیا تھا اور ابھی اس سال جب رمضان میں عمرہ کرکے آیا تو ایک بات ذہن میں آئی کہ آپ سے بھی پوچھ لوں وہ یہ کہ وہاں پر حاجیوں وغیرہ کیلئے مختلف کاریوں میں لوگ اشیائے خوردونوش لاتے ہیں اور مفت تقسیم کرتے ہیں۔ اب ہمیں نہیں معلوم کہ یہ کون ہوتے ہیں اوران کی کمائی کی کیا حیثیت

ہے آیا اس صورت میں بھی ہمارا اس مال سے کھانا درست ہے۔ اور ان لوگوں کی دی ہوئی چیزوں کو استعمال کرنے میں کوئی حرج تو نہیں ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اشیاء کے اندر اصل اباحت اور حلت ہے۔ جب تک کسی چیز کی حرمت کے بارے میں یقین یا ظن غالب نہیں ہے تو وہ حلال ہے۔ محض شبہات، خیالات اور عدم علم کی وجہ سے کوئی چیز حرام نہیں ہوگی۔ صورت مسئولہ میں چونکہ آپ کو یقینی طور پر علم نہیں ہے کہ ان لوگوں کی کمائی حرام ہے لہٰذا ان کی تقسیم شدہ اشیاء خورد ونوش کا کھانا پینا حلال اور جائز ہے۔

لما في المحيط البرهاني(۸/۸۳): "وحاصل المذهب فيه انه ان كان اكثر ماله من الرشوة والحرام لم يحل قبول الجائزة منه مالم يعلم ان ذالك من وجه حلال، وان كان صاحب تجارة وزرع واكثر ماله من ذالك، فلا بأس بقبول الجائزة منه مالم يعلم ان ذالك له من وجه حرام، وفي قبول رسول الله ﷺ الهدية من بعض المشركين دليل على ما قلنا."

وفي قاضي (۳،۴/۳۶۳): "الا ان الرجل اذا لم يعلم أنّ الذى قدم اليه من الغصب بعينه، فلأنه لم يعلم بالحرمة، والاصل في الاشياء الاباحة".

وفي الهندية(۵/۳۴۲): "قال الفقيه ابو الليث رحمه الله تعالىٰ: اختلف الناس في اخذ الجائزة من السلطان، قال بعضهم يجوز مالم يعلم أنه يعطيه من حرام قال محمد: وبه نأخذ مالم نعرف شيئاً حراماً بعينه وهو قول ابى حنيفة رحمه الله تعالىٰ واصحابه."

(۱۶۳) حجاج کرام کیلئے مکہ ومدینہ کے ہوٹلوں کے کھانے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اس سال ان شاء اللہ میں حج کی سعادت حاصل کرلوں گا۔ مجھے آپ سے پوچھنا یہ ہے کہ میں مکہ ومدینہ کے ہوٹلوں میں کھانا کھا سکتا ہوں یا نہیں؟ دراصل مجھے میرے ایک دوست نے بتایا ہے کہ وہاں اکثر گوشت باہر سے آتا ہے اور باہر ممالک کے بارے میں تو یہ بات مشہور ہے کہ وہاں عام طور پر جھٹکے کا گوشت ملتا ہے۔ آیا اس صورت میں بغیر تحقیق کے میرا وہاں کھانا درست ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......جو گوشت غیر مسلم ممالک سے منگوایا جاتا ہے اس کا کھانا جائز نہیں ہے۔ البتہ اگر ان کے ہاں اسلامی طریقہ پر ذبح کا پورا اہتمام کیا جاتا ہو، اس طور پر کہ ذبح کرنے والے مسلمان ہوں، تسمیہ (بسم اللہ) کا اہتمام ہو، اور ذبح میں بھی عروق لازمہ (سانس اور خون کی رگیں) کا کاٹا جانا پایا جاتا ہو۔ اور یہ تمام امور مسلمانوں کی نگرانی میں ہوتے ہوں، جس سے اسلامی طریقہ پر ذبح کی پوری تسلی ہو جاتی ہو تو کھانا جائز ہے۔ اور جو جانور جھٹکے سے ذبح کیے جاتے ہیں عام طور پر ان میں ذبح کی شرائط کی رعایت نہیں کی جاتی۔ لہٰذا کھانا جائز نہیں۔ البتہ جہاں تمام شرائط کی پوری پوری رعایت کی جاتی ہو تو کھانا جائز ہوگا۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر آپ کو تسلی

ہو جائے کہ تمام شرائط کی رعایت کے ساتھ ذبح شدہ جانور کا گوشت ہے تو کھانا جائز ہے۔ ورنہ احتیاط ہی کر لینا بہتر ہوگا۔

لمافی الفقه الاسلامی وادلته(۳. ۲۹۰۰): لامانع من استخدام وسائل تضعف من مقاومة الحیوان دون تعذیب له، وبناء علیه: یحل فی الاسلام استعمال طرق تخدیر المستحدثة غیر الممیتة قبل الذبح، مثل استعمال ثانی أکسید الفحم، اذا ذبح الحیوان، وکان الغالب علی الظن وجود الحیاة الطبیعیة فیه عند ذبحه، لانه لا یترتب علیه ایلام الحیوان ویحرم الصرع بمسدس او بمثقل کخشب وقدوم وعصا، او تیار کهربائی ونحوها من کل مخدر غیر ضار، لما فیها من تعذیب الحیوان والمنهی عنه شرعا ولکن استعمال ما ذکر لا یمنع من أکل الحیوان بعد ذبحه، إذاظل حیا حیاة مستقرة وان کان سیموت بعد مدة لوترک بغیر ذبح، ولو بعد استعمال هذه الوسائل التی یراد منها تسهیل عملیة الذبح(الی قوله) (صـ۲۸۰۱) وقد بنیت سابقا انه لا مانع من اکل الذبائح المستوردة من البلاد النصرانیة حتی وان لم یسم علیها بشرط کونها مذبوحة: لامخنوقة ولا ممزوعة الرقبة، ولا تحل اللحوم المستوردة من البلاد الوثنیة او اللادینیة کالیابان والهند والدول الشیوعیة. (الی قوله) وأما الطالب الذی یدرس فی البلاد الشیوعة فیجب علیه الامتناع من تناول الطعام المشتمل علی اللحوم الخ.

وفی احکام الذبائح(مفتی محمد تقی عثمانی حفظه الله)(صـ۱۰۶):وایضا ولا یصدرون شهادتهم بصفة اجمالیة من ان هذا اللحم حلال او أنه مذبوح بالطریقة الاسلامیة بل تکون شهادتهم علی التصریح بجمیع العناصر اللازمة للتذکیة الشرعیة من أن الحیوان ذبح بید مسلم او کتابی سمی عند الذبح وقطع العروق اللازمة لحلة الحیوان.

(۱۶۴) حاجی کیلئے دوسرے کیمپ میں جا کر بلا اجازت کے دواء لینے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حج کے موقع پر ہر ملک والے اپنے ملک کی طرف سے قائم کیمپ میں دواء وغیرہ کیلئے جاتے ہیں۔ بسا اوقات تو لوگوں پر پابندی ہوتی ہے کہ وہ دوسری جگہ بغرض علاج بھی نہیں جا سکتے۔ آیا اس صورت میں بغیر اجازت کے کسی دوسرے ملک کے دواخانے میں علاج کروانا درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً حاکم کی اطاعت امر مباح میں واجب ہے، نیز حدیث شریف میں آتا ہے کہ کسی مسلمان کا مال اس کے طیب نفس کے بغیر استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔ ان دو وجوہات کی بناء پر کہ کسی کا مال دھوکہ سے استعمال کرنا اور حکومت کی اجازت نہ ہونے کی بناء پر دوسرے ملک کے دواخانے میں علاج کرنا درست نہیں۔

لمافي سنن دار قطني(۳ ۲۲): عن انس بن مالک رضی الله عنه ان رسول الله ﷺ قال لايحل مال امرئ مسلم الا بطيب نفسه.

وفيه ايضاً: عن ابی حرة الرقاشي. عن عمه ان النبی ﷺ قال لا يحل مال امرئ مسلم الا عن طيب نفس.

وفي الدر المختار مع الشامية (۵/۱۶۷): وفي معروضات المفتي ابی السعود لوادان زيد العشرة باثني عشر او بثلاثة عشر بطريق المعاملة في زماننا بعد ان ورد الأمر السلطاني وفتوی شيخ الاسلام بان لا تعطی العشرة بأزيد من عشرة ونصف ونبه علی ذلک فلم يمتثل ماذا يلزمه ؟ فأجاب يعزر ويحبس الی ان تظهر توبته وصلاحه فيترک (قوله يعزر) لأن طاعة امر السلطان بمباح واجبة

(۱۶۵) غلاف کعبہ کے دھاگوں کونوچنا اور چاروں کونوں کے استلام کوضروری سمجھنا

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے بعض لوگوں سے پہلے سنا تھا اور اس سال دورانِ حج خود بھی مشاہدہ کرلیا کہ بعض لوگ غلاف کعبہ کے دھاگے نوچ نوچ کرلاتے ہیں اور اسے بطورتبرک رکھتے ہیں، آیا ان کا یہ فعل اور اس کو بطورتبرک رکھنا جائز ہے؟ نیز بعض لوگ بیت اللہ کے چاروں کونوں کا استلام ضروری سمجھتے ہیں اور کرتے ہیں اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً غلاف کعبہ کے دھاگوں کونوچ نوچ کرلانا اوران کوبطورتبرک رکھنا شرعاً درست نہیں۔ نیز بیت اللہ کے چاروں کونوں کے استلام کرنے کوضروری سمجھنا درست نہیں البتہ حجراسوداوررکن یمانی کا استلام کرنادرست ہے۔

لمافي البخاري(۱/۲۱۸): عن سالم ابن عبدالله عن ابيه قال لم أرَ النبی ﷺ يستلم من البيت الا الركنين اليمانيين.

وفي مناسک ملا علي قاري (ص۴۹۵): ......لكن في البحر الذاخر انه لا يجوز قطع شی من كسوة الكعبة، ولا نقله، ولا بيعه، ولا شراءه ولا وضعه في اوراق المصحف ومن حمل شيئا من ذلک فعليه رده ولا عبرة بما يتوهم الناس انهم يشترونه من بنی شيبة، فانهم لا يملكونه انتهی.

وفي الدرالمختار(۲/۴۹۸): وكلما مر بالحجر فعل ما ذكر من الاستلام واستلم الركن اليماني وهو مندوب لكن بلا تقبيل وقال محمد هو سنة ويقبله والدلائل تزيده ويكره استلام غيرهما وفي الشامية وهو الركن العراقي والشامي لانهما ليس ركنين حقيقة بل من وسط البيت لان بعض الحطيم من البيت بدائع والكراهة تنزيهة كمافي البحر.

(۱۶۶) حج اور عمرے کے افعال میں دعائیں

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ طواف وسعی میں دعاؤں کی کیا اہمیت ہے؟ اور صحیح طریقہ کیا ہے؟ آجکل لوگ معلمین کے پیچھے پیچھے پڑھتے چلے جاتے ہیں یا پھر از خود کتابوں میں مذکورہ دعائیں پڑھتے رہتے ہیں۔ آیا یہ طریقہ درست ہے؟ کیا یہ دعائیں عربی زبان میں ہی پڑھنا ضروری ہیں یا پھر کسی اور زبان میں بھی پڑھی جاسکتی ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً (۱)۔ طواف اور سعی میں جو دعائیں کی جاتی ہیں وہ سب کی سب سنت اور افضلیت کے درجے میں ہیں، اور حج وعمرہ کے مختلف مواقع میں خاص خاص جگہوں میں پڑھنا ضروری نہیں۔ البتہ جو دعائیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص خاص مواقع پر پڑھی ہیں تو برکت کے طور پر ان پر عمل کیا جائے تو یہ زیادہ افضل ہے۔

(۲)۔ بظاہر کتاب سے یا معلم کے پیچھے اور یا زبانی یاد کر کے ان سب طریقوں سے طواف اور سعی میں دعائیں پڑھنا درست ہے، البتہ اس بات کا خیال کرنا ضروری ہے کہ اتنی بلند آواز سے نہ پڑھی جائیں جس کی وجہ سے طواف اور سعی کرنے والوں کو تکلیف پہنچے۔

(۳)۔ طواف اور سعی میں دعائیں عربی زبان میں پڑھنا ضروری نہیں ہے بلکہ ہر زبان میں کہی جاسکتی ہیں البتہ عربی زبان میں دعا کرنا اولیٰ اور اقرب الی الاجابۃ (قبولیت) ہے۔

لمافي مناسک ملا علي القاري(صـ۱۲۰):فصل في مستحباته (الطواف) استلام الركن اليماني اى من غير قبلة ووضع جبهة، وأخذ الطواف عن يمين الحجر...... بحيث يمر جميع بدنه عليه...... ...... وإتيان الاذكار والادعية فيه أى من المأثورة وغيرها وفي (صـ۱۲۲) والإسرار بالكسر أى الاخفاء بالذكر والادعية وفيه بحث لانه يجب الاخفاء اذا كان الجهر مشوشا الطائفين والمصلين، فقد صرح ابن الضياء أن رفع الصوت في المسجد حرام ولو بالذكر، ولعله اراد بالاسرار المبالغة في الاخفاء تبعيداً عن السمعة والرياء.

وفي غنية الناسک(صـ۱۲۰): واما مستحبات الطواف...... (صـ۱۲۱) واستلام الركن اليماني واتيان الاذكار والادعية فيه ولو تركها فسكت في جميع طوافه لا بأس به...... ...... (صـ۱۲۴) وأخرج الحاكم أنه ﷺ قال: "ما انتهيت الى الركن اليماني قط الا وجدت جبريل عليه السلام عنده فقال قل يا محمد قلت وما اقول قال قل اللهم انى اعوذبک من الكفر والفاقة ومواقف الخزى في الدنيا والاخرة ثم قال جبريل عليه السلام ان بينهما سبعون الف ملک فاذا قال العبد هذا قالوا: امين .... (صـ۱۳۵) فصل في مستحباته (السعي) وهي النية...... والذكر والدعاء وتكرارهما ثلاثا.

وفي الدرالمختار(۲/۴۹۷): ولو خرج منه او من السعي الى جنازة او مكتوبة او تجديد وضوء ثم

عـاد بـنـي وجاز فيهما . . افتاء وقراءة لكن الذكر افضل منها وفي منسـک النووي الذكر والمأثور افضل.

(۱٦۷) ''طیراً ابابیل'' سے کیا مراد ہے؟اوراحرام کی حالت میں کونسے جانوروں کا قتل کرنا جائز ہے؟

سوال ... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حرم میں عام طور پر مغرب کے وقت ابابیل کے غول کے غول دکھائی دیتے ہیں آیا یہ ان ابابیل کی نسل ہی ہے جنہوں نے ابرہہ کے لشکر کو ہلاک کیا تھا؟ سنا ہے کہ حج کے موقع پر جانوروں وغیرہ کو مارنا درست نہیں لیکن پانچ جانور ایسے ہیں کہ انہیں مارنا جائز ہے، یہ کونسے جانور ہیں؟ کیا پانچ ہی ہیں یا کم وزیادہ؟ اور یہ مارنا حرم میں درست ہے یا حالت احرام میں؟

الجواب حامداً ومصلیاً (۱)۔ درحقیقت ابابیل کسی جانور اور پرندے کا نام نہیں ہے بلکہ مرکبات میں بطور لاحقہ اور صفت کے استعمال ہوتا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے''طیرابابیل'' پرندوں کے غول کے غول یا مثلاً کہا جاتا ہے۔''ابل ابابیل'' اونٹوں کے ریوڑ۔ قرآن کریم میں جو''طیرابابیل'' آیا ہے تو اس سے کونسے پرندوں کے غول مراد ہیں؟ تو اس میں مختلف تفسیری روایات ہیں البتہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ جن پرندوں نے ابرہہ کے لشکر پر پتھر پھینک دیئے تھے وہ بہت مشابہ تھے ان پرندوں کے ساتھ جن کو اردو زبان میں''ابابیل'' کہا جاتا ہے۔تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس تفسیر کو لیتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ کچھ بعید نہیں ہے کہ حرم میں عام طور پر مغرب کے وقت جو پرندوں کے غول کے غول دکھائی دیتے ہیں وہ ان پرندوں کی نسل ہو جو اردو والے ابابیل پرندوں کے ساتھ مشابہ ہیں اور جنہوں نے ابرہہ کے لشکر کو ہلاک کیا تھا اور آج کل بھی بیت اللہ کی پاسبانی کے لئے شام کے وقت نمودار ہوتے ہیں اور بیت اللہ شریف کے اردگرد آوازیں نکالتے ہوئے چکر کاٹتے ہیں۔

(۲)۔تمام احادیث سامنے رکھتے ہوئے حضرات حنفیہ نے ایسے نو(۹) جانور ذکر کیے ہیں جن کو حل اور حرم اور حالت احرام میں قتل کرنا جائز ہے۔اور وہ یہ ہیں:

(۱)۔پاگل کتا،(۲)۔بھیڑیا،(۳)۔چیل،(۴)۔سیت خورکوا،(۵)۔سانپ،(٦)۔بچھو،(۷)۔چوہا،(۸)۔چیتا

(۹)۔مذکورہ ان سب جانوروں کے علاوہ وہ جانور بھی قتل کرنا جائز ہے جو محرم پر حملہ آوری کی پہل کرے۔

لـمافي حياة الـحيـوان (۱/۲۷): "الابـابـيـل"...... وقـال ابـو عبيد القاسم بن سلام: لاواحد لها، من لـفظها...... واختلفوا في قوله تعالىٰ. وارسل عليهم طيراً ابابيل. فقال سعيد بن جبير، هي طير تعشش بيـن الـسـماء والارض وتفرخ، ولها خراطيم كخراطيم الطير، واكف كاكف الكلاب. وعن عكرمة

أنها طيور خضر خرجت من البحر لها رؤس كرءوس السباع......وقالت عائشة رضى الله تعالىٰ عنها: هي اشبه شئ بالخطاطيف. وسياتي ان شاء الله تعالىٰ في باب السين أنها السنونو الذى يأوى الآن في المسجد الحرام الواحدة. سنونة.

وفي تفسير البغوى(۳/۵۲۸): "طيراً ابابيل" كثيرة متفرقة يتبع بعضها بعضاً...... قال ابو عبيدة: ابابيل جماعات في تفرقة، يقال: جاء ت الخيل ابابيل من ههنا وههنا...... قال ابن عباس كانت طيراً لها خراطيم كخراطيم الطير وأكف كأكف الكلاب...... قال سعيد بن جبير: خضرلها مناقير صفر، وقال قتادة: طير سود جاء ت من قبل البحر فوجاً فوجاً مع كل طائر ثلاثة احجار حجران في رجليه و حجر في منقاره.

وفي اعلاء السنن(۱۰/۳۸۵): عن عائشة، قالت: امر رسول الله ﷺ بقتل خمس فواسق في الحل والحرم: الغراب، والحداة، والعقرب والفاره والكلب العقور.

وأخرجه أبو عوانة في المستخرج من طريق المحاربى عن هشام عنها بلفظ ست وزاد: الحية، وهو كذلک عند مسلم بطريق شيبان عن ابن عمر، فزاد الحية، ولم يقل في اوله: خمساً ولاستا، وقد وقع في حديث ابي سعيد عند ابي داؤد نحو رواية شيبان، وزاد السبع العادى. وفي حديث ابي هريرة عند ابن خزيمة وابن المنذر زيادة الذئب والنمر، فتصير تسعاً، وفي رواية سعيد بن المسيب عن عائشة عند مسلم: الغراب الابقع.

وفي (صـ۳۸۷): قال في شرحه: وخالفت الحنفية فاقتصروا على الخمس الا انهم الحقوا بها الحية لثبوت الخبر، والذئب لمشاركته للكلب في الكلبية (اى ولثبوت الخبر ايضاً) والحقوا بذلک من ابتدأ بالعدوان والاذى من غيرها بلا بالقياس بل لقول النبى ﷺ "والسبع العادى" كما تقدم وفي (صـ۳۸۸): واما ذكر النمر فلم يرد مرفوعاً في حديث ما غير حديث ابى هريرة.

وفي الشامية (۲/۵۷۰): قال في الدر: ولا شئ بقتل غراب الا العقعق على الظاهر، وتعميم البحر رده في النهر، وحدأة...... وذئب وعقرب وحية و فارة...... وكلب عقور...... وسبع اى حيوان صائل لا يمكن دفعه الا بالقتل، فلو أمكن بغيره فقتله لزمه الجزاء كما تلزمه قيمته لو مملوكاً.

قال في الشامي: (قوله الا العقعق) هو طائر ابيض فيه سواد و بياض يشبه صوته العين والقاف. ومثله في الحكم الزاغ...... ويقال له غراب الزرع وهو الغراب الصغير الذى ياكل الحب. وفي الشامية (۲/۵۷۱): (قوله اى حيوان) اشار الى مافي النهر من ان هذا الحكم لا يحض السبع لأن غيره اذا

صال لاشئ بقتله ..... لكن ينبغي تقييد الحيوان بغير المأكول لما في البحر من ان الجمل لو صال على انسان فقتله فعليه قيمته بالغة مابلغت لأن الاذن في قتل السبع حاصل من صاحب الحق وهو الشارع اما الجمل فلم يحصل الاذن من صاحبه.

وفي تفسير روح البيان(۱۰/۱۴-۵۱۵): وفي حواشي ابن الشيخ، كان عبد المطلب وابو مسعود الثقفي يشاهدان من فوق الجبل عسكر ابرهة، فارسل الله طيراً سوداً صفر المناقير خضر الاعناق طوالها، او حضراً او بيضاً او بلقا او حماماً، كما سئل من ابي سعيد الخدري رضي الله تعالىٰ عنه عن الطير فقال حمام مكة منها، وقد يقال ان هذا اشتباه لأن الذي قيل فيه انه من نسل الابابيل ... هو شئ يشبه الزرازير يكون بباب ابراهيم من الحرم، والا فحمام الحرم من نسل الحمام الذي عشش على فم الغار.

والزرازير جمع زرزور بضم الزاى طائر صغير من نوع العصفور سمي بذلك لزرزرته اى لصوته، وعن عائشة رضي الله تعالىٰ عنها كانت تلك الطير الابابيل اشباه الخطاطيف والوطاويط

وقال عكرمة: هي عنقاء مغرب.....قيل جاءت عشية ثم صبحتهم مع كل طائر حجر في منقاره وحجران في رجليه.

(۱۶۸) حرم میں بھیک مانگنے والوں کو خیرات دینے کا حکم اور حرم میں عورتوں کیلئے پردے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے حج کے موقع پر کئی ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو دیکھنے میں تو صحت مند تھے لیکن بھیک مانگ رہے تھے، آیا ان لوگوں کو بھیک دینا درست ہے؟

اسی طرح بعض خواتین وہاں جا کر پردہ کا اہتمام نہیں کرتیں اور کہتی ہیں کہ اللہ کے گھر میں کس سے پردہ؟ آیا ان کی یہ بات درست ہے؟ شریعت نے ان موقعوں پر پردے کا کیا حکم دیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: (۱)۔ ایسے لوگ جو حقیقت میں ضرورت مند اور محتاج نہ ہوں بلکہ بھیک مانگنا ان کا پیشہ بن گیا ہو، ان کیلئے بھیک مانگنا حرام اور ان کو دینا ناجائز ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں حج کے موقع پر جو لوگ بھیک مانگتے ہیں اور ان کے بارے میں کوئی جانتا ہو کہ یہ فقیر نہیں بلکہ پیشہ ور ہیں تو ان کو بھیک نہیں دینا چاہئے۔

(۲)۔ شریعت مطہرہ میں عورتوں کیلئے جو پردے کے احکامات بیان ہوئے ہیں وہ عام ہیں، کسی مکان، یا زمان، کیساتھ خاص نہیں، اسی لیے عورتوں کو دورانِ احرام بھی سر کھولنا جائز نہیں، البتہ چہرے پر اس طریقے سے دور ہٹا کر کپڑا ڈالے کہ وہ کپڑا چہرے پر نہ لگے اور ان کیلئے تلبیہ بھی بآواز بلند پڑھنا جائز نہیں، تاکہ لوگ فتنہ میں نہ پڑیں، لہٰذا ان عورتوں کا یہ کہنا کہ ''اللہ کے گھر میں کس سے پردہ؟''

لئے میں تمام نمازیں تو حرم میں نہیں پڑھ سکا، مجبوری بھی تھی کہ فاصلہ زیادہ تھا۔ میں قریب کی مسجد میں یا پھر کبھی ہوٹل کی ہی مسجد میں نماز پڑھ لیا کرتا تھا، اب میں سوچتا ہوں کہ کیا ان نمازوں کا ثواب مجھے حرم کے برابر ملا ہوگا یا نہیں؟ حدیث میں جو ایک لاکھ نمازوں کے برابر کی فضیلت آئی ہے وہ پورے مکہ کے بارے میں ہے یا خاص مسجد حرام کے بارے میں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... مسجد حرام کے متعلق حدیث شریف میں جو ایک لاکھ نمازوں کے برابر فضیلت بیان فرمائی گئی ہے وہ راجح قول کے مطابق حرم مکہ کے ساتھ خاص ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں مکہ میں قیام کے دوران جو نمازیں آپ نے ہوٹل یا ہوٹل کے قریب کی مسجد میں ادا کی ہیں۔ اگر یہ دونوں مسجدیں حرم مکہ میں داخل ہیں تو آپ کو ایک لاکھ نمازوں کی فضیلت حاصل ہوگئی اور اگر مذکورہ مسجد اور ہوٹل حرم مکہ میں داخل نہیں ہیں تو یہ فضیلت حاصل نہیں ہوئی۔

لمافي فتاوى اللجنة الدائمة (۶/ ۲۲۳): في المسئلة خلاف بين اهل العلم والأرجح أن المضاعفة للثواب تعم الحرم كله لأنه كله يطلق عليه المسجد الحرام في القرآن والسنة......

وفي الشامية (۲/۵۲۵): واختلف في المراد بالمسجد الحرام، قيل مسجد الجماعة وايده المحب الطبري، وقيل الحرم كله، وقيل الكعبة خاصة ...... وذكر البيري في شرح الاشباه في احكام المسجد ان المشهور عند اصحابنا ان التضعيف يعم جميع مكة بل جميع حرم مكه الذي يحرم صيده كما صححه النووي.

وفي الفقه الاسلامي وادلته (۳/ ۲۳۸۳): قال جماعة منهم النووي والزركشي: ان حرم مكة كالمسجد الحرام في مضاعفة ثواب الصلاة بل وسائر انواع الطاعات.

(۱۷۰) یوم عرفہ اور دیگر ایامِ حج میں رات کا گزرے ہوئے دن کا تابع ہونا

سوال ...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک عالم سے سنا ہے کہ یوم العرفہ کے بعد جو رات آتی ہے وہ عرفہ کی ہی شمار ہوتی ہے اور اس رات شرعاً تاریخ نہیں بدلتی؟ کیا یہ بات صحیح ہے؟ آیا یہ کسی حدیث یا نص سے ثابت ہے؟ اور اس کی کیا وجہ ہے؟ براہ کرم مجھے اس کا جواب تحریری صورت میں دیدیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... اصل تو یہ ہے کہ تمام راتیں آنے والے دن کے تابع ہوتی ہیں۔ لیکن افعال حج میں راتیں خلاف قیاس نصوص کی وجہ سے گزرے ہوئے دن کے تابع ہوتی ہیں۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ کا کسی عالم سے سننا کہ یوم العرفہ کے بعد جو رات آتی ہے وہ عرفہ کی ہی شمار ہوتی ہے، درست ہے کہ افعال حج میں یہ رات خلاف القیاس بوجہ نص کے یوم عرفہ کے تابع ہے۔ البتہ تاریخ نہ بدلنے کی بات درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ رات کا گزرے ہوئے دن کا تابع ہونا صرف حکماً ہے اور افعال حج کے متعلق ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

لمافي سنن الترمذي (۱/ ۱۷۸): عن عبدالرحمن بن يعمر ان ناسا من اهل نجد اتوا رسول الله ﷺ

لئے میں تمام نمازیں تو حرم میں نہیں پڑھ سکا، مجبوری بھی تھی کہ فاصلہ زیادہ تھا، میں قریب کی مسجد میں یا پھر کبھی ہوٹل کی ہی مسجد میں نماز پڑھ لیا کرتا تھا، اب میں سوچتا ہوں کہ کیا ان نمازوں کا ثواب مجھے حرم کے برابر ملا ہوگا یا نہیں؟ حدیث میں جو ایک لاکھ نمازوں کے برابر کی فضیلت آئی ہے وہ پورے مکہ کے بارے میں ہے یا خاص مسجد حرام کے بارے میں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... مسجد حرام کے متعلق حدیث شریف میں جو ایک لاکھ نمازوں کے برابر فضیلت بیان فرمائی گئی ہے وہ راجح قول کے مطابق حرم مکہ کے ساتھ خاص ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں مکہ میں قیام کے دوران جو نمازیں آپ نے ہوٹل یا ہوٹل کے قریب کی مسجد میں ادا کی ہیں۔ اگر یہ دونوں مسجدیں حرم مکہ میں داخل ہیں تو آپ کو ایک لاکھ نمازوں کی فضیلت حاصل ہوگئی اور اگر مذکورہ مسجد اور ہوٹل حرم مکہ میں داخل نہیں ہیں تو یہ فضیلت حاصل نہیں ہوئی۔

لمافي فتاوى اللجنة الدائمة (٦/٢٢٣): في المسئلة خلاف بين اهل العلم والأرجح أن المضاعفة للثواب تعم الحرم كله لأنه كله يطلق عليه المسجد الحرام في القرآن والسنة......

وفي الشامية (٢/٥٢٥): واختلف في المراد بالمسجد الحرام، قيل مسجد الجماعة وايده المحب الطبري، وقيل الحرم كله، وقيل الكعبة خاصة ...... وذكر البيرى في شرح الاشباه في احكام المسجد ان المشهور عند اصحابنا ان التضعيف يعم جميع مكة بل جميع حرم مكه الذى يحرم صيده كما صححه النووى.

وفي الفقه الاسلامي وادلته (٣/٢٣٨٣): قال جماعة منهم النووي والزركشي: ان حرم مكة كالمسجد الحرام في مضاعفة ثواب الصلاة بل وسائر انواع الطاعات.

(۱۷۰) یوم عرفہ اور دیگر ایامِ حج میں رات کا گزرے ہوئے دن کا تابع ہونا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک عالم سے سنا ہے کہ یوم العرفہ کے بعد جو رات آتی ہے وہ عرفہ کی ہی شمار ہوتی ہے اور اس رات شرعاً تاریخ نہیں بدلتی؟ کیا یہ بات صحیح ہے؟ آیا یہ کسی حدیث یا نص سے ثابت ہے؟ اور اس کی کیا وجہ ہے؟ براہ کرم مجھے اس کا جواب تحریری صورت میں دیدیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... اصل تو یہ ہے کہ تمام راتیں آنے والے دن کے تابع ہوتی ہیں۔ لیکن افعالِ حج میں راتیں خلافِ قیاس نصوص کی وجہ سے گزرے ہوئے دن کے تابع ہوتی ہیں۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ کا کسی عالم سے سننا کہ یوم العرفہ کے بعد جو رات آتی ہے وہ عرفہ کی ہی شمار ہوتی ہے، درست ہے کہ افعالِ حج میں یہ رات خلاف القیاس بوجہ نص کے یوم عرفہ کے تابع ہے۔ البتہ شرعاً تاریخ نہ بدلنے کی بات درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ رات کا گزرے ہوئے دن کا تابع ہونا صرف حکماً ہے اور افعالِ حج کے متعلق ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

لمافي سنن الترمذى (١/١٧٨): عن عبدالرحمن بن يعمر ان ناسا من اهل نجد اتوا رسول الله ﷺ

وهو بعرفة فسألوه فامر منا ديا فنادى الحج عرفة من جاء ليلة جمع قبل طلوع الفجر فقد ادرک الحج　　قال ابو عيسى والعمل على حديث عبدالرحمن بن يعمر عند اهل العلم من اصحاب النبی ﷺ وغيرهم انه من لم يقف بعرفات قبل طلوع الفجر فقد فاته الحج ولا يجزئ عنه ان جاء بعد طلوع الفجر ويجعلها عمرة وعليه الحج من قابل الخ.

وفى اعلاء السنن(۱۰/۲۱۵): اخبرنا مالک، حدثنا عبدالله بن ابی بكر، ان اباه اخبره، ان ابا البداح بن عاصم بن عدی اخبره عن ابيه عاصم بن عدی، عن رسول الله ﷺ: انه رخص لرعاء الابل في البيتوتة، يرمون يوم النحر، ثم يرمون من الغد اومن بعد الغد ليومين ثم يرمون يوم النفر اخرجه محمد فی "الموطا" (۲۲۸). وابو داؤد، والترمذی، والنسائی، وابن ماجة، وقال الترمذی حسن صحيح "عون المعبود (۲-۱۳۸). (ثم قال بعد ايراد هذا الحديث فی شرحه مانصه)

قوله: "اخبرنا مالک" الخ. دلالته على جواز ترک المبيت بمنى لضرورة ظاهرة، وهذا حديث مفسر لماروی ابن عمر مجملا: ان النبی ﷺ رخص للرعاء ان يرموا ليلا. فاحتج به الشافعی رحمه الله على جواز رمي الجمرة ذات العقبة بعد نصف الليل من ليلة النحر، و اوله الحنفية على الليلة الثانية والثالثة، لما عرف ان وقت رمي كل يوم اذا دخل من النهار امتد الى اخر الليلة التي تتلو ذلک النهار، فالليالی فی الرمی تابعة للايام السابقة لا اللاحقة، بدليل ادراک الوقوف بعرفة بالوقوف فی ليلة النحر قبل الفجر. وبدليل حديث ابن عباس مرفوعا: ((لاترموا الجمرة حتى تطلع الشمس)). كذا فی "فتح القدير" بمعناه (۲-۳۹۴). ويؤيد هذا التاويل ماروه مالک من حديث ابی البداح، ففيه ان الرعاء انما رخص لهم فی التاخير دون التعجيل الخ.

وفی الهندية(۱/۲۲۹،۲۳۰): والليالی كلها تابعة للايام المستقبلة لا للايام الماضية الا فی الحج فانها فی حكم ايام ماضية لافی حكم ايام مستقبلة ليلة عرفة تابعة ليوم التروية حتى لا يجوز للحاج الوقوف فيها كمالا يجوز فی يوم التروية وليلة النحر تابعة ليوم عرفة حتى يجوز الوقوف فيها كما يجوز فی يوم عرفة وكذا لاتجوز التضحية فيها كمالا تجوز فی يوم عرفة كذا فی محيط السرخسی.

وفی الشامية(۲/۵۱۸): (قوله وليا ليها منها) ..... والمراد بليلة كل يوم من ايام النحر الليلة التی تعقب ذلک اليوم فی الوجود كما ان ليلة يوم عرفة الليلة التی تعقبه فی الوجود ح. (وفی الصفحة ۵۲۱)　ثم قال: ولو لم يرم يوم النحر او الثانی او الثالث رماه فی الليلة المقبلة ای الآتية لكل من

الایام الماضیۃ، ولا شئ علیہ سوی الاساءۃ مالم یکن بعذر، ولو رمی لیلۃ الحادی عشر او غیرھا من غدھا لم یصح. لان اللیالی فی الحج فی حکم الایام الماضیۃ لا المستقبلۃ الخ.

(۱۷۱) روضہ اقدس کی طرف پاؤں پھیلانا مکروہ ہے

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مدینہ طیبہ میں قیام کے دوران آدمی گھر یا ہوٹل میں ہوتا ہے تو کبھی سوتے ہوئے پاؤں روضۂ اقدس کی طرف ہوجاتا ہے اس پر تو پکڑ نہ ہوگی؟ یہ بے ادبی میں تو داخل نہیں؟ نیز اسی طرح مدینہ منورہ میں کبھی رہائش ہوٹلوں وغیرہ میں بھی روضۂ اقدس سے اوپر بلندی پر ہوتی ہے یہ بھی بے ادبی وگستاخی میں تو شامل نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوقات سے افضل ہیں اور وہ بقعہ شریفہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن مبارک کے ساتھ متصل ہے زمین کے تمام بقعات سے افضل ہے حتیٰ کہ کعبہ شریف سے بھی افضل ہے تو جس طرح کعبہ شریف کی طرف قصداً پاؤں پھیلانا مکروہ ہے بعینہٖ اسی طرح روضۂ اقدس کی طرف بھی پاؤں پھیلانا مکروہ اور خلاف ادب ہے لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ کو چاہئے کہ سوتے ہوئے احتیاط کریں تاکہ پاؤں نیند کی حالت میں بھی روضہ اقدس کی طرف نہ ہوجائے لیکن احتیاط کے باوجود بھی سوتے ہوئے پاؤں روضۂ اقدس کی طرف ہوجائے تو اس کے آپ مکلف نہیں اور اس پر انشاء اللہ پکڑ نہ ہوگی۔

(۲)۔ ادب کا مدار چونکہ عرف پر ہے اور عرف میں روضۂ اقدس سے اوپر رہائش کو چونکہ بے اُدبی شمار نہیں کیا جاتا۔ لہٰذا روضۂ اقدس سے اوپر عمارت پر رہائش درست ہوگی۔

لمافی الدر المختار (۱/۶۵۵): (و) کما کرہ (مد رجلیہ فی نوم او غیرہ الیھا) ای عمدا لانہ اساءۃ ادب قال فی الشامیۃ تحت قولہ (ای عمداً) ای من غیر عذر أما باالعذر أو السھو فلا ،ط.

وفیہ ایضا (۲/۶۲۶): لاحرم للمدینۃ عندنا، ومکۃ افضل منھا علی الراجح الا ماضم اعضاءہ علیہ الصلاۃ والسلام فانہ افضل مطلقاً حتی من الکعبۃ والعرش والکرسی،

قال فی الشامیۃ: قال فی اللباب: والخلاف فیما عدا موضع القبر المقدس، فما ضم اعضاءہ الشریفۃ ﷺ فھو افضل بقاع الارض بالاجماع اھ. قال شارحہ: وکذا ای الخلاف فی غیر البیت فان الکعبۃ افضل من المدینۃ ماعدا الضریح الأقدس وکذاالضریح أفضل من المسجدالحرام،انتھی

وفی غنیۃ الناسک (صـ۳۸۲): ولا یستدبر القبر المقدس فی صلاۃ ولاغیرھا.

وفی ابن ماجہ (صـ۱۴۷): عن عائشۃ ان رسول اللہ ﷺ قال رفع القلم عن ثلاثۃ عن النائم حتی یستقیظ و عن الصغیر حتی یکبر وعن المجنون حتی یعقل او یفیق،

وفیہ ایضا

عن ابی ذر الغفاری قال قال رسول الله ﷺ ان الله تجاوز لی عن أمتی الخطاء والنسیان وما استکرهوا علیه.

وفی الهندیة(۵/ ۳۲۲): یجوز قربان المرءة فی بیت فیه مصحف مستور کذا فی القنیة.

(۱۷۲) مطاف میں انبیاء علیہم السلام اور عام مسلمانوں کی قبروں پر چلنے کا حکم

سوال … کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے سنا ہے کہ مطاف میں کئی انبیاء کرام مدفون ہیں۔ کیا یہ درست بات ہے؟ اگر درست ہے تو اب دورانِ طواف ان کی بے حرمتی نہیں ہوتی ہے؟ حالانکہ کسی عام مسلمان کی قبر پر چلنا بھی منع آیا ہے۔ براہ کرم تسلی وتشفی بخش جواب سے ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً … صورتِ مسئولہ میں یہ بات درست ہے کہ مطاف میں انبیاء علیہم السلام مدفون ہیں، اور جہاں تک ان کی قبروں کا تعلق ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں، اگر ان کی قبروں کے اوپر چلا جائے تو اس سے ان کی قبروں کی بے حرمتی نہیں ہوگی۔

… جہاں تک عام مسلمانوں کی قبروں کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں مسئلہ یہ ہے کہ کسی قبر میں لاش بوسیدہ اور ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے تو اس قبر کا احترام باقی نہیں رہتا، اور مطاف میں جو عام مسلمانوں کی قبریں موجود ہیں، ان پر کئی ہزار سال گزر چکے ہیں اور ان قبروں میں انکی نعشیں بوسیدہ ہو چکی ہیں۔ لہٰذا دورانِ طواف ان قبروں پر چلنے سے ان کی بے حرمتی نہیں ہوگی۔

لما فی عالمگیریة(۱/ ۱۶۶): ویکره أن یبنی علی القبر أو یقعد أو ینام علیه أو یوطأ علیه أو یقضی حاجة الإنسان من بول أو غائط أو یعلم بعلامة من کتابة ونحوه کذا فی التبیین. … وایضاً (ص ۱۶۷) ولو بلی المیت وصار ترابا جاز دفن غیره فی قبره وزرعه والبناء علیه کذا فی التبیین.

وایضاً بعد سطور ویکره قطع الحطب والحشیش من المقبرة فان کان یابساً لابأس به کذا فی فتاوی قاضیخان. والمشی فی المقابر بنعلین لا یکره عندنا کذا فی السراج الوهاج.

وفی الشامیة(۲/ ۲۴۵): وفی خزانة الفتاوی وعن ابی حنیفةؒ لایوطأ القبر الا لضرورة، ویزار من بعید ولا یقعد، وإن فعل یکره وقال بعضهم: لا بأس بأن یطأ القبور وهو یقرأ أو یسبح أو یدعو لهم اهـ الی ان قال ثم ذکر عن الإمام الطحاوی أنه حمل ماورد من النهی عن الجلوس علی القبر علی الجلوس لقضاء الحاجة، وأنه لا یکره الجلوس لغیره جمعا بین الآثار… الی ان قال قلت: وتقدم أنه إذا بلی المیت وصار ترابا یجوز زرعه والبناء علیه، ومقتضاه جواز المشی فوقه.

وفی المرقاة المفاتیح(۲/ ۳۸۹): (تحت قوله اتخذوا قبور انبیاء هم مساجد) الی قول اما من اتخذ

مسجداً فی جوار صالح أو صلی فی مقبرة وقصد الاستظهار بروحه أو وصول أثرمامن أثر عبادته الیه لا للتعظیم له والتوجه نحوه فلا حرج علیه الاتری ان مرقد اسمٰعیل علیه السلام فی المسجد الحرام عند الحطیم، ثم ان ذلک المسجد أفضل مکان یتحری المصلی لصلاته والنهی عن الصلوة فی المقابر مختص بالقبور المنبوشة لما فیها من النجاسة کذا ذکره الطیبی وذکر غیره ان صورة قبر اسماعیل علیه السلام فی الحجر تحت المیزاب، وان فی الحطیم بین الحجر الاسود وزمزم قبر سبعین نبیا وفیه ان صورة قبر اسمعیل علیه السلام وغیره مندرسة فلا یصلح الاستدلال به وقال ابن حجر أشار الشارح الی استشکال الصلاة عند قبر اسمعیل بانها تکره فی المقبرة واجاب بان محلها فی مقبرة منبوشة لنجاستها وکله غفلة عن قولهم یستثنی مقابر الانبیاء علیهم السلام فلا یکره الصلاة فیها مطلقاً لأنهم أحیاء فی قبورهم، وعلی التنزل فجوابه غیر صحیح لتصریحهم بکراهة الصلاة فی مقبرة غیر الانبیاء وان لم تنبش لانه محاذ للنجاسة ومحاذاتها فی مکروهة سواء کانت فوقه او خلفه او تحت ماهو واقف علیه.........وایضاً(۱۵۷/۴) وقد فسر فی الحدیث القعود للبول والغائط علی ان ابن وهب رواه فی مسنده عن النبی ﷺ بلفظ من جلس علی قبر یبول علیه او یتغوط وهذا حرام اجماعاً فلیس الکلام فیه قال ولا یکره دوسه لحاجة کحفر أو قراءة علیه أو زیارة ولو لأجنبی للاتباع صححه ابن حبان ولانه مع الحاجة لیس فیه انتهاک حرمة المیت بخلافه مع عدم الحاجة هذا کله قبل البلی أما بعده فلا حرمة ولا کراهة مطلقاً لعدم احترامه ایضاً.

(۱۷۳) بیت اللہ پرعطر لگانے کا حکم اور اس پر ہاتھ لگانے کی صورت میں کفارہ کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے حج کے موقع پر لوگوں کو دیکھا ہے کہ بیت اللہ پر عطر لگاتے ہیں۔اور جب بعض لوگ کعبۃ اللہ کو ہاتھ لگاتے ہیں تو یہ عطر ان کے ہاتھوں پر بھی لگ جاتا ہے، حالانکہ دورانِ احرام عطر لگانے سے علماء منع فرماتے ہیں۔آیا اس طرح بیت اللہ پر عطر لگانا درست ہے؟ اور جو لوگ اس حالت میں اسے چھو لیتے ہیں اور ان کے ہاتھوں پر عطر لگ جاتا ہے ان پر کچھ واجب تو نہیں ہوتا؟ اور اگر ہاتھ لگانے سے ہاتھوں پر عطر تو نہ لگے لیکن ہاتھوں سے عطر کی خوشبو آنے لگے تو کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... بیت اللہ پر عطر لگانا جائز اور درست ہے۔اب جو لوگ اس کو حالتِ احرام میں چھو لیتے ہیں۔اگر وہ عطر پورے ہاتھ پر یا پوری ہتھیلی پر یا کسی بھی کامل بڑے عضو پر لگ جائے، تو ان پر دم (بکری کا ذبح کرنا) آئے گا، لیکن اگر پورے ہاتھ یا پوری ہتھیلی پر یا پورے عضو پر نہ لگے، بلکہ اس کے بعض حصے پر لگ جائے، تو اس صورت میں صدقہ واجب ہوتا ہے، اور اگر عطر ہاتھ پر نہ لگے، لیکن

ہاتھ سے خوشبو آنے لگے تو اس صورت میں کچھ واجب نہیں۔ (نوٹ): ہر وہ کام جس کی ممانعت حالت احرام میں ہونے کی بجہت اور اس کے کرنے پر کفارہ (دم یا صدقہ) واجب ہوتا ہے تو جہاں حج افراد کرنے والوں پر ایک کفارہ آتا ہے وہاں حج قران کرنے والوں پر دو کفارے آئیں گے۔

لمافي غنية المناسک (ص۳۰۲): كل جناية على الاحرام على المفرد بها كفارة واحدة سواء كانت دما او صدقة وسواء كانت كفارة جناية او كفارة ضرورة فعلى القارن بها كفارتان لجناية على احرامين الا اذا جاوزا الميقات بغير احرام ثم قرن فعليه دم واحد.

وفي غنية المناسک(ص۳۰۶،۳۰۵): مطلب: ولا يجوز اخذ شي من طيب الكعبة ولو للتبرک به سواء التصق بها اولا فلا يجوز اخذ رشاش ماء الورد الذى أتى به للكعبة الشريفة كما يتبا در اليه العامة وعليه رده اليها وان اراد التبرک به اتى بطيب من عنده فمسحه بها ثم اخذه ولا يحل لخدام الكعبة ان يمنعوا احداً من ذلک ويدعوا انه اذا أتى به للكعبة ليس له ان يرجع ببقيته وكذا حكم الشمع له أن ياتى بشمع ويسرج على باب الكعبة ونحوه ثم ياخذ الباقي تبر كابه واما شمع الكعبة من الخدام وشيخ الفراشين وكذا اخذزيت الحرم منهم ومن غيرهم فلا يجوز مطلقا (لباب وشرحه)

وفي شرح العناية على حاشية فتح القدير(۲۵/۳): فان طيب عضوا كاملا فمازاد فعليه دم) وقوله فما زاد فصل في البين وقوله وذالک مثل الراس) ظاهر، والفاصل في الارتفاق بين الكامل والقاصر العادة فان العادة في استعمال الطيب لقضاء التفث عضو كامل فتتمم به الجناية وفيما دونه في جنايته نقصان فتكفيه الصدقة.

وفي فتح القدير(۲۴/۳): (قوله واذا تطيب) يفيد مفهوم شرطه انه اذا شم الطيب لاكفارة عليه اذ ليس تطيبا بل التطيب تكلف جعل نفسه طيبا وهو ان يلصق ببدنه او ثوبه طيبا هو جسم له رائحة طيبة والزعفران والبنفسج والياسمين والغالية والريحان والورد والورس والعصفر طيب.

(۱۷۴) نفلی طواف اور دوگانہ طواف کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جس طرح نفلی نماز وروزہ شروع کرنے سے واجب ہوجاتا ہے اور توڑنے پر قضا آتی ہے تو اسی طرح نفلی طواف بھی شروع کرنے سے واجب ہوجاتا ہے؟ اور اگر درمیان میں کوئی چھوڑ دے تو کیا اس کی قضا کرنا ہوگی؟ اور اس کی قضا کرنے کی صورت کیا ہوگی؟ نیز دوگانہ طواف آیا فرض طواف کے بعد ہی ہے یا نفلی طواف کے بعد بھی؟

الجواب حامداً ومصلياً ...... صورت مسئولہ میں اگر کوئی نفلی طواف شروع کرے تو شروع کرنے سے طواف واجب ہوجائے گا اور اگر درمیان

میں کوئی کسی وجہ سے طواف چھوڑ دے تو پھر اسے وہیں سے پورا کرنا ہوگا جہاں سے چھوڑا ہے کیونکہ طواف کے اشواط کے درمیان اتصال ضروری نہیں بلکہ مستحب ہے۔ تاہم بہتر یہ ہے کہ طواف کا از سر نو اعادہ کرے نیز دوگانہ طواف ہر طواف کے بعد ادا کرنا لازم ہوگا خواہ طواف فرض ہو یا نفل۔

لمافي الهندية(۱/۲۲۶): واذا فرغ من الطواف يأتي مقام ابراهيم عليه السلام ويصلي ركعتين وان لم يقدر على الصلاة في المقام بسبب المزاحمة يصلي حيث لا يعسر عليه من المسجد

وفي الهندية (۱/۲۲۷): ويصلي لكل اسبوع ركعتين في الوقت الذي يباح فيه التطوع.

وفي الدر المختار(۲/۴۹۸): (وختم الطواف باستلام الحجر استنانا ثم صلى شفعا) في وقت مباح (يجب) بالجيم على الصحيح (بعد كل اسبوع عند المقام)...... وقال الشامي. قوله بعد كل اسبوع ...... وعليه لكل اسبوع ركعتان لباب، واطلق الاسبوع فشمل طواف الفرض والواجب والسنة والنفل...... والظاهر ان المراد بالاسبوع الطواف لا العدد حتى لو ترك اقل الاشواط لعذر مثلا وجبت الركعتان وعليه موجب ماترك فليراجع، واما قوله في شرح اللباب: تجب بعد كل طواف ولوادى ناقصا فيحتمل نقصان العدد.

وفي مناسك ملا علي قاري (صـ۱۴۴): (ويلزم) اى اتمامه :بالشروع فيه) اى في طواف التطوع ...... وقال (صـ۱۵۴) وصورة الاعادة على الحجر ان ياخذعن يمينه خارج الحجر الخ (هكذا) اى مثل ماذكر من صورتي الاعادة (يفعل سبع مرات) اى ان تركه في جميع اشواط الطواف والا فبقدره (ويقضي حقه فيه) اى ويفعل في حال اعادته ما يستحق الطواف وجوبا اوسنة الخ.

(۱۷۵) ایامِ حج میں مانع حیض گولیوں کے استعمال کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ [illegible] عورت کو حج کے دوران [illegible] آجانے تو کیا وہ عورت ایامِ حج میں مانع حیض گولیاں استعمال کرسکتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... مانع حیض گولیوں کا استعمال کرنا اگر کسی دینی مصلحت کی خاطر ہو تو شرعاً ان گولیوں کا استعمال کرنا جائز ہے۔ پس صورتِ مسئولہ میں عورت ایامِ حج میں مانع حیض گولیاں استعمال کرسکتی ہے۔

لما في الشامية (۱/۳۰۴): قال في السراج: سئل بعض المشائخ عن المرضعة اذا لم ترحيضا فعالجته حتى رأت صفرة في أيام الحيض؟ قال: هو حيض تنقضي به العدة.

وفي اللجنة الدائمة(۵/۴۰۰): س: عن حكم استعمال حبوب منع الحيض في رمضان والحج

لتتمكن من أداء العبادة؟

ج: لایظهر لنامانع من ذلک إذا كان الغرض من استعمالها ما ذكر،وأنه لا يترتب على استعمالها أضرار صحية.

وفيه ايضاً(۱۱/۱۹۰): يجوز للمرأة أن تأكل حبوبالمنع العادة الشهرية عنها اثناء ادائهاللمناسک.

وفی الاشباه والنظائر(صـ۱۵۹): القاعدة الخامسة عشرة: من استعجل الشی قبل او أنه عوقب بحرمانه ومن فروعها...... السادسة: شربت دواء فحاضت لم تقض الصلوت.

(۱۷۶) حالت احرام میں غلاف کعبہ سر پر ڈالنے کا حکم

سوال ...کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص حج کرنے کیلئے گیا لیکن اس نے حالت احرام میں اپنے سر پر غلاف کعبہ ڈالدیا تاکہ برکت حاصل ہوجائے تو اب اس شخص کیلئے کیا حکم ہوگا؟ آیا اس پر دم لازم ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً......احرام کی حالت میں غلاف کعبہ سر پر ڈالنا مکروہ ہے لیکن اس سے دم لازم نہیں آئے گا۔

لمافي الهندية(۱/۲۴۲): ولو غطى المحرم رأسه او وجهه يوماً فعليه دم وان كان اقل من ذلک فعليه صدقة كذا في الخلاصة.

وفيه ايضاً(۱/۲۲۴): وكذا لو دخل تحت ستر الكعبة حتى غطاه والستر لايصيب رأسه ولا وجهه لابأس به، فان كان يصيب رأسه او وجهه كره ذلک لمكان التغطية كذا في المحيط.

وفي الدر المختار(۲/۴۸۸): وقالوا لو دخل تحت ستر الكعبة فاصاب رأسه او وجهه كره والا فلا بأس به.

وفي الشامية تحته : (قوله وقالوا) نص عليه في اللباب وغيره...... (وقال بعد سطرين قوله كره) ظاهر اطلاقه انها تحريمية ط.

(۱۷۷) عمرہ کے پیسوں سے کسی محتاج کی شادی کرانے کا حکم

سوال ...کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سائل نے عمرہ کرنے کا ارادہ کیا تھا اور رقم جمع کی تھی اور تیاری بھی کرلی تھی لیکن مجھے ہارٹ اٹیک (دل کا دورہ) ہوا، اور زبردست قسم کا حملہ ہوا تھا ڈاکٹر حضرات نے سفر کرنے سے روکا ہے لہٰذا اگر میں یہ رقم کسی یتیم لڑکی کی شادی اور کسی مسجد میں لگوادوں تو کوئی حرج تو نہیں ہے لہٰذا میرے گھر والے یہ چاہتے ہیں کہ شرعی مسئلہ معلوم کرنے کے بعد یہ رقم خرچ کریں۔

الجواب حامداً ومصلیاً   صورت مسئولہ میں اگر آپ عمرہ کریں گے تو اس کا فائدہ صرف آپ کی ذات کو ہوگا اور اگر آپ ان پیسوں سے کسی محتاج کی شادی کرادیں کے یا مسجد میں لگادیں تو اس کا نفع متعدی ہوگا آپ کو بھی اس کا فائدہ ہوگا اور دوسروں کو بھی پھر خاص طور پر جب کہ آپ کو بیماری کی وجہ سے ڈاکٹر نے عمرہ کا سفر کرنے سے روک دیا ہے تو بجائے اس کے کہ آپ کے پیسے کہیں دوسری جگہ صرف ہوں آپ ان کو مسجد میں لگادیں یا کسی غریب محتاج کی اعانت کرلیں تو آپ کیلئے بہتر اور باعث ثواب ہوگا۔

لما في المحيط البرهاني(۳۰۹۹/۳):فالمختار أن الصدقة أفضل له لان نفع الصدقة يعود الى الغير ونفع الحج يقتصر عليه.

وفي الولوالجية(۱/۳۰۰): رجل حج مرة فاراد أن يحج مرّة أخرى فالحج أفضل ام الصدقة فالمختار ان الصدقة افضل لان الصدقة تطوع يعود نفعها إلى غيره والحج لا.

وفي الدر المختار(۶۲۱/۲): بناء الرباط أفضل من حج النفل واختلف في الصدقة ورجح في البزازية افضلية الحج لمشقته في المال والبدن جميعاً قال وبه افتى أبوحنيفة حين حج وعرف المشقة.

وفي الشامية تحته (قوله ورجح في البزازية افضلية الحج) حيث قال الصدقة أفضل من الحج تطوعاً كذا روى عن الامام لكنه لما حج وعرف المشقة أفتى بأن الحج أفضل ومراده أنه لوحج نفلاً وأنفق ألفاً فلو تصدق بهذه الالف على المحاويج فهو أفضل لا ان يكون صدقة فليس أفضل من انفاق الف في سبيل الله تعالى والمشقة في الحج لما كانت عائدة الى المال والبدن جميعاً فضل في المختار على الصدقة اهـ قال الرحمتي والحق التفصيل فما كانت الحاجة فيه اكثر والمنفعة فيه أشمل فهو أفضل كما ورد "حجة أفضل من عشر غزوات" وورد عكسه فيحمل على ماكان أنفع فاذا كان اشجع وأنفع في الحرب فجهاده أفضل من حجه او بالعكس فحجه افضل، وكذا بناء الرباط ان كان محتاجاً اليه كان أفضل من الصدقة وحج النفل، واذا كان الفقير مضطرا او من أهل الصلاح او من آل بيت النبي ﷺ فقد يكون اكرامه افضل من حجات وعمر وبناء ربط.

(۱۷۸) "الحج عرفة" کا مطلب

سوال   کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک حدیث میں پڑھا تھا یا کسی کتاب میں کسی صاحب کا قول تھا اللہ بہتر جانے کہ "حج جو ہے وہ عرفہ کا نام ہے" اس کا کیا مطلب ہے؟ آیا اگر کوئی شخص صرف کچھ دیر کیلئے عرفات کے میدان میں چلا گیا اور حج کے دوسرے افعال نہیں کیے تو اس کا حج ہو جائے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً   نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حج کے متعلق پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "حج عرفہ کا نام ہے۔"

یہ حدیث ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور سنن دارمی وغیرہ میں موجود ہے۔اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ ''وقوف عرفہ'' یہ حج کے بڑے ارکان میں سے ہے اور وقوف عرفہ کے فوت ہو جانے سے حج بھی فوت ہو جائے گا اور اگر کسی نے وقوف عرفہ کو پالیا تو اس کا حج باطل ہونے سے محفوظ ہوگیا اور فوت ہونے کی صورت میں دم وغیرہ سے اس کی تلافی نہیں ہو سکتی بخلاف دیگر افعال حج کے دم وغیرہ سے ان کی تلافی ہو جائے گی۔طواف زیارت بھی اگرچہ رکن ہے اور فرض ہے لیکن اس کے فوت ہونے سے حج باطل نہ ہوگا پوری عمر میں کسی بھی وقت ادا کر سکتا ہے البتہ ایام نحر سے مؤخر کرنا مکروہ ہے اور دم لازم آئے گا۔

لہٰذا اگر کوئی شخص کچھ دیر کیلئے میدان عرفات میں چلا گیا اور حج کے دیگر افعال ادا نہیں کیے اور طواف زیارت بھی نہیں کیا تو اس کا حج طواف زیارت ادا کرنے سے ادا ہوگا اور اگر وقوف عرفہ اور طواف زیارت کر لیے اور اس کے علاوہ دیگر افعال حج ادا نہیں کئے تو دیگر افعال ادا نہ کرنے کی بناء پر اس پر دم لازم آئیں گے اور اس کا حج ہو جائے گا۔

لمافي معارف السنن(۶/۲۲۶):باب ماجاء من ادرک الامام بجمع فقد ادرک الحج:...

(صـ۲۲) قوله: الحج عرفة. يريد ﷺ أن وقوف العرفة هو الحج لانه معظم أركان الحج فكانه الحج وكل من فاته فقد فاته الحج ولا يتدارک بدم وغيره بل عليه الحج من قابل ونظير هذا التعبير ''الندم توبة''...

وفي البحر الرائق(۲/۲۱۸):فصل ومن لم يدخل مكة: (....... ......) وقال عليه الصلوة والسلام ((من ادرک عرفة بليل فقد ادرک الحج... والمراد بتمام الحج بالوقوف في الحديث وعبارتهم الأمن من البطلان لا حقيقته اذبقي الركن الثاني وهو الطواف.

وفي حاشية(نسبرے) ابن ماجه(صـ۲۱۶): تحت قوله عليه السلام الحج عرفة: قال الحج عرفة يعني الركن الاعظم للحج هو الوقوف بها كانها هي الحج فان ادراک الحج موقوف على ادراک الوقوف بها حتى ان من اخر الوقوف بها حتى خرج وقته فقد فاته الحج بخلاف سائر احكامه فبتاخيرها لايفوت الحج.

وفي هندية(۱/۲۱۹):(واما شرائط صحة ادائه فثلاثة) الاحرام والمكان والزمان هكذا في السراج الوهاج (وامار كنه فشيئان) الوقوف بعرفة وطواف الزيارة لكن الوقوف اقوى من الطواف...... حتى يفسد الحج بالجماع قبل الوقوف ولا يفسد بالجماع قبل طواف الزيارة .... (واما واجباته فخمسة) السعي بين الصفا والمروة والوقوف بمزدلفة ورمي الجمار والحلق أوالتقصير وطواف الصدر .. ..

وفي الشامية(۲/۵۱۷):مطلب في طواف الزيارة: (وأيضا صـ۵۱۸،۵۱۹) (فان اخره عنها) اى ايام النحر ولياليها منها(كره) تحريما (ووجب دم) لترک الواجب.